

AUGUST 2011

سنگرم نمبر

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk



در سالانہ ایک گیت گیسٹری
 پاکستان (سلاش) ----- 600 روپے
 ایشیا و افریقہ، یورپ ----- 4000 روپے
 امریکہ، آسٹریلیا، بحرہند ----- 5000 روپے



17	احمد زین	سیر دو جہاں	33	رضیہ جمیل	خط آپ کے
288	خالہ جیلانی	سویم کے گوان	264	سارہ غلام تہی	مسکراہٹیں
290	ادارہ	خو لصورت بنتے	282	غزل ٹوپکان	ایتنیہ خالے میں
			268	شگفتہ جاہ	یا لوں سے خوشیوں کے
			278	امت الصبور	یارخ کے جھروکے

اگست 2011
 جلد 25 شمارہ 12
 قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل فلمیں حسن پر شنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۱۱۱۱ پی ایچ ای سی بیچ ایبٹ سوسائٹی کراچی
 Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
 Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com



224	سارہ عارف	صبح کا ستارہ
74	سعدیہ عزیز	حسن زندگی کا
104	نعیمہ سار	بھٹور کا سفر



97	سعدیہ عزیز	تحفہ
63	عزیزہ مقصود	پہچان
131	حراق شیشی	اس طرح ہوتا ہے
67	توبیہ حبیب	روپ کیسے



261	فانی بدایونی	غزل
261	ناصر کاظمی	غزل
262	نعمان فاروق	غزل
262	ابن آس	نظم

10	رضیہ جمیل	پہلی شعاع
11	خالد بزمی	حمد
11	ماہر القادری	نعت
12	ادارہ	نئی کی باتیں



22	شابین رشید	بندھن
272	شابین رشید	دستک
26	ادارہ	ایک تصویر نئی جاتی ہے



40	عالیہ بخاری	دلور شب
242	آمنہ ریاض	ستارہ شام



261	فانی بدایونی	غزل
261	ناصر کاظمی	غزل
262	نعمان فاروق	غزل
262	ابن آس	نظم
192	سلوٹی علی بیٹ	دل کے رستے
140	راحت حبیب	گل ہنور

اختتام: ماہنامہ شعاع ۱۵ اگست کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تھکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

شعبان کا سالگرہ غیر اگست کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کے بے کراں خلوص اور گہری محبتوں کے ساتھ روشنی کے سفر کا ایک اور سال اختتام پذیر ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے کرم اور مہربانی سے شعبان نے کامیابی کے 26 سال مکمل کر لیے۔ آج شعبان بے شمار گھروں میں، ذہنوں میں اُجالا بکھیر رہا ہے۔ روشنی پھیلا رہا ہے۔

شعبان کی اس کامیابی میں — ہماری مصنفین کا بڑا حصہ ہے جنہوں نے دلچسپ، بامقصد اور شائستہ تحریریں لکھیں۔ ذہنوں کو نکھارنے اور بنانے کا فریضہ انجام دیا۔ اس کے لیے وہ بجا طور پر مبارک باد کی حق دار ہیں۔ ہم اپنی مصنفین کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ہم اپنی قارئین کو بھی پورے دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔ شعبان کی کامیابی آپ کی کامیابی ہے۔ شعبان آپ ہی کا پرچم ہے۔ آپ کے مشورے تعریف و تحقیر ہمیشہ ہماری رہنمائی کرتی رہی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ مصنفین کا تعاون اور آپ کی پُر خلوص محبتیں ہمارے ساتھ رہیں اور شعبان کامیابی سے آگے بڑھتا رہے۔ آمین۔

اگست کے مہینے سے ایک اور خوشی وابستہ ہے۔ سب سے بڑی خوشی۔ پاکستان کا یوم آزادی۔ 14 اگست 1947ء وہ تاریخ ساز دن، جب بڑے صغیر کے مسلمانوں کو اپنی علیحدہ شناخت، ایک وطن حاصل ہوا اور دنیا کے نقش پر پاکستان نے جگہ پائی۔ 14 اگست اس بار بھی رمضان المبارک کے مہینے میں آ رہا ہے۔ نئے دل سے اپنے آپ سے ایک سوال پوچھیے۔ کیا مسلمان اور پاکستان کے علاوہ کوئی اور شناخت ہمارے لیے باعث عزت ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمارے پاک وطن کو سلامت رکھے۔ آمین۔

عیدِ نمبر 6

شعبان کا ستمبر کا شمار عیدِ نمبر ہے۔ عیدِ نمبر میں مستقل سلسلوں کے ساتھ عید سے متعلق تحریریں بھی شامل ہوں گی۔ مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد مجلہ میں تاکہ شامل ہو سکیں۔

عیدِ سروے 6

- 1- عیدِ ہمارا مذہبی تہوار ہے۔ جو دعائی انداز سے منایا جاتا ہے۔ آپ کو یہ تہوار اپنے انداز سے منانے کا موقع ملے تو کیسے منائیں گی؟
 - 2- اپنی کسی یادگار عید کا احوال لکھیے۔ شادی کے بعد پہلی عید کچھ یاد ہے کیا تحفہ ملا تھا اور کیسے مبارک باد دی گئی تھی؟
 - 3- آپ کے گھر میں عید کی کوئی ڈش بنتی ہے؟ آپ کے ہاں عید کیسے منائی جاتی ہے؟ ان سوالوں کے جواب اس طرح لکھیں کہ 18 ستمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔
- شعبان کا سالگرہ نمبر آپ کو کیسا لگا اور ایک بار پھر ہمیشہ کی تاکید۔ ہمیں خط لکھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

اندھیرے چیر کر ان میں اُجالا تو ہی کرتا ہے
ہر ایسا کام اے اللہ تعالیٰ تو ہی کرتا ہے

شکستِ فاش دیتا ہے ہمیشہ تو ہی باطل کو

ہر اک موقع پہ حق کا بول بالا تو ہی کرتا ہے

جہاں میں وقت پیدا نہیں لے کر آخری دم تک

ہر انسان اور ہر حیوان کو پالا تو ہی کرتا ہے

بسا اوقات ہم مایوس ہو جاتے ہیں گھبرا کر

ایسے وقت میں مشکل کو ٹالا تو ہی کرتا ہے

زمین پر گل شکفتے، آسمان پر نجم رختند

ہے یہ کام تیرے کرنے والا تو ہی کرتا ہے

یہ بزمی اور اس جیسے کروڑوں ہی بشر ہوں گے

پاکوین کو گرنے سے سنبھالا تو ہی کرتا ہے

خالد نبی

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقری کی
سلام اس پر کہ اسرارِ محبت جس نے بھلے
سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر بھول بریلے
سلام اس پر کہ جس نے خون کے پیالوں کو قیام دیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں
سلام اس پر کہ دشمن کو حیاتِ باور دے دی
سلام اس پر ابو سفیان کو جس نے ماں دے دی
سلام اس پر کہ جس کا ذکر ہے سارے صحائف میں
سلام اس پر ہوا مجروح جو بازارِ طائف میں
سلام اس پر وطن کے لوگ جس کو تنگ کرتے تھے
سلام اس پر کہ گھر ولے بھی جس سے جنگ کرتے تھے
سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اس پر کہ ٹوٹا بول رہا جس کا بچھونا تھا
سلام اس پر جو سچائی کی خاطر دکھ اٹھا تھا
سلام اس پر جو بدکارہ کے اوروں کو کھلاتا
سلام اس پر جو امت کے لیے راتوں کو روتا تھا
سلام اس پر جو فرشِ خاک پر جاڑے میں سوتا تھا
سلام اس پر جو دنیا کے لیے رحمت ہی رحمت ہے
سلام اس پر کہ جس کی ذات غرّ آدمیت ہے
سلام اس پر کہ جس نے جھولیاں بھر دیں فقریوں کی
سلام اس پر کہ مشکیں کھول دیں جس نے نایروں کی
سلام اس پر کہ جس نے فضل کے موتی بکھرے ہیں
سلام اس پر بڑوں کو جس نے فرمایا کہ میرے ہیں

ماہِ القعدہ

حاملہ اور دودھ پلانے والی کا روزہ چھوڑنا

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے۔ یہ صحابی قبیلہ بنو عبد الاشہل کی شاخ بنو عبد اللہ بن کعب سے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھڑ سوار دستے نے ہمارے قبیلے پر حملہ کیا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کھانا کھا رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”آجاؤ کھانا کھاؤ۔“ میں نے کہا۔ میرا روزہ ہے۔ فرمایا ”بیٹھ جاؤ! میں تمہیں روزے کی بات بتاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے مسافر کو آدھی نماز معاف کر دی ہے اور مسافر حاملہ اور دودھ پلانے والی کو روزہ یا روزے معاف کر دیے ہیں۔“ اللہ کی قسم! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں لفظ فرمائے یا ان میں سے ایک لفظ فرمایا۔ مجھے اپنے آپ پر افسوس ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے میں شریک نہ ہوا۔“

رمضان کے روزوں کی قضا سے متعلق احکام و مسائل

- 1 جس وقت یہ واقعہ پیش آیا اس وقت حضرت انس بن مالک کعبیؓ مسلمان ہو چکے تھے جبکہ ان کا قبیلہ ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔
- 2 مسافر کو آدھی نماز معاف ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جن نمازوں میں چار رکعت فرض ہیں ان میں دو رکعت فرض نماز ادا کی جائے فجر اور مغرب کی نماز سفر میں بھی پوری پڑھی جاتی ہے۔
- 3 روزے دار کو کھانے کی دعوت دی جائے تو وہ اپنے روزے کا اظہار کر سکتا ہے یہ ریاء میں شامل نہیں۔

4 مسافر بچے کو دودھ پلانے والی اور حاملہ کے لیے رعایت ایک ہی سیاق میں بیان ہوئی ہے مگر تفصیل میں فرق ہے کہ مسافر کو روزہ معاف ہے مگر قضا ادا کرنا واجب ہے۔ اور مریضہ اور حاملہ کی بابت علماء کی چار آراء ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔ ایک رائے تو یہ ہے کہ ان کے لیے فدیہ ہی کافی ہے بعد میں قضا نہیں۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ان پر قضا ہے نہ فدیہ۔ یہ رائے حافظ ابن حزم کی ہے جو انہوں نے ”المحلی“ میں بیان کی ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ فدیہ طعام کے علاوہ بعد میں وہ قضا بھی ہیں۔ چوتھی رائے یہ ہے کہ وہ مریض کے حکم میں ہیں وہ روزہ چھوڑ دیں انہیں فدیہ دینے کی ضرورت نہیں اور بعد میں قضا دیں۔ مولانا محمد علی جاناباز نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ نیز سعودی علماء کی بھی یہی رائے ہے۔

رمضان کے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا

- ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔
- ”میرے ذمے رمضان کے روزے ہوتے تھے تو میں ان کی قضا نہیں دیتی تھی حتیٰ کہ شعبان آجاتا۔“
- 1 رمضان میں عذر شرعی کی بنا پر جو روزے چھوٹ جائیں ان کی قضا سال بھر میں کسی وقت بھی دی جاسکتی ہے ضروری نہیں کہ وہ روزے شوال ہی میں رکھے جائیں۔
 - 2 حیض روزے کے منافی ہے اس لیے ان ایام

میں روزہ رکھنا منع ہے۔

3۔ اگر روزہ رکھا ہوا ہو اور دن کے وقت حیض شروع ہو جائے تو روزہ ختم ہو جائے گا وہ روزہ شمار نہیں ہوگا۔

4۔ حیض و نفاس کے نذر کی وجہ سے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح بیماری یا سفر کی وجہ سے چھوٹے ہوئے روزے بعد میں رکھے جاتے ہیں۔

جس نے بھول کر روزہ کھول دیا (اس کے لیے کیا حکم ہے؟)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جس نے روزے کی حالت میں بھول کر کچھ کھایا اسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کرے اسے اللہ نے کھلایا اور پلایا ہے۔“

فوائد و مسائل

- 1۔ اسلام کے احکام میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بھول جانا انسان کی فطرت ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھول کر کیے ہوئے کام کو گناہوں میں شمار نہیں کیا۔ روزے کے بارے میں مزید رحمت فرمائی کہ کھانے پینے کے باوجود روزے کو قائم قرار دیا۔ اللہ کے کھلانے پلانے کا یہی مطلب ہے۔
- 2۔ بھول کر کھانے پینے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ گناہ ہو یا نہ ہو روزہ تو قائم نہیں رہا کیونکہ روزہ تو کھانے پینے سے پرہیز کا نام ہے اور وہ پرہیز ٹوٹ گیا ہے۔ روزہ دار کو چاہیے کہ روزے کا پانی وقت اسی طرح گزارے جس طرح عام حالات میں روزے کی پابندیوں کے ساتھ گزارتا ہے اس کا یہ روزہ شرعاً صحیح ہوگا لہذا اس کی قضا لازم نہیں ہوگی نہ کوئی کفارہ ادا کرنا ہوگا۔

روزے کی حالت میں قے سے متعلق احکام و مسائل

حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک ابرہہ بن ابی اسد نے ہم نے روزہ کھول دیا۔ (یہ سمجھے کہ سورج غروب ہو چکا ہے) لیکن پھر (بادل ہٹ گئے اور) سورج نکل آیا۔“

(ابو اسامہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔) میں نے ہشام بن عروہ رحمۃ اللہ علیہ سے کہا۔ کیا انہیں (روزے کی) قضا کا حکم دیا گیا تھا؟ انہوں نے کہا۔ یہ تو ضروری تھا۔

فائدہ

- 1۔ حدیث میں مذکورہ صورت بھول کر کھانے پینے سے مختلف ہے کیونکہ انہوں نے بھول کر نہیں کھایا یا بلکہ ارادے سے اپنے خیال میں روزہ کھولا تھا۔ اگرچہ غلط فہمی کی بنا پر وقت سے پہلے کھول دیا تھا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر وہ گناہ گار تو نہیں ہوئے لیکن روزہ یقیناً ناقض ہو گیا۔ ایسے روزے کی قضا کی بابت علماء میں اختلاف ہے تاہم جمہور علماء کے نزدیک ایسی صورت میں افطار کیے ہوئے روزے کی قضا واجب ہے۔

روزے دار کو قے آجائے (تو کیا حکم؟)

حضرت فضالہ بن عیاد انصاریؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے دن ان کے پاس تشریف لائے جس دن آپ روزہ رکھا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (پانی کا) برتن طلب فرمایا اور پی لیا۔ ہم نے کہا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو وہ دن ہے جس دن آپ روزہ رکھا کرتے تھے۔ فرمایا ہاں! لیکن مجھے قے آگئی تھی۔“

فائدہ

- 1۔ روزے کے دوران میں قے کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے اگر کسی وجہ سے قے کرنی پڑے تو اس سے

روزہ ٹوٹ جاتا ہے، خواہ روزہ فرضی ہو یا نفلی، تاہم فرضی روزے کی قضاء ضروری ہے۔

روزے میں مسواک کرنا اور سرمہ لگانا

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”روزے دار کے بہترین اعمال میں سے ایک عمل مسواک بھی ہے۔“

1- یہ روایت اگرچہ سداً ضعیف ہے۔ تاہم صحیح روایات سے روزے کی حالت میں مسواک کرنا ثابت ہے۔ اس سے روزے میں فرق نہیں آتا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح البخاری میں کتاب الصوم میں ایک باب کا عنوان اس طرح درج کیا ہے۔

”روزے دار کا تازہ یا خشک مسواک کرنا۔“ اس کے بعد بیان کرتے ہیں کہ حضرت عامر بن ربیعہؓ نے مذکور ہے، انہوں نے فرمایا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روزے کی حالت میں مسواک کرتے اتنی بار دیکھا ہے کہ میں شمار نہیں کر سکتا۔

روزے دار کے لیے غیبت اور فحش گوئی (کی ممانعت) کا بیان

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جس نے جھوٹ اور بے ہودہ باتوں اور بے ہودہ اعمال سے اجتناب نہ کیا، اللہ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ شخص کھانا پینا ترک کرے۔“

فوائد و مسائل

1- روزے کا بنیادی مقصد تقویٰ کا حصول ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم متقی بن جاؤ۔“

2- تقویٰ کے حصول کے لیے صرف کھانے پینے سے پرہیز کافی نہیں بلکہ ہر قسم کے گناہوں سے بچنے کی شعوری کوشش مطلوب ہے۔ روزہ رکھ کر ہم اللہ کی حلال کردہ چیزوں سے بھی اللہ کے حکم کے مطابق پرہیز

کرتے ہیں تو جو کام پہلے بھی ممنوعہ ہیں، ان سے بچنا زیادہ ضروری ہے، تاکہ مومن ان سے پرہیز کا عادی ہو جائے۔

3- شریعت اسلامیہ میں روزے کے دوران بات چیت کرنا جائز ہے بلکہ چپ کاروزہ شرعاً منع ہے۔

4- عبادات انسان کے روحانی اور جسمانی فائدے کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ اللہ کی رحمت ہے کہ وہ ان اعمال پر آخرت میں بھی عظیم انعامات عطا فرماتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”بعض روزے داروں کو روزے سے بھوک کے سوا کچھ نہیں ملتا اور بعض قیام کرنے والوں کو قیام سے بیداری کے سوا کچھ نہیں ملتا۔“

فوائد و مسائل

1- اخلاص کے بغیر نیک اعمال قبول نہیں ہوتے۔ 2- عبادت میں جس طرح ظاہری ارکان کی پابندی ضروری ہے اسی طرح باطنی کیفیات اخلاص اللہ کی محبت، اللہ کا خوف، اللہ سے امید وغیرہ بھی مطلوب ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں ظاہری عمل بے فائدہ ہے۔ 3- اگر کسی موقع پر مطلوبہ باطنی اور قلبی کیفیت موجود نہ ہو تو نیکی کو ترک نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس کا کم از کم یہ فائدہ تو حاصل ہو ہی جائے گا کہ فرض کا تارک شمار نہیں ہوگا اور وہ نیکی مسلسل انجام دینے سے امید کی جاسکتی ہے کہ دل پر تھوڑا بہت اچھا اثر لازماً ہو جائے گا۔

4- عبادات میں ان کے آداب کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

جواب

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جب تم میں سے کسی کا دن کو روزہ ہو تو وہ فحش گوئی نہ کرے اور ناروا حرکت نہ کرے، اگر کوئی اس

سے بد تمیزی کرے تو کہہ دے، میں روزے دار آدمی ہوں۔“

فوائد و مسائل

1- روزے کے فوائد کا حقہ حاصل کرنے کے لیے آداب کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

2- جمل (ناروا حرکت) سے مراد لڑائی جھگڑے کی بات ہے، یعنی روزے دار کو لڑائی میں پہل بھی نہیں کرنا چاہیے اور اگر کوئی دوسرا شخص ایسی بات کرے یا ایسی حرکت کرے جس سے روزے دار کو غصہ آجائے تب بھی روزے دار کو جواب میں جھگڑنا نہیں چاہیے۔ بلکہ اپنے روزے کا خیال کرتے ہوئے برداشت اور تحمل سے کام لیتے ہوئے جھگڑے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

3- یہ کہنا کہ میں روزے سے ہوں، اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ دل میں اپنے روزے کا خیال کرے تاکہ جھگڑے سے بچنا ممکن ہو سکے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جھگڑنے والے سے کہہ دے کہ میں تمہاری ناروا حرکت کا جواب تمہارے انداز میں اس لیے نہیں دے رہا کہ میرا روزہ مجھے اس سے روکتا ہے۔ امید ہے اس سے اس کو شرم آجائے گی اور وہ روزے دار کے روزے کا احترام کرتے ہوئے جھگڑا ختم کر دے گا۔

سحری کھانے کا بیان

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔“

فوائد

1- السحور کا لفظ سین کی زیر سے بھی پڑھا گیا ہے اور پیش سے بھی۔ سین کی زیر سے سحور کا مطلب وہ طعام ہے جو روزہ شروع کرنے سے پہلے کھایا جاتا ہے اور سحور (سین کی پیش سے) کھانے کے عمل کو کہا جاتا ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت کھانا کھانا باعث برکت ہے۔ اس کا ثواب بھی ملتا ہے کیونکہ یہ

ایک مسنون عمل ہے اور اس سے روزے کی تکمیل میں آسانی بھی ہوتی ہے، یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت کھائے جانے والے کھانے میں ایک خاص برکت ہے، اس کی وجہ بھی یہ ہی ہے کہ اس کا تعلق سنت نبوی سے ہے اور اس کی وجہ سے غیر مسلموں کی مشابہت سے بچاؤ بھی ہو جاتا ہے کیونکہ یہود و نصاریٰ سحری نہیں کھاتے۔

2- ثواب کا تعلق مشقت سے نہیں، احکام شریعت کی پابندی سے ہے۔ سنت کے مطابق تھوڑا اور آسان عمل اس سے زیادہ اور مشقت طلب عمل سے بہتر ہے جو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”سحری کے کھانے کے ساتھ دن کے روزے کے لیے مدد حاصل کرو اور قیلوے کے ذریعے سے قیام اللیل (نماز تہجد) کے لیے مدد حاصل کرو۔“

سحری دیر سے کھانے کا بیان

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، حضرت زید بن ثابتؓ نے فرمایا۔

”ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی، پھر اٹھ کر نماز کی طرف چلے۔“ (حضرت انسؓ نے فرمایا) میں نے کہا۔ ”ان دونوں کاموں کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟“ حضرت زیدؓ نے فرمایا۔ ”پچاس آیتوں کی تلاوت جتنا۔“

1- اگرچہ سحری کا کھانا صبح صادق سے کافی پہلے بھی کھایا جاسکتا ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ رات کے آخری حصے میں صبح صادق سے تھوڑی دیر پہلے کھایا جائے۔

2- فجر کی نماز اول وقت میں ادا کرنا افضل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کے بعد مختصر وقفہ دے کر فجر کی نماز ادا کی۔

انوار سہیلی (کلیلہ و دمنہ)

ترجمہ پروفیسر معین الدین درگانی تبصرہ ائمہ زہیں

کر کے واپس ہوا اور سنسکرت سے پہلوی زبان میں ترجمہ کر کے نوشیرواں کی خدمت میں پیش کی۔ ایک بادشاہ کے ذکر سے کتاب کا پہلا باب کھلتا ہے۔

اس بادشاہ کو لوگ ہمایوں خال کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ اس کے عدل سے رعایا خوش اور اس کی بخشش سے مفاوت سے بوڑھے، مجبور اور محتاج سب ہی چین کی بنی بجاتے تھے۔ اس بادشاہ کا ایک وزیر تھا جس کی صائب رائے سے امور سلطنت کی گتھیاں آسانی سے سلجھ جاتی تھیں اور اس کی تدبیر سے سلطنت میں اٹھنے والے بہت سے فتنے دب جاتے تھے۔

اسی وزیر کی ہمراہی میں بادشاہ شکار کو نکلا۔ واپسی کے سفر میں کسی پہاڑ کے سبزہ زار میں آرام کی خاطر رکنا اور اس دوران وزیر اور بادشاہ کی آپس کی گفتگو دراصل اس کتاب کے رازوں سے پردہ اٹھانے کے موجب بنے۔

”ہمایوں خال نے پوچھا کہ ”یہ زبردست حاکم کیسا ہونا چاہیے اور ملک و ملت کے کاموں کی بجا آوری میں اس کو کن صفات کا حامل ہونا چاہیے؟“

بحسبہ رائے نے جواب دیا کہ اس حاکم کے لیے ضروری ہے کہ وہ انصاف کی باریکیوں اور سیاست کے قوانین سے پوری طرح واقف ہو ورنہ ملک زوال سے قریب تر ہو جائے گا اور سلطنت ہاتھ سے نکل جائے گی۔ جس بادشاہ نے اپنے امور کا دار و مدار حکمت اور سیاست پر رکھا اس کی مملکت کے آباد اور رعایا کے دل شاد ہونے میں کوئی شک نہیں۔“

وزیر کے بیان کے مطابق عظیم ہندوستان میں ایک

انسان کو متمدن بننے کے سفر میں حاصل ہونے والے تجربات، مشاہدات اور نتائج آنے والے لوگوں کے لیے سبق آموز بن جاتے ہیں اور یہی حکمت کی بنیاد بنتے ہیں۔ یہ حکمت لوگ دانش بھی ہو سکتی ہے۔ جس کے حامل بغیر کسی سند کے اپنی زندگی میں درپیش معاملات سے بچتے ہیں اور یہ بلند درجہ معاملات میں بھی اتنی ہی مطلوب اور کارگر ثابت ہوتی ہے یعنی معاملات ریاست۔

”انوار سہیلی“ کلیلہ و دمنہ کے نام سے بھی معروف ہے اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہوتے ہوئے ہمارے لیے اردو میں اسے ”پروفیسر معین الدین درگانی“ نے ترجمہ کیا ہے اور وہ اس کے پیش لفظ میں تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”کئی ہزار سال پہلے بیربائے نامی ایک پنڈت نے ہندوستان کے ایک راجا دیشیلم کے لیے ایک کتاب لکھی تھی اور کوشش کی تھی کہ بادشاہوں کے لیے حکمرانی، عدل گستری، عیان مملکت کی وفاداری اور دشمنوں سے نجات حاصل کرنے میں یہ کتاب شعل ہدایت کا کام دے اور سوائے حکمران کے کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔

آہستہ آہستہ کسری نوشیرواں کو اس کی خبر ملی کہ ہندوستان کے ایک راجا کے پاس ایک ایسی نادر کتاب ہے جس میں آئین جہاں داری کو بہت دلکش انداز میں چرند و برند کی زبان سے پیش کیا گیا ہے تو وہ اس کو دیکھنے کا مشتاق ہوا اور اپنے دربار کے ایک مشہور ماہر السنہ حکیم ہرزویہ کو اس مقصد کے تحت ہندوستان بھیجا۔ حکیم ہرزویہ ایک عرصے تک ہندوستان میں رہا، اٹلک جیلوں اور تداہیر سے اس کتاب کی نقل حاصل

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس نے ہمیشہ روزے رکھے اس نے نہ روزہ رکھا نہ افطار کیا۔“

فوائد

- 1- عبادت میں شرعی حد سے تجاوز کرنا منع ہے۔
- 2- ہمیشہ روزہ رکھنا منع ہے۔
- 3- ”نہ روزہ رکھا نہ افطار کیا۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ اسے روزے رکھنے کا ثواب ملا نہ روزے چھوڑنے کا آرام نصیب ہوا۔ گویا نہ اخروی اور روحانی فائدہ حاصل ہوا اور نہ دنیوی اور جسمانی فائدہ حاصل ہوا بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کرنے سے وہ صورت بن سکتی ہے کہ ”نیکی برباد“ گناہ لازم۔
- 4- حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے ہمیشہ روزے رکھنے شروع کیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع فرمایا۔ ان کی باریباری درخواست پر زیادہ سے زیادہ جو اجازت دی وہ ”واؤ علیہ السلام“ والے روزے کی تھی یعنی ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن نہ رکھنا۔ جب حضرت عبداللہؓ نے فرمایا ”میں اس سے افضل عمل کی طاقت رکھتا ہوں۔“ یعنی اس سے زیادہ روزے رکھ سکتا ہوں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ ”اس سے کوئی افضل نہیں۔“

5- حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے روزہ رکھا ہی نہیں۔“



روزہ کھولنے میں جلدی کرنا

حضرت سل بن سعدؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”لوگ اس وقت تک بھلائی پر رہیں گے جب تک روزہ جلدی کھولتے رہیں گے۔“

فوائد

- 1- عبادت میں شریعت کی مقرر کردہ حد سے آگے بڑھنا دنیا اور آخرت کے نقصان کا باعث ہے۔
- 2- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”لوگ اس وقت تک بھلائی پر رہیں گے جب تک روزہ جلدی کھولتے رہیں گے۔ روزہ جلدی کھولا کرو“ کیونکہ یہودی دیر کرتے ہیں۔“

روزہ کس چیز سے کھولنا مستحب ہے؟

حضرت سلمان بن عامرؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جب کوئی روزہ کھولے تو اسے چاہیے کہ خشک کھجور سے روزہ کھولے اگر (کھجور) نہ ملے تو پانی سے روزہ کھولے کیونکہ وہ پاک کرنے والا ہے۔“

فوائد

- 1- تمر خشک کھجور کو کہتے ہیں۔ جامع الترمذی کی دوسری حدیث میں تمر (خشک کھجور) کے علاوہ رطب (تر کھجور) سے روزہ کھولنا بھی مذکور ہے۔
- 2- کھجور سے روزہ کھولنا اس لیے افضل ہے کہ یہ بابرکت پھل ہے اور پانی کا تعلق طہارت اور پاکیزگی سے ہے۔ روزہ روحانی پاکیزگی کا باعث ہے اور پانی ظاہری پاکیزگی کا۔ اس مناسبت سے پانی سے روزہ کھولنا بھی مستحب ہے۔

ہمیشہ روزے رکھنے کا بیان

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے رسول

بیدار مغز اور رعایا پرور راجا تھا جس کی سلطنت میں انصاف کا دور دورہ تھا۔

ایک دن وہ اپنے دربار میں جشن شاہانہ منارہا تھا۔ لطف اندوز ہونے کے بعد اس کو نصیحت آمیز باتوں کے سننے کی رغبت ہوئی چنانچہ حکماء علماء فضلاء نے اچھے اخلاق پر گفتگو شروع کی۔

آخر بات جو دو سخاوت اور تمام حکماء اس بات پر متفق ہو گئے کہ سخاوت تمام اخلاق اور صفات میں کامل اور بہتر ہے۔ بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اس نے خزانے کا منہ کھول دیا۔ چنانچہ سارا دن زر و جواہر تقسیم ہوتا رہا۔ شام ہوئی راجا اپنی خواب گاہ میں جا کر سو رہا۔ نیند میں اسے اپنے عمل کی قبولیت کا اشارہ ملا اور ساتھ ہی ایک مد فون خزانے کی بشارت بھی۔

بادشاہ سفر کر کے اس جگہ تک پہنچا۔ زر و جواہرات کے بھرے ہوئے صندوق اور ڈبے اس کو عطا ہوئے۔ مگر ایک ڈبے کا تالا کسی طور نہ کھلا۔ آخر کار جب کھلا تو اس میں سے خوب صورت ڈبیا نکلی جس میں سفید ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا اور اس پر انجلی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

اس تحریر کو پڑھنے والے کی تلاش شروع ہوئی اور تمام ہوئی۔ حکیم نے اس نوشتہ کو لیا اور تھوڑی دیر تک حروف کو غور سے دیکھتا رہا پھر ادب سے عرض کیا کہ۔

”اے راجا! یہ بڑی مفید تحریر ہے اور حقیقی معنوں میں گنج نامہ یہی ہے۔“ اس تحریر کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

”میں ہوشنگ بادشاہ اس خزانے کو رائے دہشلم کے لیے امانت چھوڑ رہا ہوں۔ مجھے غیب سے معلوم ہوا ہے کہ یہ خزانہ اسی عظیم راجا کے نصیب کا ہے اس لیے زر و جواہر کے ساتھ وصیت نامہ بھی اس کے لیے رکھ رہا ہوں کہ جب وہ اس خزانے کو پائے تو میری ان وصیتوں کو بھی پڑھے۔

راجا نے اگر میرے بیان کردہ چودہ اصولوں کو نہ مانا تو اس کی سلطنت کی بنیاد ہمیشہ ہتی رہے گی اور مملکت برباد رہے گی۔

پہلی وصیت یہ ہے کہ اپنے ملازموں میں سے جس کو اپنا مقرب خاص بنائے اس کے خلاف دوسروں کی شکایت ہرگز نہ سنے کیونکہ کسی کے مقرب خاص ہو جانے کے بعد لوگ اس سے حسد کرنے لگتے ہیں اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بادشاہ کی طبیعت کو اس سے برگشتہ کر کے ہی دم لیتے ہیں۔

دوسری وصیت یہ ہے کہ لگائی بجھائی کرنے والے بات چیتنے والے اور چغل خوروں کو اپنی مجلس میں نہ آنے دے کیونکہ یہ لوگ فساد، جھگڑا کرنے والے اور بڑے ناپسندیدہ عناصر ہوتے ہیں۔ اگر کسی میں یہ عیب دیکھے تو جلد سے جلد اس آگ کو سیاست کے پانی سے بجھا دے۔

تیسری وصیت یہ ہے کہ اپنے ارکان سلطنت اور امراء سے ربط ضبط اور مراعات کے ساتھ پیش آئے کیونکہ مخلص دوستوں کی موافقت اور متحد مصاحبوں کی مدد سے ہی سارے کام مکمل طور پر انجام پذیر ہوتے ہیں۔

چوتھی وصیت یہ ہے کہ دشمن کی مہمانی اور خوشامد پر مغرور نہ ہو۔ وہ کتنی ہی چالو سی اور منت سماجت کرے اس پر بھروسہ نہ کیا جائے کیونکہ دشمن سے کبھی بھلائی سرزد نہیں ہوتی۔

پانچویں وصیت یہ ہے کہ جب گوہر مراد مل جائے تو اس کو معمولی سمجھ کر حفاظت میں نہ کرے اور اپنی غفلت سے اس کو ضائع نہ کرے کیونکہ پھر اس کے حاصل ہونے کی کوئی صورت نہیں ہوتی اور پشیمانی سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

چھٹی وصیت یہ ہے کہ کاموں کی انجام دہی میں بے توجہی اور غفلت نہ کرے بلکہ رک رک کر نرمی اور آہستگی سے انجام دے کیونکہ جلدی کرنے میں بہت سے نقصانات اور صبر و سکون میں بے حساب فائدے پوشیدہ ہیں۔

ساتویں وصیت یہ ہے کہ کسی وجہ سے تدبیر کو ہاتھ سے نہ جانے دے اگر دشمنوں کی جماعت اس کے قتل پر متفق ہو جائے اور وہ مصلحت اس میں دیکھے کہ ان میں سے کسی ایک کو اپنی طرف ملا کر چھٹکارا حاصل

کیا جاسکتا ہے تو ایسا کرنے میں ہرگز نہ ہچکچائے۔ آٹھویں وصیت یہ ہے کہ کینہ پرور اور حاسد لوگوں سے پرہیز کرے اور ان کی چرب زبانی اور خوشامد پر ہول نہ جائے کیونکہ کینے اور حسد کا پودا جب کسی سینے میں نصب ہو جاتا ہے تو پھر نقصان اور ایذا کا پھل دے بغیر نہیں رہتا۔

نویں وصیت یہ ہے کہ عفو اور درگزر کو اپنا شعار بنائے ملازموں کو معمولی خطا اور تقصیر پر مورد عتاب نہ بنائے۔

دسویں وصیت یہ ہے کہ کسی شخص کے درپے آزار نہ ہو مبادا مہملہ برائی کا برائی ہے کے اصول پر اس کو ضرر پہنچ جائے بلکہ بہتر یہ ہے کہ اپنے احسانات کی بارش سے لوگوں کو سیراب کرے تاکہ ”مگر بھلا ہو بھلا“ کے مطابق وہ بھی اپنی مراد کو پہنچے۔

گیارہویں وصیت یہ ہے کہ جو کام طبیعت اور مزاج کے مطابق نہ ہو اس کو ہرگز اختیار نہ کرے کیونکہ لوگ اپنی طبیعت کے خلاف کام میں ہاتھ تو ڈال دیتے ہیں لیکن درمیان میں ہی اسے ناتمام چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا کے مطابق نشانہ ملامت بنتے ہیں۔

بارہویں وصیت یہ ہے کہ بردباری اور استقلال کو اپنا شعار بنائے کیونکہ بردبار کا دل بڑا پیارا ہوتا ہے۔

تیرہویں وصیت یہ ہے کہ امانت دار اور قابل اعتماد ملازموں کا انتخاب کرے اور خیانت کرنے والے غدار لوگوں کو اپنے گرد پھٹکنے نہ دے کیونکہ سلطنت کے مقربین اور کارندے امانت دار ہوں گے تو نہ صرف راز مملکت کی حفاظت کریں گے بلکہ عوام کو بھی دکھ نہ پہنچائیں گے۔ اگر خدا نخواستہ یہ سیاہ دل اور خائن ہوں اور بد قسمتی سے بادشاہ ان پر اعتبار بھی کرتا ہو تو سب گناہوں کی تباہی اور بردبادی یقینی ہے اور برے نتائج کا اہل از ہل مرتب ہونا بھی ضروری ہے۔

چودھویں وصیت یہ ہے کہ ستم دوراں اور گردش امام سے کم از کم دل نہ ہو اور ہمت نہ ہارے کیونکہ یہ لوگ اپنے غل میں اند اور دانش ور لوگ ہی اکثر

مصائب کا شکار رہتے ہیں اور ناکارہ اور غافل لوگ عیش کیا کرتے ہیں۔ آدمی کو یقین رکھنا چاہیے کہ بغیر فضل باری تعالیٰ کے کوئی اپنے مقصد اور مراد کو نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک فضل باری نہ ہو فضل و ہنر سب بے کار پڑے رہ جاتے ہیں۔

ان چودہ وصیتوں میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک داستان اور واقعہ وابستہ ہے۔ اگر رائے دہشلم کو ان کی تفصیل معلوم کرنے کی خواہش ہو تو وہ کوہ سراندپ جہاں آدم علیہ السلام نے نزول فرمایا تھا کی طرف روانہ ہوئے گتھی وہیں سلجھے گی اور رائے اپنے مقصد کو پہنچے گا۔

راجا نے حکیم کی زبانی جب اس سفید کانڈ پر لکھا ہوا پیغام سنا تو اس تحریر کو عزت سے چوم اور اپنے بازو سے باندھ لیا اور کہا کہ خواب میں بتایا گیا اصل خزانہ یہ ہی ہے جس کے اسرار زر و جواہر سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔ اس ہند نامے کے شکرانے میں تمام خزانہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ اس کا ثواب ہوشنگ بادشاہ کو پہنچے اور مجھ کو بھی کچھ صلہ مل جائے۔

یوں اصل قصہ شروع ہوا بادشاہ نے سفر کا قصد کر لیا۔ اس سفر سے پہلے کی گئی مشاورت بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں مگر آگے بھی چلتا ہے۔

اگر آپ کا خیال ہے کہ یہ اصول تو جہاں بانی کے امور کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور ان سے عام آدمی کو کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ تو یہ بھی ٹھیک ہے۔

مگر ہر فرد کا اپنا اک جہاں ہے۔ ہر فرد ایک نظام میں داخل اور موجود ہے۔ اس کو وہاں خوش اسلوبی سے چلنے کے لیے رہنما اصولوں کی ضرورت پڑتی ہی ہے اور یہ اصول ہر فرد خود پر لاگو کر سکتا ہے۔ اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو ہر فرد بذات خود ایک جہاں ہے۔ ایک نظام کا نگران ہے۔ وہ اپنے ذہن و دل زبان ہاتھ پیروں کی مصاحبت اور رفاقت سے ہی اپنے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔ تو یہ اصول ہر طور سے فرد کی اصلاح احوال اور ترقی کے لیے پیش نظر رکھے جاسکتے ہیں۔

اور رہ گئے حکمران؟ حق یا... مجھے یقین اور امید
واثق ہے کہ جتنی دفعہ آپ حکمرانوں کی رعایا پروری
اور انصاف پسندی کا تذکرہ سنیں گی، آپ کا دل
”توڑے گا۔ یہ پنجابی کالفظ ہے جس کا سلیس ترجمہ مچلے
یا تڑپے گا“ کریں۔

اب نصیحتوں سے وابستہ داستانوں کی طرف
چلیں۔
پہلی نصیحت سے وابستہ داستان دو گیدڑوں کی ہے۔

”دو مکار گیدڑ شیر کے خاموشوں میں شامل تھے۔ ان میں
سے ایک کا نام کلیلہ اور دوسرے کا نام دمنہ تھا۔ دونوں
ہی بڑے چالاک ذہین اور عیار تھے، لیکن دمنہ کلیلہ
سے بڑھ کر تھا اور اس کو عزت و جاہ کی بڑی ہوس تھی۔
اس نے اپنی فراست سے پتا چلا لیا کہ شیر کس چیز کا
خوف غالب ہے، چنانچہ ایک دن اس نے کلیلہ سے کہا
کہ ”اپنے بادشاہ شیر کے بارے میں تمہارا کیا خیال
ہے؟ اس نے چلنے پھرنے اور گھومنے پھرنے کو کیوں
خیر باد کہہ دیا ہے؟“

کلیلہ نے جواب دیا کہ ”مجھ کو ان باتوں سے کیا
کام۔ کہاں تو اور کہاں مملکت کے راز۔ عقل کے
باخن لے۔“

دمنہ نے کہا ”میرے دوست! بادشاہ کی قربت پیٹ
بھرنے کے لیے نہیں حاصل کی جانی۔ کھانا تو ہر جگہ مل
جاتا ہے۔ بادشاہ کے مقرب ہونے میں تو عزت جاہ اور
مرتبے کا فائدہ ہے۔ اس کے ذریعے دوستوں کی بھلائی
اور دشمنوں کی گوشمالی خوب اچھی طرح کی جاسکتی
ہے۔“

غرض کلیلہ اور دمنہ کی مدلل بحث ہوئی جس میں
آخر کار دمنہ جیت گیا اور بلند مرتبہ کی ہوس لیے بادشاہ
کے دربار جا پہنچا۔ اپنی عیار فطرت اور موقع شناسی کی
بدولت جلد ہی بادشاہ کے خوف کا کھوج لگانے اور اس
کا سدباب کرنے میں کامیاب ہو کر منظور نظر بن گیا
مگر بادشاہ کو جس کے خوف سے نجات دلائی وہ ”شترتہ“
ایک بیل تھا جو اپنی دانش مندی اور عالی ہمتی کی بنا پر جلد
ہی سپہ سالار بن گیا اور شیر ہر کام اس کے مشورے

سے کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر دمنہ کے کھجے پر سانپ لوٹنے
لگے اور وہ شترتہ کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے انتہائی
اقدام پر اتر آیا۔

دونوں طرف بے بنیاد باتوں کی لگائی بھجائی سے آخر کار
دونوں کو آمنے سامنے لڑوا دیا۔ اور شیر کے ہاتھوں
اس کا وفادار جانثار ساتھی شترتہ مارا گیا۔
شترتہ کو مارنے کے بعد شیر غم زدہ رہنے لگا اور
ندامت حد سے سوا ہو گئی۔

یہ ہوئی پہلی نصیحت۔ دوسری داستان دمنہ کے
انجام پر ہے۔ دوسری نصیحت کے مطابق داستان شیر
کے بارندامت کو کم کرنے میں چیتے کی معاونت سے
شروع ہوتی ہے۔

”ایک رات شیر چیتے سے اپنے قلب کی بے چینی
کو ظاہر کر رہا تھا جس سے متاثر ہو کر چیتے نے کہا۔
”اے بادشاہ کسی ایسے کام میں جو دوسرے سے باہر
ہو بہت زیادہ فکر و تردد کرنا جنون کو دعوت دیتا ہے۔“

غرض چیتے نے شیر کی دلجوئی کی اور معاملے کی تہہ
تک پہنچ کر اصل راز معلوم کرنے کا تہہ کیا۔ اور پہلی
ہی پیش رفت میں اس پر دمنہ کا راز کھل گیا۔ مگر ایک
خاص مصلحت اور حکمت کے تحت اس نے بادشاہ کے
سامنے دمنہ کے مکرو فریب کے وار چلنے دیے اور
مناسب موقع پر اس راز کو افشا کر دیا۔

دمنہ واقعتاً ”شترتہ“ کے قتل کی سازش کا ذمہ دار تھا
اور بادشاہ کے بار قلب کا بھی۔ مگر اپنے اوپر لگنے
والے ہر الزام کا جس دیدہ دلیری سے اس نے جواب دیا
۔۔۔ وہ انگشت بدنداں کر دینے والا معاملہ تھا۔ اور یہی وہ
موقع تھا جب حقیقت کو گمان سے الگ کرنے کے لیے
حکمت درکار تھی اور وہی غالب آئی۔

دمنہ نے کہا کہ ”جہاں پناہ سے بڑھ کر کون حاکم اور
قاضی ہو سکتا ہے۔“

اگر میں جرم کرتا تو یہاں بیٹھا رہتا اور بلاؤں
میں پھنسنے کا منتظر رہتا؟ کسی دوسرے ملک نہ بھاگ
جاتا۔“
شیر کی ماں نے کہا کہ ”اے دمنہ! تیری گفتگو تیرے

دل کے کو ظاہر کر رہی ہے۔ تو اپنی چالاکي سے اپنے کو
سب سے قصور ثابت کرنا چاہتا ہے، لیکن اب تیری خلاصی
مشکل ہے۔“

دمنہ نے کہا ”بادشاہ سلامت اچھی طرح جانتے
ہیں کہ خائن دلیر نہیں ہوتا۔ میں مجرم ہوتا تو اتنی دلیری
سے گفتگو نہ کرتا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرا
فیصلہ غلط میں نہ کیا جائے۔“

چوہہ نصیحتیں جنہیں بیان کیا گیا ہے، وہ اپنے
آپ میں ایک مکمل سبق رکھتی ہیں مگر ان سے وابستہ
حکایتیں جس طرح ان معاملات کی حقیقت کو الگ
الگ بیان کرتی ہیں، وہ بھی حیرت کا طعم کھدے۔

پندرہ نصائح پر مشتمل اس کتاب کی ایک اور نمایاں
خصوصیت یہ ہے کہ دونوں طرف سے برابر دلائل
واغے چلتے ہیں یعنی مباحثہ پھر جیت غالب دلائل
کی ہوتی ہے اور یوں اس نصیحت کو پر سبق ثابت
کرنے کے لیے منطقی راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اور
یہی داستان کی خوبی ہے۔

”مختصری اس کتاب کا وزن زور جواہر سے کہیں
زیادہ ہے اور دلچسپ اشہی کہ شروع کریں تو ایک ہی
لشت میں ختم کریں۔“

مگر کیا کتابیں صرف وقت گزاری اور لطف اندوز
ہونے کے لیے ہوتی ہیں؟
ان سے سیکھنے اور عمل پیرا ہونے کا عمل کب
شروع ہوگا؟

”حکایتیں“ روایتیں کہنے کا رواج ختم ہونے کو ہے
۔۔۔ ضرور۔ مگر زوال پذیر۔۔۔ ان کی اثر پذیری سے
کس کو انکار ہے؟ مگر ایک چھوٹا سا ڈبہ جس کو اب
انسانی کوششوں نے کافی بڑا کر کے آسائش کی دنیا میں نیا
جہاں شغارف کروایا ہے۔ اس نے ہماری بصیرت
اور حکمت پر پرفریب پردے ڈال رکھے ہیں۔

کوئی ہے جو ان پردوں کو چاک کر کے ہمارے اصل
کی شناخت کرے؟ اور ہمیں خود سے ملنے کا موقع
دے؟

”اگر آپ نے سن لیں۔ یاد رہے کہ وہ مختصر
کی ان۔ بال بارہ میں سے کچھ دیکھیں اور کچھ

آفریں جملے آپ کی خدمت میں پیش کر سکتی ہوں۔
”اے راجا، دوستی اور دشمنی ہمیشہ یکساں نہیں
رہتی۔ یہ اکثر عارضی ہوتی ہے اور بہت جلد ختم ہونے
والی۔ بلاشبہ بہت سی دوستیاں اور دوستانہ مراسم
زور یا کم سے خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی
دشمنیاں بھی زمانے کی رفتار کے ساتھ کم ہوتے ہوتے
دل سے بالکل محو ہو جاتی ہیں۔“

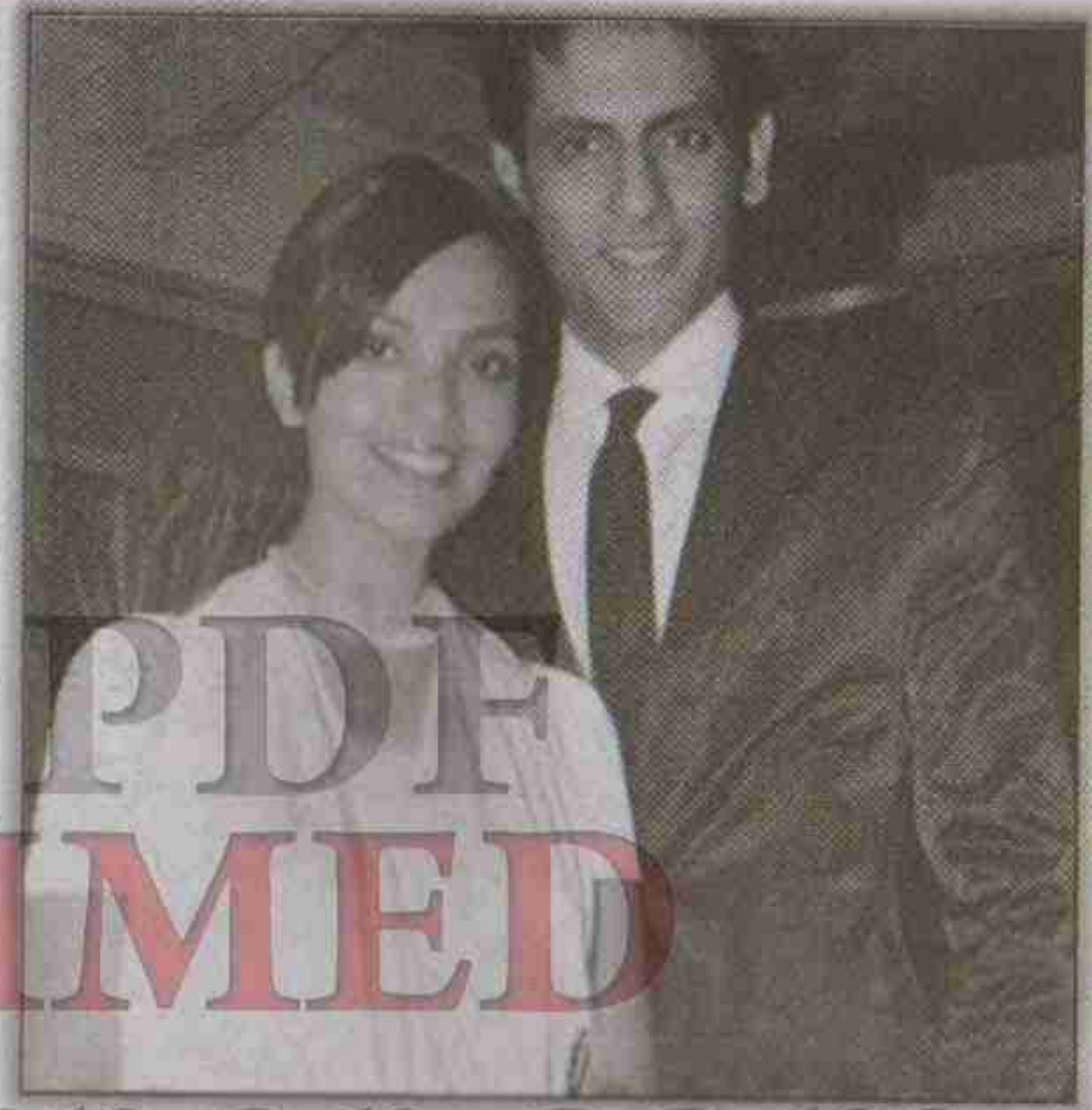
”ابائیل نے کہا کہ کینہ اور بغض سننے میں پوشیدہ
رہتا ہے، آدمی اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ نہیں سکتا،
اس لیے صرف زبان کے کہنے پر اعتبار نہیں کرنا
چاہیے۔“

”ابائیل نے کہا اے بادشاہ! دنیا والوں کا کام ان کی
تقدیر کے مطابق انجام پاتا ہے، اس میں کمی بیشی یا
آگے پیچھے کا کسی کو اختیار نہیں۔ کوئی شخص اپنے
متعلق نہیں جانتا کہ اس کا انجام سعادت پر ہو گا یا
خفاقت پر۔ لیکن اس کو اپنا کام کرتے رہنا چاہیے اور
اپنی سمجھ، عقل اور تدبیر کے مطابق فرائض دنیوی
انجام دیتے رہنا چاہیے کیونکہ اگر تقدیر نے بھی تدبیر کا
ساتھ دیا تو پھر اس کی ترقی، کامیابی اور اقبال کی بلندی
یقینی ہے اور اگر تقدیر نے ساتھ نہ دیا تو لوگ اس پر
الزام نہ رکھیں گے اور اسے معاف کر دیں گے۔“

غرض یہ کہ کتاب کا حرف حرف چنا ہوا موتی ہے۔
اور جوہر کی پہچان صرف جوہر کو ہے (یعنی ہمارے
حکمرانوں کا اس سے کوئی لینا دینا نہیں)۔

آخر میں اگر آپ کو یاد ہو تو یہ داستان ہمایوں خال کا
وزیر اسے سن رہا تھا جسے سن کر اس نے کہا۔
”متم نے اس نصیحت آمیز اور دل کش داستان سے
میری روح کو تازگی بخشی ہے۔
وزیر نے دست بستہ عرض کی۔
”جہاں پناہ نے بجا فرمایا۔“

ریا کار اور جھوٹے انسان کی بات گھاس کی طرح
جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ مخلص اور سچے انسان کی بات
آفتاب کی طرح روشن رہتی ہے اور وقت گزرنے کے
ساتھ ساتھ روشن سے روشن تر ہوئی جاتی ہے۔“



بندھن

آمنہ شیخ اور محب مرزا

شاہین رشید

آمنہ محبہ محب مرزا

ہمارے ہاں زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ شوہر کی فیملی میں آنے کے لیے خوب صورتی بہت ضروری ہے اور ہو سکتا ہے اس میں کچھ صداقت ہو، لیکن یہ ضروری نہیں، شبانہ اعظمی اور انڈیا کی ہی کئی فنکاراں بالکل بھی حین۔۔۔ نہیں ہیں، مگر اپنے فیملی کی وجہ سے بے حد مقبول ہیں۔ اسی طرح ہمارے یہاں ٹی وی کے میڈیا میں سنیٹا مارشل، عروسہ صدیقی اور آمنہ محب اپنے فیملی کی وجہ سے چھائی ہوئی ہیں۔

خاص طور پر آمنہ محب کی اداکاری میں بہت گہرائی ہوتی ہے اور حقیقت کے بے انتہا قریب، ان کی فیملی

کے حوالے سے بھی ہمیں ان کا انٹرویو کرنا ہے لیکن فی الحال تو ”بندھن“ کے سلسلے میں ان سے بات ہوئی۔ آپ کو یہ بتادیں کہ آمنہ محب آج کل ایک ”میک اپ“ برانڈ کی براڈ ایجیسیٹیڈ ہیں اور انہیں انٹرویو دینے کی اجازت نہیں ہے مگر اتفاق دیکھیں کہ ان کے ایجیسیٹیڈ بننے سے کچھ ہی عرصہ پہلے ہم نے ان کا انٹرویو کر لیا۔ اس لیے محب مرزا اور آمنہ محب کا انٹرویو پڑھیں اور انجوائے کریں۔

”کیسی ہیں آمنہ صاحبہ؟“

”جی اللہ کا شکر ہے۔“

”آج کل آپ ہر دوسرے نہیں تو تیسرے ڈرامے میں تو ضرور ہی نظر آتی ہیں۔ اتنا زیادہ اسکرین پہ نظر آنا

کیسا لگ رہا ہے۔“

”مجھے تو اچھا ہی لگ رہا ہے۔ اب ناظرین کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔“

”ناظرین کو تو آپ کی ہر فارمنس بہت پسند ہے، کسی آرٹ مووی کی فنکارہ کی طرح۔“

”ارے اتنا مت چڑھائیے مجھے۔ بس اللہ نے تھوڑی سی صلاحیت دی ہے، جس کا استعمال کر رہی ہوں۔“

”اتنی مصروفیات میں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے کا وقت مل جاتا ہے۔“

”میں آپ کو بتاؤں کہ ہمارے گھر میں سب کام کرتے ہیں۔ اس لیے ہم نے اپنے کام کی سہولتیں ایسی کی ہوئی ہے کہ سب وقت پر آجاتے ہیں۔ شکلیں بھی دیکھ لیتے ہیں اور گپ شپ بھی کر لیتے ہیں۔“

”کیا مطلب سب کام کرتے ہیں؟“

”مطلب یہ کہ میری ساس پویشیں ہیں اور میرے بھی کام کرتے ہیں اور ہم دونوں بھی کام کرتے ہیں۔“

”مزید سوالات سے پہلے اپنا تعارف کراؤ۔“

”اوکے۔۔۔ میں جی۔۔۔ 29 اگست کو نیویارک شہر میں پیدا ہوئی۔ میرے والدین کا تعلق گوجرانوالہ سے ہے، اس لحاظ سے ہم پنجابی ہیں۔ میرے والد کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ لہذا وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلے گئے۔ میرے والدین آپس میں کزن تھے شادی کے بعد امریکہ شفٹ ہو گئے جہاں میں اور میرے دو بھائیوں نے جنم لیا۔ امریکہ میں میرے والدین نے تقریباً ”تیرہ سال گزارے“ پھر سعودی عرب چلے گئے اور کچھ عرصے کے بعد پاکستان شفٹ ہو گئے۔“

”اور تعلیم کہاں سے حاصل کی؟“

”جی۔۔۔ پاکستان آنے کے بعد پاکستان میں ہی میں نے اے لیول کیا اور پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ چلی گئی اور وہاں سے پروڈکشن مینجنگ میں گریجویشن کیا۔ پھر چھ ماہ تک نیویارک میں نوکری کی اور پھر پاکستان آئی۔“

”جی بالکل اور رسمیں بھی ساری ہوئی تھیں جو کہ میں نے بہت انجوائے کیں۔ مایوں، مہندی، سب بہت اچھا رہا۔“

”پنجابی اور اردو بولنے والوں کی رسموں میں کافی فرق ہوتا ہے، کوئی رسم جو آپ کو حیرت انگیز لگی ہو۔“

”جو رسمیں ان کے یہاں کی تھیں، ایسی رسمیں عموماً میں نے انڈین فلموں میں دیکھی تھیں، جیسے کہ

”محب مرزا سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی؟“

”میں جب پاکستان آئی تو مجھے ایک پروجیکٹ ملا کرنے کے لیے ”بچے من کے سچے“ اس کے میزبان محب تھے، تب ان سے پہلو ہائے ہوئی پھر ہم دونوں نے ایک ساتھ کئی پروگرام کیے۔ ”بچے من کے سچے“ کا پروگرام ختم ہوا تو میں کچھ اور پروگرام کرنے لگی اور پھر کچھ اور۔۔۔ لیکن ملاقات رہتی تھی۔“

”پھر دوستی رشتہ داری میں کیسے بدلی؟“

”پھر ہوا یہ کہ کچھ پروگراموں کی ریکارڈنگ محب کے گھر پر بھی ہوئی تھی۔ وہاں میری ان کے والدین سے بھی ملاقات رہتی تھی اور ایک ساتھ کام کر کے ہم دونوں ایک دوسرے کے مزاجوں سے بھی واقف ہو گئے تھے۔ پھر ایک دن جب محب نے پروپوز کیا تو میں نے کچھ ٹائم مانگا اور اپنے والدین سے بات کی، ہم دونوں چونکہ ایک ہی فیملی سے تھے اور سب ایک دوسرے کو جانتے تھے اس لیے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔“

”کتنے سال ہو گئے اور بچے؟“

”ماشاء اللہ تقریباً ”چھ سال ہو گئے ہیں اور فی الحال تو بچے نہیں ہیں، ان شاء اللہ فیملی بھی ضرور بنے گی۔“

”ان شاء اللہ۔۔۔ خوش گوار ازدواجی زندگی کا کیا راز ہے۔“

”یہ ہی کہ ہم دونوں دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔“

”شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی اور عروسی جوڑا کیسا تھا؟“

”جی بالکل اور رسمیں بھی ساری ہوئی تھیں جو کہ میں نے بہت انجوائے کیں۔ مایوں، مہندی، سب بہت اچھا رہا۔“

”پنجابی اور اردو بولنے والوں کی رسموں میں کافی فرق ہوتا ہے، کوئی رسم جو آپ کو حیرت انگیز لگی ہو۔“

”جو رسمیں ان کے یہاں کی تھیں، ایسی رسمیں عموماً میں نے انڈین فلموں میں دیکھی تھیں، جیسے کہ

آر سی مصحف کی اسی طرح جب دولہا اپنے کمرے میں جانے لگتا ہے تو دلہن کو اٹھا کر لے جاتا ہے اور جب دولہا دلہن کو گود میں اٹھاتا ہے تو سب دولہا سے پیسے مانگتے ہیں۔ مجھے بہت مزا آیا تھا ان رسموں میں اور جہاں تک عروسی جوڑے کی بات ہے تو میں نے اپنا عروسی جوڑا خود ڈیزائن کیا تھا تاکہ سب سے منفرد نظر آوں۔

”جب سے آپ اس فیلڈ میں آئی ہیں بہم آپ کو اسارٹ ہی دیکھ رہے کیا بچپن سے ہی ایسی ہو یا ابھی مولیٰ تازی بھی تھیں۔“

”میں ہمیشہ سے ہی ایسی ہوں اور مجھے نہیں لگتا کہ میں کبھی مولیٰ بھی ہوں گی کیونکہ شاید میری ہڈی ایسی ہے کہ جو مجھے موٹا نہیں ہونے دیتی اور دبلا پتلا ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ ہر لباس سچ جاتا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ پنجابی لڑکی اور اتنی دلی۔ تو میں کہتی ہوں کہ مجھ پر اللہ کا خاص کرم ہے اس لیے دلی اور اسارٹ ہوں۔“

”ڈراموں میں تو ہر وقت میک اپ منت کپڑے، فیشن ہوتا ہے عام زندگی میں کیسی ہیں آپ؟“

”عام لائف میں بہت سادگی پسند ہوں۔ نہ میک اپ ہوتا ہے نہ جیولری نہ فیشن والے کپڑے گھر میں میرا پسندیدہ لباس پینٹ شرٹ ہے اور جب بازار جاتی ہوں تب بھی بغیر میک اپ کے اور انتہائی سادہ لباس میں اور بڑے آرام سے شاپنگ کر کے آجاتی ہوں۔“

”کیوں لوگ پہچانتے نہیں کیا؟“

”میں اسکرین پہ نظر آنے والی آمنہ سے بہت مختلف ہوں۔ لوگوں نے ہمیں میک اپ میں اور فیشن ایل ڈرہمنز میں دیکھا ہوا ہوتا ہے جبکہ میں ایک عام گھر پلو لڑکی کی طرح گھر سے نکلتی ہوں اس لیے لوگ آسانی سے نہیں پہچان پاتے اور جو پہچان بھی لیتے ہوں گے وہ خود ہی سوچتے ہوں گے کہ اس کی شکل تو آمنہ محب سے مل رہی ہے مگر یہ ہے کوئی اور۔“

”کیوں میک اپ انسان کو اتنا تو نہیں بدلتا۔“

”بدلتا ہے۔ آپ یقین کریں کہ جتنا میک اپ ہم لوگ کرتے ہیں اس سے تو انسان بالکل ہی بدل جاتا ہے۔“

”اتنی مصروفیات میں کچن کون سنبھالتا ہے؟“

”جب میں پروڈکشن ڈائریکشن میں تھی تب بھی اتنی ہی مصروف رہتی تھی جتنی کہ اب اداکاری میں آنے کے بعد ہوں۔ اس وقت بھی میں مکمل طور پر کچن کو ٹائم نہیں دے پاتی تھی اور اب بھی نہیں دے پاتی۔ لہذا الگ کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔“

”ہولنگ کا شوق ہے۔“

”بالکل ہے۔ چھٹی کا دن عموماً باہر گزرتا ہے اور اگر گھر پر بھی ہوں تو کھانا کھانے باہر ضرور جاتے ہیں۔“

”آپ پڑھی لکھی ہیں اور ایک خاص فیلڈ سے وابستہ ہیں اس لیے کمالات ہیں لیکن آپ کے خیال میں ہاؤس وائف کو جاب کرنا چاہیے۔“

”ہاؤس وائف اگر پڑھی لکھی ہے اور محسوس کرتی ہے کہ گھر کی گاڑی ایک بندہ نہیں چلا سکتا تو اسے ضرور ضرور جاب کرنا چاہیے اور ویسے بھی اگر کوئی مجبوری نہیں بھی ہے تو بھی جاب کرتے میں کیا حرج ہے۔ تعلیم پہ خرچ کیا ہے تو ریشن لینے میں کیا مضائقہ ہے لڑکیوں میں خود اعتمادی آتی ہے اور وہ اپنے آپ کو سیکور فیل (محفوظ محسوس) کرتی ہیں۔“

”انڈین کاروبار کیسا لگا تھا اور رخصتی کے وقت کیا کیفیت تھی؟“

”میرے خیال میں ہر لڑکی کو اپنا یہ روپ چھٹا لگتا ہوگا کیونکہ یہ روپ ہی ایسا ہوتا ہے۔ ایک نئی زندگی کا آغاز ہونے والا ہوتا ہے۔ کچھ خوشی کچھ مہمک چھوڑنے کا غم۔ ملی جلی کیفیت چہرے پہ نمایاں ہوتی ہے اور میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔“

”محب محبت کا اظہار کھل کر کرتے ہیں یا دل میں رکھتے ہیں۔“

”محب بہت رومینٹک مزاج ہیں مگر کسی کے سامنے محبت کا اظہار نہیں کرتے کہتے ہیں یہ میاں

دی کارپرائیوٹ معاملہ ہے۔“

محب مرزا

”جی محب مرزا! کیسے ہیں آپ۔ آپ اور آمنہ فیلڈ میں چھائے ہوئے ہیں۔“

”جی میں ٹھیک ہوں اور بس یہ سب اللہ تعالیٰ کا کرم ہے آپ سب کی دعائیں ہیں۔“

”ڈراموں میں آپ کمرشلز میں آپ وائس اور میں آپ۔ فارغ اوقات تو ملتے ہی نہیں ہوں گے۔“

”میتا ہے اب دیکھئے آپ سے بات ہو رہی ہے نا ویسے میں بھی اس مقام تک بہت آسانی سے نہیں پہنچا بہت محنت کی ہے میں نے۔“

”جی۔ ہمیں پتا ہے ”بچے من کے سچے“ وہ پروگرام تھا جو کہ آپ کے لیے ٹی ثابت ہوا۔“

”جی ہاں۔ ”بچے من کے سچے“ بھی یہ اور دیگر کچھ پروگرام بھی ہیں۔“

”کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟“

”میرے والدین کا تعلق لکھنؤ سے ہے۔ میری پیدائش کراچی کی ہے۔ میری ایک بڑی بہن ہیں اور میں نے گریجویشن کیا ہے۔“

”آپ اردو اسپیکنگ اور آمنہ پنجابی۔ شادی میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“

”لوگ آپس میں برے نہیں ہیں کچھ قوتوں نے انہیں برا بنایا ہوا ہے اور پھر پنجابی بھی مانگیرٹ ہو کر پاکستان آئے اور اردو بولنے والے بھی تو اللہ کا شکر ہے کہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔“

”آمنہ کو پہلی مرتبہ کہاں دیکھا تھا؟“

”میں اور میرے کچھ دوستوں نے ایک تھیٹر کیا تھا۔ ”دن وے ٹکٹ“ اس ڈرامے کو آرگنائز کرنے میں آمنہ کا بہت ہاتھ تھا۔ اس وقت ایک سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ پھر چار سال کے بعد جب میں ”بچے من کے سچے“ کر رہا تھا اور آمنہ اس کو ڈائریکٹ کر رہی تھی تب ہماری خاصی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور

”آمنہ کی پہلی میں بدل گئی۔“

”ایمانت پسند آئی تھی اور ملتے ہیں اس بات کو کہ

جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔“

”اس کی سادگی، محنت، خلوص۔ سب کچھ ہی اچھا لگا اور آج بھی مجھے اس کی سادگی ہی پسند ہے اور مجھے سادگی میں ہی اچھی لگتی ہے اور یہ سچ ہے کہ جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔“

”مزاج کس کا گرم ہے آپ کا یا آمنہ کا؟“

”مزاج کے ہم دونوں ہی تیز ہیں۔ ویسے تو لڑنے جھگڑنے کا زیادہ وقت نہیں ملتا، لیکن پھر بھی اگر کبھی کبھار لڑائی ہو جائے تو اگر ایک بول رہا ہو تو دوسرا خاموش ہو جاتا ہے۔“

”دونوں پڑھے لکھے ہیں لڑائی تو تہذیب کے دائرے میں ہی ہوتی ہوگی۔“

”لڑائی اور تہذیب۔ ہاں بری زبان استعمال نہیں کرتے تو زچھوڑ نہیں کرتے زیادہ تر خاموش رہنے کی کوشش کرتے ہیں اب تو مصروفیات نے ان جھگڑوں کو ختم کر دیا ہے۔“

”آمنہ کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟“

”اچھی عادت تو یہ ہے کہ بہت خیال رکھنے والی اور پیار کرنے والی ہستی ہے اور بری یہ کہ تھوڑی ضدی اور تھوڑی جذباتی ہے۔“

”فضول خرچ کون ہے آپ یا آمنہ؟“

”ہم دونوں فضول خرچ نہیں ہیں کیونکہ ہم دونوں ہی بہت محنت سے کماتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہم کچھ نہیں۔ جو چیز پسند آتی ہے ضرور خرید لیتے ہیں۔“

”کن چیزوں پہ زیادہ خرچ کرتے ہیں؟“

”گھر کو سجانے سنوارنے میں کچھ نہیں کرتے اور اگر کوئی نئی الیکٹرونک چیز آجائے تو ضرور خریدتے ہیں۔ ایسی ویسی چیزوں پر خرچ نہیں کرتے۔“

”گھر کے کاموں میں آمنہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔“

”ہاں۔ جب آمنہ کچن میں ہوتی ہے تو میں بھی اس کے ساتھ ضرور ہوتا ہوں ویسے اتنا کوئی کام نہیں ہوتا کہ ہاتھ بٹایا جائے ہماری فیملی ہی کتنی ہے۔“

اور اس جواب پر ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔



ہے نبیلہ عزیز، میرا ان سے کہنا ہے کہ پلپڑوہ اپنی کہانیوں میں بیڈ روم سین اور ہینڈ ڈوائف کا رومانس کچھ کم دکھایا کرے۔ میرے خیال میں یہ رسالہ پندرہ سے بیس کے درمیان والی عمر کی لڑکیاں زیادہ پڑھتی ہیں اور یہ نالج ان کے کچھ ذہنوں کے لیے قبل از وقت ہے۔

افیقہ انار۔ چکوال

1۔ اب میں نہ تو آسیہ رزاقی کی ہیروئن جیسی سنجیدہ و صابر نہ فرحت اشتیاق کی ہیروئن جیسی اعلا تعلیم یافتہ ہوں۔ نہ رخسانہ نگار کی ہیروئن کی طرح ذہین اور سمجھ دار نہ پنکچوئل نہ پریوں ساحسن ہے نہ اعلا پاپے کی ذہانت ہے۔ نہ قناعت پسند ہوں نہ سلیقہ شعار۔ پھر بھلا کس برتنے پر ان سے دوستی کروں؟

بہر کیف وہ ناول جس کی ہیروئن سے مجھے اپنائیت محسوس ہوئی۔ ”امرئیل“ ہے اور اس کی مصنفہ سے کون واقف نہیں؟ اس کی ایک ہی وجہ ہے عمر جمالیگر۔ علیزہ اور مجھ میں ایک ہی قدر مشترک ہے وہ یہ کہ ہم دونوں کا عمر سے عشق (جنوں کی حد تک) میرا علیزہ سے دوستی کرنے کو اسی لیے دل چاہا کہ میں اس سے عمر کے بارے میں باتیں کروں۔

2۔ اگر کسی تقریب میں تمام مصنفین سے ملاقات ہو تو پہلے پہل تو جھجک و تکلف اڑے آئے گا۔ جیسے ایک بار میں نگہت سیماسے ملی تو سلام دعا سے آگے کوئی بات ہی نہ ہو پائی تھی اور میں ایک گھنٹہ بیٹھ کر چلی آئی تھی۔

ملیہ شخص کی نام نہاد محبت کی خاطر اس نے اپنی نیکی باپ کی تربیت اپنی زندگی سب داؤ پر لگا دیا۔ جب دل کرنا تھا اسے ڈانٹ کر آؤں یا سمجھا کر آؤں اور اب نمروہ احمد کی کہانی ”مصنف“ پڑھ کر فرشتے اور مہمل سے ملنے کو دل کرتا ہے۔ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ ہدایت کرتے کے لیے چن لیتا ہے۔

(2) مجھے ایسے کسی اجتماع میں جانے کا موقع ملے تو میں ایک سے نہیں تین تین راٹرز سے کچھ کہوں گی۔ وہ چاہے جواب دے نہ دے مگر میں فی وی شو کے اینکر کی طرح سوال ضرور کروں گی۔

پہلا سوال نمروہ احمد سے کروں گی کہ ماشاء اللہ وہ اتنی کم عمری میں اتنا اچھا اور معلوماتی کیسے لکھ لیتی ہیں۔ کہانی کے متعلق ان کا ہوم ورک بہت اسٹرونک ہوتا ہے۔ ان کی کہانی مصنف پڑھنے کے بعد میں نے قرآن کو ترجیح کے ساتھ پڑھنا شروع کیا، آپ یقین کریں وہ سچ کہتی ہیں یہ الہامی کتاب آپ سے باتیں کرتی ہے قرآن میں ہمارے تمام مسائل کا جواب موجود ہے۔

دوسرا سوال رخسانہ نگار سے کروں گی کہ ماشاء اللہ سے اللہ لکھ دے بجائے کہ وہ اتنا زیادہ کیسے لکھ لیتی ہیں انہوں نے اس کام کے لیے موکل رکھے ہوتے ہیں کیا جبکہ وہ دو ہولڈی کی لڑکیوں کی اماں بھی ہیں۔

تیسری بات راٹرز سے معذرت کے ساتھ مگر میرا خیال ہے کہ دل میں ہو کہ دہنا چاہیے۔ اچھے لوگ اچھی لکھتے ہیں۔ ایک بہت اچھی راٹزر

خواب جب آئینہ دکھاتے ہیں
ان گنت لوگ یاد آتے ہیں
ایک تصویر بنتی جاتی ہیں
ایک تصویر ہم بناتے ہیں

زمانہ جتنا بھی جدید ہو جائے انسان اپنی جبلت کی بنا پر قدیم ہی ہے۔ اس کے احساسات اس کے جذبات صدیوں پہلے گزرے انسان سے مختلف نہیں ہو سکتے۔

کہانیاں سننے اور لکھنے کا سلسلہ بھی انسانی حیات کا ایک فطری تسلسل ہے۔ ہر فرد ایک کہانی ہے۔ آج کی تیز رفتار زندگی میں جب ہم اپنے ساتھ رہنے والے انسانوں سے بے خبر ہیں کہانی کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ کہانی اور اس کے کردار ہمارے لیے سوچ کے کئی در کھولتے ہیں۔

انسانی احساسات کی ترجمانی کرتے کردار آنے والے لوگوں کے لیے گزر جانے والے لوگوں کو جاننے کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔

یہ کہانی کار کا کمال ہوتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو اپنی سوچ، مشاہدے اور فکر سے ایسے لفظوں میں تشکیل دیتا ہے کہ پڑھنے والے اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کہانی کار آپ کو اسی گھر اسی ماحول اور اسی دور میں لے جاتا ہے جہاں آپ خود کو اس کہانی کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کرداروں سے اپنائیت لگتا ہے اور محبت کا احساس دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ دل میں نفرت اور غصہ کے جذبات بھی اسی طرح ابھرتے ہیں جسے وہ جیتے جاگتے انسان ہیں۔

ہر کہانی میں ایک مرکزی کردار ہوتا ہے۔ پوری کہانی کا تانا بانا اسی کے گرد بنا جاتا ہے۔ کہانی کا یہ مرکزی کردار ہر مصنف پوری یکسوئی سے اپنے مشاہدے، مطالعہ یا تخیل کے لحاظ سے تخلیق کرتا ہے۔

خواتین کی کہانیوں میں یہ مرکزی کردار عموماً ”کہانی کی ہیروئن“ ہوتی ہے۔ مختلف مصنفین کی کہانیوں میں یہ ہیروئن مختلف صفات لیے جلوہ گر ہوتی ہے اور پڑھنے والے اس کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ سروے کا پہلا سوال اسی حوالے سے ہے۔

1۔ آپ نے شعاع میں مختلف تحریریں پڑھی ہوں گی، کس ہیروئن یا مرکزی کردار کو اپنائیت کی نظر سے دیکھا خود سے قریب محسوس کیا اور آپ کا اس سے دوستی کرنے کو دل چاہا اور کیوں؟ جس ناول، ناولٹ یا افسانہ سے آپ نے یہ مرکزی کردار منتخب کیا۔ اس کا نام اور اس کی مصنفہ کا نام بھی لکھیں۔

2۔ آپ کسی ایسی تقریب میں جہاں شعاع کی ساری مصنفین کا اجتماع ہو تو آپ کس مصنفہ سے کیا سوال کریں گی۔

آئیے دیکھتے ہیں قارئین نے کیا جواب دیے ہیں۔

ایک تصویر بنتی جاتی ہے

ادارہ

ام شمام۔۔۔۔۔ جھڈو

قاری کھلائے گا اس لیے قارئین کے سروے میں جواب دینے کا حق ہم بھی رکھتے ہیں۔

(1) میں نے زیادہ کہانیاں نہیں پڑھیں مگر عمیرہ احمد کا من و سلوی پڑھ کر زین پر بہت غصہ آتا تھا کہ ایک بے

سروے کے سوالات اچھے تھے۔ دل نے پھل کر کہا کہ جوابات لکھے جائیں گو کہ ہمارا شمار اللہ کے فضل و کرم سے راٹرز میں ہوتا ہے لیکن اصولی طور پر جو بھی رسالہ پڑھے



کی ”دیوار شب“ کا معاذ مجھے حد سے زیادہ یہ کردار پسند ہے۔ مگر یہ سب تو کردار ہیروز کے ہوئے جبکہ آپ نے ہیروئن کے متعلق پوچھا ہے۔

میں نے کافی عرصہ پہلے شعاع میں نگت سیما کا ایک ناول پڑھا ”ایک تھی علیزہ ایک تھا شہزاد“ اس ناول کی ہیروئن ”علیزہ“ مجھے اپنے دل سے بہت قریب محسوس ہوئی۔ وجہ؟ علیزہ بہت سادہ دل، معصوم اور اعلا ظرف لڑکی تھی جو اپنی کزن ”بازغہ“ کے مذاق کی بھیٹ چڑھ گئی اور جس نے صرف اپنی انا اور خودداری کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی محبت کی بھی قربانی دے ڈالی اور ہمیشہ کے لیے شہزاد کی زندگی سے نکل گئی۔

عالیہ بخاری کا سلسلہ وار ناول ”دیوار شب“ کی زری مجھے بہت دل سے قریب محسوس ہوئی اور میرا اس سادہ سی لڑکی سے دوستی کرنے کا دل چاہا۔ نیلہ ابرار کا ناول ”ہم جو معتبر ٹھہرے“ کا مرکزی کردار ”آبدار“ تمام کہانی جس کے گرد گھومتی ہے۔ آبدار جو سب کی نظروں میں بد کردار تھی اور ایک دن اس کی سچائی سب کے سامنے ظاہر ہوئی اور وہ سرخرو اور معتبر ٹھہری۔

آسیہ رزاقی میری پسندیدہ رازز میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کی کہانیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ وہ ہمیشہ جوائنٹ فیملی سسٹم کا ایک مثبت اور روشن رخ روشناس کراتی ہیں۔ ان کے ناولز میں اخلاقی اقدار اور روایات دکھائی دیتی ہیں۔ آسیہ رزاقی کی ہیروئن بہت سنجیدہ صابر شاکر اور حالات سے سمجھوتا کرنے والی ہوتی ہے۔ جیسے کہ ناول ”پہلی نظر کا

مالو فردا“ فردا“ سب سے ایک سوال کروں گی کہ آپ کے پاس ایسا پیار اور سبق آموز انداز تحریر کیسے آیا؟ یہ ہنر مجھے بھی سکھا دیں کہ میں بھی بچوں کی کہانیاں لکھتے لکھتے (شائع بھی ہوتی رہتی ہیں جناب...) آپ سب کی طرح افسانے، ناول، ناولٹ لکھ سکیں۔

ثمینہ اکرم۔۔۔ کراچی

1۔ پہلے سوال کے جواب میں میں یہ کہنا چاہوں گی کہ اسی تازہ تازہ میں نے جو کہانیاں پڑھیں اور اس میں جن کرداروں سے میں متاثر ہوئی سب سے پہلے یہاں ان کا ذکر کروں گی مگر ایسا ہے کہ باوجود میرے پسندیدہ کردار ہونے کے میں ان سے دوستی نہیں کر سکتی (کیونکہ یہ سب میل کردار ہیں) جیسے کہ مصنفہ نبیلہ عزیز کے ناول ”کردار“ کا ہیرو ”داؤ بخش“ اپنے بلند کردار اور وفاداری کے سبب مجھے اچھا لگا۔ مریم عزیز کے ناول ”سلطنت دل“ کا ہیرو ”ابراہیم“ اپنی خوب صورتی، اچھی عادات و اطوار اور مشرقیت، ایک سیرت کی وجہ سے میرے من کو بھایا۔ سلوی علی بٹ کے ناول ”دل کے رستے“ کا اہم کردار ”منصور“ جو اپنی وہی سے بے پناہ محبت کرنے کی وجہ سے میرا پسندیدہ ٹھہرا اور فرحت اشتیاق کے تمام ناولز کے ہیرو ”عباد“ (متاع جان ہے تو) ”ہم سفر“ کا شعر میری گڈ بک میں ہمیشہ محفوظ رہا ہے۔ ماہا ملک کا ناول ”میرے خواب ریزہ ریزہ“ کا مرکزی کردار ”حسن“ مجھے کبھی نہیں بھولنا۔ اور رخصانہ ”انار“ زندگی اک روشنی میں ہیرو کا کردار اور عالیہ بخاری



میرے شعاع کی۔ جو اور جیتے رہو ”پیارے شعاع“ تھی جناب! اب آتے ہیں شاندار سروے کے منفرد سوالات کی جانب۔

1۔ جی ہاں! ایسا ہے اور سو فیصد ہے۔ یوں تو بہت ساری (متذکرہ بھی) مصنفات کی ہیروئنیں دل و جان سے پسند ہیں مگر جس مصنفہ کے تخلیق کردہ کردار سے اپنائیت کی مہک آتی ہے۔ یوں لگتا ہے گویا میری روح سے قریب تر ہے اور میری سب سے بہترین دوست ”راحت آبی“ کے انداز تحریر میں (کوڑی سیکی) ہے وہ ہے ”راحت جبین آبی“ کی رومانٹک اور فطرت کی رنگینیوں سے پیار کرنے والی بے ساختہ ہنسنے اور باتیں کرنے والی ہیروئن اور میرے یہ جذبات اس لیے ہیں کہ میں خود ایسا ہی مزاج و انداز رکھتی ہوں۔ کسی ایک مخصوص تحریر میں نہیں بلکہ جب جب انہوں نے ایسا کردار تخلیق کیا، میرا شدت سے دل چاہا کہ اس سے ملوں اور دوستی کروں۔

2۔ ارے واہ! ایسی قریب جہاں شعاع کی ساری مصنفات کا اجتماع ہو۔ پچھلے دنوں ایک ادبی نشست میں مجھے اپنی بچپن سے پسندیدہ ترین مصنفہ ”نگت عبد اللہ“ کو قریب سے دیکھنے، سننے، ملنے اور آؤ گراف لینے کا موقع ملا۔ سوال تو خیر کوئی کیا کرتی؟ ان کا متاثر کن انداز گفتگو مجھے گنگ کر گیا۔ بالکل میری ای کی طرح گفتگو کر رہی تھیں۔ ان کا شفقت اور محبت سے مجھے آؤ گراف دینا اور میرے نزدیک ہی ساتھ ساتھ نماز عصر ادا کرنا، میں تاحیات نہ بھولوں گی۔

تو جناب! جہاں ساری مصنفات ہوں گی اور مجھے موقع

طویل فہرست ہے۔ ایک ایک کر کے تمام مصنفین سے سوال کرتے ہیں۔

رفعت سراج! ان کی ہیروئن چندے آفتاب و مہتاب اور ہر ہیرو پاؤ دیو تا سا کہ بڑھاپے میں بھی ان کا حسن ماند نہیں پڑتا۔ ان سے پوچھوں گی ”آخر وہ اتنا پیش بہا حسن کہاں سے لے کر آتی ہیں؟“

عنیزہ سید! آپ کے ناول ”شب گزیدہ“ میں ایک فارسی غزل پڑھی تھی۔ اگر اس کا اردو ترجمہ ہوتا تو کیا بات تھی۔ اب ذرا اس غزل کا مفہوم ہی بتا دیجئے۔ فرحت اشتیاق! سراپا محبت و سراپا زبانت۔ میں ان سے پوچھنا چاہوں گی۔ ”فرحت جی! آج کے دور میں جب اپنے ہی اپنوں کے خون کے پیاسے ہیں تو آپ اتنی محبت کیسے لاتی ہیں؟“

نمو بخاری! آپ نے ایک طویل مدت سے پنجاب کی سرزمین پر کچھ نہیں لکھا کیوں؟

درنمن! تنزیلہ ریاض! آخر وہ جبین! ان سب سے ایک ہی سوال کہ آپ نے شادی کے بعد لکھنا کیوں چھوڑا؟

فائزہ افتخار! ثروت نذیر! ماہا ملک! ڈراے لکھتے لکھتے آپ ہم قارئین کو بھلا تو نہیں دیں گی؟

نیلہ عزیز! نایاب جیلانی! سلوی علی! عنیقہ ناز! اتنا متواتر لکھتے لکھتے، بہت سی دوسری مصنفین کی طرح آپ بھی ایک دم منظر سے غائب تو نہیں ہو جائیں گی؟

رضوانہ خان۔۔۔ کراچی

واہ! ایک اور شان دار اور منفرد سروے۔ کیا بات ہے

اب باری آتی ہے کنیز نبوی کی جی..... ان کے ناول
”آتش عشق“ کے حوالے سے کنیز جی حسن کا ایسا انجام
صرف عشق کی تربیت کے لیے کیا عورت محض اک شے
ہے جسے مثال بنا کر مرد کی فہم کو چنگی کا شعور عطا کیا جاتا
ہے۔ جانب علی شاہ نے ہجر سے ہجر اور پھر اپنے پر سکون گھر
گرہستی کا سفر طے کر لیا۔ اولاد کی منزل بھی پالی۔ ولی محمد نے
مرشد کا حق ادا کر دیا۔ بابا صاحب نے اپنے مریدوں کے
بھرم ٹوٹنے سے بچا کر اپنے سب ہی خواب جاڈالے اور
بے چاری سدوری جس کے پاس نہ تو عقیدتوں کا ہجوم تھا
اور نہ ہی کسی بھرم کے ٹوٹ جانے کا خوف۔ اس کے سب
ہی خواب کیوں بھلائی لی اور دسے کی تاریکیوں میں گم ہو
گئے.....؟

عارفہ غنبرین..... نامعلوم شہر

1۔ ابھی تک کسی بھی کردار میں اپنی جھلک نظر نہیں
آئی۔ اگر مجھے کسی ناول کے کردار کے ساتھ دوستی کرنے کا
موقع ملتا تو وہ تھا عزیزہ سید کے ناول ”دل من مسافر من“
میں ”ماسٹر دایت اللہ“ کا کردار وہ علم کا استاد دیا ہے۔
ایک اور کردار جسے میں نے اپنے دل کے قریب محسوس
کیا اور اس سے ہمدردی ہوئی وہ تھا عالیہ بخاری کے ناول
”دوبار شب“ میں ”گنیزہ“ کا کردار۔ گنیزہ ایک ایکسٹرا گرل
ہے لیکن اس کے سینے میں ایک ماں کا دل بھی ہے وہ اپنی
بیٹی کو زمانے کے سرد گرم سے بچانا چاہتی ہے لیکن وہ بے
بس ہے۔

2۔ اگر مجھے کسی ایسی محفل میں جانے کا موقع ملتا جہاں
میری ساری پسندیدہ مصنفین جمع ہوتیں تو میں اس محفل
میں جاتی ان سب کو رک کے دور سے ایک نظر دیکھتی اور
واپس آجاتی اور کسی سے کوئی سوال نہ کرتی کیونکہ ہم نے
اپنے فیورٹ لوگوں کا ایک آئیڈیل بت بنایا ہوتا ہے۔ تو اگر
ان لوگوں سے ملنے کے بعد ہم ان کو ویسا نہ پائیں تو ہمارے
آئیڈیل کا بت پاش پاش ہو جاتا ہے۔

بالکل ویسے جیسے چاند کو دور سے دیکھیں تو بہت خوب
صورت نظر آتا ہے مگر قریب جائیں تو دھبے اس میں بھی
ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنے فیورٹ لوگوں سے زندگی میں
کبھی نہیں ملتی چاہے وہ کوئی رائٹر ہو یا شوبز کا کوئی اشار۔

سدرہ سعیدی..... بھکر

1۔ یادگار کردار تو بہت ہیں لیکن فرحت اشتیاق باقی

کنیز نبوی! دوسری رائٹرز کی طرح آپ بھی شادی کے
بعد منظر عام سے غائب ہو گئی ہیں، آپ کی سندھ دھرتی
سے محبت سے گندھی کہانی کو ہم بہت مس کر رہے ہیں۔
پلیز جلد ہی کسی اچھی سی سندھ کی لوک داستان کے ساتھ
عاشر ہوں۔

عالیہ بخاری! آپ کی ہیروئن ہمیشہ سنجیدہ، سمجھ دار،
دلکش اور ایک خاندانی لڑکی ہوتی ہے۔ کیا آپ کی ہیروئن
میں آپ کی جھلک نظر آتی ہے؟
آسیہ رزاقی سے میرا سوال ہو گا۔ آسیہ جی! آپ نے
ہمیشہ جو کہانیاں لکھی، ان میں بھرے پرے خاندان اور
جو انٹ فیمیلی سسٹم کو ہی اپنا موضوع بنایا ہے۔ کیا آپ کو
ذاتی طور پر مشترکہ خاندانی نظام پسند ہے یا فیمیلی سسٹم۔ اپنے
پسندیدہ ترین ناول کا نام بتائیے؟

میرے خیال میں رائٹرز سے کیے جانے والے اتنے
ڈھیر سارے سوالات کافی ہیں۔

رضوانہ شکیل راؤ..... لودھراں

1۔ ویسے تو ساری کہانیوں کے کردار پرفیکٹ ہوتے ہیں
لیکن کچھ ایسے خاص کردار ہوتے ہیں جو دل و دماغ پر نقش
ہو جاتے ہیں۔ جیسے عزیزہ سید کے ناول ”دل من مسافر
من“ کے ”ماسٹر دایت اللہ“۔
بشری سعید کے ناول ”سفار گر“ کی ”حکیم بیگم“ مجھے
ان سے گہری انیٹ محسوس ہوئی۔

کنیز نبوی کے ناول ”آتش عشق“ کے دو کردار ”جانب
علی شاہ اور سدوری“ جن سے ملنے کو دل چاہا۔ جانب علی
شاہ اور سدوری کی تینیس سالہ محبت..... ہمیں وہ محبت
نہیں شاید عشق کی انتہائی ہو سکتی ہے۔

اسی ناول کا ایک کردار جس میں مجھے بہت اپنائیت
محسوس ہوئی وہ ہے ”جیجی“ ان کی لکھی ”بیٹا صبروہ“ ہے جو
شروع صدمے میں کیا جائے ”ان لفظوں نے بہت متاثر
کیا اور میرا واقعی دل چاہا کہ وہ اس کردار سے نکل کر سامنے
آجائیں اور میں ان سے دوستی کر لوں۔

2۔ جی اگر ملاقات ہو جائے تمام رائٹرز سے کسی محفل
میں تو..... تو

سعدیہ عزیز آفریدی سے پوچھنا چاہوں گی کہ آپ محبت
کو اس گرائی اور خوب صورتی کیسے لکھ لیتی ہیں کہ محبت کا
دکھ بھی محبت کی محبت میں جھٹلا ہونے لگتا ہے۔



مکمل نہ کر پائی ہوں اور اسی پلاٹ پر کسی اور رائٹر کی کہانی
شائع ہو جائے تو آپ کو کیسا لگے گا؟
راخسانہ نگار! اگر آپ رائٹر نہ ہوتیں تو پھر کیا ہوتیں اور
آپ نے کس سے متاثر ہو کر لکھنے کا آغاز کیا؟

راحت جی! اگست کا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ پلیز
ساوان کے حوالے سے کوئی کہانی لکھیں۔ راحت جی سے

میرا دوسرا سوال..... اپنی تحاریر کے علاوہ اور کس کی
تحریروں سے متاثر ہوئی ہیں؟ جیسی کا دن کیسے
تیار ہیں؟

میرا بخاری سے میرا سوال..... کبھی ایسا ہوا کہ آپ اپنی
کسی کہانی کو لکھ کر مطمئن نہ ہوں مگر جب وہ شائع ہوئی تو
قارئین نے اسے بے حساب پسند کیا ہو..... اور غیر متوقع
طور پر وہ بہت مقبول ہو جائے تو؟

رفعت سراج صاحب! میں آپ کی فین ہوں مگر آج کل
آپ بہت کم کم لکھ رہی ہیں کیا وجہ ہے؟
نگہت عبد اللہ جی! پھر سے لکھنا شروع کریں۔ ہم آج
بھی آپ کو پڑھنا چاہتے ہیں۔

عزیزہ سید جی! ”دل من مسافر من“ جیسی کوئی دوسری
کہانی نہیں لکھی کیوں؟ اور آپ فارغ وقت میں کیا کرتی
ہیں؟

آمنہ مفتی جی..... محنت سے انسان سب کچھ حاصل کر
سکتا ہے یا قسمت سے..... آپ کس رائٹر سے متاثر ہیں؟
آمنہ مفتی جی..... ایک لفظ جو آپ کی شخصیت کی
وضاحت کر دے.....

انعام ”اس کی“ ”آفس“ جو اپنے گھریلو مسائل سے بہرہ آزما
ہونے کے باوجود ہمت نہیں ہارتی۔ حالات کا مروانہ وار
مقابلہ کرتی ہے۔ آسیہ رزاقی کا ناول ”تلاش ختم“ کی
”مہربانو“ وہ بھی حالات کی ماری شوہر کی ستائی ہوئی۔ یہ
کردار بھی اچھا لگا۔ نمرہ احمد کے ناول ”بیلی راجپوتوں کی
ملکہ“ کی ہیروئن (مایا) اپنے حسن جہاں سوز اور اپنے رعب
و دبدبہ کے باعث بہت پسند آتی۔

2۔ دوسرا سوال پڑھ کر تو میں چشم تصور میں ایسی تقریب
میں جا پئی جہاں میری ساری فیورٹ رائٹرز موجود ہیں۔
”مجھ کو دیکھیں کہ مجھ سے بات کریں“ انوالا معاملہ ہو گا
خیر جب جو اس کچھ قابو میں آئیں گے تو میں مندرجہ ذیل
رائٹرز سے کچھ اس طرح کے سوال پوچھوں گی۔

میرا پہلا سوال نمرہ احمد سے ہو گا..... پلیز یہ بتائیں کہ
اب آپ کی شادی ہو گئی ہے گھریلو ذمہ داریاں بھی ہوں گی
تو آپ لکھنے کے لیے کس طرح ٹائم نکالتی ہیں؟

فرحت اشتیاق! اب تو آپ اپنی تعلیم مکمل کر کے ماشاء اللہ
کالج میں جاب بھی کر رہی ہیں مگر اپنی مصروفیت میں
سے کچھ وقت نکال کر اپنے قارئین کے لیے سلسلہ وار
ناول نہ سسی، صرف ایک طویل ناول ہی لکھ ڈالیں۔

شفقتہ بھٹی جی! آج کل جو ہمارے ملک کے حالات چل
رہے ہیں اس میں ایک رائٹر کس طرح اپنا کردار ادا کر سکتا
ہے؟

نگہت سیمبا جی! کبھی ایسا ہوا کہ آپ نے کوئی پلاٹ سوچا
ہو، اس پر کہانی لکھنا شروع کی ہو مگر مصروفیت کے باعث



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

ہمیں اپنے منفذ کی طرف لوٹنے کی توفیق مرحمت فرما۔۔۔۔۔
ہم پر رحم کر۔ آمین ثم آمین۔
اب آئے ہیں شعاع کی طرف۔۔۔۔۔
سب سے پہلے ”دل کے راستے“ بڑھا، ماہم کی سزا
شروع ہوئی۔ شام کا فیصلہ جذباتی ساگا۔۔۔۔۔ پھر اس کے
دلائل نے قائل کر ہی لیا۔۔۔۔۔ ویل ڈن سلوی علی بٹ۔
اس کے بعد ”ستارہ شام“ پڑھا معاذ کی کمی شدت سے
محسوس ہوئی۔ پتہ تو چلے۔۔۔۔۔ زری کا کیا ہوگا؟
باقی شعاع بھی بس ٹھیک ہی تھا۔۔۔۔۔ نہ برت یہ بے
نیازی کاشلی نام نے بہت متاثر کیا۔
پیاری ماہدہ! آپ نے بالکل سچ لکھا، کراچی کے حالات
سے ہر حس دل رنجیدہ ہے پریشان ہے، خون کے آنسو
رہتا ہے۔ حکومت دہشت گردوں کے سامنے بے بس
ہے۔ جو خطرات ہمارے سر پر منڈلا رہے ہیں ان کی ہمیں
نہ فکر ہے نہ پروا۔ معیشت دن بہ دن بگڑتی جا رہی ہے،
گیس بجلی اور پانی کا بحران حد سے زیادہ تجاوز کر چکا ہے۔
لیکن ہم اپنے آپس کے جھگڑوں میں اچھے ہوئے ہیں۔
ہم کو زمین و بام کی تقسیم سے فرصت نہیں
بیتھتی جاتی ہیں بنیادیں، مکان گرنے کو ہے
رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں اللہ تعالیٰ کے
حضور گزرا کر دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام دہشت گردوں
کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دے، جو بے گناہ معصوم
انسانوں کی جانیں لے رہے ہیں اور جو ان کو سپورٹ
کرتے ہیں انہیں دنیا میں نشان عبرت بنادے۔ آمین

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں
آپ کی عافیت سکون اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ پاک ہم سب کو ہمارے پیارے ملک کو اپنے حفظ و
امان میں رکھے جو لوگ ہمارے درمیان نفرت کی دیواریں
کھڑی کر رہے ہیں۔ ان کے مذموم ارادوں کو ناکام کر دے
اور انہیں دنیا اور آخرت میں نادمہ اور رکھے۔ آمین۔
پہلا خط لکھی مروت سے عابدہ بشیر مروت کا ہے، لکھتی
ہیں
الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مسلمان بنایا، سب سے
پیارا، اونچا اور عظیم الشان مذہب عطا فرمایا اور پھر اس کے
بعد پیارا پاکستان۔۔۔۔۔
”اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے“

اگست کا مہینہ۔۔۔۔۔ ماہ رمضان۔۔۔۔۔ بہت کچھ یاد دل رہا ہے
پیارا ملک جو ہمارے بزرگوں نے خون کی ندیاں عبور کر
کے حاصل کیا یہاں ہمیں جان و مال کا تحفظ حاصل نہیں
۔۔۔۔۔ کراچی جیسا شہر جس کو ہم مروت ”قطر“ کا نام دیتے ہیں
۔۔۔۔۔ جس نے پاکستان بھر کے بے روزگاروں کو ایک ماں کی
طرف اپنے دامن و سبج میں جگہ دی۔۔۔۔۔ یہاں روزانہ
درجنوں افراد کی موت۔۔۔۔۔ دل خون کے آنسو روتا ہے۔۔۔۔۔
ایسے حالات میں کیسا جشن آزادی۔۔۔۔۔؟ بس دعا ہے کہ یا
اللہ تو نے یہ ملک پاکستان کی نعمت عظمیٰ ہمیں عطا کی اس کی
فحالت میں ہم نے کوتاہی کی۔۔۔۔۔ معاف فرما اور آئندہ

جویا سے دوستی کر کے کہوں کہ جہاں اتنی ہمت کرنے
شادی سے انکار کر دیا وہاں تھوڑی سی ہمت اور کر لو اور معاذ
کی تمام غلط فہمیاں دور کر دو۔
2۔ اجتماع میں ہم موجود اور صرف ایک مصنفہ سے ایک
سوال؟ نہیں نہیں ایسا ظلم ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ یوں
کہے سب مصنفین سے بہت سے سوالات لیکن۔
نمرونی! کیا آپ کلاس کی لڑکی ہی مہم جو بن سکتی ہے؟
کنیز! کیا وادی سندھ ہی عشق سے بڑے پنجاب نہیں؟
کبھی پنجاب کی محبت اس کے ہیر رانجھا کے بارے میں
بھی لکھتے تھے۔
نگت سیم! آپ کی کہانیوں کا بیڑا اس کیوں کر جاتا
ہے۔ لیکن پھر بھی نہیں آپ کی کہانیاں بہت اچھی لکھی
ہیں۔ اور موری سی ہونے کے باوجود۔

نمل۔۔۔۔۔ شاد محمد خان

1۔ پہلے سوال کا جواب دینے کے لیے کہوں گی کہ آسیہ
رزاقی کی بنجیدہ صابرو شاہ حالات سے سمجھو تاکہ رزاقی
نگت سیم کی سعادت مند فرحت اشتیاق کی ایثار کا مجسمہ
نگت عبد اللہ کی نام سادہ سی پر کشش لڑکی، نمرونی کی
خاموش طبع راحت جنیں کی فطرت کی رنگینوں سے محبت
کرنے والی کنیز نبوی کی عشق حقیقی کی عارف، الحمد للہ یہ
سب عکس مجھے اپنی ذات میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان سب
کرواروں کو میں اپنے قریب محسوس کرتی ہوں۔
آسیہ رزاقی کے ناول ”آسمان امتحان“ جو اگست
2010ء میں شائع ہوا، کی ”آمنہ“ وجہ؟ دوسروں کے
آرام و خوشی کے لیے اپنی ذات کی تکلیف بھلا دینے والی۔
رخسانہ نگار کے ناولٹ ”کوئی دپک ہو“ کی ”غانیہ“
جس کو پڑھنے سے محبت ہے، لگن ہے، جستجو ہے، مجھے دل
سے قریب محسوس ہوئی۔
دوستی کا سوال ہے تو آسیہ رزاقی کے ناول کی ہر وہ عورت
جو سلیقہ مند، گھریلو منہر سے آراستہ مہربان برداشت والی ہو،
اس سے دوستی کرنے کو دل چاہتا ہے تاکہ وہ مجھے کمزور
پڑنے پر ہمت دلا سکے۔
2۔ دوسرے سوال کا جواب دینے کے لیے بھی ہم تیار
ہیں۔

جقیہ صفحہ 286 پر

موسٹ فیورٹ رائٹرز جن کا ہر لفظ مجھے اپنے دل میں اترتا
محسوس ہوتا ہے۔ اگر دوستی کرنے کا موقع ملے تو میں بنیہ
سجاد ”مستاع جاں ہے تو“ سے دوستی کرنا چاہوں گی اور ہاں
دوستی کرنے کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بہت
اچھی تھی یا عباد عذیری کی رفاقت نے اسے اچھا بنا دیا تھا اور
اچھے لوگوں سے ملنے کا ان سے دوستی کرنے کا مجھے بہت
شوق ہے۔

2۔ دوسرا سوال تو انتہائی پر جوش کر دینے والا سوال ہے۔
کاش کہ ایسا ممکن ہو پاتا۔ اگر کسی قریب میں مجھے تمام
مصنفین ایک ساتھ مل جائیں تو میں سب سے پہلے فرحت
اشتیاق کو ڈھونڈوں گی اور ان سے پکی پوچھوں گی کہ آپ
مجھے اتنا کیوں رلاتی ہیں؟ ان کی ہر تحریر مجھے پہروں رلاتی
ہے اور میرے خیال میں وہ بہترین مصنفہ ہیں۔

نمرو احمد جو ہمارے نمل کے علاقے کی نامور مصنفہ
ہیں، ان سے تو میں بس ان کا ایڈریس لوں گی اور پھر تفصیلی
ملاقات کر کے خوب انجوائے کروں گی۔ ان کے ناول
”مصحف“ سے تو میں ان سے بہت اچھے پس ہو گئی ہوں۔ اللہ
ہم سب کو قرآن وحدیث کا علم سیکھنے کی توفیق دے۔ آمین
کنیز نبوی سے نہیں، ان کے ہر بیڑے سے پوچھوں گی کہ
جتنی اونگ اور کیرنگ ان کی کہانی کی ہیروئن ہوتی ہیں یہ
خود بھی ویسی ہیں کیا؟

آمنہ ریاض سے ریکویسٹ کروں گی کہ پلیز ”ستارہ شام“
کو اتنا طویل مت کیجئے تاکہ ہم پور ہو جائیں بنیہ عزیز اور
مریم عزیز کی ہلکی پھلکی اور رومانٹک اسٹوریز مجھے بے حد
پسند ہیں۔ ان کو بہت بہت شاباش دوں گی۔

سدرہ ایس ایم جی عبد الحکیم

1۔ سب ہی بہت اچھی اور دل کے قریب محسوس ہوتی
ہیں۔ ہم ان ہی کے ساتھ روتے، ہنستے، خوشی مناتے اور
رتگوں سے کھیلتے ہیں۔ بات تو ساری لکھاری کی ہوتی ہے
کہ وہ انداز یہاں سے کیسے قارئین کو جکڑ لیتا ہے۔
مگر عالیہ بخاری کی ”جویا“ سے جو اپنائیت محسوس ہوتی
ہے، ایسی آج تک کسی سے نہیں ہوئی۔ اس کا ہر ایک
انداز، رویہ، بنجیدگی اور سمجھ داری سب دل کش محسوس
ہوتی ہے۔

جویا اور معاذ کے درمیان ہونے والی ہر گفتگو اور پاکیزہ
محبت کو میں نے اپنے دل سے قریب محسوس کیا۔ جی چاہا،

سدرہ نے ایس ایم جی عبدالحمیم سے لکھا ہے
اس بار گیتی کی بہت بہت اچھی لگی۔ سیدھی دل میں
اتر گئی اور سالار کی تیزیاں ایک سیڈنٹ سمیت۔
یہ بے نیازی ہے۔ نبیلہ آپ نے اتنا اچھا لکھنا کیسے
سیکھ لیا۔ مسلسل اور خوب صورت آپ بور نہیں ہونے
دیتیں۔
مریم عزیز نے بھی اچھا لکھا۔

ع سے عورت م..... راشدہ نے دریا کو کوزے میں بند
کر دیا طرف طرف کی بات ہے عورت کا ظرف سمندر
ہے۔

مجھے بات کرنا تھی آپ سے نہیں جی کسی بھی شاخسار
کی اوٹ میں نہیں بلکہ سرعام! بہت سی قارئین کا کہنا ہے
کہ شعاع کا وہ معیار نہیں رہا یا پہلی کہانیوں جیسی بات
نہیں رہی۔ اب انعام تجربے اور مشاہدے سے یہ بات اخذ
کی گئی ہے کہ جب انسانی ذہن میں ذخیرہ مواد کم ہوتا ہے تو
پڑھی یا سنی جانے والی چیزیں دیر تک یاد رہتی ہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ بچپن میں سنی گئی کہانیاں ہمیں آج تک یاد ہیں جبکہ
آج کل ہم ادھر ادھر خواتین، شعاع اور کرن پڑھ رہے ہوتے
ہیں اور ادھر ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا ہے کہ فلاں کہانی
شعاع میں ہے یا خواتین میں۔

میں نے اپنی پیدائش سے بھی پہلے کے تمام رسالے
حفظ کر لیے جو میری پچھوکے پاس ابھی تک محفوظ ہیں اور
وہ ناول مجھے ازبر ہیں ان کے نام، کرداروں کے نام اور سن
تک! جب کہ اب مصروفیت کی وجہ سے کہانی کا نام یاد رہا تو
ہیرو، ہیروئن کا بھول گیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ مصروفیت

کی وجہ سے ہم خود ناول یا کہانی کو وہ توجہ نہیں دے پاتے جو
اس کا حق ہوتا۔ یقین کیجئے! یہ رسالے اور پیاری پیاری
رائٹرز موجودہ حالات کے جس میں ہمارے لیے ٹھنڈی ہوا
کا جھونکا ہیں!

پیاری سدرہ! آپ نے تو ہمارے جواب کی گنجائش ہی
نہیں چھوڑی۔ بہنوں کے اعتراض کا اتنا اچھا جواب دیا تمہ
دل سے شکریہ۔

تحریم فاطمہ نے لکھا ہے
سب سے پہلے دل کے رستے دشوار بہت تھے پڑھا۔ کیا
زبردست ناول ہے۔ ویل ڈن سلوی جی۔ پلیز سلوی جی

ارسل کے ساتھ برا مت کیجئے گا۔ ارسل میرا پسندیدہ
کرکٹر ہے۔ ویلے ماہم کے ساتھ اچھا ہوا۔ وہ اسی قابل
تھی۔ مریم عزیز کا ناول ”تم سنگ منکنے لگے راتے“ بہت
پسند آیا۔ عمرانہ مقصود کا ناول ”نہکین“ کچھ خاص نہیں
تھا ”ستارہ شام“ بھی زبردست جا رہا ہے۔
پیاری تحریم! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ تفصیلی
تبصرہ اچھا لگا۔
متعلقہ مصنفین تک آپ کا تبصرہ ان سطور کے ذریعے
پہنچایا جا رہا ہے۔

شامیانی نے کامو کی ضلع گوجرانوالہ سے لکھا ہے
دیوار شب اچھی کاوش ہے مگر ستارہ شام میرا فیورٹ
ناول ہے۔ ماوی تو بالکل میرا ہی عکس ہے۔
اس ماہ کا شعاع اچھا لگا۔ سارے سلسلے ہی بہت اچھے
اور خوب صورت اور فیورٹ رہے۔ بس ایک استوری کی
سمجھ نہ آ سکی کہ لکھاری اس میں اپنا کیا ”پوائنٹ آف ویو“
بیان کرنا چاہتی ہے۔ راشدہ رفعت کا افسانہ عورت م
مرد۔

پیاری شامیانی! محفل میں خوش آمدید۔
آپ نے جو کہانی لکھی ہے، ہمیں جھجھکاؤ میں ہم پڑھ کر
ی رائے دے سکتے ہیں۔

راشدہ رفعت کے افسانہ میں مرد کی ذہنیت کی عکاسی کی
گئی تھی کہ وہ اپنے گناہوں اور غلطیوں پر تو خود چاہے، جتنی
غلطیاں یا گناہ کر لے اس کو حق ہے لیکن عورت کی
چھوٹی سی غلطی بھی معاف نہیں کرتا۔

آصفہ صداقت نے چشتیاں سے لکھا ہے
لودھراں سے بہن رضوانہ ٹکلیل راؤ نے ایک افسانے
کے متعلق پوچھا تھا ”ذیر رضوانہ وہ افسانہ اکتوبر 2009ء
خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ مصنفہ عائشہ فیاض
تھیں افسانے کا نام مجھے گوندھ طیبہ کی خاک میں تھا۔ خط
لکھنے کی دوسری وجہ پیاری سی قارئین ہیں۔ ان سے
انتہاس ہے کہ خدا را تنقید کرتے وقت مثبت انداز اپنایا
کریں۔ نایاب جیلانی قطعی حقیقت سے دور نہیں لکھتیں۔
ہمارے معاشرے میں اس سے زیادہ تنگی اور سفاک
حقیقتیں موجود ہیں جو بعض اوقات قلم میں بھی نہیں
لائی جاسکتیں۔
آصفہ جی! ایک طویل خاموشی کے بعد آپ نے خط

لکھا ”اچھا لگا۔ شعاع پر تبصرہ بھی ہوتا تو زیادہ اچھا لگتا۔
آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا اور
اب اتنا طویل وقفہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔
ایمن تحریم سرگودھا سے شریک محفل ہیں

جب سے ہوش سنبھالا۔ گھر میں نانی، امی، آپ سب کو
شعاع پڑھتے پایا۔ سلوی علی بٹ نے بہت اچھا شروع کیا
ہے۔ بے شک ”دل کے رستے دشوار بہت تھے“ ایک عمدہ
کہانی ہے۔ آمنہ ریاض جی نے بھی ”ستارہ شام“ کمال کا
لکھا ہے۔ عورت۔ م۔ مرد بھی بہت اچھا افسانہ تھا۔
پیاری ایمن! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ
نے پہلی بار شرکت کی اور صرف دو کہانیوں پر تبصرہ۔ آئندہ
تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

آمنہ اجالا ڈھرکی سے لکھتی ہیں
مکمل ناول میں نبیلہ عزیز اور مریم عزیز ایک ساتھ جلوہ
افروز نظر آئیں تو ہماری چھوٹی بہن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ
رہا۔ کیونکہ یہ دونوں رائٹرز اس کی آل ٹائم فیورٹ رائٹرز
ہیں۔ ”تم سنگ منکنے لگے رستے“ لکھ کر اس بار مریم عزیز
آپ نے میدان مار لیا۔ باوردی ہیرو صاحب نے کہانی کو اور
بھی خوب صورت بنا دیا۔ ہمیں پولیس افسر و فوجی افسر
ہیروز بہت پسند آتے ہیں۔ اس کے بعد جی باری آپ کی نبیلہ
عزیز آپ کی مکمل ناول ”نہ برت یہ بے نیازی“ کی لیکن
اس بار وہ ہمیں ذرا بھی متاثر نہ کر سکیں یوں کیجیے صرف
خانہ پری کے لیے لکھا گیا ہو۔

اور نہ ہی ہمیں کشمالہ حیدر کی ایزد آفریدی سے
نفرت ہی سمجھ میں آئی ایزد نے اسے کوئی دھوکا تو دیا نہیں
تھا۔ صرف اپنی اور کشمالہ کی مدد کے کہنے پر اس سے
دوستی ہی تو کی تھی وہ بھی محض اس کی بھلائی کی خاطر۔
اس بار عمرانہ مقصود کا نیا نام بھی دیکھنے کو ملا ان کا ناول
نہکین پڑھا لیکن رائٹر صاحبہ کیا کہنا چاہتی تھیں۔ کچھ سمجھ
میں نہیں آیا معذرت کے ساتھ بہت ہی بورنگ کہانی
تھی۔

اور جی سلوی بٹ کا مکمل ناول بھی بہت اچھے انداز سے
آگے بڑھ رہا ہے۔
عالیہ آبی نے بالا خرماری التجاؤں پہ کان دھری لیے
”دیوار شب“ کی یہ قسط زبردست رہی۔ کہانی میں کچھ نیا موڑ

تو آیا۔ شکر ہے سالار کی انٹری صحیح وقت پہ ہو گئی مگر آپ کی
اب ہمارے خیام کا کیا ہو گا وہ میرا سب سے زیادہ فیورٹ
کردار ہے۔

ایک بہن کی نایاب آپ کی کہانیوں پہ کی گئی تنقید بھی
بالکل پسند نہیں آئی کیونکہ ہم نے ان کی آج تک جتنی بھی
تخریریں پڑھی ہیں وہ بغیر مقصد کے نہیں تھیں۔ وہ ایک
بہت اچھی رائٹرز ہیں۔

آمنہ! نایاب جیلانی پر تنقید کا آپ بالکل برائے نام ہیں۔
ان کو پسند کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔
دیوار شب میں خیام کی فکر نہ کریں۔ اس کے ساتھ
اچھا ہی ہو گا۔

طاہرہ حنا ساسی نے ڈھوک کا سب سے لکھا ہے
ہوش سنبھالا تو شعاع نے اپنا گرویدہ بنالیا۔ وہ دن اور
آج کا دن ہے شعاع سے دامن چھڑانے میں ناکام ہیں۔
تبصرہ کرنے کی وجہ خاص سلسلہ ”سیر دو جہاں“ ہے
دوسرے نمبر پر ”دیوار شب“ واہ عالیہ جی! کیا بلاٹ ہے کیا
کردار نگاری اور کیا سسپنس..... لا جواب۔ گیتی مجھے بے
حد پیاری ہے تب تک اس آپ نے اسے سالار کا ساتھ بخشا
..... کسی طرح آپ اگلے کا کچھ مرنگے تو ٹھنڈی پڑ جائے۔

”دل کے رستے دشوار بہت تھے“ بہت اچھا جا رہا ہے
”نہ برت یہ نیازی“ وندر فل لگا..... خاص کر
جب پوری غزل پڑھنے کو ملی تو شعاع پر ٹوٹ کر رہا آیا۔
افسانے سب ہی اچھے تھے۔ ”عین عورت م مرد نے
دکھی تو کیا مگر کیا ہی بات تھی۔ پلیز آپ سارہ رضا (نکھی سنگر)
اور FM-95 کے بلال چوہدری کا انٹرویو ہمہ تصاویر
شائع کریں۔

پیاری حنا! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی
فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں
گے۔

بشریٰ انور خان سپریم کالج اوکاڑہ سے تشریف لائی ہیں
اس ماہ ”دیوار شب“ نے کافی اسپڈ پکڑی۔ اگلی قسط کا
شدت سے انتظار ہے۔ عورت۔ م۔ مرد بہت اچھا
افسانہ تھا۔ ”دل کے رستے دشوار بہت تھے“ شروع سے
اب تک بالکل بھی متاثر کن نہیں ہے۔ شاہم اور ارسل
کی احد درجہ تکلفی، منصور کا پیار اور ماہم کی بے اعتنائی غیر

حقیقی لگتے ہیں۔ ”تم سنگ مٹنے لگے راستے کیا فلمی ناول تھا۔ پڑھ کر دیر تک افسوس ہوتا رہا کہ اگر شعاع میں بھی ایسے ناول پڑھتے ہیں تو اس سے بہتر ہے کہ بولی ووڈ کی فضول سی فلم دیکھ لی جائے۔

اب تو شعاع کی اکثر تحریر پڑھتے وقت یوں لگتا ہے کہ کوئی انڈین سوپ دیکھ رہے ہوں۔ جانے وہ نٹ کھٹ حقیقی زندگی کے قریب تحریریں لکھنے والی ناول نگار کہاں جا چھپی ہیں؟ ”تمکین لکھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی؟ فضول سی تحریر لگی۔ ”صبح کا ستارہ“ ستارہ شام اور دیوار شب ایچھے ناول ہیں۔ افسانے سب سے اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن ناولوں میں ہر مرتبہ باقی آئندہ کی جگہ دل جلا دیتی ہے۔ ایک ہی شمارے میں اتنے زیادہ قسط وار ناول شروع کرنے کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔

میں نے تو اپنی شکایتیں آپ تک پہنچا دیں اگر آپ کو برا لگا ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ پیاری بشری! آپ کی ساری شکایتیں سر آنکھوں پر۔ شعاع آپ کو پسند نہیں آ رہا۔ ہم کوشش کریں گے کہ اسے مزید بہتر بنائیں۔

دو سے زیادہ قسط وار کہانیاں دینا ہمیں خود پسند نہیں۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ ہماری مسکین باوجود ہمارے شدید اصرار کے مختصر لکھنے پر آمادہ نہیں ہیں اس وقت بھی ہمارے پاس کم از کم دس طویل ناول رکھے ہوئے ہیں جو ایک قسط میں نہیں لگا سکتے۔ اب آپ ہی بتائیے ہم کیا کریں؟

آپ نے مریم عزیز کے ناول پر جو اعتراض کیا ہے طویل ناول عموماً ”ایک نشست میں نہیں لکھے جاتے۔ اس لیے کہیں اس طرح کی بھول چوک ہو جاتی ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہم نے بھی یہ غلطی نوٹ نہیں کی اور آپ کو کوفت ہوئی۔

ماہم کی بے اعتنائی اور منصور کا پیار آپ کو غیر حقیقی لگتا ہے لیکن جب انسان کی تقدیر میں خرابی لکھی ہو تو پہلے اس کا دماغ خراب ہوتا ہے اور وہ اسی طرح کی حرکتیں کرتا ہے جیسے ماہم کر رہی ہے۔

تزیلہ ریاض اور آمنہ ریاض بہنیں ہیں۔ ہم ان تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

صالہ اقصیٰ، میر نور آزاد کشمیر سے شریک محفل ہیں

سب سے پہلے ہماری طرف سے شعاع کو سالگرہ کی بہت بہت مبارک ہو۔ شعاع اور خواتین کی تمام رائٹرز اچھی ہیں۔ کسی ایک رائٹر کی تعریف کرنا تو نا انصافی ہوگی۔ صالہ اور اقصیٰ! آپ کا خط شامل اشاعت ہے آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا ہمارے لیے کوئی بھی خط معمولی نہیں ہوتا اس لیے آئندہ یہ نہ سوچئے گا کہ آپ کا معمولی خط کون پڑھے گا۔

سدرہ اشرف ضلع چنیوٹ تحصیل بھوانہ سے شریک محفل ہیں

میں 2002ء میں آٹھویں کلاس میں تھی جب پہلی دفعہ شعاع کو اپنی ایک ہم جماعت سے چھین کر پڑھا۔ بہت مزا آیا۔ اس کے بعد سے شعاع باقاعدگی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ نہ صرف ہمارا گھرانہ بلکہ میرے نھیاں میں میری باج ممانیاں بھی بہت شوقین ہیں۔ ماہ رمضان کی آمد آمد ہے اور ہم سب ایک مرتبہ پھر سے شبلی اور جواد کی خوش آمدید کہنے کو تیار ہیں۔

پیاری سدرہ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ جواد کی اور شبلی ان شاء اللہ آئندہ ماہ عید نمبر میں شامل ہوں گے۔

حمیرا رانا نے حافظ آباد سے لکھا ہے

مجھے سلسلہ وار ناول بہت پسند ہیں۔ برعکس مکمل ناول ناولٹ وغیرہ کے لیکن حد سے زیادہ اقساط بھی پڑھنے والوں کے لیے بوجھ بن جاتی ہیں۔ عالیہ بخاری کا ”دیوار شب“ ایک اچھا ناول ہے۔ ساتھ ہی یہ ناول ست روی کا شکار ہے۔ جو یا اور معاذ والا چیپٹر تو آپ نے کلوز ہی کر دیا ہے۔ آمنہ ریاض کا ”ستارہ شام“ میں شمیم کا عجیب و غریب رویہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ وہ جیڈی کو دھوکا کیوں دے رہی ہے۔ ماوی کا کردار بہت دلچسپ ہے۔ ”تم سنگ مٹنے لگے راستے“ مریم عزیز نے کمال کر دیا۔ اور دوسری بہترین کاوش ”نہ برت بے نیازی“ نبیلہ عزیز بہت اچھا لکھا آپ نے سلوی علی بٹ آپ نے شاہم کے ساتھ وہی کیا جو ہر دوسری بہن کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی پرانا موضوع کہ اگر ایک فوت ہو جائے یا کوئی غلط قدم اٹھائے تو دوسری کو اس کی جگہ قربان کر دیا جاتا ہے۔ خواہ اسے اپنے

لوہوں کا ٹل ہی کیوں نہ سہار کرنا پڑ جائے۔ بہر حال اسل کو فوت مت کیجئے گا۔ ”صبح کا ستارہ“ کاشف کا یہ روپ بالکل پسند نہیں آیا۔ کیا کم شکل لوگوں کا اس دنیا میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ تمکین بالکل پسند نہیں آیا۔ افسانے تمام ہی اچھے تھے۔ باقی تمام سلسلے بھی پہلے کی طرح اچھے تھے۔

نایاب جیلانی کے بھائی کا کیا مسئلہ ہے۔ پیاری حمیرا! ملک کے سب سے بڑے شہر کراچی میں جہاں جگہ جگہ گھرے لگے ہوئے ہیں یہ حال ہے کہ دن دھاڑے بے گناہ معصوم لوگوں کو قتل کر دیا جاتا ہے اور قاتلوں پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ جب اس بڑے شہر میں یہ حال ہے تو سوچ لیں کہ گاؤں اور قصبوں میں کیا حال ہو گا۔ نایاب جیلانی کا بھائی بے گناہ تھا اس لیے ان کے والد نے خود حوالے کیا تاکہ اس کی بے گناہی ثابت ہو اور دشمنی کا سلسلہ آگے نہ بڑھے لیکن یہاں انصاف کون کرنے والا ہے۔

آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اللہ تعالیٰ اس بچے کو تمام مشکلات سے نجات دے تاکہ وہ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔

سلوی علی بٹ نے رائے موضوع کو کیا نیا رنگ دیا ہے۔ وہ آپ آخری قسط پڑھ کر جان سکیں گی۔ تبصرے کے شمارے میں اس ناول کی آخری قسط شائع ہوگی۔

بشری حسن راولپنڈی سے تشریف لائی ہیں

ماہ جولائی کے شمارے کا سرورق پسند آیا۔ انٹرویو کا نیا شروع ہونے والا سلسلہ بندھن کچھ خاص متاثر نہیں کر سکا۔ کچھ نئے فنکاروں کے انٹرویو بھی لیے جائیں۔ جیسے یمنی پیرزادہ، رضوان علی اور FM-94.6 کے DJ کے متیق الرحمن بھٹی کا بھی انٹرویو شائع کریں۔ ”دل کے راستے“ سلوی بٹ کی تحریر متاثر کن ہے۔ افسانے سب ہی اچھے تھے عمرانہ مقصود کا ناول ”تمکین“ بہت اچھا لگا۔ میری صبح کا ستارہ کچھ خاص تاثر قائم نہیں کر سکا۔ شکل و صورت پر کلاس کا مسئلہ نہیں ویسے بھی کاسمیٹکس انڈسٹری میں اب اتنی ترقی ہو چکی ہے کہ لیزر ٹریشمنٹ سے کالی رنگت کو بھی سفید کیا جا سکتا ہے۔ مریم عزیز کا ناول بھی بہت اچھا تھا۔ میں ایک گزارش آپ اور تمام کارکن کے سامنے رکھنا چاہتی ہوں کہ پرانی تحریریں جو کارکن نے بہت پسند کیں ان میں سے کچھ بہترین

تحریریں شائع کریں۔ جیسے ساجدہ حبیب، سلمیٰ یاسمین نجی، راحت جبین اور غزالہ نگار اور کرنی کی تحریریں اب تک دل پر نقش ہیں لیکن نئی آنے والی تحریروں میں سے چند ہی اپنا تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

تاریخ کے جھروکے کا سلسلہ مجھے بہت پسند ہے۔ بہت معلوماتی سلسلہ ہے۔ شاعری بچ بولتی ہے میں مسز فصیحہ کا انتخاب اچھا تھا۔

پیاری بشری! پہلی بات تو یہ ہے کہ کاسمیٹکس انڈسٹری کتنی بھی ترقی کر لے خوب صورتی صرف رنگ، نقش خدوخال میں نہیں ہوتی۔ پوری شخصیت میں ہوتی ہے۔ ماہین کا مسئلہ بد صورتی نہیں اعتماد کی کمی ہے جو اس کی چھوٹی بہن اور ماں کی غیر معمولی خوبصورتی کی اور ان کے رویے کی وجہ سے۔ بچپن سے ہی اس کی شخصیت کو دبایا گیا جس کی بنا پر وہ تعلیم بھی نہ حاصل کر سکی جبکہ اس کی پھوپھی ثروت جس کی شکل و صورت اسی طرح ہے زندگی میں کامیاب اور خود اعتماد ہے۔ سائرہ عارف نے اسی مسئلہ کو اجاگر کیا ہے۔ پرانی تحریریں ہم بھی شائع کرنا چاہتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہماری بیشتر قارئین کہیں نہ کہیں سے شعاع کے پرانے پرچے حاصل کر کے پڑھ لیتی ہیں اس لیے ان تحریروں کو دوبارہ شعاع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

حمیرا قانزہ، اجواء اور عابدہ، مصطفیٰ آباد (ملیانی) ضلع قصور سے شریک محفل ہیں

سب سے پہلے آمنہ ریاض کا ناول ستارہ شام پڑھا بہت ہی اچھا لگا کہ آپ اس میں تھوڑی سی تیزی پیدا کریں اس کے بعد میں سائرہ عارف کے ناولٹ میری صبح کا ستارہ کی تعریف کرنا چاہوں گی۔ بہت ہی اچھا ناولٹ ہے عالیہ بخاری جی آپ کے تو کیا کہنے ہیں آپ نے تو واقعی ہی میں اس دفعہ بہت بہت کمال سے لکھا ہے۔ باقی سب ناول بھی اچھے ہیں پلیز آپ کبھی تفصیل سے ابرار الحق اور شاہد خان آفریدی کا بھی انٹرویو شائع کریں۔ سب سے خاص بات آپ کے تاریخ کے جھروکوں سے بہت اچھے لگتے ہیں اس سے ہمیں بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہے بہت سے ایسے واقعات اور ایسی شخصیات ہوتی ہیں جن کے بارے میں ہم نہیں جانتے۔

حمیرا قانزہ، اجواء اور عابدہ! بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں خط لکھا۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا پچھلا خط

شامل نہیں ہو سکا۔

مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے اور ہاں ایک بات تو آپ نے بتائی ہی نہیں آپ لوگ نہیں ہیں یا سہیلیاں؟

عابدہ خان عالی نے گوجران سے لکھا ہے

میری سسر نازیہ اور میری بھانجیاں بھی بہت شوق سے آپ کے پرچے پڑھتی ہیں۔ اس ماہ کے شمارے کی کہانی ریح عورت۔ مہر کوئی اتنا بھی لکھ سکتا ہے؟ اتنی گہری اور زبردست کہانی لکھنے پہ پہلے راشدہ رفعت کو مبارک باد۔ آمنہ ریاض اور عالیہ بخاری کے ناولٹ پڑھے۔ مجھے عالیہ جی اور آمنہ جی کے لکھنے میں بہت مماثلت نظر آتی ہے، عمدہ انداز بیان، عالیہ کے ناولز انتہائی سادگی لیے ہوئے مگر بہت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں جالی دار دروازے، وادی اماں کا کردار، محراب ستون والے برآمدے، پکن کی کھڑکی اور سیدھے سادے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ پلیز مکمل ناول لکھیں۔ اس کے علاوہ سلوی علی بٹ، ایک نیا اضافہ کاشا کے ڈائلاگز بہت مزادیتے ہیں۔ ہر لحاظ سے بہترین ناول۔ اس کے علاوہ سب کہانیاں اچھی لگیں۔ میں تو لکھنے والوں کو داد دیتی ہوں کہ وہ لکھ کیسے لکھتی ہیں؟ میں نے ایک دوبارہ کوشش کی لکھنے کی مگر نہیں لکھا گیا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ لکھنا اتنا بھی آسان نہیں جتنا آسانی سے ہم تنقید کر جاتے ہیں۔

پیارے عابدہ! کہانی لکھنا واقعی بہت محنت طلب کام ہے اور یہ ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔ اس کے لیے خدا داد صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بے جا تنقید جس سے کسی کی حوصلہ شکنی ہو ہرگز نہیں ہونا چاہیے لیکن مثبت تنقید جس سے کسی کو خود کو بہتر بنانے یا سنوارنے کا موقع ملے اسے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اپنی بہن نازیہ اور بھانجیوں تک ہمارا شکریہ پہنچادیں اور یہ کیا بات ہوئی کہ گیارہ سال سے مستقل قاری ہیں اور خط ایک بھی نہیں لکھا۔

ستارہ آمین کوئل نے پیر محل سے لکھا ہے

شعاع دس سالہ کوئی تفریح کے طور پر پڑھا جانے والا نہیں بلکہ شاندار استاد قابل ترین دوست پیاری والدہ عالی شان

بڑی اماں لائق فائق بھیا اور نرم نفیس بہن سایہ دار شجر جو پھل بھی دے کے طور پر پسند کیا پڑھا دوستی بھائی اور ثابت قدم رہے۔ یوں یہ سفر جاری و ساری ہے۔ ایسا وقت بھی تھا جب ہم اسے لک چھپ کر پڑھتے کیوں کہ اماں پڑھی لکھی ہیں نہیں۔ کسی نے ان کے کان بھر دیے کہ رسالوں میں منگنی، دیوانہ، عشق محبت کے سوا کچھ نہیں ہوتا خود ڈاٹیشن ایسا کو بھی گرم کرتی تھیں۔ تو ڈاٹیشن پڑنی شاندار اور جاندار قسم کی پھر پہلے میں نے ایسا کو قائل کیا۔ انہیں بتایا بھلے آپ پڑھ لو اس میں کوئی ایسا ویسا نہیں ہوتا۔ اب صورت حال اس طرح ہے اب خود شعاع لاتے ہیں۔ مجھے حکم دیا جاتا ہے کہ آپ بھی لکھو حصہ لو۔ اپنی صلاحیت بروئے کار لاؤ۔ آپ کے میگزین کے ذریعے ایسا کو خراج تحسین پیش کروں گی۔ جنہوں نے ہمیں تعلیم دوائی، انہوں نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہوا خصوصی کاکھانا، پننا پوھنا، لکھنا ہر طرح سے ہمارا ساتھ دیا۔ پاکستان سے محبت کا درس اولین ہے۔ پہلے ذرا مجھے بتادیں کہ شعاعی بچ بولتی ہے میں انتخاب بچوایا تھا۔ اس کا کیا بنا؟

بتادیں پلیز، میری اکلوتی فرمائش، جناب مجید نظامی کا انٹرویو دس پلیز جلدی سے۔ ستارہ! آپ کے والد واقعی خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ بیٹیوں کی تعلیم و تربیت کرنے ان سے محبت کا سلوک کرنے والے اور ان کی بہترین پرورش کرنے والوں کا برادر جہ اور مقام ہے شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ندرت نے کراچی سے لکھا ہے

ہمارے اور شعاع کے ساتھ کو برسوں بیت گئے، پہلے میری خالہ پڑھا کرتی تھیں۔ اب بھی پڑھتی ہیں اور نانی کے گھر تین ڈائجسٹ آتے ہیں شعاع، گرن اور خواتین میں نانی کے گھر ہی جا کر پڑھتی ہوں جب تک کوئی بھی کہانی پوری نہ کر لوں، رکھتی نہیں ہوں۔ میری خالہ بہت کو پڑھتے ہوئے تقریباً بیس سال ہو گئے اور مجھے دس سال ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنی خالہ سے کہا کہ آپ بھی خط لکھ کر بھیجیں تو انہوں نے کہا کہ میں نے دو دفعہ لکھ کر دیا ہے لیکن وہ شائع نہیں ہوا پھر مجھے کہا کہ اچھا تم لکھ لو۔ پلیز یہ خط ضرور شائع کیجئے گا تاکہ میں اپنی خالہ کو دکھا سکوں۔ ہماری سب سے پسندیدہ رائٹر ”عمیرہ احمد“ ہے اور

ناول ”پیر کامل“ ہے۔ اس کے بعد فرحت اشتیاق وہ بھی لکھنا چاہتی ہیں پلیز ان سے کہیں کہ وہ دوبارہ لکھیں۔ اب آتے ہیں اس شمارے کی طرف۔ سب سے پہلے بخاری کا دیوار شب پڑھا پڑھ کر حیرانی ہوئی کہ سالار اور گیتی کا نکاح کافی عرصے بعد کہانی میں نیا موڑ۔ پلیز کہانی میں اور تیزی لائیے۔ آمنہ ریاض بھی کافی اچھا لکھ رہی ہیں ایک بات سمجھ نہیں آرہی کہ ماوی کا منگیتر شہروز ہے یا نہیں؟

مریم عزیز کا تم سنگ پڑھا ٹھیک ہی تھا۔

ندرت! شینہ ماوی کو ایک خاص مقصد کے تحت جلال کی طرف راغب کر رہی ہیں۔ کیونکہ جلال کا حوصلی سے تعلق ہے اور ماوی کے والد کا بھی اسی جگہ سے تعلق تھا۔ شعاع میں خط لکھنے کا شکریہ آپ کی خالہ بھی خط لکھتیں تو ہم ضرور شائع کرتے۔ انہیں ہماری طرف سے سلام پہنچا دیں۔

انعم فیاض فرام اکبر ناؤن ملتان سے لکھتی ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے رسالوں کا معیار یونہی قائم رکھے۔ میرا رزلٹ 4 اگست کو آؤٹ ہو گا تمام قارئین سے استدعا ہے کہ میرے لیے بہت محنت دے جائیجئے۔ پیاری انعم! شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی کے ہر امتحان میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔ آمین۔

قارئین تک آپ کی درخواست پہنچا رہے ہیں۔

شما نلکہ تاج نے خان پور سے شرکت کی ہے

ٹائٹل گرمیوں کی مناسبت سے بہت اچھا تھا۔ سب سے پہلے سلوی علی بٹ کا ناول ”دل کے راستے دشوار بہت تھے“ پڑھا۔ ماہم پر بہت زیادہ غصہ آیا، یقین نہیں آتا تھا کہ اتنی خفا غصہ اتنی بے حس کوئی عورت ہو سکتی ہے۔

آصفہ عنبرین قاضی کا افسانہ ”یہ لوگ“ بھی کافی اچھا افسانہ تھا۔

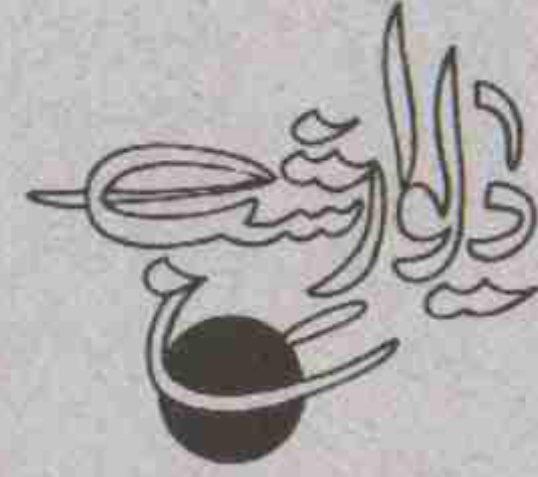
پیاری شما نلکہ! ہمیں بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ متواتر کئی خط شائع نہ ہونے کے باوجود آپ نے ہمیں خط لکھا لیکن آپ یقین کریں کہ ہمیں اس سے پہلے آپ کے خطوط موصول نہیں ہوئے شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

شاهم اور ماہم دونوں بہنیں ایک ہی جیسے کردار اور ذہن کی مالک ہیں۔ ان کی زندگی میں اہمیت صرف اپنے فیصلوں، اپنے دل کی ہے۔ جو ان کی خواہش ہے وہ صرف اس پر عمل کرتی ہیں۔ ماہم نے اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے نہ منصور کے دل کی پروا کی نہ بچے اسے روک پائے۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر صرف اپنی خوشیوں کے پیچھے چلی گئی۔

شاهم نے بھی یہی کیا۔ ارسل کے ساتھ محبت کے راستوں پر اتنی دور چلی گئی۔ بے تکلفی کی انتہا کر دی۔ اس کے فلیٹ پر جا کر اس سے ملتی رہی اور جب یہ فیصلہ کیا کہ اسے منصور سے شادی کرنا ہے (وجہ جو بھی ہو، حقیقت صرف اتنی ہے کہ منصور ایسا نہیں چاہتا تھا) تو اس نے ارسل کو ٹھکرا دیا اور منصور کے فرار کے سارے راستے مسدود کر دیے۔ منصور کو شاہم سے شادی کرنا پڑی۔ جو لوگ دل کے راستوں پر آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں ان کو پشیمانی کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔



ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ، کرتہ شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت پر ڈراما، ڈرامائی تھکیل اور سلسلہ وار قطع کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



قیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو ترائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلے ہوئے قیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لیتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک قیام کو چھوڑتا ہے۔ قیام کے لیے سالار کا دیر حیران کن ہے۔ شہر اگر کسے کئی روز تک بے روزگار رہتا ہے۔ وہ بالور شوکت کے موٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گئی آڈی کی پوزیشن دیکھ کر قیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھر دیا لوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار میڈیکلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل آبا کا پروردگار کا مہل میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی بڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار و جہاں ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کمایکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ جوا کی بات معاذ سے ملے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر غاک ڈال ہے۔ چچانے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی ذویہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جوا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موانع نہیں ہیں۔

Scan & PDF
FIAZ AHMED
Friends Korner.com

دو سو سال قدیم 'محرابی دروازوں والے اس چوبارے کے باہر بارش ایک بار پھر بہت زور سے برسنے شروع ہوئی تھی۔ شر، شر، شر! شر!

محرابوں کے اوپر سے بہتے ہوئے پانی کا شور، بادلوں کی گھن گرج، آس پاس دہلی زبانوں میں ہونے والے تبصروں کو اس تک پہنچنے میں حائل ہوئی تھی۔

سالار کے ساتھ وہ طویل برآمدہ طے کرتے ہوئے گیتی نے چند ہاتھوں کو اپنے سر پر باری باری محسوس کیا اور ہر بار آنسوؤں کے قطرے چہرے سے پھسل کر فرش میں جذب ہوئے۔

کون کون تھا ان میں!

شاما، خالہ گل، نازی، نانی، دل، داریا، پھر شاما کے پاس آئی پاس پرئوس کی وہ لڑکیاں، جن کا کوئی رتبہ مرتبہ بھی نہیں مگر وہ ان سب کی دل سے مقروض ہوئی۔ دعا سے بڑھ کر کسی کو دینے کے لیے کوئی قیمتی تحفہ نہیں اور دل سے دعا دینے والے سے بڑھ کر کوئی نخی نہیں۔

سو اس کی خوش قسمتی میں کیا کلام!

اپنے پیروں پر نظر جمائے اس نے یہاں سے وہاں تک کا راستہ طے کیا۔

"میری بچی کو رخصت کیجئے اماں!"

پہلی سیڑھی اترنے سے پہلے نگینہ نے اسے نانی ستارہ کے سامنے کھڑا کیا۔

آس پاس چند لحوں کے لیے جیسے سناٹا سا چھایا۔ گیتی کا دل بہت زور سے دھڑکا۔

اب معلوم نہیں وہ کس طرح کے رد عمل کا اظہار کرنے والی تھیں گھر آنے کی تاریخ میں یہ پہلا کام تھا، جوان کی

مرضی کے خلاف ہوا تھا۔

نہیں شاید دوسرا!

پہلا خالہ فیروزہ کا جانا تھا۔

مگر وہ تو جیسے سے چلی گئی تھیں، یوں علی الاعلان نافرمانی تو اسی کے حصے میں آئی تھی۔

ہلکی سی کنگیا ہٹ گیتی کے سارے وجود میں اتری۔

اس روز جب محض زبانی انکار پر ان کا ہاتھ اس پر پہلی بار اٹھا تھا تب اس نے بجا طور پر جانا تھا کہ نانی ستارہ کے

جاہ و جلال کا ڈنکایوں ہی نہیں بجتا تھا۔

برادری کی لڑکیاں ان کے سامنے کھڑا ہونے کے خیال سے ہی کانپتی تھیں، تو حق بجانب تھیں۔

اس کی اپنی نگاہ فرش پر جمی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے جس خود اعتمادی کا مظاہرہ وہ کر چکی تھی وہ نکاح نامے پر

دستخط کے ساتھ ہی پھر سے زیر و پر آچکی تھی۔

ایک انتہا سے دوسری ابتدا کے بیچ کا راستہ جیسے فضا میں معلق تھا۔

"گیتی کو اپنی دعا کے ساتھ رخصت کیجئے اماں!"

نگینہ نے خاموش کھڑی نانی ستارہ کو پھر سے یاد دلایا تو انہوں نے چونک کر نگینہ اور پھر گیتی کو دیکھا۔

"نی امان اللہ!"

الفاظ ان کے منہ سے بنا کسی تاثر کے نکلے اور ان کی انگلیوں نے گیتی کے سر کو چھونے کا فرض سدا ادا کیا اور

بس۔

برآمدے میں جمع اس چھوٹے سے مجمع میں نانی ستارہ کے لیے راستہ بنانے میں ہلکی سی کھلبلی مچی۔

بنا کسی اور کی طرف دیکھے وہ سیدھی اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔

"نانی، پلیز!" سالار نے بے چین سا ہو کر انہیں پکارنا چاہا مگر نگینہ نے اشارے سے منع کیا۔

"فکر مت کرو، میں دیکھ لوں گی۔" اس کے لہجے میں بڑی ہی نرمی اور مٹھاس تھی "تم خیر سے اپنے گھر کو

سدا رو!"

یہ لب و لہجہ نگینہ کا نہیں تھا۔

خود گیتی نے چونک کر نگینہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اسی کی طرف متوجہ تھی۔

چہرے پر غضب کا سکون اور پورا وجود جیسے بہت ہی ملائم سی روشنی کے ہالے میں مقید

اتنی روشن، اتنی اجلی، اتنی حسین اور منفرد

گیتی کی نگاہ اس پر سے ہٹنا بھول گئی تھی۔

یہ وہ چہرہ کب تھا جسے ہوش سنبھالنے سے اب تک محض جیسے بھاگتے دوڑتے ہی دیکھا تھا۔

پیروں تلے جلتی آگ کی پیش پورے وجود اور زبان پر انگارے برساتی تھی۔

نانی ستارہ جان کے معروف گھرانے میں سب سے چھپے درجے پر کھڑی نگینہ جان۔

یہ وہ کب تھی!

گیتی کی خود پر جمی نگاہ نے اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیری تھی۔

"شکر ہے اس پروردگار کا جس نے مجھے میری اپنی نظر میں سرخ رو کیا۔" گیتی کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں

تھام کر اس نے پورے سکون قلب کے ساتھ کہا اور محبت سے اس کی پیشانی چومی۔

"اللہ کے سپرد!"

گیتی بے ساختہ اس کے سینے سے لگی۔

"اے لئی!"

الفاظ سکیوں کی طرح اس کے لبوں سے ادا ہوئے اور چہرہ آنسوؤں سے بھیگنا چلا گیا۔

نگینہ کے پورے وجود میں ٹھنڈک کا ایسا سکون بخش احساس جاگا جس کے لیے وہ آج تک ترسی تھی۔

نہ صندل کے سپر اشار بننے میں

نہ ہی خالہ دل دار اور گل ناز کو نیچا دکھانے میں

اور نہ ہی الماس کی مارکیٹ ویلیو کم ہونے اور شیرازی کینے کو اس کی اوقات یا دولانے میں۔

ایسی راحت تو نصیب والوں کو ملتی ہے، سو وہ آج واقعی نصیب والی ٹھہری۔

"بس کر بیٹا! خوشی کے موقع پر روتے ہیں کیا؟"

نگینہ کو دھیرے سے خود سے الگ کرتے ہوئے وہ دھیرے سے ہنس پڑی۔

"ہل بیٹا سالار! سنبھال اپنی امانت!"

اس نے گیتی کا ہاتھ سالار کے ہاتھ میں تھمایا اور خود جیسے ہر فرض سے فارغ ہو کر پیچھے ہٹی۔

ایک قدم نیچے اور ایک قدم۔

کون کون تھا جو گیتی کو رخصت کرنے نیچے تک گیا تھا۔ لیکن وہ وہیں کھڑی تھی تب ہی اپنے پیچھے گھٹی گھٹی

سکین پر اس نے مڑ کر دیکھا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی گل ناز کی آنکھیں روتے روتے سرخ تھیں۔

"لے پاگل ہوئی ہے، رو رو کر برا حال کر لیا، بھانجی عزت سے رخصت ہوئی ہے، اس سے بڑھ کر خوشی کی کیا

بات ہے، تیرا بھی جواب نہیں گل ناز!"

گے سے لگ کر روئی ہوئی گل ناز پر اسے زندگی میں پہلی بار بڑا ہی پیار آیا۔

مگر عجیب سی بات تھی وہ خود جو زندگی بھر بات بے بات دل بھر کر آنسو بہاتی آئی تھی آج اس کی آنکھ میں آنسو کی بوند بھی نہیں چمکی تھی گل ناز نے اس کے خوشی سے چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔
”اللہ تجھے کیتی کی بہت خوشیاں دکھائے نگینہ! بڑی کٹھن محنت ہے تیری ان بچیوں کے پیچھے۔“ گل ناز نے آہستہ سے کہا۔

آج کا دن خاص تھا دعاؤں اور برکتوں والا۔

”چل آ یہاں اوپر سے دیکھتے ہیں۔“

گل ناز کا ہاتھ پکڑ کر وہ برآمدے کی محراب کے نیچے آکر کھڑی ہوئی۔

اوپر سے تسلسل کے ساتھ پتے ہوئے پانی کے دوسری طرف کا منظر دھندلائے جا رہا تھا مگر بے حد خوشگوار تھا۔ کسی مہربان نے چھتری تان دی تھی۔

سالار نے بڑی مشکور نظروں سے دیکھا۔

بالی صاحب اور صندل نے انہیں چھوڑنے جانے کی ذمہ داری از خود سنبھالنا چاہی تھی۔

”آپ چاہیں تو ہوٹل میں یا پھر میرے گھر پر۔۔۔“

بالی صاحب اب تک اس سے بے حد متاثر ہو چکے تھے اور ان کی ایک چھوڑی ہوئی قیمتی گاڑیاں قریب ہی کھڑی تھیں۔

”آپ کا بے حد شکریہ بالی صاحب! مگر میرے پاس جانے کا انتظام ہے!“ سالار متانت سے مسکرایا۔

دکان کے شیلڈ کے نیچے کھڑی ٹیکسی کے ساتھ کھڑا ہوا وہ باتوٹی ڈرائیور مسکرا رہا تھا۔

”اس میں۔۔۔ اس میں جائیں گے؟“ بالی سے زیادہ صندل کو عجیب سا لگا۔

”ہوں کیا حرج ہے اور یہ برات آئی بھی تو اسی میں ہے کیوں راجو؟“

اس بھیڑ میں بھی اپنے ساتھ ساتھ چلتے راجو سے سالار نے تائید چاہی تو اس نے مسکرا کر فوراً ہی سر ہلایا۔

معاملہ اب پوری طرح نہ سہی کچھ کچھ تو سمجھ میں آئی رہا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مستعدی سے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔

”اجازت!“ وہ ان سب کی طرف مڑا۔

”جیتے رہو!“ اسافر اغت بیگ کا کانپتا ہوا کمزور ہاتھ کسی سائبان کی مانند ان دونوں کے سروں پر ٹہرا۔

اور صندل کیتی کو گلے لگاتے ہوئے بڑے دل سے دیکھی ہوئی۔

”کیا جھوٹ اور کیا حقیقت، کیتی کا نصیب بھی جانے کہاں کھلا ہے۔“ وہ ابھی تک مشکوک تھی۔

”سینیں! آپ لوگ ابھی کہاں جائیں گے، میرا مطلب ہے کون سے ہوٹل؟“

سالار کی اوقات جاننے کے لیے اسے فی الحال یہی طریقہ سوجھا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا صندل کا سوال سن کر ایک لمحے کے لیے رک کر مسکرایا۔

”میرا گھر ہے بیس ڈیفنس میں اس کا ایڈریس آپ کو ٹیکسٹ کر دوں گا ٹھیک؟“

صندل کا منہ ہلکے سے کھلا۔

”اور یہ آپ کی ٹانگ، کوئی چوٹ لگی تھی کیا؟“ اتنی دیر میں پہلی بار بان کدساں ہوا تھا کہ اسے چلنے میں دقت

ہورہی ہے۔

”جی بس چھوٹا سا ایکسپینڈنٹ ہو گیا تھا۔“

وہ مختصری وضاحت دے کر ٹیکسی میں بیٹھ چکا تھا۔

سامنے برآمدے کی محراب کے نیچے کھڑی نگینہ اور گل ناز کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔
”کیسی نرالی شان ہے کیتی کی برات کی!“ آج نگینہ کی نگاہ میں پراڈو، گرولہ، سب ہی صفر ہوئی تھیں۔
ٹیکسی۔ دائیں بائیں گھومتی گلی میں اب غائب ہوتی جا رہی تھی اور آسمان سے برستا پانی جیسے نہ رکنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

”آپ تو بہت ہی کمال کے آدمی نکلے صاحب! میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ یہاں اس وقت اس موسم میں شادی کرنے آئے ہیں۔ حد ہو گئی یہ تو میں نے تو اپنی ساری زندگی میں کبھی ایسی شادی نہیں دیکھی، یقین ہی نہیں آ رہا ہے سچ مانے گا۔“

ٹیکسی ڈرائیور کی زبان پھر چل پڑی تھی اور اتنی دیر میں جتنا وہ حیرت زدہ ہو چکا تھا اب اتنا بولنا اس کا حق بنتا تھا۔
”زندگی میں بہت کچھ ہم پہلی بار ہی دیکھتے اور سنتے ہیں بھائی! اس لیے اب اگلی بار جب تم ایسی کوئی شادی دیکھو گے تو بالکل بھی حیرت نہیں ہوگی، بلکہ کہو گے کہ ارے یہ کون سی خاص بات ہے، ہم تو پہلے بھی دیکھ چکے ہیں!“

”ہاں یہ تو ہے!“ وہ سالار کے جواب سے فوراً ہی متفق بھی ہوا۔ ”ویسے لوگ بہت مہمان نواز تھے، مجھے بھی اصرار کر کے کھانا کھلایا اور بڑی مدت بعد اتنا لذیذ کھانا کھایا کہ مزا آگیا میں نے تو ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے کہ اپنے بیٹے کی شادی بھی بس اسی طرح کروں گا کوئی جھنجھٹ کوئی ہڑبونگ نہیں اور براتی بس اس ٹیکسی کی سواریوں سے زیادہ نہیں۔“ آج ہی یہ فیصلہ گھروالوں کو سنا دوں گا جسے اعتراض ہو، ہوتا رہے۔

اس تازہ ترین واقعہ سے وہ سخت متاثر تھا اور ایک انٹرمینٹ تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔
سالار نے ایک ٹھنڈی سائس لے کر قریب بیٹھی کیتی کی طرف دیکھا، دوپٹہ کچھ اس طرح تھا کہ چہرے کی بس ایک جھلک ہی دکھائی پڑتی تھی، سو وہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے سے قاصر تھا۔

ٹیکسی والا ابھی تک اپنے بیٹے کی شادی کے ٹھکرے میں الجھا ہوا تھا۔
”ہمارا تو مذہب بھی سادگی اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ بس جی بس ابتدا آپ نے کی آگے میں لے کر جاؤں گا، میرا بیٹا۔۔۔“

”کیا عمر ہے آپ کے بیٹے کی؟“ سالار کو ٹوکنا پڑا۔

”اس کی۔۔۔ جی سات سال اور ساڑھے چار ماہ!“

”کیا!“ سالار کا منہ حیرت سے کھلا تھا۔

تب ہی اس کے کانوں میں دبی دبی سی ہنسی گونجی تھی۔ ایک ہاتھ سے ہنسی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بڑے ہی بے ساختہ انداز میں ہنس رہی تھی۔

باہر دھواں دار برستے پانی کے پس منظر میں اس پرانی ٹیکسی میں کتنے ہی رنگ اترے۔ وہ بڑے دھیان سے اسے دیکھے گیا۔

کیتی کو شاید اس کی خود پر جی نگاہ کا ہی احساس ہوا تھا جو اس نے جھینپ کر پھر سے سر جھکا لیا، لیکن وہ پھر بھی اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔

جو کچھ بھی ان چند گھنٹوں میں رونما ہوا، خود اس کے لیے بھی ناقابل یقین تھا ابھی جب وہ یہاں آ رہا تھا تمام تر پریشانی اور بے چینی کے باوجود وہ گمان میں، کہیں دور دور بھی ایسی صورت حال نہیں تھی جو کہ پیش آئی۔

وہ جو کچھ کہنے کا ارادہ ہی پاندھنے سے گھبرا اٹھا تھا آج سارے معاملے کو ہنگامی بنیادوں میں نمٹا گیا۔
سب کچھ جیسے خود بخود ہوتا چلا گیا تھا۔

”اگر وہ ذرا سا بھی لیٹ ہو جاتا تو؟“

گواہ سارے برے امکان ختم ہو چکے تھے پھر بھی۔

اس نے ہلکے سے سر کو جھٹک کر جیسے کچھ رد کیا۔

آگے بیٹھا راجو بڑے اعتماد سے گھر کا پتا سمجھا رہا تھا۔

سالار کو یاد آیا کہ وہ نیبل کے ساتھ یہاں آکر رہ چکا ہے۔ گیٹ پر کھڑے گاؤں نے احترام سے گیٹ کھولا تھا۔

شام مکمل طور پر ڈھل کر رات میں تبدیل ہو رہی تھی جب وہ نیلی کو لے کر گھر کے اندر آیا تھا۔

”یہاں کوئی بھی نہیں ہے جو تمہارا استقبال کر سکے“ ویسے تو میرا اپنا کوئی ہے بھی نہیں جو تمہیں اس محبت کے ساتھ خوش آمدید کہہ سکے گیٹی! جواب تمہارا حق بنتا ہے مگر مجبوری ہے امید ہے تم زیادہ محسوس نہیں کرو گی۔“

بڑے سے بڑے جب وہ ٹیک لگا کر بیٹھی تھی تب سالار نے پہلی تفصیلی بات کی۔

گیٹی نے جھکی جھکی نظر سے سالار کی طرف دیکھا۔

ایک ہلکی سی مسکراہٹ اب بھی اس کے چہرے پر تھی۔

مگر وہ تھوڑا سا داس بھی تھا۔

گیٹی کا دل اسے بہت ساری تسلی دینے کو شدت سے چاہا۔

مگر۔۔۔

دونوں کے بیچ خاموشی کا سکون بھرا سا وقفہ آیا۔

گلے شکوے خوشی تشکر اور اعصاب کو توڑتا ہے یقینی کا طویل دور۔

سب ہی کچھ آپس میں گڈمڈ ہوا جا رہا تھا اور وہ جو اس سے پتا نہیں کیا کیا کہنے کے لیے بے تاب تھی اب سخت کنفیوژن کا شکار۔

بات شروع بھی ہو تو کہاں سے؟

جب وہ اسے اس طرح چھوڑ گیا تھا کہ پیچھے پاٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا اس شدت بھرے گلے سے۔

یا پھر اس مہربان لمحے کے شکریہ سے جب وہ اس مہمانوں سے بھرے ہال میں اپنا فیصلہ سن رہا تھا اور وہ خود زندگی کی طرف واپس آئی تھی۔

اس نئی زندگی کا شکریہ تو واجب تھا۔

نگاہیں جھکائے دلہن کے خوب صورت روپ میں کسی سوچ میں گم اتنی گم کہ شاید اس کی یہاں موجودگی بھی بھولی ہوئی ہے۔

سالار نے گیٹی کے چہرے کو تکتے ہوئے کچھ ایسا ہی محسوس کیا اور بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا ہوا؟“ وہ بے ساختہ ہی اس کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”کچھ نہیں! وہ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں یہ تمہارا بیگ آیا ہے کپڑوں کا۔“ چنچ کر لیتا۔

وہ کہہ کر مڑنے لگا تھا کہ نگاہ بالکل سامنے ڈرینگ نیبل کے شیشے پر رکی۔

گیٹی کا حسین چہرہ اس کا پورا وجود کسی خوب صورت پینٹنگ کی مانند وہاں قید تھا اور اس کے ساتھ خود بھی سادہ سے کپڑے پہنے سانولی رنگت عام سے نقوش عام قد و قامت والا سالار احمد گیٹی آرا سے بالکل ہی مختلف۔

پچھلے دنوں ہونے والے حادثے کے بعد سے اب تک وہ سنبھلا نہیں تھا سو موت کو چھو کر پلٹا تھا جس کے اثرات چہرے اور وجود پر ابھی بھی باقی تھے۔

دونوں کی شخصیت کے بیچ آیا تضاد پہلے بھی اندر کہیں چھین پیدا کرتا تھا مگر آج تو کچھ زیادہ ہی۔ مگر وہ کیے دستبردار ہو سکتا ہے۔

سالار نے بمشکل ہی خود سے نگاہ چرائی۔

”ابھی آتا ہوں!“ اس بار وہ اس کا جواب سنے بغیر ہی باہر نکل گیا۔

وہ کچھ حیران سی ہوئی وہیں کھڑی رہ گئی۔

ساتھ آیا کپڑوں کا بیگ وہیں کسی نے صوفے پر لا کر رکھ دیا تھا۔

وہ چپ چاپ صوفے پر آ بیٹھی۔

یہ خاصا بڑا بیداروم تھا قیمتی سامان سے آراستہ مگر تاثر میں سادگی تھی اور اندر آتے ہوئے وہ دیکھ چکی تھی کہ یہ خاصا بڑا اور شان دار گھر تھا صندل کی کوٹھی سے بھی بڑا اور خوب صورت۔

اس نے نانی ستارہ کے چوہارے کے علاوہ ایک ہی گھروں دیکھا تھا اور اب یہ دوسرا۔

”واقعی ان ہی کا ہے یا پھر۔۔۔!“ دل میں اٹھتے خیال پر وہ فوراً ہی شرمندہ ہوئی۔

سالار کے لیے تو کچھ ایسا ایسا گمان بھی رکھنا سخت بے ادبی میں شمار تھا اب۔

ایک شرمیلی سی مسکراہٹ گیٹی کے لبوں پر آئی۔

دل پر چھایا اضطراب اب سکون میں بدل رہا تھا۔ زندگی میں اتنی اچانک آئی تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے جو وقفہ چاہیے تھا پورا ہوا۔

البتہ اس پر مہربان ہے سوا سے وہی عطا ہوا جس کی ہلکی سی امید بھی باقی نہیں رہی تھی اور جس کے قابل وہ تھی بھی نہیں!

ایک ایمان داری بھرا تجزیہ صرف اور صرف شکرگزاری کا اظہار تھا سوا اب وہ آگے جیسے بھی اور جس حال میں رکھے حرف شکایت زبان پر کسی صورت نہیں لانا تھا۔

وہ بڑی مگن سی خود سے عہد باندھ رہی تھی جب ہی سالار کی واپسی ہوئی۔

”ارے تم نے کپڑے چنچ نہیں کیے پریشانی ہو رہی ہو گی۔“

چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ سادہ سے لمبے میں کہتا ہوا خود راہٹ کر بیٹھا۔

”جی۔ بس جا ہی رہی تھی۔“

”ہوں۔۔۔ بارش بند ہو گئی ہے۔“

”جی!“

”آج تو کچھ زیادہ ہی پانی برس رہا ہے۔۔۔ ہے نا!“

اس نے تائید چاہی تھی سو گیٹی نے ہلکے سے سر ہلا دیا۔

”چائے کیسی پی پی ہے؟“

”اچھی ہے۔“

”ہوں۔“ اس کے پاس سوالوں کا ذخیرہ اتنا ہی مختصر تھا۔ ”اور بھلا یہ خود کوئی بات کیوں نہیں کرتی۔ شاید اپنی جلد بازی پر پچھتا رہی ہو۔“

گیٹی نے جھکی جھکی سی نگاہ سالار کی طرف اٹھائی۔

”بھلا اپنی نئی نوپلی دلہن سے کرنے کے لیے یہی باتیں رہ گئی ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ ابھی یہ حضرت اتنی جی داری کا مظاہرہ کر چکے ہیں جس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ مگر وہ اکیلا تو نہیں کہانی کا رخ موڑنے میں اس کا اپنا بھی تو برابر کا ہاتھ تھا۔“

قاضی صاحب کے پاس سے اٹھنا سب کے سامنے اقرار کر لینا وہ اندر ہی اندر شرم سے کٹی۔

”اب پتا نہیں یہ مجھے کتنی بے شرم لڑکی سمجھ رہے ہوں گے۔ سوچتے ہوں گے کہ ماحول کا اثر لیا ہے میں نے۔“ اندر کا کمپلیکس پرانا تھا۔

”اور کہیں اسی بات پر تو نہیں پچھتا رہی کہ خیام جیسے حسین لڑکے کے بعد مجھ جیسے معمولی شکل کے انسان کے ساتھ بندھ گئی ہے۔“

کمپلیکس یہ بھی پرانا ہی تھا۔

”مگر اب یہ خود ہی تو سب کے سامنے اقرار۔“

”مگر اب یہ خود ہی تو سب کے سامنے اقرار بھی۔“

دونوں نے ایک ہی احساس سے مورل سپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک ساتھ ہی ایک دوسرے کو دیکھا۔

”تم۔“

”اب۔“

”اچھا تم کو پہلے۔“

”واہ میں کیسے کہوں۔ لڑکیاں بولتی ہیں کیا ایسے موقعوں پر۔“ اس کی ناراضی اتنی بے ساختہ تھی کہ وہ ہنستا ہی چلا گیا۔

”میری بھی تو پہلی شادی ہے اور وہ بھی اتنی ہنگامی کہ تیاری کا تو موقع ہی نہیں ملا، ورنہ تمہاری تعریف میں کوئی نظم غزل نہ سہی کوئی دو چار شعر ہی یاد کر لیتا۔“

”کیوں اب کو تو فیض اور غالب زبانی یاد ہیں۔“ وہ معذرت قبول کرنے سے انکاری تھی۔

”اچھا پتا نہیں اس وقت کیسے بھول گیا۔“

ساتھ کو شہادت کی انگلی سے مسلتے ہوئے وہ شرارت سے مسکرایا۔

”چھوڑیں کیا فائدہ جب یاد کر کے سنایا جائے۔“

وہ تھوڑی سی دل شکستہ ہو کر اٹھنے لگی۔

تب ہی سالار نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھاما۔

یوں سجا چاند کہ جھلکا تیرے انداز کا رنگ

یوں فضا مہلکی کہ بدلا میرے ہمزاد کا رنگ

سایہ چشم میں حیراں رخ روشن کا جمال

سرخ لب میں پریشان تیری آواز کا رنگ

وہ اس کے بالکل قریب تھا۔

”کیا اب پوری ہی سنو گی؟“

سالار کے انداز میں بے ساختہ سی بے بسی تھی۔

گیتی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

سالار کی آنکھوں میں محبت کا وہی دل چھوٹا احساس جاگ رہا تھا جو اسے خاموشی سے اسیر کر گیا تھا۔

اس بار وہ ہنسی نہیں

شرمانی تھی۔



شہر میں آج اچانک ہی ہڑتال شہری۔

سڑکوں پر سے پبلک ٹرانسپورٹ دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح غائب ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ وہ تھا بھی گھر سے اور شہر کے دوسرے سرے پر اور ساتھ میں وفاداری سے ساتھ نبھاتی اس کی اپنی بدنصیبی۔

سو میلوں پیدل چل کر گھر پہنچا تھا۔

ساجد باہر ہی کھڑا مل گیا۔

”کہاں رہ گئے تھے آپ مارے فکر کے جان نکلی جا رہی تھی۔“ اس کی محبت سچی اور کھری تھی۔ ”پتا ہے اس پاس کا سارا علاقہ چھان کر آ رہا ہوں، موبائل بھی نہیں رکھتے اپنے پاس یہ اور بھی غلط بات ہے۔“

خیام کو دیکھتے ہی وہ بنار کے بولنا شروع ہوا۔

خیام تھکے تھکے سے انداز میں گھر کے ساتھ بنے چبوترے پر بیٹھا۔ ہمت بالکل ہی جواب دے چکی تھی۔

فوری طور پر تو ساجد کے شکایت نامے کے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں تھا۔

اس کے براؤن بالوں پر گرد کی تہ جم رہی تھی اور پرانی سو فٹھی میں سے جھانکتے ہوئے اس کے پیر بھی مٹی میں اتر رہے تھے۔

ساجد کو خود ہی خیال آگیا۔

”اب اندر چل کر آرام کریں پھر جلدی کھانا کھا کر سو جائیے گا۔ میں چھت پر بستر لگالیتا ہوں۔“

”بھوک تو بالکل نہیں ہے ساجد! تم کھا لو کھانا میں اوپر ہی چلا جاتا ہوں۔“

”تھوڑا سا آرام کریں تو بھوک بھی لگ جائے گی۔“ وہ اسے لیے اندر چلا آیا۔

بتول صحن میں ہی چبوترے پر بیٹھی تھی چوہے پر کچھ پک رہا تھا جس میں وہ بڑے اہتمام سے چچہ چلانے میں مصروف تھی۔

خیام کو آتا دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی اطمینان اترتا تھا۔

”شکر ہے جو ساتھ خیریت کے واپس آ گئے تم میرا تو مارے فکر کے دل پریشان تھا اوپر سے یہ ساجد اور بھی ہولا رہا تھا۔ کہاں چلے گئے خیام بھائی کہاں چلے گئے رٹ لگا رکھی تھی۔“

وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔

کوئی وقت تھا جب اس کی آمد و روانگی کے گھنٹے منٹ کیا سینڈ بھی گئے جاتے تھے اور فکر کرنے والوں کا کوئی لکھنا نہ تھا۔

مگر اب؟

” غسل خانے میں پانی بھرا ہے بالٹی میں جا کر نہالو تب تک میں چائے بناتی ہوں پھر تھوڑی دیر آرام کر کے کھانا کھا لیتا۔“ بتول کے لہجے میں اتنی محبت ہوتی تھی کہ وہ اسے کبھی کسی بھی بات کے لیے منع نہیں کر پاتا تھا۔ سو اس وقت بھی چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

اس کا بیگ برآمدے میں رکھی الماری کے اوپر پڑے سامان کے ڈھیر میں ہی پڑا تھا۔

خیام نے ہاتھ بڑھا کر اسی طے جلے سامان میں سے اپنا بیگ کھینچ کر نکالا تو فوراً ہی ایک عجیب سا احساس ہوا۔ بیگ کی زپ آدھی کھلی تھی۔

بالکل ایسے جیسے کسی نے جلدی میں بند کرنی چاہی اور ہونہ سکی۔



Chicken Cubes

Recipe Card

ردا آفتاب کی ڈبل تڑکا دال

تعداد

دال کی دال 1/2 پاؤ

پھنکی دال 1/2 پاؤ

بھار 1 عدد

لہار 6 عدد

1 چائے کا چمچ

1 چائے کا چمچ

2 چائے کے چمچے

2 چائے کے چمچے

4 کھانے کے چمچے

1 عدد

تڑکا بنانے کے اجزاء:

لہسن کے جوئے 6 عدد

کڑی پتے 6 عدد

ثابت گول مرچ 6 عدد

ہری مرچ 6 عدد

باریک کٹی اورک 1 ٹکڑا

ہرا دھنیا 1/2 گھنٹی

مکھن 100 گرام

1 چائے کا چمچ

زیرہ 1 عدد

دال دھو کر دال اور 1/2 پاؤ پھنکی دال کو ایک گھنٹے کے لئے بھگو دیں۔ اب پھنکی میں 4 کھانے کے چمچے گرم کر کے 1 عدد پیاز براؤن کریں۔ پھر اس میں 6 عدد لہار، 1 عدد کنور چکن کیوب، 2 چائے کے چمچے لہار، 1 چائے کا چمچ نمک، 1 چائے کا چمچ ہلدی اور 2 چائے کے چمچے اورک لہسن کا پیسٹ شامل کر کے دھال دیں۔

اب اس میں بھنگی ہوئی دالیں اور تین گلاس پانی ڈال کر بھکی آٹے پر آدھے گھنٹے پکھن دیں۔ دالیں گھنے کے بعد انہیں اگلی طرح گھوٹیں اور چھو لہا بند کر دیں۔ اب ایک بین میں 100 گرام مکھن کو گرم کر کے 1 چائے کا چمچ زیرہ، 1 عدد لہسن کے جوئے، 6 عدد کڑی پتے اور 6 عدد ثابت گول مرچ ڈال کر فرائی کریں اور تیار دال پر تڑکا لگائیں۔

Rida Aftab

(Rida Aftab)



عام کھانوں میں
چکن کا مزہ



تو کوئی تھا جو اس کے اس واحد سرمائے تک پہنچا تھا۔ خیام کے دل کی دھڑکن ایک دم ہی تیز تر ہوئی۔ کانٹے ہوئے ہاتھوں سے اپنے کپڑوں کے ڈھیر میں چھپی ان دو چوڑیوں کو ڈھونڈتے ہوئے وہ صبح سے اب تک کی جھیلی ہوئی تھکان یکسر بھولا تھا۔

رومال میں گرہ کی صورت باندھی ہوئی وہ دونوں چوڑیاں کہیں بھی نہیں تھیں۔ خیام نے سارے کپڑے فرش پر ڈھیر کیے، بیگ کو اٹھا کر جھاڑ لیا، مگر بے سود۔ ”کیا ہوا خیام بھائی؟“

ساجد دودھ لینے جا رہا تھا، دروازے سے واپس آکر اس کے قریب کھڑا تھا۔ ”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“ خیام کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا۔

چولہے کے پاس بیٹھی بتول نے کچھ حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہو گیا، کوئی سانپ، کیزا کھس گیا کیا کپڑوں میں۔“ خیام نے بے بسی سے بتول کی طرف دیکھا۔ ”کچھ کھو گیا ہے خیام بھائی؟“

ساجد نے بالکل درست اندازہ لگایا، اور اس بار وہ انکار بھی نہ کر سکا۔ ”اس میں سونے کی دو چوڑیاں تھیں ساجد! کسی کی امانت۔“ نیچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے ہوئے وہ کچھ یاد کر کے کمزور پڑا تھا۔ ”کیا سونے کی!“ ساجد کی آواز مارے حیرت کے اتنی بلند تھی کہ چوتھرے پر بیٹھی بتول بھی اتر کر نیچے کھڑی ہوئی۔

”سچ سونے کی؟“ بتول کے انداز میں دبا دبا سا جوش تھا۔ ”ارے دکھا تو دیتا مجھے۔ سچ کبھی ہاتھ میں لے کر نہیں دیکھیں اصلی سونے کی چوڑیاں۔“

دونوں ہاتھوں میں نقلی سونے کی چوڑیاں پہنے بتول کے پاس بڑی فطری سی حسرت تھی۔

ساجد نے جھنجھلا کر ماں کی طرف دیکھا۔ ”کمال کرتی ہو اماں! خیام بھائی نے کہا نہیں ابھی کہ امانت ہیں کسی کی۔ پھر کیسے وہ انہیں تمہیں دکھاتے؟“ اس نے خیام کے زرد پڑتے چہرے کو ہمدردی سے دیکھا۔ ”فکر مت کریں، میں وہ چوڑیاں کہیں سے بھی واپس لاؤں گا اور اگر نہ لاسکا تو آپ کو ان کی قیمت ادا کروں گا“ جن کی تھیں، انہیں دے دیجیے گا۔“

اس چھوٹے سے لڑکے کی خود اعتمادی غضب کی تھی۔ ”ویسے آپ کو اتنی قیمتی چیز گھر میں نہیں رکھنا چاہیے تھی یا کم از کم مجھے ہی بتا دیتے، بس کہیں حفاظت سے رکھوا دیتا۔“

”میں خود حفاظت نہیں کر سکا ساجد! ایک ہی تو قیمتی شے تھی میرے پاس، اسے بھی نہیں سنبھال سکا۔“ بچی آواز میں اس نے ساجد سے کہا تھا یا خود سے۔

ساجد کو تو لگا تھا جیسے وہ اب رونے ہی والا ہے۔

”شاید کچھ زیادہ قیمتی ہوں گی۔“ اسے اور بھی افسوس ہونے لگا۔ ”خیام بھائی بھی بے چارے سیدھے ہی ہیں۔ کیسے خاموش، سر جھکائے اپنے کام سے کام، سونے کی ویلیو کو اس کے کھونے کے بعد سمجھے ہیں، سونا ہو بھی تو کتنا مہنگا گیا ہے۔“ اس نے اپنے طور پر خیام کے دکھ کی گہرائی کو ناپا۔

مگر یہ قصہ اتنا سیدھا سادہ نہیں تھا۔ خیام کی حالت بہت رومی تھی۔ ”مجھے وہ چوڑیاں چاہئیں ساجد! اگر میں وہ واپس نہ کر سکا تو ساری عمر خود کو معاف نہیں کر سکوں گا، سارا سامان ہٹا کر دیکھتے ہیں الماری کے اوپر ابھی صبح تو میں نے کپڑے نکالے تھے، جب تک تو تھیں اس میں۔“ ساجد نے چونک کر بتول کی طرف دیکھا۔

”صبح سے گھر میں کون آیا ہے، تم گھر پر ہی تھیں نا، یا کہیں محلے میں جا کر بیٹھ گئی تھیں۔“ تفتیش بتول سے شروع ہوئی تھی۔

”میں تو گھر پر ہی تھی بیٹا! بس دروازے میں کھڑے ہو کر سبزی لی تھی، اب سعیدہ تو ہے نہیں جس کے پاس جا کر گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر آدمی دل ہلکا کر لے۔“ بتول کو اپنی دیرینہ دوست کی یاد بے موقع آئی تھی۔

”خالہ سعیدہ کو چھوڑو، چھو رہا ہوں میں، اس کا جواب دو۔“

ساجد جھنجھلایا، گھر میں اب اس کی حیثیت کمانے والے کی تھی۔

”کہہ تو رہی ہوں کوئی نہیں تھا گھر میں، بس تیرا ابا تھا۔ آج سارا دن بیٹھائی وی دیکھتا رہا، چھتیس بار چائے بنوائی، بالکل ہی فارغ ہو گیا ہے لگتا ہے اب تو کام سے۔“ ساجد کے ماتھے پر شکنیں ابھری۔ ”ابا!“

تب ہی محسن کا دروازہ کھول کر وہ اندر چلا آیا۔

”کیا ہو رہا ہے ادھر کوئی نیا تماشا لگایا ہے کیا تم لوگوں نے۔“ اس کی گرج دار آواز نے ان سب کو مڑنے پر مجبور کیا۔

”کیا ہوا ہے، ہاں اور یہ کیا گند پھیلا رکھا ہے یہاں۔“ اس نے خیام کے گرے ہوئے کپڑوں کو حقارت سے دیکھا۔

”خیام بھائی کی سونے کی چوڑیاں کھو گئی ہیں ابا! یہاں اس بیگ میں سے۔“ بنا وقت ضائع کیے ساجد نے اسے مازہ اطلاق دی۔

”کیا۔۔۔“ اس نے چونک کر ان لوگوں کی طرف دیکھا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

”مجھے تو پہلے ہی لگتا تھا کہ تجھ میں مردوں والی کوئی بات نہیں، کوئی غیرت، کوئی ویدہ نہیں، اب یہ چوڑیوں کا قصہ۔“ اپنی بات کہہ کر وہ پھر سے ہنسنے کی تیاری میں تھا کہ خیام ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”وہ چوڑیاں میرے پاس کسی کی امانت تھیں خالو! اگر آپ کو کچھ پتا ہے ان کے بارے میں تو بتا دیجئے۔“ اس کا ہوا سرخ ہو رہا تھا۔

”کیا مطلب ہے تیرا، میں کوئی تیرے سامان کی تلاش لیتا ہوں جو مجھے خبر ہوگی، اپنی چیز خود سنبھال کر رکھ۔ ہم کوئی تیرے باپ کے نوکر ہیں، گھر میں بھی رکھیں، کھانے کو بھی دیں اور تیرے سامان کی چوکیداری بھی کریں۔ واہ۔۔۔“

ایک ہاتھ سے اس نے خیام کو دھکیلنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اپنی جگہ بر جما کھڑا تھا۔

ساجد کسی غیر معمولی صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے آگے بڑھا تھا، مگر خیام نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

”خالو پلیز! میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں، مجھے جو چاہے کہہ لیں، لیکن وہ چوڑیاں۔۔۔“

”ارے بالکل ہوا ہے کیا، مجھے چور سمجھ رہا ہے، ایسا ہاتھ دوں گا کہ سب چوڑیاں دوڑیاں بھول جائے گا، دفع ہو، ہاں سے، نکل ابھی کہاں سے آیا ہے پتا نہیں۔“

اس کی زبان اتنی گندی تھی کہ خیام کی نگاہ خود بخود جھکنے لگی مگر ساجد اس کا بیٹھا تھا۔

”ایک لفظ مت کہنا! خیام بھائی کا زیور واپس کرو! ابھی لے کر چلو مجھے، اگر کہیں دے کر آگے ہو، ورنہ سمجھ لینا کہ میں بھی اب کیا کر سکتا ہوں۔“

بتول نے سم کر جان ہوتے بیٹے کی آنکھوں میں خون اترتے دیکھا۔

”اگر تو اس بد بخت کی خاطر میرے منہ کو آئے گا تو سمجھ لے اولاد نہیں ہے میری، معلوم نہیں کس کا خون۔“

ساجد کا باپ بے حیائی کی ہر حد کو پار کر رہا تھا۔ بتول کو لگا جیسے وہ زمین میں گڑتی ہی چلی جا رہی ہے، گالی گلوچ، الزامات کچھ بھی نیا نہیں تھا۔

مگر اس لڑکے کے سامنے جو اس کے بیٹے جیسا ہی تھا، اس نے سامنے کھڑے خیام کی طرف دیکھنا چاہا، مگر نگاہ نہیں اٹھ سکی۔

”نہیں دوں گا اب تو اگر میرے پاس بھی ہیں تو رکھ اس کینے کو اپنے گھر میں، میں جا رہا ہوں، یہ ہی باپ ہے تیرا، نکاح چڑھاوے انی ماں کا۔“

مزید ایک سیکنڈ کی بھی دیر کے خیام اس گھر سے نکلا تھا۔

تیز اور تیز، اور تیز، دام میں بائیں اس نے اپنے پیچھے ساجد کو پکارتے سنا۔

”خیام بھائی، خیام بھائی!“ مگر اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا، وہ بھول چکا تھا کہ آج وہ کتنا زیادہ چل چکا ہے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک قدم بھی اٹھانے کی ہمت کھو چکا تھا، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا۔

”خیام بھائی! اسم ہے آپ کو۔“

وہ اس کے پیچھے پہنچ چکا تھا اور بری طرح ہانپ رہا تھا۔

”اس طرح مت جائیں، نہیں جانے دوں گا میں آپ کو۔ وہ تو ہیں اتنے گندے آدمی کہ باپ کہتے ہوئے شرم آتی ہے، مگر کیا کریں مجبوری ہے میری بھی اماں کی بھی۔“

پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ اسے جس بات کے لیے منارہا تھا، خیام کے لیے قطعی ناقابل قبول ٹھہری تھی۔

”میری بھی مجبوری ہے ساجد، مجھے بھی شرم آرہی ہے، اتنی کہ ڈوب مرنے کو دل چاہ رہا ہے۔“ اس کی آواز بچی تھی اور دکھ سے بوجھل۔ ”اب ساری زندگی میں خالہ بتول کا سامنا نہیں کر سکتا، کبھی اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا انہیں، یہ میرا خود سے عہد ہے۔“

اس کے انداز میں قطعی فیصلے والا گہرا اثر تھا۔ ساجد گم صم سا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”مگر اس طرح اس وقت کہاں جائیں گے آپ؟ ابھی تو آپ کے کپڑے بھی وہیں پڑے ہیں اور وہ چوڑیاں۔“

چند لمحوں کے وقفے کے بعد وہ خیام کو کونٹیں کرنے کی دوسری کوشش میں مصروف ہوا۔

”ارے بھاڑ میں گئے کپڑے اور چوڑیاں۔ ان ہی کی وجہ سے اتنی گری ہوئی بات۔“ ذرا رک کر اس نے خود کو کمپوز کیا، اور میں کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہوں جو اس شہر میں کھو جاؤں گا، بہت بڑی غلطی کی تھی میں نے تمہارے گھر آکر۔“

”اور اب اس طرح اکیلے شہر میں نکل کر کوئی عقل مندی کر رہے ہیں کیا، حالات دیکھے ہیں شہر کے۔“

”مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرو ساجد، جاؤ پلینز واپس جاؤ۔“ وہ پھر سے تیز چلنا شروع ہو گیا، لیکن ساجد اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ مت چلیں میرے ساتھ۔“ اچانک ہی ساجد اس کے ساتھ متفق ہوا۔ ”مگر میں جہاں لے کر چل رہا ہوں وہاں ضرور چلیں پلینز۔“

”کیا۔“ اسے جیسے شاک سا لگا۔ ”تم کیوں سمجھ رہے ہو کہ ہر بار تم مجھ سے کچھ منوالو گے۔ مجھے کہیں نہیں جانا سمجھ

”مگر یہ لے جاؤں تو آپ کو پریشان نہیں کریں گے، اور انہیں تو آپ یہاں بھی رکھ سکتے ہیں، زری باجی کا پر اہلم ام احمد میں سلجھا لیں گے مل کر۔“

”سدا ہر جاؤ ساجد تم۔ ورنہ۔۔۔“ معاذ کی بات ادھوری رہ گئی۔

”میرا نام خیام ہے۔“ وہ دروازے کی چوکھٹ میں آکر کھڑا تھا۔

”میرا نام خیام ہے۔“ وہ دروازے کی چوکھٹ میں آکر کھڑا تھا۔

”م اور جاؤ خدا کے واسطے، میرا پیچھا چھوڑو تم۔“

”بس صرف ایک بار چلیں، آپ کا دل نہ چاہے تو مت رکھیے گا، مگر مل کر دیکھ لیں، صرف ایک بار خیام بھائی، آپ کو میری جان کی قسم۔“

”قسم صرف اللہ کی کھانا جائز ہے اور وہ بھی کوئی ایسی پسندیدہ بات نہیں ہے۔ سمجھے، بات بات پر قسم نہیں کھائی جاتی۔“

”چلیں، آئندہ نہیں کھاؤں گا، وعدہ مگر آپ بھی مان لیں تا میری بات یہاں سے تھوڑا سا ہی فاصلہ ہے۔“

”میں کسی کے بھی گھر میں نہیں رہوں گا، مجھے گھر اس نہیں آئے گا۔“

”وہ گھر نہیں ہے، میرا مطلب ہے کہ گھر جیسا نہیں ہے وہاں کوئی عورت نہیں ہے۔“

روانی میں وہ شاید سب سے قیمتی پتا شو کر گیا تھا۔ خیام چلتے چلتے رکا۔

”کوئی آفس ہے۔“

”آفس ہی سمجھ لیں، بلکہ صحیح کہہ رہے ہیں آفس ہی ہے، مگر ذرا چھوٹا اور وہاں کوئی رہتا بھی نہیں ہے، بس دن میں کھلتا ہے۔“ ساجد نے جلدی جلدی چھوٹی سی تفصیل دی۔ ”بس چلیں ابھی دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔“

”شاید کہیں گاڑیاں واپس مل سکیں۔“ اسے کچھ ایسا ہی لگا۔

ساجد امید بھری نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ملے سے اثبات میں سر ہلا کر وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔

☆ ☆ ☆

معاذ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا، کیا؟ ایک بار پھر۔

”نہیں ساجد! اب کوئی گنجائش نہیں، میں اس زری کو ہی رکھ کر اب تک بچھتا رہا ہوں اب کوئی دوسری نیکی ملے نہیں پاندھوں گا، سوری دیکھو ہاتھ جوڑ رہا ہوں تمہارے۔“ مسامحہ کھلا رہا جبر بند کر کے اس نے واقعی دونوں ہاتھ باندھے تھے۔

”ان میں اور زری باجی میں بہت فرق ہے معاذ بھائی، یہ بے چارے تو کسی کو بھی کچھ نہیں کہتے، بالکل اکیلے ہیں، کوئی بھی نہیں ہے ان کا تو۔“

ساجد نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کا ذرا بھی اثر نہیں لیا تھا، سوا اپنی ہی کہے گیا۔

”سنو زری کے معاملے میں بھی میں اسی غلط فہمی میں یار آگیا تھا۔ تم تھے تا اس کے معاملے میں مجھے ڈالنے والے اور وہ بھی اس وقت اتنی بے چاری اور بے ضرر لگی تھی کہ میں فوری طور پر اسے اپنے گھر لے گیا اور اب ہمت رہا ہوں اچھی طرح سارا گھر ناراض ہے مجھ سے۔ پتا ہے۔“

”زری باجی ایسی تو نہیں تھیں معاذ بھائی! وہ تو بے چاری سارا دن اپنی بھابھی سے ڈانٹ کھاتی تھیں۔“ ساجد نے ایک بار پھر بات کرتے ہوئے پیچھے کھلے دروازے کی طرف دیکھا، جہاں برآمدے میں وہ خیام کو بٹھا کر آیا تھا۔

”لے جاؤ ان بے چاری کو اپنے گھر، مہربانی ہوگی تمہاری۔“ پیچھے دونوں پے درپے ایسے واقعات ہوئے تھے کہ وہ سوچنے پر مجبور تھا۔

”مگر یہ لے جاؤں تو آپ کو پریشان نہیں کریں گے، اور انہیں تو آپ یہاں بھی رکھ سکتے ہیں، زری باجی کا پر اہلم ام احمد میں سلجھا لیں گے مل کر۔“

”سدا ہر جاؤ ساجد تم۔ ورنہ۔۔۔“ معاذ کی بات ادھوری رہ گئی۔

”میرا نام خیام ہے۔“ وہ دروازے کی چوکھٹ میں آکر کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

”ہوں اندر آؤ۔“ کچھ تھا جس نے معاذ کہہ لیں مجبور کیا تھا۔

گرمی کی شدت بڑھ رہی تھی اور ساتھ ہی مسائل بھی سلمان کا واپس آجانا بذات خود ایک بڑی ٹینشن تھی۔ اس میں اور بھی بڑھاوا اس کا بگڑا ہوا رویہ کر رہا تھا۔ ”خرے“ آرام طلبی اور ساری خد میں لینے کے باوجود جواباً ”حرف تشکر کے بجائے“ محض شکایتیں، شکایتیں اور شکایتیں۔

”زویہ کے ساتھ رہ کر وہ مکمل طور پر بگڑ چکا ہے۔“

جویا اور زویا کی مشترکہ رائے تھی اور اس بار آپا گل بھی مکمل طور پر متفق تھیں، وجہ زویا اور جویا کی طرف سے آیا کوئی نرم گوشہ نہیں تھا بلکہ سلمان کے ساتھ تیزی سے بڑھتا ہوا اختلاف رائے تھا۔

ہزاران کی آمد پر خود بخود ہی طبل جنگ بج اٹھا اور شاکرہ بیگم کی ساری کوششوں کے باوجود ان کے پرانے اور عزیز اذجان اتحادیوں میں غضب کا معرکہ چھڑتا۔

اور انجام کار آپا گل ”آئندہ قدم نہ رکھنے کی“ دھمکی کے ساتھ رخصت ہو جاتیں اور سلمان رات گئے تک موڈ خراب کے ہر ایک سے لڑے جاتا، زویا، جویا جیسے سے اپنے کمرے میں بند ہو جاتیں اور شاکرہ بیگم جب تک ہمت ہوتی سنتیں، پھر منہ لپیٹ کر اپنے بستر پر جا لیٹتیں۔

گھر پر عجیب سی نحوست طاری رہتی۔

”میری سب سے بڑی بے وقوفی یہاں آنا ہے، مجھے چاہیے تھا کہ کسی طرح بھی زویہ کو منا کر لوں صبح کر لیتا، یہاں تو میری زندگی جہنم بن کر رہ گئی ہے۔“

صبح جس وقت جویا نے اس کے سامنے چائے پر اٹھا رکھا وہ حسب معمول شکوہ کناں تھا۔

اظہار صاحب کی آج پشیمانی تھی، سو وہ بھی اپنی تپاری میں مصروف تھے۔ سلمان کی بات پر خاموشی نہ رہ سکے۔ ”تمہاری اور ہم سب کی سب سے بڑی بے وقوفی اس زویہ سے تمہاری شادی اور پھر اس پر پانی کی طرح پیر لانا تھی جسے سب آج بھگت رہے ہیں۔“ سلمان کے چہرے پر بڑی حقارت آمیز مسکراہٹ اتری۔

”آپ نے اتنا پیسہ دیکھا ہی کب ہے، جویا پانی کی طرح بہا یا جاسکتا تھا، وہ تو لوگ ہی اور ہوتے ہیں جو دس بیس لاکھ خرچ کر کے تو نگاہ بھی نہیں اٹھا کر دیکھتے، ہمارے ہاں تو ایک شور مچ کر رہ گیا ہے، ابھی تک اس شادی کو یاد کیا جا رہا ہے۔“

کوئی شک نہیں تھا کہ اب وہ گھر والوں کو خود سے بہت نچلے مقام پر دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔

اظہار صاحب جو ابھی ابھی ناشتے کے لیے آکر بیٹھے تھے، انہوں نے ہاتھ میں تمباکو پر اٹھے کا ٹکڑا واپس پلیٹ میں رکھا تھا۔

قریب بیٹھی شاکرہ چچی نے حالات میں آئی سنگینی کو فی الفور محسوس کیا تھا۔ ”آپ ناشتہ کریں، دیر ہو رہی ہے، کہاں بحث میں الجھ رہے ہیں۔“

مگر انہوں نے سنا ہی نہیں تھا۔ چند لمحے وہ چپ چاپ سلمان کے چہرے پر آئی طنز پر مسکراہٹ کو دیکھتے رہے۔

”اس شادی کو اس لیے یاد کیا جا رہا ہے کہ اسے میں اور میرا خاندان اب تک بھگت رہا ہے، اس عمر میں میں کورٹ پکھڑوں کے چکر لگا رہا ہوں اور تم بے غیرتوں کی طرح گھر میں پڑے روٹیاں توڑ رہے ہو، بڑی غلطی کی میں نے، جو تمہیں اس گھر میں واپس قدم رکھنے دیا۔“

جوش جذبات میں ان کی آواز اتنی اونچی ہوئی تھی کہ جویا کچن سے گھبرا کر نکلی اور کمرے کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

”کورٹ کے چکر آپ اپنی غلطیوں کی وجہ سے لگا رہے ہیں اور صرف مجھے الزام مت دیجئے، سارے گھر نے پیش کیے ہیں آپ کی بیوی بیٹیاں، کس طرح پیسہ اڑاتی تھیں۔ آپ ان سے کیوں نہیں حساب مانگتے۔ یہ بیٹھی اس سب سے بڑی قصور وار اور وہ جو سب کچھ سمیٹ کر لے گئیں۔ جویا کا جینز تک اٹھوا لیا انہوں نے، ان کا کھانا کھولے۔ میری شادی کو بھول جائیں گے۔“ وہ نہ ان کے غصے سے مرعوب ہوا تھا اور نہ ہی ان کے دیے ہوئے لہجوں سے شرمندہ۔

اور اس کی بات میں اتنی سچائی تو سہر حال تھی کہ شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب دونوں ہی کو ایک دوسرے سے آنکھ ملانا مشکل ہوا۔

”تم سب کے سب خود غرض اور کینے ہو، برباد کر کے رکھ دیا مجھے، سب کو نکال باہر کروں گا میں اپنے گھر سے، دفع ہو جاؤ۔“ شکل نہ دیکھوں کسی کی بھی۔“

”آپ نہیں نکال سکتے، بھول رہے ہیں۔ یہ آپ کا گھر نہیں کرائے کا ہے۔“ وہ بڑے اطمینان سے پرانے کے نوالے توڑ رہا تھا، اظہار صاحب نے ایک نظر سامنے لگی گھڑی پر ڈالی۔ وقت گزر رہا تھا۔

اپنے آگے سے ناشتے کی ٹرے سر کا کردہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جویا نے دیکھا، انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ ہی نہیں لیا تھا۔

”ابو! ناشتہ تو کر لیں!“

گودہ اس سے کم ہی بات کرتے تھے، مگر وہ کبے بغیر نہ رہ سکی۔

”کر لیا ناشتہ! جہاں تم جیسی نافرمان اولادیں مل رہی ہوں وہاں منحوس آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی، میری لگائی کی ساری خیر و برکت ختم کرنے کی ذمہ داری تم سب پر ہے، برابر کے شریک ہو سب!“

وہ اونچی آواز میں بول رہے تھے۔

”آقا ز سلمان کی شادی سے ہوا اور آخری کیل اس لڑکی کے انکار نے ٹھوٹھی۔ دفع ہو جاتی یہ شادی کر کے تو کچھ کون کا سانس شاید میں لے لیتا، مگر انہوں نے تو مل کر ٹھانی ہے کہ مجھے برباد کرنا ہے۔“

”اب بھی کوئی کسر رہ گئی ہے گویا ان کی بربادی میں!“ سلمان منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

خیر ہوئی جو اظہار صاحب کا سیل فون بج اٹھا، سو انہیں وقفہ دے کر باہر صحن میں نکلنا پڑا۔

اور یہاں کمرے میں چند لمحوں کے لیے بوجھل سی خاموشی چھائی۔

”ذہنی مریض ہو چکے ہیں اب یہ، اسی طرح دماغی دورے پڑتے رہے تو کہیں کسی کو یا خود اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا لیں، کسی ماہر نفسیات کو دکھانا چاہیے انہیں اب!“ سلمان نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے اطمینان بھرا ہوا جاری کیا۔

جویا کی آنکھوں میں ضبط کے باوجود آنسو آرہے تھے، رگڑ کر صاف کرتے ہوئے مڑنے لگی تھی کہ پیچھے سے امی کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

”خیر بات اتنی بھی غلط نہیں تمہارے ابو کی، اگر جویا کی شادی اعجاز سے ہو ہی گئی ہوتی تو شاید اس طرح کے حالات پیدا نہ ہوتے، ناشکرے بن کی سزا سب نے جھیلی ہے۔“

”ہو سکتا ہے!“ سلمان کو کوئی اعتراض نہیں تھا، سو اطمینان سے چائے پیے گیا۔

جویا نے اس بار مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

اس کے اور زویا کے مشترکہ کمرے میں اس وقت کوئی نہیں تھا، زویا کالج گئی ہوئی تھی۔ سو فی الوقت یگوتہ تنہائی

بھی غنیمت تھا۔

بندر پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے وہ کتنی ہی دیر بیٹھی رہی۔

کبھی عجیب بات بھی کہ یہاں اس کے علاوہ ہر ایک بالآخر بری الذمہ ہو جاتا تھا۔

وہ بھی جن کے دامن پر چیٹ نہیں بلکہ سارا دامن ہی داغ دار تھا اس کی ایک نافرمانی کے آگے سرخرو تھے۔ اور نافرمانی بھی کیا صرف ایک جائز حق کا استعمال! کسی کسی وقت تو اس پاس پھیلا اندھیرا اور بھی گھٹا ٹوپ ہوتا اور اس میں وہ تن تنہا کھڑی رہ جاتی۔

باہر دن چڑھنے لگا تھا۔

اور وہ سارے کام جو خاموشی سے معمول کے مطابق انجام پاتے رہتے تھے آج جوں کے توں پڑے دکھائی دینے لگے تو شاکرہ بیگم اور سلمان کو مجبوراً اسے یاد کرنا پڑا۔

”آج تو صبح سے بس ایک ہی کپ چائے ملی ہے“ آپ کی بیٹیوں کو تو کم ہی فرصت ملتی ہے خود ہی بنا دیجئے۔“ سلمان نے بڑا سامنے کھول کر جمائی لی۔ ”سخت سستی سوار ہو رہی ہے چائے پیوں تو پھر سوؤں گا ایک تو صبح ہی صبح ابونے موڈ آف کر کے رکھ دیا۔“

سامنے کھلنے والی دی پر نگاہ جماتے ہوئے وہ وہیں صوفے پر نیم دراز ہوا۔

”اور اب کچھ تو اچھا پکالیں صبح بھی چائے پرائے پر رُخا دیا۔“ شاکرہ بیگم کو اٹھنا پڑا ”بے چارہ بچہ ہر ایک ہی کی سنتا ہے کسی کو بھی اس کی بریادی کا احساس نہیں۔“ سلمان سے ان کے سارے گلے اس کی واپسی کے بعد مٹ چکے تھے اور زویا اور جویا کے لیے جو تھوڑا سا نرم گوشہ بننے لگا تھا اب اتنا بھی نرم نہیں رہا تھا۔

یکن میں سارا کام جوں کا توں تھا۔ سلمان کی فرمائش چائے ناشتے کے برتن دوپہر کے کھانے کی تیاری گھر کی صفائی انہیں ایک ساتھ کتنی ہی گھروں نے گھیرا۔

”جویا! اے جویا!“ بجائے کسی ایک کام کو بھی ہاتھ لگانے کے انہوں نے جویا کو پکارنا بہتر سمجھا۔

آج اس کا دروازہ فوری طور پر نہیں کھلا تھا۔ ”جویا! جویا!“ اس بار انہوں نے ساتھ ہی زور سے دستک بھی دی تھی۔ اسے چند منٹ شاید خود کو سنبھالنے میں لگے تھے۔

”سو گئی تھیں کیا؟ اور یہ کوئی وقت ہے کمرے میں بیٹھنے کا بھائی کب سے چائے کے لیے تڑپ رہا ہے رُل گیا غریب یہاں آکر ذرا تو خیال کر لیا کرو۔“

جویا کی سرخ ہوتی آنکھوں پر ذرا بھی دھیان دے بغیر وہ خفا ہوئے گئیں۔

سلمان اور آپاگل دونوں ہی کی محبت ان سے نا انصافی کرواتا تھی اور وہ اس کی عادی بھی تھی۔

مگر آج دل کچھ اور ہی انداز میں دکھاتا تھا۔

وہ بنا کچھ کمرے سے نکل کر یکن میں چلی آئی تو شاکرہ بیگم اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔

”برتن بعد میں دھونا پہلے سلمان کو چائے بنا دو اور ہاں۔۔۔ تمہاری یوشن کے کچھ پیسے ملے کل؟“

”جی دو ہزار ملے تھے بیگم میں پڑے ہیں۔“

”یہ بہت اچھا ہوا میں سوچ ہی رہی تھی کہ کچھ مرغی گوشت چاول منگوا لوں۔۔۔ بریانی پکا لینا بہت دن ہو گا کوئی اچھی چیز چکے ہوئے۔“

وہ کہتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف چلی گئیں اور چند لمحوں بعد واپس نکلتی ہوئی نظر آئیں۔

جویا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر چائے کا پانی چولے پر رکھا ڈبہ میں چائے کی تکی بھی قریب الختم تھی۔ سلمان جس طرح دن بھر میں دس بارہ کپ پینے کا عادی تھا وہ چائے چینی دودھ کے خرچ کا گراف ہر وقت بلند رکھتا تھا زویا گھر میں کئی بار اس بات کو لے کر خاصا جھگڑ چکی تھی مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں۔

شاکرہ بیگم کی آواز یکن میں سنائی دے رہی تھی وہ نیچے مالک مکان کے بیٹے کو پکار رہی تھیں جویا زار سے سامان لا کر دے سکتا تھا۔

چائے کا پانی پکتنے پکتنے اس نے دو چار برتن دھو ہی لیے اور جب چائے لے کر اندر کمرے میں آئی تو شاکرہ بیگم اور سلمان دونوں ہی خوشگوار موڈ میں تھے۔

”نیچے والوں کا لڑکا ابھی لا کر دے جائے گا سامان بس پھر فوراً ہی پکا لینا۔ اٹھا ہوا جو تمہارے پاس پیسے نکل آئے میں نے کچھ اور سامان بھی منگالیا ہے روز روز تو کسی سے کہنا بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔“

”کوئی کولڈ ڈرنک ضرور منگوا لیا کریں بڑی طلب ہوتی ہے اس موسم میں۔“

”منگوالی ہے میں نے بے فکر ہو۔“ وہ حلقہلا کر نپ دس۔

”واہ! دل خوش کر دیا آپ نے اب ذرا اچھی سی پکانا بریانی تمہیں سارا کباباڑا ہی کر دو۔“

چائے کا کھونٹ لیتے ہوئے سلمان نے ایک ہدایت ضروری سمجھی تب ہی سیر پھیوں پر بڑی مانوس سی ہلچل ہوئی۔

جویا نے اندر ہی اندر ایک گہری سانس لی۔

”جیونہ ہو کم ہے!“

”یہ بچے آگئیں وہ بھی بریانی کی خوشبو سو گھمتی۔“

سلمان نے طنزیہ نگاہوں سے شاکرہ امی کو دیکھا تو وہ بڑے لاڈ سے اول نہہ۔

کتنی ہوئی باہر نکل گئیں۔

آپاگل کے پیچھے ہی پڑوس کا لڑکا تھا۔

”یہ لیں جویا باجی! خالہ نے منگوا یا تھا!“

اس نے دو شاہر جویا کو پکڑائے اور یہ باقی پیسے ایک سو پینتیس روپے ”باقی حساب اس پرچے پر لکھا ہے۔“

آپاگل ساتھ ہی چلتی ہوئی صحن میں آئی تھیں۔

”آج تو بہت اہتمام ہو رہا ہے! اکبر کو بھی فون کر دینا۔ ہمیں کھانا کھالیں گے کتنے دن سے آپ لوگوں نے انہیں کھانے پر نہیں بلایا ہے!“

جویا کو ہدایت اور شاکرہ بیگم سے شکوہ کرتی ہوئی وہ اندر چلی گئیں۔

صحن میں اتری تیز دھوپ میں وہ اکیلی کھڑی تھی۔ منٹھی میں دے ایک سو پینتیس روپے اور سامان کے شاہر۔

اندر سے ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔

پتہ نہیں خیر سگالی کا مظاہرہ ہو رہا تھا یا محبت کا اس کا سننے کو بھی دل نہیں چاہا۔

بے حسی اور خود غرضی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور انسان اپنی فطرت سے کب ہٹا ہے؟ شاکرہ بیگم نے محض آج کی موت کا اہتمام نہیں کیا تھا اس کے علاوہ بھی گوشت قیمہ وغیرہ منگالیا تھا۔

سلمان کے حلق سے دال اور سبزی کا اترنا شکل ہوتا تھا سوا گلے چند دنوں کے لیے یہ پیشگی انتظام تھا۔

وہ جب تک فارغ ہوئی ان میں کسی نے بھی آکر نہیں جھانکا تھا اور جب وہ کپن سے نکل رہی تھی تب زویا کی آواز سے واپس ہوئی۔

”تم اب تک اپنے ٹیوشن سینٹر جانے کے لیے تیار نہیں ہوئیں۔“ اسے دیکھ کر وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔
پچھلے دو ماہ سے اس نے پچھلی گلی میں واقع ٹیوشن سینٹر میں پڑھانا شروع کر رکھا تھا، اور نہ تو اس کی دوست کی بڑی
ہن تھیں، تین سے چھ تک کی کلاسز تھیں فی الحال اور پانچ ہزار مقررہ۔

شاہد بیگم کو اچھا تو نہیں لگا تھا، مگر مصیبت ”خاموش تھیں۔“
”اور یہ کیا شاہی دسترخوان لگنے والا ہے۔ جو تم اب تک کچن میں کھڑی ہو۔“ اس نے ڈھکن ہٹا کر باری باری
ساری چیزیں چیک کر لیں اور ناراضی سے جو یا کی طرف دیکھا۔
”بس جاری ہوں، تم کپڑے وغیرہ بیچ کر کے ذرا کھانا لگا دینا۔“ اس نے نرمی سے محض اتنا ہی کہا مگر وہ حسب
عادت غصہ میں آچکی تھی۔

”وہ جو اندر بیٹھے ہیں سب اتنی تکلیف تو دے ہی سکتے ہیں تاخود کو کہ کھانا نکال لیں، تو نکال لیں گے، تم فکر
مت کرو۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے کی طرف چلی گئی۔
جو یا کو مجبوراً ”تیار ہونے کے لیے جانا پڑا“ محض آدھ گھنٹہ رہ گیا تھا، اس کی کلاس میں۔
”میں جاری ہوں امی! مجھے بہت دیر ہو گئی ہے!“ بھاگتے دوڑتے بیگ سنبھالتے، اس نے دروازے پر رک کر
شاہد بیگم کو اطلاع دی تو ان سب نے ہی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”کیا مطلب، کھانا کون لگائے گا یہاں!“

”مجھے بہت دیر ہو رہی ہے سلمان بھائی! اور سب کچھ تیار ہے کوئی بھی نکال لے گا، دو منٹ کا کام ہے۔“
”یہ لیں اور مصیبت اس سے تو انسان اپنے گھر سے ہی کھا کر آجاتا اب تو آپ کے ہاں آکر سکون کا سانس بھی
نہیں نصیب ہوتا ہے، کھانا پینا تو دور کی بات!“
آپا گل کاموڈ ایک دم ہی خراب ہونے لگا تھا۔

”سب کچھ تیار ہے آپا گل! میری کلاس نہ ہوتی تو میں۔۔۔“
”ارے تو کس نے کہا ہے کہ خواری کے لیے گھر سے نکل جاؤ، دو چار ہزار کی حیثیت ہی کیا ہے۔ ایک وقت
کے کھانے پر نکل جاتے ہیں اتنے پیسے تو صاف بات ہے امی! میں تو لڑکیوں کی نوکری کے حق میں ہی نہیں ہوں،
صرف سیرپائے کی نیت سے نکلتی ہیں، کام و ام کا تو بس بہانا ہے۔“
ان کا بیان اور لہجہ دونوں ہی بدلتی پر مشتمل تھا، جو یا کو بہت دن بعد بڑے زور کا غصہ آیا تھا مگر۔

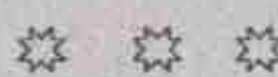
”میں جاری ہوں امی!“
آپا گل کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے وہ شاہد بیگم سے مخاطب ہوئی اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔
”دیکھا، دیکھا آپ نے، ذرا بھی عزت ہے میری اس کی نظر میں!“ آپا گل کی غصے میں ڈوبی آواز اس کے پیچھے
آئی تھی ”سارا غصہ اسی منحوس معاذ کے لیے ہے میں نے ہی تو سب سے زیادہ مخالفت کی تھی جب ہی سے دشمن
سمجھنے لگی ہے، بات بات میں ذلیل کرتی ہے اور۔۔۔!“

جو یا کے قدم ایک لمحے کے لیے تھمے اور پھر وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔
باہر گلی دھوپ سے بھری تھی۔

اس نے آہستگی سے انگلیاں اپنی آنکھوں پر پھیریں، آنکھوں میں اتنی ہی انگلیوں پر آئی تھی۔
”بیچھے وہاں کمرے میں آپا گل ابھی بھی جو منہ میں آیا، کہہ رہی ہوں گی۔“ اس نے سامنے راستے پر نگاہ جمائے
ہوئے سوچا۔

”کیسی عجیب بات ہے کہ وہ اسے قتل کر چکی ہیں اور پھر بھی الناد اوپلا ہی کرتی ہیں!“ دھوپ بھری گلی کو پار کرتے

ہوئے وہ سوچے گئی۔



معاذ نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی، تب ہی قریب میں ایک مائوس سی آہٹ
اُٹتی، سامنے زری کھڑی تھی۔

شوخی سے رنگ کا سوٹ پہنے، آنکھوں میں کاجل اور بھی شاید میک اپ۔
وہ میک اپ کی تفصیلات سے اتنا زیادہ آگاہ نہیں تھا، لیکن ایک ہی نظر میں وہ اسے بہت تیار تیار سی ضرور لگی
تھی۔

”کیا ہے؟“ معاذ نے اب اپنا رویہ اس کے ساتھ خاصا ریزرو کر لیا تھا۔ امی کو زری سے زیادہ اب اس سے
دکایت تھی، سو اس لیے ضروری تھا۔

”کچھ نہیں، بس آپ اکیلے بیٹھے تھے، مجھے اچھا نہیں لگا۔“ وہ بے تکلفی سے وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔
”اوپر بیٹھ جاؤ۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کہنا پڑا۔

”جی اچھا۔“ وہ خوش ہو کر فوراً ہی اس کے بالکل قریب والی کرسی پر بیٹھی، معاذ نے جھک کر اپنی کرسی ذرا پیچھے
کی۔

”چائے بنا کر لاؤں آپ کے لیے؟“
”نہیں، تمہیں کچھ کام تھا مجھ سے؟“ وہ اسے جلد سے جلد یہاں سے چلتا کرنا چاہ رہا تھا، کم از کم امی کے آنے
سے پہلے۔

”نہیں۔ میں تو آپ کو تسلی دینے کے لیے آئی تھی بہت ہی صدمہ لیا ہے آپ نے، مجھے لگتا ہے۔“ وہ ذرا اس
کی طرف جھک کر بیٹھی تو معاذ کو بتا چلا کہ وہ رادی کا مخصوص عطر بھی لگائے ہوئے ہے۔

”سیدھی طرح بیٹھو زری! اور مجھے کوئی صدمہ ددمہ نہیں ہے، کس نے کہا ہے تم سے؟“
اس لڑکی کے انداز اب ہوشیار رہنے پر مجبور کرتے تھے، سو وہ محتاط تھا۔

”سب ہی کو افسوس ہو رہا ہے، خاص طور پر آپ کی امی کو تو بڑا ہی صدمہ ہوا ہے، ان کے خیال میں آپ کے
رشتے کو انکار کر کے، ان لوگوں نے آپ کی بڑی ہی بے عزت کر دی ہے۔ آپ کو بھی برا تو لگا ہی ہو گا نا۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو	راحت جبین	قیمت: 225 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	قیمت: 500 روپے
☆ محبت بیاں نہیں	لعلی جدون	قیمت: 250 روپے

منکوانے کا پتہ: مکتبہ عثمان ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ایک ایک لفظ کو چبا کر ادا کرتے ہوئے وہ کیا جتنا چاہ رہی تھی۔

معاز نے ذرا غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔“ وہ کچھ شرما گئی۔

”کچھ نہیں اور تم یہاں کہاں بیٹھ گئی ہو، جاؤ دادی کے کمرے میں جا کر دیکھو، کہیں انہیں کوئی کام ہو۔“ وہ تھوڑا سا جھنجھلا ہی گیا۔

یہ لڑکی حد سے بڑھ رہی تھی اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا۔

”میں سارے کام کر چکی ہوں اور دادی تو ویسے بھی اب اپنا وظیفہ پڑھ رہی ہیں، ریبیجہ کلج گئی ہے اور آپ آج کتنے دن بعد گھر پر ہیں، آفس نہیں گئے۔“

”غلطی ہو گئی، جا رہا ہوں۔“ وہ چڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تو وہ اس طرح کھلکھلا کر ہنسی جیسے دونوں کے بیچ بہت ہی بے تکلفی کا رشتہ ہو۔

”آپ تو ناراض ہو گئے، ویسے ناراض ہو کر آپ۔۔۔“

”زری!“ معاز نے بہت سنجیدگی سے اس کی بات کاٹی۔

”خود کو سنبھالو، مجھے نہیں پتا کہ میں نے تمہیں یہاں رکھ کر اچھا کیا ہے یا غلط، لیکن اس وقت جب میں تمہیں لایا تھا، اس وقت میں نے صرف خدا خوفی میں تمہیں سہارا دیا تھا، وہ سب تمہیں دارالامان بھیج رہے تھے، میرے دل نے گوارا نہیں کیا، مگر اب مجھے لگتا ہے کہ میں نے کوئی بڑی غلطی کر لی ہے۔“

وہ اتنا سنجیدہ تھا کہ زری سے فوری طور پر تو کچھ بھی جواب نہیں بن رہا۔

”ہو سکے تو امی اور دادی کو شکایت کا موقع نہ دو، ورنہ میرے لیے مشکل کھڑی ہو سکتی ہے۔ اور تمہارے لیے بھی۔“

”مگر میں نے تو۔۔۔“ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی، مگر معاز باہر کی طرف کھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”معاز جی!“ اس نے اگلے احاطے کی سیڑھیوں پر اسے رکنے پر مجبور کیا۔ ”آپ غلط سمجھ رہے ہیں، ان لوگوں سے میں نے کچھ نہیں کہا تھا، انہوں نے جھوٹا میرا نام لگایا ہے جی، مجھے کیا پڑی تھی ان سے الٹی سیدھی بات کرنے کی۔“

اس کی گھبراہٹ خود اس کے خلاف گواہی دے رہی تھی، معاز نے بمشکل خود کو کمپوز کیا۔

”میرا کوئی انٹرسٹ نہیں تھا وہاں شادی میں، بلکہ میں فی الحال شادی کرنا ہی نہیں چاہتا، لیکن کسی بھی شریف گھرانے کو میری وجہ سے تکلیف پہنچے، یہ بھی میری برداشت سے باہر ہے، دھیان رکھنا۔“

اس نے بغیر زری کی طرف مڑ کر دیکھے اپنی بات پوری کی اور اپنی اس چھوٹی سی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ جواب اس کے استعمال میں بھی زری وہیں کھڑی تھی۔

معاز کے لیے کی سرد مہری اور اس سے بھی بڑھ کر یہ اطلاع کہ وہ اتنا بھی بے خبر اور بے ضرر نہیں ہے۔

گاڑی گیٹ سے نکل کر گلی اور پھر سڑک پر آرہی تھی، اس کا رخ اپنے چھوٹے سے اسکول کی طرف تھا، جہاں ایک اور نیکی اس کی منتظر تھی۔

”کہیں ایک بار پھر وہ کوئی حماقت بھری ہمدردی کے لیے تیار ہے؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

اگست کا مہینہ کیا آیا کہ جشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ پاکستان کے گلی کوچوں میں ہرے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ گاڑیوں پر ٹرکوں پر بچوں کے ہاتھوں میں، چھوٹے بڑے گھروں پر ان ہی جھنڈوں کا راج تھا۔ سڑکوں پر شور تھا ملی نغموں کا۔ آج بھی 14 اگست کو لوگ سب کچھ بھول کر صرف پاکستانی ہو جاتے ہیں اور پاکستان کے جھنڈے سے پیار کرنے لگتے ہیں۔ خدیجہ نے راستے میں جگہ جگہ لوگوں کو جھنڈیاں خریدتے دیکھا۔ بچے خاص طور پر والدین سے ضد کر کے جھنڈے خرید رہے تھے۔ رکشا اور گاڑیوں پر جھنڈے لہرا رہے تھے، کھوئی کھوئی سی نازک سی خدیجہ نے قلموں میں جگہ بننے ہی اپنا نام کرن رکھ لیا تھا۔ کرن نام ایسا مبارک ثابت ہوا کہ وہ خود بھی بھول گئی کہ اس کا اصلی نام کیا تھا۔

گھر میں آنے کے بعد دن بھر کی تھکن اتارنے کے لیے وہ اپنے آپ کو سگریٹ کے دھوئیں میں گم کر دینا چاہتی تھی۔ ہونایوں تھا کہ جیسے ہی کرن نے سگریٹ اور لائٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا، ملازمین میں کھلبلی مچ جاتی تھی، کیونکہ اگر پہلے ہی سگریٹ کے ساتھ بلیک کالی میز پر نہ آجائے تو میڈم کا پارہ چڑھ سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ ہی پاس

عزیز مقصود



”ہندوستان نے جشن آزادی کے موقع پر قیدیوں کا تبادلہ کیا تھا، اس کے تحت آج اٹھارہ پاکستانیوں کو رہا کر کے واپس بارڈر پر پہنچا دیا۔“

کیمرہ واہنگہ بارڈر پر چلا گیا۔ کرن کو دھوئیں میں

کمرے سیکریٹری نے کچن کے انچارج کو اشارہ کیا اور کافی کا مک حاضر ہو گیا۔ خدیجہ نے کالی کی طرف ہاتھ دھرایا اور بے دھیانی میں ہاتھ نیوی کے ریموٹ کی طرف گیا۔ ایک چینل دبا دیا۔ خبریں آرہی تھیں۔

ٹی وی کی تصویر گڈڈ ہی نظر آ رہی تھی۔

اس نے چینل بدلنے کے لیے ریموٹ اٹھایا۔ اسی وقت وہاں بارڈر پر بہت سے لوگوں کے درمیان ایک چہرہ نظر آیا۔ چہرہ واڑھی کے بالوں سے بھرا ہوا تھا، پھر بھی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ یہ بابا ہیں۔ کرن سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس کے منہ سے نکلا ”بابا“ دھواں کم ہو گیا۔ چہرے صاف نظر آنے لگے۔ بارڈر پر استقبال کرنے والوں نے سب کے گلے میں ہار ڈالے۔

بابا کا چہرہ پہچانا آسان تھا۔ اس پاس کھڑے خدمت گاروں نے کرن کے چہرے کے بدلنے ہوئے تاثرات دیکھے اور ڈر کر تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹ گئے۔ کافی کامک ویسے ہی پڑا رہا۔ سگریٹ کا ڈبہ بھرا رکھا رہ گیا۔ کرن کا جسم اسی کرسی پر تھا، لیکن اس کی روح کہیں اور تھی۔



کریم آباد کا دو کسروں کا چھوٹا سا گھر۔ بابا صدیق ٹیکسی چلاتے۔ ماں گھر میں محلے والوں کی سلائی کرتے بچیوں کو اسکول میں پڑھاتی تھی۔ چھوٹی بچی فریدہ پڑھائی میں ٹھیک تھی، مگر بڑی بچی خدیجہ کا دل پڑھائی میں لگتا ہی نہیں تھا۔ ان پڑھ ماں بابا ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ کبھی کیا سکتے ہیں؟ خدیجہ گھر کے کاموں پڑھائی اور ڈانٹ سے بچ کر کسی کونے میں چھپ کر ڈانٹ کرتی۔ چہرے پر رنگ لگاتی جیسے میک اپ گر رہی ہو۔ اوڑھن سے قدم اٹھاتی ہوئی چلتی۔ جو کچھ وہ ٹی وی پر دیکھتی تھی، اپنے انداز سے دہرائی رہتی۔ ایسے میں فریدہ ماں سے شکایت کر دیتی اور خدیجہ کو خوب ڈانٹ پڑتی۔ رات کو تھکا ہارا بابا آتا تو ماں شکایتوں کا پٹارہ کھول کر بیٹھ جاتی۔

”سمجھا لو اپنی لاڈلی کو، سارا وقت فلمی انداز دکھاتی ہے۔ ہم غریبوں کے گھر میں یہ کہاں پیدا ہو گئی ہے۔“ تھکا ہارا صدیق سر جھکائے روٹی کھاتا رہتا اور اس کے بعد چارپائی پر گر تاتا اپنا ہوش بھی نہ رہتا۔ ایک رات بابا واپس نہیں آیا۔ رات جاگ کر کاٹی

پھر کئی دن اور کئی راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں۔ کوئی خیر خبر نہ ملی۔ انتظار دم توڑ گیا۔ انتظار کی بجائے مغفرت کی دعا مانگی جانے لگی۔ مہینے گزرے، پھر سال گزرتے چلے گئے۔ فریدہ گھرداری میں ماہر تھی اور خدیجہ ہمیشہ کی طرح اپنے آپ میں گم تھی۔ محلے والے رشتہ دار

باتیں بناتے تھے بھلا ایک ماں باپ کی دو اولادیں اور ایک دوسرے سے اتنی مختلف؟ چھوٹی بہن کے رشتے آنے لگے اور شادی بھی ہو گئی۔ خدیجہ دوبار میٹرک میں ٹیل ہوئی تو ماں نے گھر بٹھا لیا۔ اب اس سے زیادہ کام نہیں ہوتا تھا۔ سارا دن آنکھیں پھوڑتی تھی تو دو چار کپڑے مکمل کر پاتی تھی اور خدیجہ آئینہ پکڑے کبھی کبھی لگاتی، کبھی گانے گاتی خدیجہ کا رشتہ تو کوئی نہ آیا، ایک پڑوس کا لڑکا شریار اور اس کا دوست ضرور آیا۔ ماں کپڑے پہچانے لگی تھی۔ شریار نے دروازے کی کنڈی کھڑکائی، خدیجہ بھاگی ہوئی گئی۔ شریار دروازے پر کھڑا تھا۔

شریار نے بہروز کے مختصر سے تعارف کے بعد بات چیت کی، ڈوری بہروز کے حوالے کر دی۔ بہروز نے ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں نئی نئی نوکری شروع کی تھی۔ جو میں مارنے کی دوائی کے لیے ایک چہرے کی ضرورت تھی۔ خدیجہ کے لیے ٹی وی فلم کا نام ہی کافی تھا۔ مزید کچھ سمجھنے یا جاننے کی ضرورت ہی نہ تھی اور ہاں کہہ دی۔ بہروز نے اسٹوڈیو کا پتا بتایا، آنے کا وقت بتایا اور دونوں لڑکے چلے گئے۔ قسمت نے اچانک نور دستک دی تھی۔ خدیجہ کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ آفر خود چل کر اس کے دروازے پر آئی ہے۔

اگلی صبح ماں سے جھوٹ بچ بول کر خدیجہ نکل گئی۔ دو بیس بدل کر خدیجہ ماڈرن اسٹوڈیو پہنچی۔ بہروز ہاں لان میں ہی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ خدیجہ کو تیزی سے دفتر کے اندر لے گیا۔ افتخار صاحب سے تعارف کروایا۔ خدیجہ کے لیے کپڑے، میک اپ سب مہیا تھے۔

خدیجہ ایک چابی بھرے ہوئے کھلونے کی طرح ہر گم ہانپتی تھی۔ سب ہی بہروز کو تعریفی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دو ڈھائی جملے بولتے بولتے شام ہو گئی۔ کسی نہ کسی طرح شاٹ اوکے ہوا۔ اس عرصہ میں نہ جانے کتنے لوگ اندر آئے۔ خدیجہ کو تعریفی نظروں سے دیکھا اور چلے گئے۔ خدیجہ کی نظر ایک بار میڈم عظیم آرا پر بھی پڑی۔ وہ اسٹوڈیو میں آئی تھیں۔ افتخار صاحب کے پاس کھڑے ہو کر کچھ باتیں کیں اور چلی گئیں۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ خدیجہ کو ہوش آیا تو رات ہو چکی تھی۔ اندھیرے میں وہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔

بہروز نے ہاتھ میں ایک لفافہ پکڑ لیا۔ خدیجہ نے کھولا تو ڈھائی ہزار روپے تھے۔ وہ حیران رہ گئی۔ کہاں ماں ایک مہینے میں ڈھائی ہزار نہیں کماسکتی تھی اور میں نے ایک دن میں؟

گھر پہنچی تو ماں پریشان بیٹھی تھی۔ خدیجہ نے ساری کہانی اسے سنادی۔ کل تین ہزار ملیں گے یہ بھی بتا دیا۔

سوسو کے پچیس نوٹوں کا جادو سرچڑھ کر بولا۔ اگلا دن سوسو کے تیس نوٹوں کا تھا۔

وقت کے ساتھ تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ بہروز نے تقریباً ”خدیجہ کی نوکری کر لی۔ ٹیکسی میں اس کو لینے آنا اور چھوڑنے آنا۔ خدیجہ کا چہرہ اب پہچانا جانے لگا تھا۔ راہ چلتا آدمی اس کو مڑ کر ضرور دیکھتا تھا۔ محلے کی عورتیں جو پہلے باتیں بناتی تھیں، اب رشتہ داروں کو ہاتھی تھیں کہ فلاں اشتہار والی لڑکی ہماری پڑوس کی بیٹی ہے۔ گھر میں نیانی وی، فریج، قالین، بہت سی تبدیلیاں آئیں اور پھر ایک بہت بڑی تبدیلی آئی۔ بہروز خدیجہ کے قریب آ گیا۔ اس نے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ خدیجہ کے ساتھ رہتا۔ سارا حساب کتاب اسی کے ہاتھ میں تھا۔ خدیجہ یوری طرح بہروز کے سحر میں گرفتار تھی۔ وہ تو چاہتی تھی بہروز سے شادی کر لے، لیکن بہروز نے سمجھایا، ماڈل اور ایکٹریس اگر جلدی شادی کر

لے تو مارکیٹ خراب ہو جاتی ہے۔ بہروز نے کوئٹہ کر کے ایک فلم میں خدیجہ کے لیے کام حاصل کر لیا۔ چھوٹا سا رول تھا لیکن فلم کا ہیرو وحید مراد تھے۔ خدیجہ تو خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔

وحید مراد کے خواب وہ سوتے جاگتے دیکھتی تھی۔ اب وحید مراد کے ساتھ کام کرے گی۔ پروڈیو سر نے اسے بلوایا۔ کپڑوں کے ناپ لیے گئے۔ میک اپ کے ٹرائل ہوئے اور انگریزی اردو کی ٹریننگ ہوئی۔

بہروز نے اسے مشورہ دیا کہ اب وہ فلم میں کام کرے گی، بڑے بڑے پروڈیو سراس محلے میں کیسے آئیں گے، اس لیے کسی اچھی جگہ فلیٹ لے لیتا چاہیے۔ ماں اپنا محلہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی، لیکن خدیجہ کہاں سننے والی تھی۔ بہروز نے کلفٹن میں فلیٹ کرائے پر لیا۔ فلیٹ کو سجایا سنوارا۔ ماں بیمار رہنے لگی تھی۔ خدیجہ کو اب اس کا بوجھ ناگوار تھا۔ اس نے فریدہ کو فون کر کے کہا، ماں کو اپنے ساتھ لے جائے، اس کے پاس وقت نہیں ہے۔ فریدہ آکر ماں کو لے گئی۔

شوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ جس دن وحید مراد کو آنا تھا، خدیجہ کی دھڑکنیں بے قابو تھیں۔ وہ صبح سے تیار ہو کر منتظر بیٹھی تھی۔ صبح گیارہ بجے سے کمرے تیار تھے۔ وحید مراد دو بجے پہنچے۔ اس نے خود آگے بڑھ کر وحید مراد سے اپنا تعارف کرایا۔ وحید مراد نے توجہ نہیں دی، لیکن پہلے سین کے بعد انہیں بھی احساس ہوا کہ یہ نیا چہرہ صرف چہرہ نہیں، نواکارہ ہے۔ شوٹنگ ختم ہوئی تو انہوں نے اس سے کہا۔

”آپ اپنا نام بدل دیجئے۔“ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح اسٹوڈیو میں گشت کر گئی اور اس رات خدیجہ کا نام ”کرن“ طے کر دیا گیا۔ کرن گھر پہنچی تو ایک خبر اس کی منتظر تھی۔ فریدہ نے فون کیا تھا کہ ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

کرن پہلی بار فریدہ کے گھر گئی۔ سب لوگ مرنے والے کا غم بھول کر اس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

خدیجہ کو ماں کے عم سے زیادہ یہ فکر تھی کہ لیس وہ لیٹ نہ ہو جائے۔ ماڈرن اسٹوڈیو میں سیٹ لگا ہے۔ اسے وحید جی سے پہلے پہنچنا چاہیے۔ وہ بمشکل آدھے گھنٹے بیٹھی پھر اٹھ کر آگئی۔

بہروز نے کلفٹن کافلیٹ خرید لیا۔ کس وقت خریدا؟ کس کے دستخط سے خریدا؟ کچھ پتا نہیں تھا۔ بینک میں رقم کب آتی ہے؟ کب نکالی جاتی ہے؟ چیک کون بھرتا ہے؟ یہ بھی پتا نہیں تھا۔ اتنے بڑے بڑے کام والے بھلا اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیسے دھیان دیں۔ بہروز ہر چیز پر قابض تھا۔ فلمیں تھیں کہ ایک کے بعد ایک چلی آتی تھیں۔ ہر فلمی پوسٹر پر کرن کی تصویر تھی اور اگر نہیں ہوتی تو لوگ فلم دیکھنے جانے سے پہلے سوچتے تھے۔

بایا کوئی وی میں دیکھ کر اس کو ماضی یاد آگیا تھا۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ فریدہ کو فون کروے مگر فریدہ کا فون خود ہی آگیا۔ سب ناراضی بھول کر بہت جوش اور جذبے سے تقریباً "جی رہی تھی۔"

"خدیجہ! تم نے بایا کو دیکھا؟"

کچھ سیکنڈ سوچ کر وہ رکھائی سے بولی۔

"مرے ہوئے لوگ نظر نہیں آتے ہیں۔"

فریدہ کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی لیکن خدیجہ نے مزید کچھ نہ بغیر فون بند کر دیا۔

دھڑا دھڑ فلمیں بن رہی تھیں۔ مقابلے کا زمانہ تھا۔ کرن چوٹی پر پہنچی ہوئی تھی۔ آگے جانے کا راستہ بند تھا۔ واپس اترنا پڑا۔ واپسی پڑھنے سے زیادہ تیز تھی۔ نوجوان لڑکیاں اپنی جگہ بنا چکی تھیں۔ پرانی ایکٹریس اپنا پیسہ بزنس میں لگا رہی تھیں۔ آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ اس کے ہاتھ تو پہلے دن کی طرح خالی ہیں۔ بہروز بھی بدلتا جا رہا تھا۔ کرن جب بھی روپیہ پیسہ کا ذکر کرتی، بہروز چلانا شروع کر دیتا۔ بڑی گاڑی پک گئی۔ وہ فلیٹ بیچ کر کسی سے علاقے میں فلیٹ لیتا چاہتی تھی۔ پتا چلا فلیٹ پر بہت قرضہ ہے اور اس کے

نام بھی نہیں ہے۔ ہر کاغذ پر بہروز کے علاوہ کرن کے دستخط تھے، پھر بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ بینک اکاؤنٹ کا پتا کیا، وہ بھی خالی تھا۔ کیونکہ اکاؤنٹ پر دستخط بہروز کے بھی تھے۔ واپسی کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی۔ خدیجہ نے آنکھیں بند کر کے بہروز پر اعتماد کیا تھا۔

ہر خبر پر سرپیٹ کر بیٹھ جاتی تھی۔ اونے اونے کلفٹن کافلیٹ بکا اور بہروز کے کہنے کے مطابق قرضہ ادا ہو گیا۔ کرن ایک سے علاقے میں کرایہ پر مکان یا فلیٹ ڈھونڈ رہی تھی۔ بہروز اس وقت بھی ساتھ تھا، لیکن ملازم یا سیکرٹری نہیں، بلکہ حاکم بنا ہوا تھا۔ کسی نے ایک اجڑی ہوئی ایکٹریس کو گھر دینے کی جرأت نہیں کی۔

وہ بھی 14 اگست تھی، جب سگریٹ کے دھوئیں میں کرن اپنی پہچان کھو بیٹھی تھی اور آج بھی 14 اگست تھی، جب کرن اندھیرے میں اپنی پہچان ڈھونڈ رہی تھی۔

بہروز کو بغیر بتائے کرن نے ٹیکسی پکڑی اور سڑکوں پر نکل گئی۔ شہر سجا ہوا تھا۔ قومی نغموں کا شور اور ہرے جھنڈے ہر طرف نظر آرہے تھے۔ ٹیکسی والا بار بار پتا معلوم کرتا، مگر کرن کو یاد نہیں آ رہا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد کرن کے منہ سے نکلا "کریم آباد اور ٹیکسی جب کریم آباد میں داخل ہوئی تو کرن کو سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگا۔ انڈیا سے قیدیوں کے تبادلہ میں چھوڑے گئے بایا کا چہرہ بھی بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ گھر کے سامنے سے ٹیکسی گزری۔

کرن چیخ پڑی۔ "روک، روک، روک، یہ میرا گھر ہے۔"

ٹیکسی والے نے بریک لگایا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کرن دوڑ کر اندر چلی گئی۔ بابا چارپائی پر بیٹھا تھا۔ فریدہ روٹی بنا رہی تھی۔ کرن کو دیکھ کر پہلے تو دونوں سکے میں آگئے، پھر آہستہ آہستہ خون نے جوش مارا۔ بادلوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار برسنے لگی اور اس سے زیادہ تینوں کے آنسو۔

☆



ٹوبہ جیجی



ہو جاتا۔ ایسے میں سب جیلہ آیا ہی تھیں جنہوں نے میرا پہاڑ سا وقت گزروایا۔ ایک تو وہ بات تو بہت تھیں۔ دوسرے وہ کھاتی بھی اسی رفتار سے تھیں۔

"ارے بیٹا! ذرا شربت تو پلا نا۔ پیاس لگوڑی ایسی لگتی ہے ادھر کولر کے کولر چڑھا جاؤ۔ پل بھر میں ہونٹ پھر سوکھ جاتے ہیں۔"

"ارے علیحدہ! یہ چٹکی کباب تو تو بڑے مزے کے بناتی ہے۔ میری بیٹی اور داماد آرہے ہیں ملتان سے ڈرا ترکیب بتا دینا۔ بلکہ تم خود ہی آ جانا۔ وقت بھی کٹ جائے گا اور میری مدد بھی ہو جائے گی۔"

سب جیلہ آیا ہمارے ساتھ والے فلیٹ میں رہتی تھیں۔ اب یہ نہیں معلوم کہ ان کے آنے کی وجہ سے اچھے فائدہ ہوا یا میرے آنے کی وجہ سے انہیں فائدہ ہوا۔ بات یہ تھی کہ جن دنوں اظہر "میرے شوہر" کا سفر اسلام آباد ہوا۔ ان دنوں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں، سو آس پاس کے تمام فلیٹ ویران تھے۔ ظاہر ہے چھٹیاں ہر کوئی میکے یا سسرال میں منانا پسند کرتا ہے۔ اظہر کو چونکہ چھٹیاں کرنا یا لینا پسند نہیں تھا۔ اس لیے میں یہاں پس رہی تھی۔ خود تو وہ آفس سدھار ہاتے اور میرا گھبرانے اور بور ہونے کا ٹائم شروع

انہیں شاید میری کمزوری ہاتھ لگ گئی تھی۔ سو وہ خوب فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ یا پھر میں ہی بے وقوف بن رہی تھی۔

رمضان کی آمد آمد تھی اور میں گھر کی صفائی ستھرائی میں صبح سے لگی ہوئی تھی۔ میری ہمیشہ ہی سے عادت تھی کہ رمضان سے پہلے جو ضروری کام بنانے ہوتے وہ کر لیتی ورنہ روزے میں مجھ سے کام وغیرہ نہیں ہوتا تھا اور ویسے بھی اچھا نہیں لگتا کہ آپ عبادت چھوڑ کر کاموں میں لگے رہیں۔ مجھے تو فی الحال کوئی مصروفیت بھی نہیں تھی۔

میری شادی کو چھ سات مہینے ہی ہوئے تھے۔ یونیورسٹی سے بھی چھٹیاں تھیں۔ جمعرات کو پہلا روزہ اور ہفتے کو 14 اگست۔ میں نے کیلنڈر دیکھا۔ اس کا مطلب ہے دو دن رہ گئے ہیں۔ آج تو پیر ہے۔

بچن دیکھا ضرورت کے برتن شلٹ پر دھلے ہوئے بڑے تھے۔ کچھ برتن سنک میں گندے اور باقی برتن ابھی پیکنگ سے کھولے ہی نہیں تھے۔ کمرے میں جالے کونوں کھدروں میں لٹک رہے تھے۔ ہاتھ دھو بھی ان سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ ایک طرف کسی نے شاید اضافی ٹونٹی لگوائی تھی۔ پتا نہیں اس کی کیا ضرورت تھی۔ جب پہلے سے ہی ایک نلکا اور شاہور موجود ہے تو بھلا اس کی کیا ضرورت ہے۔ شاید خاتون خانہ نے یہاں کپڑے دھونے کے لیے لگوائی ہوگی۔ میں آپ ہی آپ جھنجھلائے گئی۔ لا حول ولا قوۃ۔ اپنی سستی پہ لعنت بھیجی اور کام میں جُت گئی۔

سارے ٹرنک کھول دیے پردے چادریں صوفہ کور گدیاں پتا نہیں کیا کیا تھا۔ ابھی تک تو میں نے جینز کی ایک چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اور آدھا سامان تو ہم ساتھ لائے ہی نہیں۔ ان کا ٹرانسفر اتنی جلدی ہوا تھا کہ بس ضرورت کا سامان ہی لاسکے تھے۔ باقی سامان کو بعد میں پہنچنا تھا۔ سیلاب زدگان کی وجہ سے کسی کا ٹرانسفر بھی نہیں ہو رہا تھا۔ انہوں نے تو شادی سے پہلے کے پیپر سائن کیے ہوئے تھے۔ اور

باری اب آئی تھی۔ پہلے تو فی وی کا بھی تھوڑا سا سارا ہو جاتا تھا۔ لیکن اب تو جس چینل کو لگاؤ وہاں ڈیٹ لائن فلڈ وکٹم اینڈ ہیملپ لائن والے بیٹھے ہر کسی کا ایمان جگا رہے ہوتے۔ میرا تو دل بھی بقول اظہر بڑیا جتنا تھا۔ یہ سب سننا میرے لیے آسان نہ ہوتا تھا۔ اور فی وی تو ویسے بھی ابھی پیکنگ سے کھولا ہی نہیں تھا۔ آپ سوچ رہی ہوں گی جب کچھ بھی پیکنگ سے نہیں کھولا تو رہ کسے رہے ہوں گے تو اس کی وجہ میری انی سستی تھی۔ لیکن اٹنی بھی نہیں کہ کھانے بنے کا ہوش ہی نہ رہے۔ ابھی آئے ہوئے ہمیں دن ہی گنتے ہوئے تھے۔

کام کے لحاظ سے آگے پیچھے دنوں کو ترتیب دیتے ہوئے سارے گھر کی صفائی میں تقریباً کمری چلی گئی۔ لیکن ابھی کچھ کام باقی تھا کہ دروازہ کھینچنے کی آواز آئی۔ دوسری تیسری دستک بجلی گئی ہوئی تھی شاید اس لیے کسی نے دروازہ بجانے پہ اکتفا کر لیا، میچک آئی سے دیکھنے پر مجھلہ آپاکی جھلک دکھائی دی۔ وہ تو ویسے ہی بجلی ہو یا نہ ہو دروازہ ہی بجائی تھیں۔ میں نے دروازہ کھولا اور مسکراتے ہوئے ان کا خیر مقدم کیا۔

”اف میں تو مرے ہی گئی بیٹا! آئی گری پیسہ پیسہ ہو گئی۔ حالانکہ کل ہی تو بارش ہوئی تھی۔“

”کہاں سے آرہی ہیں آیا ہوا کیا ہے؟“ میری کم بختی کہ پوچھ لیا اور وہ شروع ہو چکی تھیں اور مجھے معلوم تھا۔ اب دو ڈھائی گھنٹے کہیں نہیں گئے اور ہوا بھی یہ ہی جو باقی کا کام تھا وہ ہیں انکارہ گیا۔ حالانکہ میرا مکمل ارادہ تھا کہ آج کام مکمل کر کے چھوڑتا ہے۔ بیچ میں میرا تو دل ہی اچاٹ ہو جاتا ہے۔ امی کے بقول تم بہت کام چور ہو۔

”کیا کریں بیٹا! یہ آج کل چور اچکے بھیک منگے بڑے ڈول رہے ہیں ان سے ہوشیار رہنا۔“ ان کی بات میں چونکئی ہوئی۔

”کیا مطلب آیا؟“ میں نا سمجھی سے بولی تھی۔

”ارے یہ یہی سیلاب زدگان کا امداد کے لیے یہ ہو

لوٹے اور لور پھر رہے ہیں۔ ان کو کبھی کچھ مت دینا“ علیہ ان کا سینٹھوں والا ہونا اور مانگ یہ فقیروں کی طرح رہے ہوتے ہیں۔“

”اچھا ابھی تک تو میرے گھر کوئی ایسا مانگنے والا نہیں آیا۔“ مجھے نیا خوف گھیرنے لگا۔ اگر کسی کو پتا چل گیا کہ میں گھر پہ اکیلی ہوتی ہوں تو کوئی پتا نہیں ہوتا۔ آج کل تو دن دہپاڑے کل ہو جاتے ہیں۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ پونے دو گھنٹے بعد خالہ واپس آئیں۔ میرا تو دل اب ویسے ہی نہیں کر رہا تھا (کام کرنے کو) اور وہ جو مجھے ڈرا گئی تھیں۔ برتن دھو کر کام مکمل کر کے جب میں واپس کمرے میں آئی تو شام کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ ساڑھے چار بج وقت دیکھا اظہر ابھی تک نہیں آئے۔ حالانکہ وہ تین بجے تک آجاتے تھے۔ دل میں عجیب وسوسے پیدا ہونے لگے۔ کھینچی کی زوردار آواز پہ میں اپنی جگہ اچھل کے رہ گئی۔

”خدا یا! کیا مصیبت ہے۔“ کسی دن ایسے ہی میں دنیا سے چل بسوں گی۔ غصے میں آئی میچک سے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور بیٹ سے دروازہ کھولا۔ اظہر کی مسکین سی صورت نظر آئی۔ شکر ہے جان میں جان آئی۔

”کہاں تھے آپ؟ پتا ہے میرا دل اتنا ڈر رہا تھا۔“ ان کے آتے ہی شکوہ جڑ دیا۔

دونوں ہاتھوں میں سامان سے بھرے ہوئے تھیلے ساڈ ٹیبل پہ رکھ کر وہ صوفے پہ پاؤں پیر کے لیٹ گئے۔

”تمہارا دل اپنی جگہ پہ ہوتا ہی کب ہے؟ سلام نہ دے، شکوے شروع ہو جاتے ہیں تمہارے اور یہ کیا ابروائی ہے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا دروازہ کھول دیا۔ لگ کے ہی کھڑی ہوئی تھیں کیا؟ پانی پلاؤ مجھے۔“ میرے شکوؤں کا جواب دیتے ہوئے میرے مجازی خدا نے اچھا خاصا جھڑک کے رکھ دیا۔

”تو ہاں نا! بندہ ایک فون تو کر سکتا ہے ادھر میں

پریشان ہو رہی ہوں اور یہ کیا ہے؟“ پانی کا گلاس پکڑاتے ہوئے نظر سامان والے تھیلوں پر پڑ گئی۔

”کل برسوں سے روزے شروع ہیں یہاں کوئی آثار ہی نہیں ہیں۔ کم از کم تم لسٹ ہی تیار کر سکتی تھیں کہ کیا کیا لانا ہے۔ مجھے ہی لانا پڑا ہے۔“

”اوہ۔“ میں نے شرمندگی سے ہونٹ سکڑے۔

”تو میں کون سا فارغ تھی۔ سارا گھر جھاڑا ہے آج تمہیں یہ تو نظر نہیں آیا۔“ ایک دوسرے کی غلطیوں کو پکڑنے میں ہم دونوں ہی ماہر تھے۔

”اوہ کیا ہے بھئی! چپ کرنا تھا ہوا ہوں میں۔“ بیویاں شوہروں کے آتے ہی ان کے آگے پیچھے پھرنے لگتی ہیں، کبھی سردباتی ہیں، تو کبھی پاؤں اور غم ہونہ۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے آنکھوں پہ بازو رکھ لیٹ رہے۔

اب انہیں غول سے دیکھا۔ اف بے چارے واقعی تھکے ہوئے ہیں۔ ماتھے پہ پسینہ بدستور تھا۔ آستینیں اوپر چڑھی ہوئی اور یہ کیا جوتوں سمیت ہی۔ میری اتنی

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



بساطِ دل

آمنہ ریاض

قیمت --- / 500 روپے

مکھانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

محنت کا ستیاناس، کچھ کہنے کے لیے کھولا، لیکن چپ رہی کہیں پھر کچھ نہ کہہ دیں۔ سامان لاکے کچن میں رکھا اور جلدی سے چائے بنا کے لے آئی تب تک وہ سو چکے تھے۔ الماری سے ان کے کپڑے نکالے۔ جگانے کے لیے آئی۔ اب اٹھاؤں کہ نہ اٹھاؤں۔ سر دبانی لگی۔

”اظہر! اٹھ جائیں نا، فریش ہو جائیں، دیکھیں آپ کے کپڑے بھی نکال دیے ہیں۔“

”اوں ہاں۔“ گھڑی پر ٹائم دیکھا اور جلدی سے کھڑے ہو گئے۔

”اب جوتے تو اتار لیں، یا یہ بھی میں اتاروں۔“ میں منمنائی۔

میری شکل دیکھ کر وہ ہنسنے لگے۔ ”مہربانی بڑی۔ اتار لوں گا۔ تم بس ایک کپ چائے ملا دو۔ یا وہ بھی میں ہی بنا لوں۔“ میرے ہی انداز سے کہتے ہوئے وہ جوتے اتارنے لگے۔

”لالی تو ہوں چائے۔“ نیبل سے چائے کا کپ اٹھا کے پکڑاتے ہوئے کہا۔

”زندگی میں پہلی مرتبہ بغیر گے کوئی کام کیا ہے تم نے۔“ شرارت سے کہا گیا۔

”اب ایسا بھی نہیں ہے جناب! ہم تو بہت کچھ کرتے ہیں، آپ ہی کو نظر نہیں آتا، جوتے الماری میں رکھے اور ہاتھ روم میں ان کپڑے اور تولیہ لٹکاتے ہوئے میں بھی جاری تھی۔“

”یہ تم کس چلے میں پھیر رہی ہو، ماسی بھنگن۔“ ”ہاں میں بھی جاری تھی، پہلے آپ چلے جائیں، سوپر صاحب۔“

میری بات پہ اظہر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور میری پونی ٹھپٹے ہوئے چلے گئے، میرے ہونٹوں پہ دھیمی سی مسکان سج گئی۔ مطلع صاف ہو گیا تھا۔ سو میرے دل میں بھی اطمینان کا موسم چھا گیا۔

چار روزے کیسے چٹکی بجاتے گزرے۔ پتا ہی

نہیں چلا۔ آج پانچواں روزہ تھا۔ کچن بکرا ہوا تھا، رات کو سحری بناتے اور پھر روزہ رکھنے کے بعد اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی کہ برتنوں کو سمیٹ لوں۔ دس بجے سونا دو بجے جاگنا اور چھ بجے تک جاگتے ہی رہنا۔ انہیں آفس بھیج کر ہی میں سوپاتی، دس بجے بمشکل اٹھتی، تیند ہی پوری نہیں ہو رہی تھی۔ اور اس سارے میں عبادت کہیں دور رہ گئی تھی۔ اظہر کو عبادت تھی، وہ ہر نماز کے بعد قرآن پاک کی تھوڑی سی تلاوت کرتے اور مجھے بھی بٹھا لیتے۔ سو آسانی ہو گئی، نہیں تو خود سے تو کبھی بیٹھا ہی نہیں جاتا، ہر شام کو وہ پوچھتے، کتنے سہارے ہو گئے، میں آدھے پر اڑی رہتی، وہ آدھے گھٹنے میں پورا سپارہ بھی پڑھ لیتے۔

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ کالم کہاں سے شروع کروں کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔

”بابی! سیلاب زدگان کے لیے امداد کی ضرورت ہے۔ پلیز آپ بھی کچھ مدد کریں۔“ ہوں سیٹھوں والا حلیہ، آپا سیجیلہ کی باتیں ذہن میں گونجنے لگیں۔

”کیسی مدد بھی؟“ ”کچھ بھی دے دیں، پیسے، کپڑے، اناج، جو آپ کر سکیں۔“

”نہیں بھائی! ہم نے تو دے دیا ہے، آپ لوگوں کا کیا بھروسہ۔ امداد والے بھی ہو یا نہیں۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی، سوری۔“

”دیکھیے بہن! یہاں لوگ جو چھٹانک بھر کی امداد کر رہے ہیں اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ ہم تو ان لوگوں کے لیے کر رہے ہیں جنہیں اس مشکل گھڑی میں ہماری ضرورت ہے جو بے سائبان ہو گئے ہیں، آپ کی بھلائی بھی ہوگی، ثواب ملے گا اور ان غریبوں کو بھی کچھ مدد ملے گی، آپ کو دعا دیں گے۔ آپ نہیں دینا چاہتیں بہن آپ کی مرضی۔ لیکن یوں الزام تو مت لگائیے؟“ اتنا کہہ کہ وہ حضرت دائیں طرف والے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ میں ہونق بنی کھڑی دیکھتی رہی۔

کچھ دیر بعد جب گیلری میں کپڑے سکھانے کے

لیے میں باہر آئی نیچے کافی بڑی گاڑی، ٹرک ٹائپ ویگن کھڑی تھی۔ وہاں کھڑے کھڑے اندازہ کیا۔ تقریباً سب ہی لوگوں نے انہیں امدادی تھی۔ ایک میرے گھر کے سوا، وہ کسی کے گھر سے خالی نہ لوٹے ہوں گے۔

”اف خدا یا! یہ میں نے کیا کیا؟ یہ اگر واقعی سیلاب زدگان والوں کی طرف سے ہوئے تو۔۔“ اب ایک نئی فکر نے آگھیرا

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اب کے کوئی عورت ایک تھیلا لیے کھڑی تھی۔

”بابی! امداد کر دیں، سیلاب زدگان کے لیے۔“

”اچھا میں لاتی ہوں، میں ابھی بچھتاوے کے زیر اثر تھی، سو اس کی پوری بات سننے کا انتظار بھی نہیں کیا، کلو آنا نکالا، اتنی ہی چینی اور دو سو روپے لاکے اس کے تھیلے میں ڈال دے۔“

دروازہ بند کر کے ابھی پلٹی ہی تھی کہ پھر دروازہ بجایا، کھولا تو آپا سیجیلہ سرایا انتظار تھیں۔

”آئی آئی! میں نے انہیں اندر بلا دیا۔“

”اف گری۔“ ان کا زلی تکیہ کلام تھا۔ گری گری کرتی وہ اندر آئیں اندر آتے تک یہ اپنے پسندیدہ مشغلے یعنی بے تکان بولنا شروع ہو چکی تھیں۔

”ارے علیحدہ! آج کیا بنا رہی ہو افطاری میں۔ اے ہاں تم نے دیکھا ابھی یہ امداد والے جو آئے تھے۔“ وہ پہلی بات چھوڑ کے اچانک کچھ یاد آنے پہ بولیں۔

”ہاں آئی!“ ”کیسے کم بخت، بے غیرت لوگ ہیں، ذرا جو شرم آتی ہو؟“

”کیوں؟ کیا مطلب؟“ میں اچنبھے میں پڑ گئی۔ ”یہ جو بندہ لور لور پھر رہا تھا، جانتی ہو کون تھا یہ؟ ارے اپنے قریشی صاحب کی دکان میں ملازم لگا ہوا ہے۔“

”اب یہ ان کے قریشی صاحب کون ہیں۔ یہاں تو سارے ہی ان کے اپنے ہیں، کوئی جو پرایا ہو۔“

”کون آیا!“ ان کے پسلیاں بکھوانے سے مجھے کوفت ہو رہی تھی۔

”اے تمہیں پتا۔ بڑے جنرل اسٹور کے مالک قریشی صاحب، بڑے چھترے بندے ہیں، ساری مارکیٹ میں ان سے مہنگا کوئی نہیں۔ میں نے تو ایک دھیلا نہیں دیا۔ تم نے تو کچھ دے دلا نہیں دیا اسے؟“

”نہیں آیا!“ (یہ ہی تو غلطی ہوئی) دل پشیمان تھا۔

”کیا پتا آیا! وہ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت یہ سب کر رہے ہوں۔ کتنے ہی لوگ ایسے کرتے ہیں۔“ مجھے ان کی باتوں سے منافقت کی بو آ رہی تھی۔ سو بالکل اتفاق نہیں کیا۔

”کہاں کی مدد کے تحت، لوٹنے کے سوہانے ہیں ان کے پاس، خوب فائدہ ہے ان کو تو ان غریبوں کو کچھ نہیں ملتا۔ یہ سب اپنے لیے لے جاتے ہیں۔“

”آپا جیسی حکومت ویسی عوام! اب کیا کر سکتے ہیں۔“ اب ان کی ہاں میں ہاں ملائی پڑی۔ ورنہ تو وہ پیچھے بڑ جاتی تھیں۔ یونہی ادھر ادھر کی باتوں میں کب وقت گنا پتا ہی نہیں چلا۔

آپا بھی چلی گئیں اور میں کچن میں آکر سوچنے لگی کہ آج کیا بنایا جائے۔ تمام گھرانوں کی طرح یہاں میرے لیے بھی یہ مسئلہ ہوتا تھا کہ کیا کایا جائے۔

میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کھٹنی بج اٹھی۔ ”اوہو اب کون ہے۔“ پریشانی میں یہ بھی بھول گئی تھی کہ اظہر کے آنے کا وقت ہے۔

خلاف توقع بڑی سنجیدہ سی شکل بنائے اندر داخل ہوئے اور کمرے میں سیدھے چلے گئے۔

”شاید روزہ زیادہ لگ رہا ہے۔“ مجھے ان سے ہمدردی ہونے لگی۔ حالانکہ روزہ تو مجھے بھی لگ رہا تھا۔ لیکن وہ تو باہر سے آئے تھے نا!

سکنجین بنائے فریق میں رکھتے ہوئے مجھے کچھ یاد آیا۔ اظہر نے آج سلام نہیں کیا تھا۔ کیا بات ہے مجھے پھر پریشانی نے گھیر لیا۔

ہاتھ دھو کے کمرے میں آئی تو وہ چیخ کر کے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ جیسے انہیں انتظار

ہو کہ مجھے آتا ہے۔

”اظہر۔“ میں نے پکارا۔

”ہوں۔“ وہ جیسے کسی گہری سوچ سے نکلے۔
”ہاں۔“ تم نے آج امین صاحب سے بدتمیزی کی تھی؟

”ہیں۔ کون؟“ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں، قریشی صاحب نے مجھے فون کر کے بتایا، سچی بات ہے مجھے اتنی شرمندگی ہوئی کہ میں بتا نہیں سکتا اور اب ان کا سامنا کرنے کی بھی میرے اندر ہمت نہیں۔“

”اظہر! کیا کہہ رہے ہیں۔“

ارے قریشی صاحب! آیا بھی تو ان کا ذکر کر رہی تھیں۔ اب کیا کروں اظہر کو غصہ بہت آتا تھا۔ خدا کی پناہ۔ میرا تو رواں رواں کانپنے لگ جاتا تھا۔ خدا جانے کیا کچھ کہہ دس، کچھ بتا نہیں چلتا۔

”وہ امداد کے لیے چندہ مانگنے آئے تھے گھر؟“ جرح کی گئی۔

”ہاں وہ ایک آدمی آیا تو تھا۔“ میں منمنائی۔

”جاہل عورت۔“ ان کا چہرہ غیض و غضب سے سرخ ہو گیا۔

”مجھے کیا پتا تھا آپ نے کہا یہ غریبوں کے نام پر لوٹنے والے ہیں اس لیے میں نے۔“

”کون آیا؟“ انہوں نے میری بات کٹنی چہرے سے غصہ مترشح تھا۔

”سجیلہ آیا!“ میں نا سمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”جانتی ہو یہ عورت ایک نمبر کی فراڈ ہے۔ قریشی صاحب سے اپنی بیٹی کی شادی کرانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ

نہیں مانے تب سے تمہاری یہ آپاں کی جان کی دشمن بنی ہوئی ہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ قریشی صاحب اخلاق کے اتنے اچھے ہیں کہ کوئی ان لوگوں کی باتوں میں آتا نہیں

ہے اور یہ تم جیسوں کو بے وقوف بناتی ہیں، خود اس نے تین چار عورتوں کا گروپ بنایا ہوا ہے، لوٹ رہی ہے دونوں ہاتھوں سے۔“ کہتے ساتھ ہی اظہر نے

نظریں پھیر لیں۔

”آپ کو کس نے بتایا یہ سب؟“ یک دم مجھے یاد آیا۔ صبح ایک عورت کو امداد دی تو تھی کہیں وہ امدادی گاڑ۔

”سارا احمق جانتا ہے ایک تم ہی احمق رہ گئیں۔“

”تو آپ مجھے بتا دیتے۔ اور ان صاحب نے بھی نہیں بتایا کہ وہ کون ہیں اور مجھے کیا پتا کہ یہ قریشی صاحب کون ہیں؟“

”اللہ کی بندی! پرسوں ہی تو بتایا تھا تمہیں، عقل گھاس چر گئی ہے تمہاری، کچھ خود ہی عقل استعمال کر لیتا ہے بندہ۔ مدد نہیں کرنا تھی نہ کرتیں اتنی بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”سوری اظہر! مجھے نہیں پتا تھا۔“ مجھے پچھتاوا گھیرنے لگا۔ واقعی مجھے یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔ لیکن جو کہا تھا وہ واپس تو نہیں ہو سکتا تھا نا۔

اظہر عصر کی نماز پڑھنے جا چکے تھے۔ اور میں مرجھائی کھلی بنی کام پٹائی رہی۔

روزہ کھلا، افطاری بھی اظہر نے چکھنے کی حد تک کھائی اور نماز پڑھنے چلے گئے۔

”یا اللہ! مجھے معاف کر دے میں کیا کروں اب آپ کے مناؤں اظہر کو؟“ میں نے قصداً تو نہیں کیا۔ مجھ سے غلطی ہی ہوئی ہے، نماز پڑھنے کے بعد میں زار و قطار روئے لگی۔

وہ شوق وہ جذبہ ہی جیسے ختم ہو گیا۔ آہستگی سے جائے نماز اٹھا کے تہہ کی اور اظہر کا انتظار کرنے لگی۔

آج اٹھارواں روزہ تھا اور اظہر کا روزہ بدستور قائم تھا۔ میں پریشان تھی کہ یہ گھٹا کب چھٹے گی۔ دل بہت بوجھل تھا۔ عشاء کی اذان کے بعد اب ساڑھے دس

ہونے کو تھے۔ اظہر ابھی تک گھر نہیں آئے تھے وہ روزیوں ہی کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو بارہ بج جاتے۔

سحری ہو یا افطاری بس چکھنے کی رسم پوری کرتے اور جانے کہاں نکل جاتے، لیکن آج تو ضبط کا یا راہی نہ رہا۔

”می! مجھے آپ کیسے آتا ہے۔“ کچھ دیر بعد میں فون کرتے ہوئے رو رہی تھی۔

”میری بچی! کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہے؟“ اظہر نے تو کچھ کہا نہیں، کہاں ہے وہ؟“ ایک ہی سانس میں انہوں نے کئی سوال کر ڈالے۔

”نہیں امی! یونہی۔ یہاں کوئی نہیں ہے اس پاس۔ دل اداس ہو رہا تھا اس لیے آپ کو فون کیا۔ آپ ایسا کریں عباس بھائی کو بھیج دیں وہ مجھے آکے لے جائیں اظہر بڑی ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، تم پریشان نہ ہونا۔ ہاں۔“ فون کر کے بھی دل کو چین نہیں آیا۔

”یا اللہ! میں اپنی غلطی کا مداوا کیسے کروں؟“ ہاتھ مسلتے ہوئے مسلسل میری آنکھوں میں نمی آتی رہی۔

”ہاں۔“ ایک دم دماغ میں ایک ترکیب آگئی۔ کچھ دیر بعد میں ٹرنک کھولے کھڑی تھی۔

”بس آبی اتنی دن بعد عید ہے یا دونوں بعد۔“ چھوٹا عمار خوشی سے چمک رہا تھا۔ اور میری خوشی تو کوئی خوشی نہیں تھی، اظہر کو بغیر بتائے آگئی تھی اور اس دن سے ان کا فون بھی نہیں آیا تھا۔ البتہ امی کو وہ فون کرتے ہی رہتے تھے اور میں کیا ہوئی۔ آنکھوں کے سامنے دھواں سا چھانے لگا۔ یہاں آنے کے دو

دن بعد مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری ملی تھی۔ میں دنیا کے سب سے مقدس رشتے میں بندھنے والی تھی۔ یعنی ماں کا رتبہ، پتا نہیں وہ سنگ دل شخص، اسے کوئی خوشی بھی ہوئی ہوگی یا نہیں۔ اس کے بغیر میری ہر خوشی ادھوری تھی۔ اور میری سوچوں کا محور اب صبح و شام اظہر کی ذات ہی تھی۔ اور اسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔

”انتیسواں روزہ بھی آگیا، لیکن وہ نہ آیا۔“ جب دل کے ہاتھوں پریشان ہو گئی تو فون اٹھایا اور نمبر پیش کرنے لگی۔ اظہر کی گھبر آواز سننے ہی دل میں ہانپ سی مچی اور میں پھٹ پڑی۔

”اظہر! آپ کو واقعی کوئی پروا نہیں ہے میری مر رہی ہوں یا جی رہی ہوں؟ کیوں کر رہے ہیں میرے ساتھ ایسا، میری غلطی کی اتنی بڑی سزا تو مت دیں۔ مر جاؤں گی میں۔“

تیز تیز کہتے ہوئے میری سانس پھول گئی۔ کچھ دیر رابطہ رہا، پھر کٹ دیا گیا۔ میں شاکد رہ گئی۔ میرے خدا! موبائل فون ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کے بعد میں ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گئی۔

”علینہ! میری جان آنکھیں تو کھولو۔“ ایک مانوس سی آواز کانوں سے ٹکرائی اور میں نے پٹ سے آنکھیں وا کیں، بے تابی سے نظر دوڑائی یہ میری نظروں کا دھوکا تو نہیں۔

”یہ میں ہی ہوں یا زکیا ہو گیا ہے تمہیں اپنا خیال نہیں رکھا جاتا تم سے۔“ ان کی اپنائیت بھری ڈانٹ سے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

”اب میں آگیا ہوں نا تمہارے پاس یہ آنسو اب نہیں ہونے چاہئیں۔“

”کیوں آئے ہیں نہ آتے۔“ شکوہ لبوں سے پھسل ہی گیا آخر۔

”کیوں نہ آتا۔ میری جان نے بلایا، میں نہ آتا۔“ انہوں نے پیار سے میرے بال سنوارے، میری آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

”اتنی دیر اظہر!“

”سوری علینہ! تم بغیر بتائے یوں چلی گئیں، مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے تمہیں فون ہی نہیں کیا۔ لیکن جب تم نے فون کیا تو مجھے احساس ہو گیا کہ تمہاری ذرا سی غلطی کی اتنی طویل سزا دینے کا مجھے واقعی کوئی حق نہیں تھا۔ اب روؤ نہیں پکیز، ہنسوا لے۔“ انہوں نے دانت نکالے۔

ادب میں بے ساختہ کھلکھلائی۔ اظہر نے محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ان کی محبت کی پھوار میں میں بھگ بھگ گئی۔

☆

حسرت کی زندگی کا

تھا کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
شاہ میر! آپ نے آج پھر میرے استری کیے ہوئے
کپڑے پہن لیے؟

دائیم جتنی تیزی سے باہر آیا تھا، شاہ میر کوئی وی کے
سامنے ہی ہونا چاہیے تھا، مگر وہ اس کی چیخ سن کر ہی
منظر سے غائب تھے، لیکن آج دائیم کا پورا ارادہ تھا کہ وہ
شاہ میر سے زبردست جھگڑا کرے گا، نئی وجہ تھی کہ وہ
اسی چیلے میں بیڑھیاں اترا تھا مگر کھانے کے کمرے
میں سب کو بیٹھا دیکھ کر دائیم نے ایک نظر خود پر ڈالی بغیر
شرٹ کے ہاف پینٹ اور بنیان میں کھڑا وہ عجوبہ ہی لگتا

اُس کی ابھی ابھی آنکھ کھلی تھی اور کمرے میں ہلکی
آواز میں چلتا ہی وی اس بات کی علامت تھا کہ شاہ میر
جاگ گئے ہیں۔

دائیم نے میوزک پر سر دھنتے ہوئے ہلکی سی انگڑائی
کے بعد پورے بدن کو تالاؤں سے کرطویل انگڑائی لی اور
اپنی طرف کمر کے کرسی پر بیٹھے ہی وی سے محظوظ
ہوتے شاہ میر کو دیکھا۔ 80 کی دہائی کا میوزک چل رہا
تھا اور میوزک سنتے وقت وہ مداخلت پسند نہیں کرتے
تھے یہی وجہ تھی کہ وہ سوئی جاگی کیفیت میں اٹھا اور
واش روم کی طرف بڑھا۔ واش روم میں داخل ہوا ہی

نکال دیا

Scan & PDF
FIAZ AHMED
Friends Korner.com



اور داد کی لمبی فضیحت بھری تقریر شروع ہوتی وہ دانت پیتا ہوا واپس اپنے کمرے میں آیا اور اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

”آپ انسان ہیں یا بھوت ابھی آپ یہاں نہیں تھے۔“ وہ واقعی حق بجانب تھا حیرت دکھانے میں مگر شاہ میر کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اب اس کی الماری کھولے کھڑے تھے۔

”یہ پرفیوم ڈھائی سو والا ہے ناں میں لگا لوں؟“ ان کے چہرے کی معصومیت دائم کا غصہ کم نہ کر سکی۔

”یہ مہونے دیا ہے گفت ہے اور پورے ڈھائی ہزار کا ہے۔“

”آسہاں مگیت صاحبہ نے دیا ہے، لیکن یار! صرف ایک زیرو ہی تو کم لگایا تھا پلین اس غلطی کی اتنی بڑی سزا تو مت دے یار۔“ شاہ میر گلوں کی طرح بولے اور دائم کو ہنسی آگئی۔

”بس کر دیں، اتنا ڈرامہ نہ کیا کریں۔“ اب وہ مجبوراً اپنی ہی شرٹ پر اپنی مگیت کے دیے ہوئے پرفیوم سے شاہ میر کو خوشبو میں سارہا تھا۔

”بچی کی چوائس بہت اچھی ہے بس تھوڑی سی مار کھا گئی، جیون سا بھی کی چوائس میں۔“

”شاہ میر! کچھ خیال کریں وہ آپ کی کزن کی بیٹی ہے۔“

”تب ہی تو کلیجہ منہ کو آتا ہے یہ سوچ سوچ کر کہ مائیں اپنی بیٹیوں کے اچھے نصیب کی کیسی کیسی دعائیں نہیں مانگتیں۔“ وہ لمحہ بھر کو رُکے پھر رازدارانہ بولے۔

”وہ بلیک کف لنکس کہاں رکھے ہیں؟ رات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔“

”شاہ میر! آپ میرے ہاتھ سے قتل ہو جائیں گے۔ آپ کے پاس اپنا بھی کچھ ہے؟“

”ہاں ہے، میرے پاس ماں ہے، میرے پاس ہے؟“ وہ اداکاری کرنے پر اتر آئے اور دائم نے ان کی ٹون ہی میں کہا۔

”شکر ہے، آپ سے بہت اچھی ماں ہے میرے پاس۔“ اور شاہ میر نے آنکھیں نکال لیں۔

”قرب قیامت ہے، اپنی ماں کے چکر میں اپنی داد کو نکما کہہ رہا ہے نامعقول! اگر آج وہ نہ ہوتیں تو کیا اتنا اچھا باپ ملتا تجھے؟“

”شاہ میر! آپ بات کو غلط رنگ میں لے رہے ہیں۔“ مگر وہ اس جملے سے کچھ نہیں اور دائم کو الماری میں سے کف لنکس نکال کر ان کے سامنے رکھتے پڑے کیونکہ وہ اسے دھمکانی اسی لیے رہے تھے۔

”بہت خبیث ہیں آپ!“ غصے میں وہ انہیں توپ قسم کی بری زبان میں خبیث ہی کہتا تھا مگر ہمیشہ کی طرح ان پر آج بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ کمرے سے جانے لگے تھے جب دائم نے یکدم شاہ میر کو روک کے پوچھا۔

”آپ کو قسم ہے یہ بتا کر جائیں، جب میں بہت شدید غصے میں ہوتا ہوں تو آپ اک دم کمرے سے کہاں گم ہو جاتے ہیں؟“ وہ تھکے لگا کر غصے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے ”تمہارے غصے سے بچنے کے لیے میں شاہ زین بھیا کی ٹیرس پر کوہ جاتا ہوں۔“

”آپ کا داغ خراب ہے! اگر تو ازن خراب ہو جائے تو آپ کو پتا ہے آپ کا کیا حال ہو گا؟“ وہ سوچ کر ہی کانپ گیا تھا شاہ زین چاچو کے ٹیرس سے اس کا ٹیرس کوئی چار پانچ فٹ دور تھا درمیان میں صفائی ستھرائی کروانے کے لیے پیر رکھنے کے لیے شیڈ ساناٹا گیا تھا مگر یہ شیڈ اتنا چھوٹا تھا کہ عموماً استعمال نہیں ہوتا تھا اور ماہانہ صفائی کے لیے ملازمین باہر کی سیڑھیاں لگوا کر اسے صاف کرتے تھے۔

”اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو؟“

”تو مجھے پتا ہے، گھر میں کسی کو نے میں تبدیلی نہیں اترے گی۔ شاہ زمان بھیا تیرے پاس آکر نہیں آسوا پوچھ لو۔ شاہ جنید کے گھرانے کے مرد بھی نہیں روتے۔ ساری بھابھیاں سکون کا سانس لیں گی اور شاہ احمد بھیا وہ تو قسم سے روتے ہیں۔ دنیا گدھر سے اصر ہو جائے مجال ہے اس بندے کے اندر کوئی اتار چھا

پیدا ہو، میں جس دن مرا تب یہ بندہ ٹی وی اسکرین کی طرح بس دو منٹ کی خاموشی اختیار کرے گا اور اپنے کسی کام میں بڑی ہو جائے گا۔“

”تو ہے شاہ! اگر آپ کے خیالات ان تک پہنچ گئے ناں کسی دن تو خوب پانی پت کی جنگ چھڑ جائے گی۔“

”چھڑ جائے، میں کوئی ڈر تا ہوں۔ اللہ جانتا ہے اللہ کے بعد صرف اپنی ماں سے ڈر تا ہوں۔“

وہ صاف گوئی سے بولے اور نیچے چلے گئے تھے۔ دائم نے گہری سانس لے کر ہاتھ روم کا رخ کیا۔ نما دھو کر تیار ہوا کہ والٹ اٹھاتے ہوئے اس نے عادتاً رقم گنی اور پانچ سو روپے پھر کیائے۔

”یہ شاہ میر بھی۔“ وہ جلدیانا ہوا ناشتے کے کمرے میں آیا اور حیران رہ گیا، وہ کینڈل کیک لیے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

”بیٹی برتھ ڈے دائم۔!“ اسے حیرت ہوئی۔

”یہ تیرا ہے اپنی سالگرہ یاد نہیں تھی۔“

”آپ کو کیسے یاد رہا اور مہو کیوں بھول گئی؟“ وہ بے چاری کہاں بھولی تھی صبح فجر سے فون کیے جا رہی ہے مگر میں تمہیں سربراہ زین چاہتا تھا اس لیے تمہارا سیل فون آف کر دیا تھا وہ بے چاری تو کب سے کوششیں کر رہی ہوگی۔ ”وہ مزے سے کہہ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔“

”یہ آپ جیسا لونگ بندہ کب سے کیدو کا پھوپھا بن گیا؟“

”بس کبھی کبھی دل چاہتا ہے نا؟ ہم جس سے محبت کرتے ہیں، وہ صرف اکیلا ہمارے پاس ہو ہمارے ہاتھ ہو چوبیس سال میں یہ چھٹی برتھ ڈے ہے جو تم میرے ساتھ گزار رہے ہو۔“

”آپ اتنا حساس کیوں ہیں میرے لیے؟“ اس نے شاہ میر کو حیرت سے دیکھا وہ مسکرا کر بولے۔

”پتا نہیں بس مجھے تم شروع سے اپنے سے لگتے ہو۔ جب میں گھر آیا تو پوری زندگی میں تم میرے پہلے

دوست تھے۔ مجھ سے چار سال چھوٹے مگر میرے بہت اپنے۔ بڑے بھیا کی خاموش محبت، نیبھی لوجہ پروا کرنا یہ سب مجھے اچھا لگتا تھا پھر تپا نہیں بھابھی کو کیا ہوا، انہوں نے تمہارے بگڑ جانے کے ڈر سے تمہیں ہاسٹل میں شفٹ کروا دیا اور تم جانتے ہو، یہ اتنے سارے سال میرے لیے کتنے تکلیف دہ اور اکیلے تھے۔“

اور یہ سچ تھا۔ وہ پچھلے سال ہی سی ایس ایس مکمل کر کے گھر آیا تھا، پھر سول سروس کی ٹریننگ وغیرہ سے نمٹ کر تقریباً تین ماہ سے پوری طرح شاہ میر کے زیر کنٹرول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہ میر اس کے ساتھ کو انجوائے کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا چاہتے تھے۔

وہ شاہ میر کو سوچ کے زاویوں سے جھانک رہا تھا، جب انہوں نے چاکلیٹ کیک کا ایک ٹکڑا اس کے منہ میں رکھا اور خود بھی کھانے لگے۔ دائم نے اچانک پوچھا۔

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھرمالو انسائیکلو پیڈیا

کانیا ایڈیشن قیمت -/750 روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

کھانا کھانا

قیمت -/250 روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی -/800 روپے کا مفت آؤر سال فرمائیں۔

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32216361

”ایک مزے کا ہے مگر آپ اتنا تیار کیوں ہوئے ہیں شاہ میر؟“

”تمہاری برتھ ڈے کے لیے۔“ جواب پر وہ ہنسنے والا ہی تھا کہ ماما کھانے کے کمرے میں آگئیں اور شاہ میر کو تیز نظروں سے گھور کر بولیں۔

”تمہارے پاس اپنی بھی کوئی چیز ہے؟ سر سے پیر تک دائم سے مانگی ہوئی چیزوں سے سجے کھڑے ہو۔“

”ماما!۔۔۔ اس سے پہلے کہ دائم انہیں منع کر دیتا، شاہ میر ان کے قریب بڑھتے چلے گئے پھر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولے۔

”ہے ناں میرا اپنا بھی کچھ۔۔۔ یہ مسکراہٹ۔۔۔ یہ خالص میری ہے۔“ وہ بولے سے مسکرائے بھی تھے اور ماما کو اس مسکراہٹ پر ہنسنے لگ گئے۔

”میں سب سے کشتی ہوں کہ شاہ میر اب گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہا، مگر بتائیں امیں اور بابا کو کیا نظر آتا ہے تم میں اور بابی سب بھی تم سے کم ہر مائتاز کیوں کر رکھتے ہیں۔“

”شاید اس لیے کہ انہیں لگتا ہے میں مستقبل میں کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیتے والا ہوں یا دیکھو گا بھابھی! اگر میرا دل دکھائیں گی تو جب میں مشہور ہو جاؤں گا ناں تو آپ کو پہچانوں گا بھی نہیں۔“

وہ کچھ کہے بغیر چلی گئیں ایک ہفتے بعد کی بات تھی۔ سخت گرمی تھی دائم باہر لان میں بیڑھیوں پر بیٹھا تھا کہ وہ اس کے پاس چلے آئے۔

”چل ناں دائم! باہر کتنے مزے کا موسم ہو رہا ہے۔“

”کوئی نہیں ہو رہا مزے کا موسم۔ اتنا جس ہے۔“ اس نے گھور کے دیکھا اور شاہ میر ہنسنے لگے۔

”اچھا دیکھ! ابا جان کہتی ہیں، جب جس ہوتا ہے تو پنجاب میں بارش ضرور ہوتی ہے۔“ وہ اس انوکھی منطق پر ہنس پڑا۔

”ہاں پنجاب میں نا! کراچی میں نہیں۔ آپ کراچی کی شام میں بیٹھے ہوئے ہیں میری جان۔“ اس نے شرٹ کے اوپری بٹن کھولے ہوئے تھے جب کہ وہ

جینز پر کرتا پن کر بڑے تک سبک سے تیار کھڑے تھے۔

”کہاں جا رہے ہیں شاہ میر۔۔۔؟“ اس نے انہیں تیار دیکھ کر پوچھا۔

”بس کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں ٹائل ادب گیا ہے گھر سے چل نا! میرا بھائی نہیں؟“

”نہیں میں نہیں جا رہا مجھے اس گرمی میں صرف گھر میں رہنا پسند ہے۔“

اس نے صاف منع کر دیا اور وہ بوتھا بٹھا کر بیٹھ گئے۔ دائم کا خیال تھا وہ اب خود ہی چلے جائیں گے مگر دوسرے لمحے شاہ میر نے دائم کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا اور کھینچے ہوئے باہر لے گئے۔

”مجھے کیا لگتا ہے میں تیری جان آسانی سے چھوڑ دوں گا؟“

”مجھے کہیں نہیں جانا شاہ کے بچے۔“ وہ تنک کر بولا مگر وہ خاطر میں لائے بغیر اسے شانے لگے۔

”نیکو اس نہ کر۔ باقی لوگوں کی طرح رو بوش بن کر میرا جانا ہے کیا؟ انسان بن یا رہا جیتا جاگتا انسان۔ پھول پودوں خوشبو، چاند کی باتیں کرنے والا میری میری باتیں کرنے والا کسی کے آسوا صاف کرنے، کسی کی تسلی بننے والا عام سا انسان۔“

”مجھے عام انسان نہیں بننا شاہ! مجھے ایلٹ کلاس میں جینے کے ڈھنگ سکھائے گئے ہیں اور آپ ساٹھ ستر کی وہائی جیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

”باتیں کرنا بھی کبھی چپ رہنے سے بہتر ہوتا ہے۔“ شاہ میر سنجیدگی سے بولے۔

”آپ جیسے لوگوں کے لیے خلیل جبران کہتا ہے، باتوں لوگوں پر صرف گوئے ہی رشک کر سکتے ہیں۔“

دائم کے اس جملے پر شاہ میر کا قہقہہ گاڑی میں گونج کر رہ گیا تھا ”اوتے ہوئے پوائنٹ مارتا ہے بد تمیز شرم کر میں تیرا چاچا ہوں۔“

اس نے شاہ میر کو غور سے دیکھا۔ بے شک ہنسنے نہیں تھے مگر خوب ضرور تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں دراز تھیں۔ وہ اسے متاثر کر جاتے تھے۔ لوگوں کا

حال ہی عجب تھا۔

”مجھے بتا ہے میں آج بڑا خوب صورت لگ رہا ہوں، بلیک رنگ مجھ پر واقعی بہت سوٹ کرتا ہے۔“

اس نے بریک پر دیا وڈالا ان کے پیر دیکھے بھرے بھرے پاؤں اور اس پر ڈارک براؤن کو لہا پوری۔

”نئی ہیں پیرا کر بھاگتا ہے کیا؟“ شاہ میر مسکرا کر بولے۔ وہ جھینپ گیا۔ اتنے غور سے تو اس نے کبھی اپنی منگتر کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

”مجھے تیری صحبت خراب لگتی ہے۔“ وہ شرارت سے بولے۔

اب کی بار دائم ہنس پڑا تھا ”تو بہ شاہ میر! کہاں کی بات کہیں لے گئے۔ یہ میڈیکل ٹاپ فلموں نے تو رشتوں کا دھڑن تختہ ہی کر کے رکھ دیا ہے اب جہاں دوست بھی بیٹھے ہوں شوگ عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہیں انہیں۔“

”آہ یہ تو ہے پیر ہمیں کیا شوگ جو سوچیں مگر سچ تو یہی ہے نا کہ ہم جان ہیں تیری۔“ شاہ میر کا خاص ریشہ غلطی اشائل تھا تھیں اب کوئی فراموشی ہم گرانے والے تھے وہ اس پر۔

”مجھے کیا کرنا ہو گا جناب کے لیے؟“ اس نے شاہ میر کو غور سے دیکھا۔

”ہاں پانچ ہزار چاہئیں جان جگر!“

”پانچ ہزار کیوں۔۔۔ ابھی پچھلے ہفتے تو دادو اور پاپا نے الگ الگ دس دس ہزار دیے تھے آپ کو۔“

”یار! میرے ہاتھ میں چھید ہے پیسے رکھتے ہی نہیں ہوتا بھی روک لوں۔“

”بس یہی عادتیں ہیں جو گھر بھر کی عورتیں آپ سے نالاں ہیں۔ آپ کی وجہ سے ان کا بجٹ جو خراب ہو جاتا ہے۔“

”عورتیں نہ کہو، وہ سب تو جلا دیں اگر ان کا بس چلے تو ایک ہی پھونک مار کر مجھے خاکستر کر دیں۔“

”دیے کل دادو بھی یہی کہہ رہی تھیں اب آپ کیا کہتے ہیں۔“

ان کی مسکراہٹ میں حلاوت در آئی تھی۔ ”وہ وہ تو

جنتی عورت ہیں بلکہ جنت ہیں میرے لیے۔ اس لیے مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔ ان کی کسی بات سے مجھے اختلاف نہیں۔“

وہ ہنس پڑا۔ ”میں جھوٹ بول رہا تھا۔ دادو کبھی آپ کے لیے کوئی سخت کمٹ پاس کر ہی نہیں سکتیں۔“

”بابا بابا۔۔۔ ظاہر ہے ان کا لاڈلا بیٹا جو ہوں اتنا پیارا اتنا اسارٹ کہ بس۔“ وہ مصنوعی کالر اکڑانے لگے۔ دائم نے والٹ نکال لیا تھا مگر جو اضافی پانچ ہزار تھے وہ اس میں نہیں تھے۔

”چاچو! آپ جیب کترے کب سے بن گئے؟“

”ابے چل! میں کیوں بننے لگا جیب کتر۔ کسی اپنے کی جیب سے پیسے نکالنا جب کہ وہ خود بھی دینے پر آمادہ ہو جیب کتر اپن تھوڑا کماتا ہے یہ تو ہنرمندی ہے۔“

”پوچھ سکتا ہوں یہ ہنرمندی جناب نے سیکھی کہاں سے؟“ اس نے ابرو ترچھا کر کے پوچھا۔ وہ مسکرانے لگے۔

”ایک دوست تھا بہت برسوں سے پھڑا ہوا بازار میں اچانک ملا میری جیب تراشتے ہوئے میں نے کوٹ کے اندر سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ شرمندگی سے ہنسنے لگا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہنے لگا، وائف کے ساتھ ہوں۔ اس کی شاپنگ میں پیسے کم پڑ گئے ہیں اس لیے تیری جیب سے قرض مانگ رہا تھا۔ میں نے والٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا جو لیتا ہے خود لے لو۔ بس کراہیہ چھوڑ دینا۔“

”کیا ایران توران کی ہانگ رہے ہیں میں آپ کے سب دوستوں کو جانتا ہوں سب ویل آف فیملیز سے ہیں۔ اور یہ کس زمانے کا واقعہ ہے کہ آپ کرائے کی بات کرتے ہیں پندرہ برس سے آپ گھر کی ہر گاڑی پر ہاتھ صاف کرتے آرہے ہیں چاچو۔“

وہ بے ساختہ ہنس پڑے ”ابے اس کا مطلب میں کبھی ایک اچھا واقعہ نگار نہیں بن سکتا یعنی بیوی کے سامنے جھوٹ بولا تو فوراً پکڑا جاؤں گا۔“

”تو جب جھوٹ بولنا آتا نہیں تو بولتے کیوں ہیں؟“ اس نے گھورا۔

وہ نمائے سے ہو کر بولے ”کل بھابھی کو جھوٹ پر سچ پینٹ کرتے دیکھا تو مجھے لگا میں بھی اچھی خاصی گل کاری کر سکتا ہوں۔“

”کون سی بھابھی... کیا ملا...؟“ دائم کے کان کھڑے ہوئے۔

شاہ میر شرارت سے بولے ”ارے وہ تو جنتی عورت ہیں میں کہاں ان کے خلاف بول سکتا ہوں۔ میں تو صبا بھابھی کی بات کر رہا تھا۔ کل بھیا سے کہہ رہی تھیں شاہ میر بہت بگڑ گیا ہے۔ آج اس نے میری فرینڈز کے سامنے بڑا ندیدہ پن دکھایا جیسے اسے گھر میں کھانے کو کچھ ملتا ہی نہیں۔“

”ہوا کیا تھا...؟“ وہ ایسے گھبرا گیا تھا جیسے اپنے سامنے سانپ دیکھ لیا ہو۔

صبا بھابھی گھر بھر میں ہری مرج مشہور تھیں۔ انہیں باتوں کو رنگ لگانا، اس میں تیز مسالہ چھڑکنا خوب آتا تھا، ہر کوئی ان سے گھر میں بنا کر رکھتا تھا مگر یہ شاہ میر تھے۔ اس زمانے کے ایک عجیب ترین انسان جنہیں خطروں سے کھیلنا اور پھر جیت جانے کا جنون تھا۔

”اب بولیں بھی، آپ نے کل کیا کارنامہ کیا تھا؟“ کمپنی کی مشہوری کے لیے۔

”کچھ بھی نہیں۔ ان کی کچھ فرینڈز آئی تھیں، سب مجھے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح حیران رہ گئیں، یہ تو تمہارے بیٹے سے چار پانچ سال ہی بڑا لگتا ہے۔ بھابھی اتج کانٹنسی ہیں، بڑبڑانے لگیں اور میں انہیں جیلانے کو وہیں بیٹھ گیا، پھر میں تھا اور بھابھی کی جھوٹی سچی تعریفیں۔ بھابھی انہیں صرف کولڈ ڈرنک پر رخصانے والی تھیں اور میں کمینہ پن سے سب کا پسندیدہ مینو پوچھنے بیٹھ گیا۔ پھر میرے دل نے کہا، موقع اچھا ہے کباب کھانے کا، سوان کے مینو میں، میں نے اپنے کباب بھی ایڈ کر دیے۔ لوجی پھر تو بھابھی نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں فرشتہ نہ ہوتا تو جہنم ہو کر مرجاتا۔“

”شاہ میر! آپ بھی ناں...“ وہ ان کے فرشتے والی بات پر ہنسنے لگا۔

وہ مزید شرارتی ہو کر بولے ”بھابھی نے بھیا کے لیے کباب بنا کر رکھے تھے، ملتان کی آمد پر تھا۔ ان کا خیال تھا وہ رات کو کباب کی منہ دکھائی اکیلے میں کروائیں گی، مگر میری وجہ سے انہیں فوراً محنت کرنا پڑی، پھر کھانا کھاتے کھاتے جب میں نے اپنی برتھ ڈیے کا شو شاپ چھوڑا تو صبا بھابھی کی شکل دیکھنے والی ہو گئی تھی، وہ مجھے جھٹلا بھی نہیں سکتی تھیں۔ میں اور پھیل گیا، پھر ان کی ساری فرینڈز ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے چکر میں آگے بڑھ کر اچھی خاصی رقم میری جیب میں ڈالنے لگیں، بھابھی وانت بیٹس رہی تھیں، جب میں نے معصومیت سے ان کے آگے ہاتھ پھیلا کر کہا تھا۔

”کیوں بھابھی ماں! آپ مجھے کوئی گفٹ نہیں دیں گی؟“

بس پھر ان کی سرخ آنکھیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ کیا غضب تھا ان میں مگر صبا بھابھی نے پورے دو ہزار میری ہتھیلی پر رکھے تھے، کل ملا کے میں نے بیٹھے بٹھائے پندرہ ہزار کمائے تھے۔

”پندرہ ہزار...! گئے کہاں چاچو؟“ دائم پھر حیران ہوا اور وہ تہقہ لگا کر بولے۔

”پانچ ہزار اظفر کی جیب میں ڈال دیے تھے تاکہ جب بھابھی میری شکایتیں لگا رہی ہوں، بھیا سے تو اظفر میرا وکیل بن کر میری طرف داری کرے۔“

”پھر کی اس نے طرف داری؟“ دائم نے انہیں گھورا، وہ شرارت سے بولے۔

”ہاں ناں، کی طرف داری، وہ بھی بڑی دھانسو، ویسے بھی بھیا تو بھیا... بھابھی بھی اس کی بات کو انور نہیں کرتیں۔“

”اس نے کیا کہا آپ کی بابت؟“ دائم کو کھدبہ ہونے لگی اور وہ اسی شرارت بھری ٹون میں بولے۔ ”اس نے کہا ایسا! چاچو نے یہ سب ڈرامہ کوئی اپنے لیے تھوڑا کیا تھا، وہ تو چیری کے لیے رقم جمع کرنا چاہتے تھے۔“

آپ جانتے ہیں ملا سمیت ملا کی کئی پارٹی فرینڈز چیری پر رقم اسی وقت خرچ کرتی ہیں جب انہیں وہاں میڈیا کی لائٹ لائٹ میں جگہ لگایا جائے اور چاچو نیک نیکی سے صرف چیری کرنے کا شوق رکھتے ہیں اس لیے انہیں یہ ڈرامہ کرنا پڑا۔“

”پھر...؟“ دائم نے اور پچھسی لی۔ وہ مزید بولے۔ ”پھر بھابھی نے کہا، اور وہ کباب کھا گیا سارے۔“

بھیا نے گھور کے انہیں دیکھا ”بس کرو صبا اتنی تنگ دلی کا ثبوت نہ دیا کرو جیسے ہمارے لیے اظفر اور شہناز ہیں، ویسے ہی شاہ میر۔“ صبا بھابھی پر پختی ہوئی چلی گئیں اور میں نے بھیا کے بیڈ کے نیچے انگڑائی لے کر سوچا، بیڈ کے اوپر اور بیڈ کے نیچے سونے والے ایک بیسے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے کیونکہ ڈش پر چیونٹیاں اور لال بیگ بھی ہو سکتے ہیں۔“

”شاہ میر! توبہ کریں... چاچی کو صفائی کا بہت خیط ہے، ان کے کمرے میں چیونٹیاں اور لال بیگ نہیں ہو سکتے۔“

”پتا ہے مجھے، میں تو جبران کے قول کو ٹھیک کر رہا تھا۔“

”واہ، واہ آپ اور جبران کے اقوال کو ٹھیک کریں گے۔ جانتے بھی ہیں، وہ کتنا بڑا فلسفی تھا۔“

”بہت بڑا نہیں تھا۔ یہی کوئی ساڑھے پانچ فٹ کا ہو گا اور تمہارے چاچو چھ فٹ 3 انچ ہیں، پس ثابت ہوا وہ فلسفی بڑا تھا تو ہم بڑے انسان۔“

”کیا پیمانہ ہے آپ کا بڑائی ناپے کا...“ وہ ہنسا اور پھر رازدارانہ بولا ”ویسے آپس کی بات ہے، آپ نے وہ پیسے کس چیری لون میں جمع کرائے۔“

”سیدھی سی بات ہے سب سے زیادہ چیری کا تو میں خود حق دار تھا۔ یتیم، مسکین بچہ ہوں، اگر وہ رقم نوڈ پر خرچ کر لی تو کوئی غلط بات تھوڑا ہے۔“

”ہاں ہاں، کہاں غلط بات ہے آپ کبھی غلط بات کر سکتے ہیں۔“ وہ کالر اکڑا کر دائم کی خفگی بھری تعریف پر مسکرائے۔ ان کی گاڑی ایک ہوٹل کے سامنے رک

چکی تھی۔ ”یہ الیڈ ہوٹل بہت مہنگا ہوٹل ہے۔“ شاہ میر نے عینک اتار کر دائم کو غور سے دیکھا، پھر رازدارانہ بولے۔

”خیر ہے! یہ تیری روح اندر سے اتنی غریب کب سے ہو گئی۔“

”شاہ میر! یہاں چائے کا ایک کپ ڈھائی سو کا ہے۔“

”اچھا چل تو صرف چائے پینا ڈھائی سو روپے تو ہوں گے، ناتیروے پاس؟ میں تو یہاں کے چکن چیز سینڈویچ کھانے آیا ہوں۔ ساتھ گارلگ ساس والے فٹنر چیس... Yummy۔“

”یہ آپ ایک دم سے ریسوں والے چونچلے کب سے کرنے لگے؟“

وہ مڑ کر شرارت سے بولے۔ ”جب سے مجھے پتا چلا ہے، میرا بھتیجا فارن منسٹری میں جانے والا ہے۔“

اس نے اتنی اپ ڈیٹ پر شاہ میر کو حیرت سے دیکھا پھر بولا۔ ”میں نے انٹری ٹیسٹ ضرور دیا ہے مگر تین ہزار میں سے میرا سلیکشن ہو جائے، یہ ضروری تو نہیں شاہ میر۔“

”نہ ہو۔ پورو کریٹ تو بن چکا ہے ناں! منسٹری بھی مل ہی جائے گی، اپنی بڑی دھوم ہے سیاسی میدانوں میں۔“

وہ اب اندر داخل ہو چکے تھے اور دائم کرسی کھسکا کر بیٹھتے ہوئے حیران تھا کہ وہ سیاسی میدان میں کہاں سے کود پڑے۔

”وہ اپنا ایک دوست ہے جلیل راؤ، بہت مشہور کالم نگار ہے، اپنا یار غار ہے اور سمجھ لو، مجھے کوئی کام نکلوانا ہوتا ہے تو بس جلیل راؤ کے گلے پر پیر رکھ دیتا ہوں۔“

”توبہ توبہ شاہ میر! دوستوں کے ساتھ یہ بد سلوکی... آپ کو کبھی شرم بھی آئی ہے۔“

”ہاں آئی تھی، ایک بار جب میں نے بابا کے سامنے زندگی میں پہلی بار سچ بولا تھا اور بابا جان بولے تھے، بہت ہو گیا شاہ میر! اور کتنا جھوٹ بولو گے۔“

”یہ کس زمانے کی بات ہے۔“ داعم نے بمشکل مسکراہٹ چھپائی تھی اور وہ اسی منہری شان سے بولے۔

”یہ پچھلے ہفتے کی بات ہے ویسے آپس کی بات ہے پتا نہیں بابا جان ہمیشہ میری طرف سے اتنے مشکوک کیوں رہتے ہیں حالانکہ دس بجے تک گھر آجانے والی پہلی اور آخری اولاد ہوں ان کی۔“

”جی بھی کھی کھی۔۔۔ داعم اب ہنسی ضبط نہیں کر سکتا تھا۔“ ایک ایسی اولاد جو کوئی کام نہ کرتی ہو اس کا رات کے دس بجے آنا بھی مشکوک کر دیتا ہے۔ سارا دن کیا کرتے رہے یہ سوچ کر چاچیوں کا تو پکا خیال ہے آپ نے چھپ کر کوئی شادی تو نہیں کر رکھی۔“

”ابے میں چھپ کر شادی کیوں کروں گا مالی طور پر اخلاقی طور پر ہر طرح سے مضبوط ہوں یا ر! ہاں کرل فریڈ بہت ساری ہیں۔“

”کیا مضبوط کروا رہے۔“ داعم نے پھر سے طنز کیا۔ وہ اثر لیے بغیر بولے۔

”کام نکلتے رہتے ہیں بہت سے۔ ساری اچھی کیشگری کی دوست ہیں میری۔“

وہ یک دم سنجیدہ ہو گئے۔ انہوں نے ٹیبل پر رکھے ٹشو پر کچھ لکھ کر اشارے سے ایک ویٹر کو دیا تھا۔ داعم کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ ان کی ٹیبل کا سروس عملہ ایک دم سے چینی ہو گیا تھا۔

”جی سرفرمائیے۔۔۔“ ہیڈ ویٹر ان سے آرڈر لے رہا تھا انہوں نے شام کی چائے کا خاصا اہتمام کروا لیا تھا۔ داعم نے احتیاط ”کوٹ کی جیب سے والٹ نکال کر ٹیبل کے نیچے رکھ کر پھر سے نوٹ گنے پورے پندرہ ہزار تھے کل ہی بابا نے جیب خرچ دیا تھا۔“

ویٹر پندرہ منٹ کا وقت دے کر جا چکا تھا اور اب شاہ میرا دم کو دیکھ رہے تھے۔

”گن لیے نوٹ؟ ویسے یہ کام گاڑی میں تم پہلے بھی کر چکے تھے پھر ضرورت کیوں محسوس کی؟“

”اس لیے کہ میرے ساتھ ایک بہت ہی فن کار آدمی بیٹھا ہے۔ میں نے سوچا کیا پتا۔“

اب شاہ میرا دم سے تہقیر لگا کر رہے۔ ہنستے ہوئے ان کی آنکھیں تک ہنسنے لگتی تھیں۔

”آپ ہنستے رہا کریں شاہ میر۔۔۔“ وہ بے ساختہ بولا اور شاہ میر شربانے کی اداکاری کرنے لگے۔

”ہائیں نظر نہ لگادیتا بچے کو۔ ویسے ہی میری ماں کا خیال ہے میرا خون بڑا پاک ہے۔“

”بس کر دس کوئی نہیں خوب صورت آپ جو آپ کو نظر لگے گی۔“

انہوں نے گھور کے دیکھا اور اسٹائل سے بولے ”نظر نظر کی بات ہے۔ ماں کی نظر سے دیکھ دنیا کا سب سے خوب صورت انسان لگوں گا۔“

”بس کر دس خود ستائی کی اس مہم کو اس کے لیے داد ہی بہت ہیں پتا نہیں کیا نظر آتا ہے انہیں آپ میں۔“

وہ ہولے سے مسکرائے پھر ہنستی سے بولے۔

”میں ابھی آیا۔۔۔“ اور اٹھ کر ایک دم غائب ہو گئے۔ ویٹر آندر لگا رہا تھا داعم نے کچھ دیر تو ان کا انتظار کیا پھر آہستگی سے اٹھا۔ ان کا والٹ اور موبائل ٹیبل پر ہی تھا یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ آندر چھوڑ کر نہیں آئے۔

داعم نے شاہ میر کو ڈھونڈنے کی کوشش شروع کی تھی پھر وہ نظر آ گئے۔ وہ ایک ویٹر کا ہاتھ تھامے ہوئے اسے بہت محبت پاش نظروں سے دیکھ رہے تھے،

”ہولے ہولے اس کے ہاتھ کی اوپری سٹر کو دلا سے اور ڈھارس سے سہارا دے تھے۔“

وہ لوٹ میں ہو گیا تبھی وہاں سے ایک ویٹر گزرا ”سنیے یہ ویٹر کون ہے؟“

”جی ابو میٹر ہے۔۔۔“ سامنے کھڑا شخص بھی ایک کائیاں تھا۔ داعم نے گلا کھنکارا۔

”اس کا نام اور یہ کیسا آدمی ہے؟“

اس نے داعم کو اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر قدرے تلخی سے بولا ”شمال خان ہے اور آپ جیسے حسن پرست افراد کو ڈیل سے داموں فراہم کرتا ہے۔“

”ڈیل۔۔۔“ داعم کے منہ کا مزا خراب ہو گیا۔ یہ شاہ

میر کن چکروں میں پڑ گئے۔ کیا واقعی اب وہ اخلاقی قدروں کو نکھو کر مار کر لذت کے راستے پر چل پڑے تھے مگر یہ تو نگاہ کار راستہ تھا اور شاہ میر کو اس نے بہت اونچے سنگھاس پر بٹھار کھا تھا۔

داعم ٹیبل پر آکر بیٹھ گیا پانچ منٹ بعد شاہ میر واپس لوٹے۔ ان کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔

”گرمی بہت ہے ٹھنڈے پن پانی سے منہ دھویا ہے تو تھوڑا سکون ملا ہے۔“

”گرمی اور یہاں۔۔۔“ داعم کو یکدم وہ برے لگنے لگے تھے۔ اے سی کی ٹھنڈک میں گرمی کی بات نہایت احمقانہ تھی مگر وہ کر رہے تھے۔ داعم نے بھی خاموشی اختیار کرلی۔

”آج رات آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

”آج ایک دوست کی پیمن کی مایوں ہے وہاں جانا ہے۔“

”ایک اور جھوٹ۔۔۔“ داعم نے غصے کا گھونٹ پیا۔

وہ نہ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اس معصومیت کے پیچھے مجھے چہرے کو سب کے سامنے ظاہر کر دے اور پھر اپنے دل کی مادی بھڑاس نکال کر ان سے ہر تعلق توڑ لے۔

”کس پر اتنا غصہ کھا رہے ہو؟ دیکھو تمہارا گلانی رنگ جل جائے گا تو مہو تمہیں دیکھے گی بھی نہیں۔“

مہو کے نام پر ہمیشہ داعم کے ہونٹ مسکراہٹ کو چھو جاتے تھے مگر آج اس کے ہونٹ بھیجے ہوئے تھے۔

”خیر ہے یا رہا بل میں ہی پے گروں گا تو پریشان کیوں ہے؟“

”مجھے آپ کے ساتھ چائے نہیں پینا۔“ وہ ایک دم اکھڑ گیا تھا۔

شاہ میر نے یکدم اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا ”چل اب زیادہ ڈرائے نہ کر پی لے چائے۔“ ان کے ہونٹ ہی اس کا نص۔

وہ ان کے ہاتھ لگتے ہی جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ”کیا شاہ میر کو کوئی جانا آتا ہے؟“ داعم نے سوچا وہ اس کے لیے چائے بنانے لگے ”آج چائے میں ایک چمچ شکر

لانا ڈال رہا ہوں تاکہ تیرے من کی کرواہٹ کم ہو جائے۔“

وہ کچھ نہیں بولا خاموشی سے مینڈو ج کھانے لگا۔

”اماں کہتی ہیں جس کا من سچا ہو اس کی مرادیں بڑی پوری ہوتی ہیں۔“ وہ ترنگ میں بولے اور داعم کو بل پڑنے لگے ویٹر۔ اس کی شہرتیں اور شاہ میر کی محبت

”میرا دل چاہتا ہے آج تیز بارش ہو۔ تیرے ساتھ بارش میں بھیگے ہوئے کتے دن ہو گئے ناں۔“

”میرے ساتھ بارش میں بھیگنے کا بڑا شوق ہے آپ کو؟“ اس نے چائے کا ہلکا سا گھونٹ لیا۔ وہ مسکراتے لگے۔

”تجھے یاد ہے جب تو کانویونٹ سے چھٹی پر آیا کرتا تھا تو میں گرمیوں میں تیز دھوپ میں کیسے کیسے بارش کی دعا میں مانگا کرتا تھا۔ مجھے بارش بھی اپنی کرل فریڈ لگتی تھی اس زمانے میں تو جمع باجی اور آصفہ باجی کی طرح وہ میری سہیلی ہوتی تھی اور میرا دل چاہتا تھا میں سارا دن ساری رات بارش میں بھیگتا رہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اچھا لگتا تھا ایسا کرنا۔“

”مگر کیا تب آپ کی دعاؤں پر بارش ہو جاتی تھی؟“ وہ ابھی بھی اکھڑ تھا۔

مگر وہ توجہ دیے بغیر بولے ”ہاں کبھی کبھی ہو جایا کرتی تھی مگر تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے میرے ساتھ کبھی بارش انجوائے نہیں کی ہو۔“

”مجھے بارش اچھی نہیں لگتی۔“ داعم نے سرسری سا کہا۔ وہ ایک لمحے کو جب ہوئے اور پھر بولے۔

”یعنی تجھے میں اچھا نہیں لگتا مگر یہ اچانک اتنا بدلاؤ کیوں؟“

”کچھ چیزیں بس اچانک ہی وقوع پذیر ہو جاتی ہیں جیسے۔۔۔ جیسے۔۔۔“

”جیسے اچانک ہونے والی بارش۔“ وہ ایک زوردار خوشی بھری فلکاری مار کر بولے۔ داعم نے گلاس وینڈو سے دیکھا یا ہوا واقعی بارش ہونے لگی تھی۔

”چل نا! بارش میں بھیگتے ہیں۔“ وہ بل ادا کر کے یکدم اٹھ کھڑے ہوئے داعم ان کے ساتھ کھینچا پھر رہا

تھا پھر وہ ہوٹل کی پارکنگ لٹ میں کھڑے تھے۔
 ”گاڑی میں نہیں جا رہے۔ میں نے شاہ زین بھائی کے بیٹے کو بلا لیا ہے وہ گاڑی گھر لے جائے گا۔“
 ”تو ہم یہاں شہباز کے آنے تک کھڑے رہیں گے۔“ اسے غصہ آگیا تھا ان کی اس لاپرواہی پر۔
 ”نہیں، میری گاڑی کی ایک چابی شہباز کے پاس بھی ہے وہ خود ہینڈل کر لے گا۔“
 انہیں کسی بھی بات سے پریشانی نہیں ہوتی تھی مگر اسے ہو رہی تھی ”آپ اس سترہ سال کے بچے کو بلا کر یہ گاڑی ہینڈل کرنے کو کہہ رہے ہیں اگر کوئی حادثہ ہو گیا تو؟“

”کبھی اچھا بھی سوچ لیا کر۔ وہ کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہے میری گاڑی استعمال کر کے اب اس کا ہاتھ بہت رواں ہو گیا ہے۔“ انہوں نے دائم کے اس خدشے کو بھی رد کر دیا تو اس نے ایک نئی بات نکالی ”رات کے آٹھ بج رہے ہیں اگر راستے میں ٹریفک پولیس نے پریشان کر دیا تو۔“

”نہیں کرے گا میرا نام ہی کافی ہے۔“
 ”آپ کوئی پرائم فیسٹر ہیں۔ امریکن صدر کے چیمبرے بھائی لگتے ہیں جو آپ کا نام ہی کافی ہے۔“
 ”ہائے تو یہ ہے دائم! میرا رنگ گندی ہے کلا نہیں کیا ہو گیا ہے تیری عقل کو۔“ وہ اسے بالکل خاطر میں نہیں لارہے تھے اور دائم کو ان کی یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

”پکوڑے کھائیں۔“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا وہ ایک نئی فرمائش اٹھالائے۔
 ”آپ کا پیٹ ہے یا ہائی کورٹ کا دفتر؟“ وہ ہنسنے لگے پھر اثر لگے بغیر وہ سڑک کنارے شید کے نیچے کھڑے پکوڑوں کا آرڈر دے رہے تھے۔

”پودینے کی چٹنی زیادہ ڈال کے دینا۔“
 ”آپ کی ساری عادتیں لڑکیوں والی ہیں خواجواہ آپ کو شاہ میر بنا دیا اللہ جی نے۔“ وہ پھر ہنسنا شروع ہو گئے۔ انہیں کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ زبردستی اسے بھی کھلا رہے تھے پکوڑے ختم ہو گئے

تھے اور اب وہ چٹنی کے گھونٹ لے رہے تھے۔
 ”خدا کا خوف کریں، سینہ جل جائے گا آپ کا۔“
 مگر سنتا کون! وہ چٹنی کے بعد ہلکا کر کے چٹنی کی تیزی سے پریشان تھے۔ ”آئس کریم کھالیں؟“ دائم نے جل کر کہا اور وہ مسکرانے لگے۔

”گڈ آئیڈیا، چلو اسی لین میں پشاور آئس کریم پارلر ہے وہاں دو گھڑی بیٹھ کر آئس کریم کا لطف اٹھاتے ہیں۔“

”دو گھڑی تو ایسا کہہ رہے ہیں جیسے میں سالوں بعد آپ سے ملتا ہوں، روز ہوتا ہوں آپ کے ساتھ بیار کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“

”کچھ نہیں مگر ایک بات یاد رکھنا جو آپ کے ساتھ روز ہو، آپ کے شب و روز میں گھڑی کی ٹیک ٹیک کی طرح شامل ہو ضروری نہیں وہ واقعی دل سے بھی آپ کے ساتھ ہو آپ کے پاس ہو کیا پتا وہ صرف آپ کے ساتھ ایویس کھٹتا پھر رہا ہو۔“

دائم کو یکدم کچھ عجیب سا لگا مگر پھر وہ کچھ نہیں بولے تھے خاموشی سے آئس کریم ختم کر کے اٹھتے تھے اور انور کو آکر آٹوولے کو گھر کا پتا سمجھانے لگے۔

”آپ میرے ساتھ نہیں چل رہے؟“
 دائم کو لگا وہ خفا ہو گئے ہیں اس کے رویے پر مگر انہوں نے اس کا کال چھو کر کہا تھا۔

”پے منٹ کر چکا ہوں، یہ تمہیں آسانی سے گھر پہنچا دے گا۔“ لمحہ بھر کور کے پھر آہستگی سے بولے۔
 ”اتنی دیر برداشت کرنے کا شکریہ میری جان!“

اب ان کی پشت تھی اس کی طرف۔
 ”آپ نہیں چلیں گے گھر؟“ وہ مڑے بغیر بلند آواز میں بولے۔

”نہیں مجھے ایک بہت ضروری کام ہے۔ بابا سے کہہ دینا، تھوڑی دیر ہو جائے گی آج۔“ ان کی تیز آواز اور شاہ میر کا ناقابل قسم رویہ دائم نے کچھ دیر تو سوچا مگر پھر ساری توجہ گھر پر لگا دی، مہر النساء کی آٹھ دس برس کا لڑوہ دیکھ چکا تھا، اس لیے اسے منانے کے لیے لفظ جوڑ رہا تھا۔

وہ تیز قدموں سے بارش میں بھگتے ہوئے جا رہے تھے جب بہت اچانک ان کے قریب ایک کار آ کر رکی پھر جو شکل ان کو نظر آئی تھی اسے دیکھ کر وہ جی جان سے جل گئے۔

”اتنی بارش میں کہاں گھومتے پھر رہے ہو، تمہیں پتا بھی ہے کیا وقت ہو رہا ہے اور یہ کراچی کی بارش ہے، انتہائی جمع ہے سڑکوں پر یہاں مین ہائٹر کھلے پڑے رہتے ہیں اور۔۔۔“

”پلیز زبان بھیا! کوئی نیوز جیو کے لیے بھی رہنے دیں۔“ لمحہ بھر کور کے پھر مزید بولے۔

”کیا آپ چاہتے ہیں میں آپ کے ساتھ چلوں؟“
 ”نہیں مجھے اپنی گاڑی خراب نہیں کروانا۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں تمہیں آٹو کا کرایہ دے سکتا ہوں۔“

”چلیے نکلیے کرایہ۔۔۔“ وہ یکدم ہاتھ پھیلا کر شرارت سے بولے۔

اور شاہ زبان بڑھاتے ہوئے والٹ نکالنے لگے ”سو روپے کافی ہیں؟“

”سو روپے میں کیا ہو گا بھیا پانچ سو روپے تو دیں۔“ وہ ڈھٹائی سے بولے۔

”تم کیا کرتے ہو اتنے پیسوں کا؟ جب دیکھو ہاتھ پھیلائے کھڑے ہوتے ہو۔“

وہ مسکرا کر انہیں دیکھنے لگے تھے پھر ہنس کر بولے ”آج کل وزیروں سفیروں کے ساتھ بیٹھنے لگا ہوں اس لیے ہاتھ کھلا زبان خاموش ہو گئی ہے۔“

”خوش قسمی ہے کہ تم خاموشی کا سہیل ہو۔“ شاہ زبان نے نخوت سے کہا اور وہ اثر لیے بغیر بولے۔

”بدگمانی کرنے سے بہتر ہے خوش گمانی پال لی جائے۔ ویسے سب بھائیوں میں آپ مجھے بہت ڈار لنگ بھائی لگتے ہیں۔“

شاہ زبان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ کوئی غصے میں ہو اور آپ اس کی تعریف کر دیں تو وہ ہکا بکار ہی جاتا ہے۔

انہوں نے کچھ کہے بغیر گاڑی آگے بڑھالی اور وہ اسی طرح سڑک پر بارش میں نہاتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ٹریفک بری طرح جام تھا، یہی وجہ تھی وہ رک کر، ٹھہر کر، ٹھہل کر، کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ گئے۔

”تم کہاں نکلے ہوئے تھے؟ دائم تو کب کا گھر آ چکا ہے۔“ نیلو فریڈا بھی نے ان کے لئے لے ڈیوٹ سے آگے آنے کے بجائے چوکیدار کی کرسی پر ہی بیٹھ گئے۔

”سائنس تو لینے دیں بھائی ماں! ساری انفارمیشن کا تبادلہ ہو گا میں بہت تھکا ہوا ہوں۔“

چوکیدار شیڈ کے نیچے کھڑا تھا اور وہ گہرے گہرے سائنس لے رہے تھے گھر کی باقی عورتیں جاچکی تھیں، صرف نیلو فریڈا بھی کھڑی تھیں یا تازہ اطلاع پر اماں جان بھاگی ہوئی آئی تھیں۔

”کتنا بھگ گیا ہے شاہ میر چل جلدی سے کپڑے بدل لے ورنہ بیمار پڑ جائے گا۔“ اماں کھینچ کھانچ کر انہیں اندر لے گئی تھیں وہ تو لیے سے اس کے بال خشک کرتی رہیں۔ نیلو فریڈا بھی ان کا کرتا اور ٹراؤزر اٹھا لائیں۔

”تمہیں پتا ہے تم بیمار پڑ جاتے ہو بارش میں بھگ کر پھر بھی بارشیں انجوائے کرنا ہیں۔“

نیلو فریڈا بھی بڑبڑائیں اور وہ اماں کے واش روم میں کپڑے لے کر کھس گئے۔ پانچ منٹ بعد باہر تھے اور اماں چائے کا بڑا مک ان کے سامنے رکھ رہی تھیں۔

وہ چائے پینے کا ارادہ باندھ ہی رہے تھے کہ نیلو فریڈا بھی ان کے لیے پینا ڈول لے آئیں ”یہ کھالو ماکہ طبیعت خراب نہ ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے گولیاں نگل گئے اور دادی اماں کے کمرے میں کھلنے والی باغ کی طرف والی کھڑکی سے جھانکتے دائم کو ان کی اتنی خاطر مدارات دیکھ کر برا لگا۔

”پتا نہیں ان سب کو کیا دکھتا ہے شاہ میر میں۔۔۔“ اس نے بہت الگ طرح سے آج شاہ میر کے بارے میں سوچا تھا۔ یہ وہ سوچ تھی جو اس گھر میں بہت

سارے فزوں میں پیدا ہو جاتی تھی۔

وہ باہر کوریڈور میں کرسی پر بیٹھا بارش کو برساتا دیکھ رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ شاہ میر کو کچھ دیر کے لیے نہ دیکھے۔ مہو سے ابھی ابھی اس کی بات ہوئی تھی اور وہ اس پر غصے سے الٹ پڑی تھی کہ شاہ میر نے اس کی آواز سن کر فون کاٹا تھا اور یہ کہ وہ کون ہوتے ہیں ظالم سماج بننے والے اس نے کہا ابھی وہ صرف اس کے چاچو ہی نہیں اس کے دوست بھی ہیں مگر اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔

”دوست محبوب کی جگہ نہیں لے سکتا۔“ آخری فقرہ اس کا یہی تھا اور وہ اس وقت بھی مہو کے اسی فقرے کے ساتھ اکیلا بیٹھا تھا۔ دل بے چین تھا۔ ہونٹ والی ادھوری اسٹوری اس کے دل میں اودھم مچائے پھر رہی تھی۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا کہ اچانک کسی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”یہ آج کل تم پرانی فلموں کی سٹیلی ماں کی طرح ہونٹ کیوں کاتے رہتے ہو۔“

”مجھے آپ سے اس وقت کوئی بات نہیں کرنا۔“ اس نے بے مروتی کی انتہا کر دی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔

”خیر ہے یہ نصیب و شمنال آج موسم اتنا گرم کیوں ہے؟“

”آپ مجھے اکیلا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ جب آپ کا دل چاہے میں بات کروں؟ آپ کا دل چاہے میں ہوں، تھمتے لگاؤں میں کوئی جو کر ہوں یا کوئی کھلوں؟“

میں موجود نہیں تھے۔

”شاہ میر کہاں ہیں۔۔۔؟“ اس نے دادی جان سے پوچھا۔

وہ فکر مند سی بولیں ”پتا نہیں کل سے کیا ہو گیا ہے، کچھ بول ہی نہیں رہا بس خاموشی سے آفس کے کاموں میں لگا ہوا ہے۔“

”آؤٹ ہاؤس میں ہیں کیا؟“ شاہ میر اور آفس کے کام۔ اسے حیرت ہوئی دادی نے آہستگی سے سر ہلایا اور وہ ناشتے کی ٹرے لے کر آؤٹ ہاؤس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

دادی جان شاہ میر کو کچھ ڈکھٹ کر رہے تھے اور وہ وہ ان کے لفظوں کو ای میل میں ڈھال رہے تھے۔

”السلام علیکم دادو! کوآئم نے یا آواز بلند سلام کیا۔ شاہ میر نے ذرا بھی توجہ نہ دی تو اسے دھکا لگا۔

”کیا آپ بہت مصروف ہیں شاہ میر؟“

”جی ہاں! وہ سائنس اینڈ سائنس کے سلسلے میں بھی آپ کچھ کہہ رہے تھے، انہیں بھی ای میل کرنا ہے۔“

”نہیں میری ان سے کل بات ہو گئی ہے۔ وہ معاملہ حل ہو گیا ہے۔ بے منٹ میں کچھ ڈیلے تھا۔ اس کا چیک امپروو ہو گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے بیلا! پھر میں چلتا ہوں، مجھے آج کچھ بہت ضروری کام ہیں۔ رات کو بھی بہت دیر ہو جائے گی۔“

دائم کو پھر رات اور دیر جیسے جملوں نے ڈنک مارا تھا۔

”آپ کبھی نہیں سدھر سکتے۔ پتا نہیں اچھے بھلے راستوں پر چلتے چلتے کہاں کی خاک چھانے نکل پڑے ہیں۔“ وہ دل میں سوچتا ہوا ناشتے کی ٹرے واپس لے کر اپنے کمرے میں آیا۔

اکیلے ناشتے کی اسے عادت تھی مگر شاہ میر کے ہوتے ہوئے اکیلے ناشتہ کرنا اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا اور وہ خود بھی اس کے بغیر ناشتہ نہیں کر سکتے تھے۔

”میرا دل چاہتا ہے، میرا ایک ٹرسٹ ہو جس کے وسیلے سے بھوکے لوگ تینوں وقت کھانا کھائیں اور مجھے دعائیں دیں۔ اکیلے ناشتہ کرنا بڑا عجیب لگتا ہے۔“

وہ جس سے چڑ رہا تھا اسی کے متعلق سوچے جا رہا تھا۔ اس نے صرف ایک سلاٹس کھایا تھا اور ٹیسٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بہت مٹاس بھری آواز نے اسے چونکا دیا۔

”عائشہ باجی! آپ اتنی اچانک۔“

”بس ہر بار سوچتی تھی تم سے ملنے کا، مگر اس بار سب سنا تم آئے ہو تو میں نے کہہ دیا، ایک ہفتے رکوں کی سواموں جان کے گھر آگئی مگر یہ لیلیٰ مینوں کی جوڑی ایک ساتھ کیوں نظر نہیں آرہی؟ ماموں جان کہہ رہے تھے۔ بہت مصروف رہنے لگا ہے شاہ میر۔“

”پتا نہیں مجھے بھی یہ اطلاع دادو جان سے ہی ملی ہے آج۔“

”کیا بات ہے، تم اور اس کے ذکر پر اتنے اکھڑے اٹھ رہے ہو۔“

”بس کچھ نہیں عائشہ باجی! ایویس تھوڑا اور ہو رہا تھا۔“

”واہ! تم اور بور ہونے لگے۔ شاہ میر اور تمہارے اٹنے تو آج تک ہم لوگ مزے سے دوہراتے ہیں۔ سارے بچے تم دونوں کے دیوانے ہیں بھئی۔“

وہ دھیسے سے مسکرانے لگا اور وہ ہنس کر بولیں

”آصفہ کی شادی ہمارے گھر کی پہلی شادی تھی۔ سب کتنا حیران پریشان تھے اور شاہ میر دس برس کے ہو کر بھی کیسے کمپوزڈ تھے۔“

وہ ہنس پڑا۔ یکدم اسے اتنی پرانی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ وہ آصفہ باجی کی شادی کی اپنے تئیں تحقیقات کر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سوال کرتے پھرتے ہر شے میں نقص نکالتے۔ بڑوں کے سامنے تو چیپ رہتے مگر آصفہ کو کتنے آصفہ باجی محبت کرنا لڑکا کتنے جوس

”ہا آں۔۔۔ سب عمر سے بڑی باتوں پر ہکا بکا رہ جاتے مگر تحقیقات میں جب کوئی نقص معلوم ہوتا، ان کے کہے ہوئے لفظوں سے انہیں بیس کا فرق ہی ہوتا۔“

پھر آمنہ باجی کی شادی طے ہوئی اور انہوں نے وہ ہنگامہ کیا کہ الاماں میوزک ڈانس یہاں تک کہ شادیوں کی وہ جان بن گئے جہاں باقی لڑکوں کا داخلہ ممنوع ہوتا۔ شاہ میر دھڑکے ہوئے جب آصفہ باجی کی شادی ہوئی تو اس وقت شاہ میر کالج میں تھے، انہوں نے صرف آپس میں تین دن ڈھولگی کی قرار داد پاس کی، بات بابا جان تک پہنچ گئی تو وہ تب گئے۔

”شاہ عالم کے گھرانے کے لڑکے گانا بجانا نہیں کرتے۔“

وہ بابا جان کے سر ہو گئے۔ ”پلیز بابا جان! تین دن تک بھول جائیں ناں، آپ شاہ عالم ہیں۔“

”کیا جانتے ہو؟ میں یہ بھول جاؤں کہ میں شاہ عالم ہوں تو پھر کیا یاد رکھوں؟“

”آپ خود کو کشور واجی سمجھنے لگیں۔ پلیز بابا جان! یہ عیا زمانہ ہے، کونے میں ناں، بے چاری لڑکیاں کن کے اچھے لگنے کے یہی تو دو تین دن ہوتے ہیں پھر تو چلی جاتی ہیں یہ۔۔۔ عائشہ باجی اور آصفہ باجی کی طرح پھر تھوڑی کر سکتی ہیں اپنی من مرضی۔“ بابا جان نے ان کی صورت دیکھی، لفظوں کا چننا دیکھا اور کہا۔

”او کے! اگر ایک ہلکی آواز میں بچے گا۔“

یوں شادی کے وہ لمحات بے عدا یادگار ہو گئے تھے۔ وہ ساری ساری رات باتیں کرتے۔ اماں جان چاچا جی آکر کہتیں۔

”بچی کو آرام کرنے دو۔۔۔“ اور وہ صاف کہہ دیتے۔

”پلیز اماں جی! یہ ہی دن تو ہیں جب ہم ان کے پاس اتنے حق سے بیٹھے ہیں، پھر تو بہنوئی صاحب ہوں گے اور ان کی جی حضوری۔“

”آصفہ باجی چہرہ ڈھانکے ہنسنے جاتیں یہ خاموش عہد تھا کہ وہ مایوں کے بعد چہرہ دیکھنے کی ضد نہیں کریں گے۔ سب کمزور اور بہن بھائیوں نے اس خاموش عہد پر

دستخط کر رکھے تھے۔ وہ سب باتوں میں مگن رہتے شاہ میر آصف باجی کے بعد اب عائشہ باجی کی خدمت داری کر رہے تھے جو فرمائش منہ سے نکلتی غورا پوری ہونے لگی تھی۔ عائشہ باجی بھی حیران تھیں۔

وہ اتنے دھڑلے سے خرچ کر رہے تھے کہ دائم کو شبہ ہوا کہیں شاہ میر آج کل ہاتھ کی صفائی تو نہیں دکھانے لگے دل کو تسلی نہ ہوئی تو ان کی غیر موجودگی میں اس نے ان کی الماری کھنگال ڈالی۔ تب وہ ہکا بکارہ گیا آمنہ باجی عائشہ اور میر باجی کے نام کے منی باکس رکھے تھے خاص ٹیک کے ہوئے اور ہر باکس میں اچھی خاصی رقم تھی۔ پتا نہیں وہ کب سے یہ رقم جمع کر رہے تھے اور اب شادی کے بعد بھی یہ باکس خالی نہیں ہوئے تھے۔

”کیوں شادی کے بعد آپ پیسے کیوں جمع کرتے ہیں؟“ رات گئے اس نے پوچھا تو وہ مسکرا کر رویشانہ بولے۔

”بہنیں ہیں یا راتنا سادہ ہوتا ہے اتنی سی بات پر خوش ہو جانے اور اتنی سی بات پر روٹھ جانے والا بڑی نرگسی طبیعت ہوتی ہے ان کی۔ اگر کوئی ان کی پروا کرنے لگے، بھلے صرف لفظی یا پھر میری طرح لفظی اور عملی دونوں تو ان کے اندر کا جومان بھرم کا پندار ہے نا، اونچا رہتا ہے اور جب یہ اونچا رہتا ہے تو سمجھو لڑکی کے اندر کامورال بھی اونچا رہتا ہے۔ اعتماد اعتبار سب کچھ ان کے لہجے سے رویے سے چھلکیاں مارتا ہے۔ ان کی آنکھوں کی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے بھی زیادہ خوب صورت ہوتی ہے اور میں یہی چاہتا ہوں کہ ان کے اندر کی لڑکی ہر وقت مسکراتی رہے۔“

اتنا گہرا سوچتے ہیں یہ شاہ میر۔ اس نے آج پھر سے نئی طرح سے سوچا تھا اور اپنی خفگی بہت عجیب سی لگی تھی۔ عائشہ باجی جانے کیا دنیا جہاں کی باتیں کر رہی تھیں اور وہ ان کی چھوٹی بیٹی کو گود میں لیے ماضی کو کھنگال رہا تھا۔ ایک شخص جو دنیا کی پروا رشتوں کی پروا سے افضل نہیں سمجھتا وہ کیسے کرپٹ ہو سکتا ہے۔ دل

نے مشورہ دیا اور اس نے ایک بار پھر سے شاہ میر کی تلاش شروع کی لیکن جب تک وہ آفس پہنچا وہ وہاں سے نکل رہے تھے۔

”میں کچھ بھی کہہ کر مثالوں گا انہیں۔ میں غلط تھا۔ ہر رشتے کی قدر حیثیت دوسرے رشتے سے الگ سی، مگر ضروری ہوتی ہے ایک رشتے کو نبھانے کے لیے پہلے کے کسی رشتے کو گنوا دینا عقلمندی تو نہیں۔“ وہ سوچے جا رہا تھا اور ان کی گاڑی کا پیچھا کر رہا تھا پھر چونک گیا۔

”ہاسپٹل۔۔۔ کیوں؟“ ایک بڑا سا کیوں اس کے اندر ڈنک مارنے لگا۔

”ہو گا کوئی جان پہچان کا بندہ ایڈمٹ شاہ میر کو بھی تو ہر کسی سے خلوص اور محبت کی پیشکشیں بڑھانے کی عادت ہے، ہر اچھے بڑھتے چلتے پھرتے شخص سے انہیں انسیت ہو جاتی ہے۔“

وہ گاڑی سے باہر نکلا اور فاصلے سے ان کا تعاقب کرنے لگا۔

یہاں تک کہ انہوں نے کوریڈر میں چلتے ہوئے ایک ڈاکٹر کو دیکھ کر پکارا تھا۔

”ڈاکٹر سعید! میں شاہ میر میری آپ سے آپ کیس کے سلسلے میں بات ہوئی تھی۔“

”او ہاں! والو سر جری کا کیس جی جی میں نے دیکھ لیا ہے۔ آپ چل کر میرے روم میں بیٹھیے۔ میں بس چندرہ منٹ میں آپ کے پاس آتا ہوں۔“

دائم ٹھنڈے کوریڈور میں یکدم برف ہو گیا۔ اسے لگ رہا تھا وہ مارچری میں بڑی ہوئی کوئی لاش تھی جس کا پوسٹ مارٹم ہونے جا رہا تھا۔

مگر لاش کو تکلیف کا احساس کب ہوتا ہے اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا تھا۔

”سوری سر! سموکنگ الاؤ نہیں ہسپتال میں۔“ اس کے کپکپاتے ہاتھ جو لائٹ سے شعلہ دکھانے لگے تھے یکدم بے جان ہو کر پھر سے گر گئے تھے۔ وہ تڑپ سے باہر نکلا اور اپنی کار کے کھلے دروازے پر ہاتھ رکھ کر

اس نے گہرے گہرے سانس لیے تھے مگر آنسو رک ہی نہیں رہے تھے۔

”گاڑی سی سائیڈ پر لے گیا تھا پھر پتھر پینڈہ کر کتے ای منظر اس کی نظروں کے سامنے پھر گئے تھے۔ وہ ماضی میں داخل ہوا تھا اور شاہ میر اس کے لیے لڑ رہے تھے۔“ نہیں اگر دائم شامل نہیں ہو گا کرکٹ میں تو میں بھی نہیں کھیلوں گا۔“

”چاچو! دائم بھیا کی بیننگ فیلڈنگ بولنگ کچھ بھی نہیں اچھی۔ آپ بلا وجہ ضد کرتے ہیں۔“

”نہ ہو کچھ بھی اچھا، مگر یہ میرا سیر ہے جہاں میں ہوں گا وہاں یہ ہو گا جہاں یہ ہو گا وہاں آف کورس میں ہوں گا۔“

”نہیں چاچو! آپ کچھ بھی کہہ لیں ہم دائم بھائی کو نہیں کھلائیں گے۔ ایک تو پہلے یہ کھیلتے ہیں پھر جب ان پڑتی ہے تو صاف بیچ جاتے ہیں۔ انہی ہم سب کی

کامیابی لگاتے ہیں داؤد جان اور بی جان کو۔“

”تو کیا ہوا یا ر! بچہ بڑا ہو کر سیاست دان بنے گا۔“

”موت کے پاؤں پانے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔“

”کیسے؟ آپ کو یہ کیسے پتا یہ سیاست دان ہمیں گے؟“ ایک بچہ پوچھتا اور وہ ہنس کر کہتے۔

”ایک کامیاب سیاست دان یا بیورو کریٹ ہو ہی ہوتا ہے جب گنگا بہہ رہی ہو تو دونوں ہاتھ دھو تا رہے اور جب پکڑ دھکڑ شروع ہو تو مسکین بن کر اگلی حکومت میں سیٹ لینے کے لیے سارے پرانے جرائم اور

کرائمن کے پلندے دوسروں پر ڈال دے۔“

”ہاں تو پھر بھی آپ کہتے ہیں یہ قابل اعتبار ہیں۔“

”ہاں یا ر! اپنا یا ر ہے جیسا بھی ہے قبول ہے۔“

اس نے بہتے آنسوؤں کو صاف کیا۔ وہ ہمیشہ ہی ہر مسئلے پر انہیں بیچ میں چھوڑ کر خود الگ ہو جاتا تھا، کچھ دنوں میں وہ داؤد جان کا ڈر اور کچھ اپنی سخت گیر مہاجان کا

کرف مگر شاہ میر عجیب ہے کبھی ماتھے پر شکن لائے۔“

اسے کلج کا دور یاد آنے لگا جب شاہ میر نے لڑکیوں کو قبول رہنے کے لیے پامسٹری سیکھی تھی یہ سناختہ

مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر در آئی پھر اسے وہ دن یاد آیا جب ایک بہت ذہین طالبہ کے نوٹس کی دھوم پر اس نے ان سے کہا تھا۔

”مجھ سے محبت کرتے ہیں تو اس کے نوٹس لا کر دیں۔ میں اپنی حیثیت اس کلج میں بہت شان دار چاہتا ہوں۔“

اور شاہ میر دوپہر تک اس لڑکی سے مل بیٹھے تھے پھر وہ اسائنمنٹ کے لیے صرف منہ ہلا دیتا اور اس کا اسائنمنٹ بغیر محنت کے وقت پر تیار ہوتا ہاں یہ اور بات تھی کہ وہ اس سے دور ہو گئے تھے۔ ان کا موبائل بڑی آتا راتوں کو بھی وہ دیر سے آتے۔

”محبت کا چکر ہے۔“ اس نے جان کر انہیں بھائی کے سامنے کہا، جانتا تھا وہ یہ خبر پورے گھر میں نشر کر دیں گے، مگر بات آگے نہیں بڑھی تھی۔

”کلج میں یونیورسٹی میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ شاہ میر بہت سمجھ دار ہیں۔“

”ہو گا، مگر میں اس آوارہ لڑکے کے ساتھ اپنے بیٹے کو مزید نہیں رکھ سکتی۔ مجھے شاہ بہروز کی بات ماننا ہی نہیں چاہیے تھی اولیول کے بعد مجھے اسے یہاں بلانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ بس طے ہو گیا۔ دائم اگلے ہفتے

سے پھر اسلام آباد جا رہا ہے اپنے ماموں کے گھر وہ جتنا شاہ میر سے دور رہے گا اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہے۔“

”مت جاؤ ناں!“ وہ کمرے میں آیا تو انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر منت سے کہا۔

”یہ ماما کا فیصلہ ہے شاہ میر! مجھے جانا پڑے گا۔“

”اگر تم کہہ دو کہ تم نہیں جانا چاہتے تو بھابھی ضد نہیں کر سکیں گی۔“ انہوں نے اسے گھیرا اور دائم بہروز کی آنکھوں میں چھین سے ”مہو“ کا سراپا کھوم گیا۔ وہ جس عمر میں تھا اس میں انسان فطرتاً نہ بھی ہو عیب بھی مصلحت تھوڑا خود غرض ہو ہی جاتا ہے۔

”میں تمہارے بغیر کیا کروں گا کلج میں۔“

”کیوں کلج میں تو آپ کی لڑکیوں میں بڑی دھوم ہے پھر وہ نئی لڑکی رانیہ بھی تو ہے۔“

2011

”میں نہیں جانتا کسی رائے شانیہ کو۔ میں اس کے پاس صرف تمہارے نوٹس لینے کے لیے گیا تھا مگر بدتمیز نے صاف منع کر دیا۔“

”پھر وہ سال بھر نوٹس کہاں سے آتے رہے؟“ دائم حیران ہوا تھا مگر شاہ میر کچھ کہے بغیر چلے گئے تھے۔

”تیرے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں میری جان۔“ ہر معاملے ہر فرمائش پر ان کا یہی جواب ہوتا تھا اور اب وہ کچھ کہے بغیر چلے گئے تھے تو اس کے اندر یہ فقرہ کسی شرارتی بچے کی طرح دوڑتا پھر رہا تھا۔

”بہت تھک گیا ہوں یا ر سونے دے۔“ یہ وہ جملہ تھا جو پھر اس نے سارا سال سنا تھا اور پھر ان کی تھرڈ ڈویژن آنے پر گھر میں کتنا ہنگامہ ہوا تھا۔

”بڑھنے جاتے ہو یا گھاس کھونے؟“ ”کوک کی بوتلیں جمع کرنے۔“ وہ شاہ زمان چاچو کی بات کا اثر لیے بغیر بولے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”کوک کی بوتلیں جمع کرنے کا مطلب؟“ دائم شاہ میر کے چاچو کیا کرتے تھے کالج میں؟

”چاچو! کوک کی ایک بوتل کینٹین میں دینے کی ایک معقول رقم ملتی ہے اسٹوڈنٹ کو۔“

”یہ کالج کی انتظامیہ ہے یا بھٹیاری خانہ؟ بچے اس لیے جاتے ہیں یا پڑھنے۔“ شاہ زین بھی غصے سے بڑبڑائے اور وہ مسکینی سے بولا۔

”چاچو! یہ انتظامیہ کا قصور نہیں۔ یہ تو ایک اوپن آفر ہے جو بچے اضافی رقم جمع کرنا چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں وقت کا ضیاع۔“

”مگر شاہ میر! تم تو ان بچوں کے لیے رول ماڈل ہو ناں پھر تم سے یہ چوک کیوں ہوئی؟“

”میرا پڑھنے میں دل نہیں لگتا۔“ ایک نپا تلا جواب آیا۔

”پھر کس چیز میں دل لگتا ہے؟“ دادو جان نے تپ کر کہا۔

”مجھے سوشل ورک کا شوق ہے مجھ سے نہیں ہوتیں یہ پڑھائیاں۔ سوشل ورک کے لیے انسان کا

حساس ہونا ضروری ہے اور وہ میں ہوں۔“

”سوشل ورک کوئی کام نہیں ہوتا آپ نے بیوی بچوں کو آگے چل کر کیا کھلاؤ گے سوشل ورک کی بریائی پا سوشل ورک کی شہرتیں؟“ شاہ زمان چاچو کا غصہ دیدی تھا اور شاہ میر کو جیسے ایک دم سے کچھ یاد آیا تھا۔

”تم نے پیپرزمین چیشنگ بھی کروائی تھی جس کی وجہ سے اس بار تمہارا ایگزامین میں بیٹھنا بھی ناممکن تھا وہ تو پرنسپل صاحب نے مجھے فون کر لیا اور میں نے معاملہ رفع دفع کروا دیا۔“

”چیشنگ کیوں کروائی تھی؟“ اس پر سوال سامنے آیا اور شاہ میر کھڑے سے بیٹھ گئے۔

”اپنا جگر پیسے دے رہا تھا میں نے کہا کوئی براہیم نہ اسے اس لیے بوٹیاں بنوائیں اور لگ گیا کام سے۔ اس نے تو منہ نہیں لگایا مگر دوسرے اسٹوڈنٹس نے دلچسپی دکھائی تو میں نے وہ ساری بوٹیاں وہاں چلا دیں لوگ ایک بوٹی کے سو روپے لے رہے تھے میں نے پچاس روپے میں دے کر پرافٹ کما لیا اب یہ کوئی بڑی بات ہے؟“

سب بڑے تو ہکا بکا ہوئے ہی تھے خود دائم بھی حیران رہ گیا تھا۔

”اتنے بزنس مائنڈڈ کب سے ہو گئے شاہ میر۔“ کمرے میں خاموشی تھی۔ کسی کو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا تب شاہ زین چاچو نے کہا۔

”اچھا تو یہ بولی مافیا کا حصہ بنا کون سا سوشل ورک ہے۔“

شاہ میر نے شرارت سے دیکھا ”دیکھیے اتنی بڑی کتاب سے مختصر مواد نکالنا، ناکرو کروانا پھر جان پر کھیل کر اپنے او بیکیشن تک پہنچانا سوشل ورک پس نیکی ہے۔“

”نیکی۔“ دادو جان کی چیخ نکل گئی تھی۔

”کسی کی مدد کرنا نیکی ہی تو ہے بابا! رسلان سے کہا گیا اور وہ سب کمرے سے باہر چلے گئے۔ شاہ میر وہیں بیٹھ رہے مگر دائم باہر نکلا تھا۔ شاہ میر زنگ کر رہے تھے۔

”دیکھ رہے ہیں ناں بابا وہ کتنا بگڑ گیا ہے اسے اب

میرے غلط صحیح کی تمیز بھی ختم ہو گئی ہے۔ باقی چھوٹے بچے اس سے کیا سیکھیں گے؟ نیلو فر ٹھیک ہتی ہے، دائم اس کے ساتھ رہا تو یہ بھی بگڑ جائے گا اور میں نے اپنے بیٹے کے حوالے سے بہت اچھے اچھے خواب دیکھے ہیں۔“

دادو جان سر جھکا کر رہ گئے۔ دوسرے دن وہ کالج گیا۔ کالج کا ایک لڑکا شاہ میر سے بہت زیادہ ریشہ منطقی ہو کر مل رہا تھا۔

”شکریہ شاہ میر! اگر آپ اس چیشنگ اسکینڈل سے مجھے نہ بچاتے تو میری ماں تو یہ صدیہ برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی چنانچہ نہیں کیا سو بھی تھی مجھے شارٹ کٹ مارنے کی۔“

شاہ میر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا پھر نرمی سے بولے ”شکریہ تو مجھے تمہارا کہنا چاہیے اگر تم مجھے دائم کے نوٹس بنوانے میں پہلپ نہ کرتے تو میرا جگر اسے پاس نہیں لاسکتا تھا۔“

”کہاں شاہ میر! ساری محنت آپ نے کی تھی میں نے تو صرف پوائنٹس بتائے تھے ساری کتابیں لکھنا سب کچھ لکھنا لکھنا یہ تو ساری آپ کی محنت ہے۔“

دائم کا داغ ایک دم بھک سے اڑ گیا تھا ”مگر آج وہ سب کچھ نہ سنتا تو یہ ساری باتیں ہمیشہ راز رہتیں مگر ان باتوں پر کسی نے یقین نہیں کرنا تھا شاید وہ خود بھی نہ آتا یعنی وہ بے چارے اس لیے اس سے دور رہتے تھے عدم الفرصت ہوتے یا ٹھکے ہوئے ہوتے تھے اور اس نے کیا کیا معنی دیے تھے اور وہ بوتلیں جمع کرنے کا

الگ بکدم اسے کچھ یاد آیا تھا اور وہ ان کی اس کام میں مدد کرنے والے دوست ظفر کے سر ہو گیا تھا۔

”بتائیے ناں ظفر بھائی! شاہ میر بوتلوں کے پیسے کہاں گناتے ہیں۔“

”وہ بڑا ذہین ہے۔ اس کی کوئی بھی جسمانی یا ذہنی ایکسٹرا سٹرافالٹو یا وقت کا ضیاع نہیں ہوتی۔“

”پھر بولے ناں کیا کرتے ہیں وہ روزانہ پیسوں

نے اس کے غلط صحیح کی تمیز بھی ختم ہو گئی ہے۔ باقی چھوٹے بچے اس سے کیا سیکھیں گے؟ نیلو فر ٹھیک ہتی ہے، دائم اس کے ساتھ رہا تو یہ بھی بگڑ جائے گا اور میں نے اپنے بیٹے کے حوالے سے بہت اچھے اچھے خواب دیکھے ہیں۔“

ظفر بھائی نے ادھر ادھر دیکھا اور بولے ”میرے پاس ایک منی باکس ہے شاہ میر روز کے پیسے وہاں جمع کرواتے ہیں پھر ایسے اسٹوڈنٹس وغیرہ کی مدد کرتے ہیں جنہیں پیسوں کی ضرورت ہو مگر اس کی جیب اجازت نہ دیتی ہو وہ کم آمدنی والے گھرانے کے بچوں کو کتابیں اور دیگر چیزیں مہیا کرتے ہیں۔“

”بوتلیں جمع کرنے سے اتنی رقم جمع ہو جاتی ہے؟“ اس سے حیرت ہوئی۔

”نہیں شاہ میر! منی باکس منی کا ایک اچھا خاصا حصہ بھی ڈالتے ہیں پھر ہم سب دوستوں کا گروپ بھی اس میں حصہ ڈالتا ہے سو اب تک اچھا خاصا کام کر چکے ہیں۔ اس بار پرنسپل سے مل کر کالج میں ایک پیڑ

کے سائے تلے اپنا کین بھی لگایا ہے۔ پچھلی کلاسوں سے پرانی کتابیں آدھی قیمت میں لے کر ضرورت مند اسٹوڈنٹس میں تقسیم کرتے ہیں رجبشہر نل سب کچھ۔“

”اچھا تب ہی پرنسپل صاحب نے بابا جان کی باتوں پر اتنی جلدی شاہ میر کو معاف کر دیا تھا وگرنہ یہ پرنسپل صاحب بہت ایمان دار اور سخت گیر پرنسپل مشہور تھے۔“

”بابا خوش ہیں کہ یہ ان کی معذرت اور نام کا کمال ہے اور وہ خاموشی سے اپنا کمال دکھا کر ساری لعین طعن خود سے کرا لگ کھڑے تھے۔ نیکی کیا ہے اسے کس طرح کرنا چاہیے یہ صرف شاہ میر جانتے تھے تب ہی تو ان کا واہنا ہاتھ تلاوت کرتا تھا اور بابا جان ہاتھ لا علم رہتا تھا۔ وہ جو ہر وقت ان کے ساتھ ہونے کا دعوے دار تھا اسے بھی کہاں پاتا تھا۔

”میں ہمیشہ شاہ میر کو غلط سمجھتا ہوں۔“ اس نے گہرا المبا سانس کھینچا اور خاموشی سے گھر آ گیا۔ غیر متوقع طور پر شاہ میر اسے ڈریسنگ روم کے سامنے کھڑے ملے ڈارک براؤن کرتا سفید شلوار میں ان کا رنگ کھل رہا تھا۔

”کہیں جا رہے ہیں؟“ ان کی بڑی بڑی آنکھوں نے اس کے خود خال کو آشنائی سے چھوا مگر وہ کچھ

نے اس کے غلط صحیح کی تمیز بھی ختم ہو گئی ہے۔ باقی چھوٹے بچے اس سے کیا سیکھیں گے؟ نیلو فر ٹھیک ہتی ہے، دائم اس کے ساتھ رہا تو یہ بھی بگڑ جائے گا اور میں نے اپنے بیٹے کے حوالے سے بہت اچھے اچھے خواب دیکھے ہیں۔“

”بابا! رسلان سے کہا گیا اور وہ سب کمرے سے باہر چلے گئے۔ شاہ میر وہیں بیٹھ رہے مگر دائم باہر نکلا تھا۔ شاہ میر زنگ کر رہے تھے۔

”دیکھ رہے ہیں ناں بابا وہ کتنا بگڑ گیا ہے اسے اب

بولے نہیں تھے۔

”شاہ میر! ابھی تک خفا ہیں۔“ اس نے ان کا ہاتھ پکڑا اور یکدم ہراساں ہو گیا۔

”آپ کو اتنا تیز بخار ہے۔“

”آپ کہیں نہیں جا رہے ہیں۔ سنا آپ نے۔۔۔“ اس نے کمرے کو لاک کر دیا تھا مگر وہ آہستگی سے کولہا پوری پہن رہے تھے۔

”اگر آپ نہیں رُکے تو میں دادی جان کو بلا لوں گا۔“

”جاؤ! اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو۔“ یہ پہلا اور آخری جملہ تھا۔

”آپ مجھے تو لے جاسکتے ہیں ناں۔“ وہ نئے سرے سے منت پر اتر آیا تھا۔

”عین موقع پر ساتھ چھوڑنے والوں اور اعتبار نہ کرنے والوں کو میں کہیں نہیں لے کر جاتا۔“

”آپ کو پتا ہے اگر آپ مجھے ٹینشن دیں گے تو پھر خود بھگتیں گے۔“

یہ اس کا آخری حربہ تھا جو وہ کبھی کبھی ضد پوری کروانے کے لیے اماں جان بابا جان یا جنمو کے سامنے آزما تا تھا بلکہ خود بخود ہو جایا کرتا تھا غصے اور ٹینشن سے اس کے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی تھی بظاہر اس کی طبی کوئی وجہ نہیں تھی ہزار بار کے ٹیسٹ یہی کہتے تھے مگر اس کے بچپن کا یہ مسئلہ آج تک برقرار تھا۔

شاہ میر کے سامنے ایسا کرنے کی ضرورت کبھی نہیں پیش آئی تھی وہ ہمیشہ ماموں کے گھر رہا تھا اور نیلو فر بھابھی اس کے متعلق کوئی اپ ڈیٹ کسی کو دینا مناسب نہیں سمجھتی تھیں۔ یہ ان کے بیٹے کی کمزوری تھی اور وہ گھر میں اس کمزوری کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی تھیں۔

”شاہ میر! آپ اگر اکیلے گئے یا اور کچھ دیر مزید مجھ سے ناراض رہے ناں تو میں مرجاؤں گا۔“ اس کا سانس تیز ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ شاہ میر نے دھیرے سے مڑ کے اسے دیکھا وہ بیڈ پر بیٹھے سے یکدم گر گیا تھا اس کے سانس

لینے کی آواز بہت تیز تھی کیسا غصہ کہاں کا غصہ شاہ میر یکدم بھاگ کر اس کے پاس دوڑے آئے تھے۔

”کیا ہو گیا ہے پاگل! ابھی تو اچھا بھلا تھا۔“ انہوں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا تھا۔ اس نے شاہ میر کے کندھے پر سر رکھ دیا تھا۔

”آپ ابھی تک خفا ہیں مجھ سے۔۔۔“ اس سے جملے بھی آوا نہیں ہو رہے تھے۔ اس نے ان کے کندھے پر آنکھیں رگڑی تھیں اور شاہ میر ہونق رہ گئے۔

”بھاڑ میں گئی ناراضی یہ ہوا کیا ہے؟ بچپن میں اماں جان سے سنا تھا ضد میں لمبی سانس کھینچ لیتا ہے نیلا پیلا ہو جاتا ہے مگر اب تو اتنا بڑا ہو گیا ہے تیری یہ عادت ابھی تک نہیں گئی۔“

”ہاں زیادہ اپ ڈیٹ ہو گئی ہے۔“ وہ پھیکا سا ہنسا شاہ میر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر درود پڑھنے لگے۔ اس کی دھڑکنیں آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگی تھیں پندرہ منٹ بعد وہ بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔

”کوئی ٹیبلیٹ لیتے رہے ہو ایسے موقعوں پر؟“ وہ سر ہلا کر ٹیبلیٹ نکال کر دکھانے لگا تھا۔

”یہ تو اعصاب کوری لیکس کرنے کی ٹیبلیٹ ہے بہت مائنو M.G کی ہے۔ ڈونٹ وری آئندہ صرف درود سے کام چلانا۔“ انہوں نے اسے خود سے لپٹا لیا اور وہ بے ساختہ بولا۔

”آئی لو یو شاہ میر! آپ کی جگہ کوئی کبھی بھی نہیں لے سکتا۔“

”مجھے پتا ہے اسی لیے تو خرے دکھا رہا تھا۔“ وہ نے اور تھوڑی دیر بعد ہمیشہ کی طرح دونوں ساتھ ہی نکلے تھے۔

”یہ دائم ہر وقت ان کا دم چھلا کیوں بنا پھرتا ہے؟“ اس لیے بھابھی کہ وہ دونوں چاند اور ہالہ کی طرح ہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہی جتتے ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے الگ کریں گی تو دوسرا بے رنگ بے ذائقہ ہو جائے گا۔“

نیلو فر بھابھی نے مڑ کر عائشہ کی طرف دیکھا مگر کچھ

کہ بغیر آگے بڑھ گئیں۔

دائم ایک نچلے متوسط طبقے کی کلاس شادی میں شریک تھا اور اسے ایک بار پھر شرمندگی ہو رہی تھی اس نے شاہ میر کو کتنا غلط سمجھا تھا لڑکی کی شادی تھی اور شاہ میر اسے رش میں چھوڑ کر کہیں باہر گم ہو گئے تھے۔ بوڑھی عورتیں اس کا شکریہ ادا کر رہی تھیں اور وہ شمال خان کو دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”آپ کا بھائی بہت کمال کا آدمی ہے۔ اس نے مجھ جیسے شخص کو سدھارا ہے یہ صرف وہ ہی کر سکتا تھا۔ میں بہت برا انسان تھا۔ گھر کے حالات کی وجہ سے اتنا گرا ہوا کام کرتا تھا پھر ایک دن تمہارا بھائی ملا ہم اسے ہی عام گاڑی سمجھا وہ روز ہمیں ملتا ہمیں حالات سے لڑنے کے قسمت بدلنے کے نئے راستے بتاتا مگر ہر راستہ مشکل ہر راستہ ٹھنک لگتا۔ جب حرام منہ کو لگ جائے تو محنت کرنے کو ہی نہیں کرتا۔ ہمارا بھائی کی حال تھا ہم قسمت کو اپنی ذمہ داریوں کو اپنے پرے ہونے کی وجہ سمجھ کر مطمئن رہتا وہ ہمیں ایسے لوگوں کے قصے سناتا جو ہم سے بھی گئی گزری زندگی گزارتے تھے مگر حرام نہیں کھاتے تھے ہم اس کی باتوں سے چڑ جاتا اس سے لڑ پڑتا مگر وہ بڑا لوگ تھا ہم کو برداشت کرتا، وہ اکثر اپنی ٹیبلیٹ پر ہماری سروس کی مانگ رکھتا ہمیں اچھی خاصی شب دیتا منیجر تمہارے بھائی کے نام کی وجہ سے جپ رہتا تھا ورنہ ہونٹل کے کمروں کا سروس عملہ اور ڈاننگ ہال کا سروس عملہ الگ الگ ہوتا ہے مگر وہ ہمیں ہی اپنی ٹیبلیٹ پر حاضر رکھتا۔“

دائم کرسی پر بیٹھ گیا اور شمال خان نے پھر سے کہا تھا۔ ”اس دن بھی وہ ایسے ہی ڈاننگ ہال سے اٹھ کر ہمارے پیچھے آ گیا تھا۔ اس وقت ہم روم نمبر 7 کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک عبایا میں ڈھکی چھپی لڑکی آ کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”گل۔“ اس کا لہجہ خاص فرنٹشو کا تھا ہمارا داغ بھک سے اڑ گیا تھا۔

”تم یہاں کیسے آیا؟“ ہم اس پر چیخا تھا تب ہی روم نمبر 7 کا آدمی ہمارے سامنے آ گیا۔ اس نے گل کو دیکھ کر سیٹی بجائی۔

”ہم کو یہی چاہیے۔“ اور اس کا یہ جملہ سن کر ہماری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

ہم اس آدمی سے لڑ پڑے۔ ہم نے اس کا مار مار کر بھر کس نکال دیا پھر ہم گل کی طرف مڑے تو اس نے نقاب اتار دیا ہم نے ٹھنڈی سانس لی ہم نے اس وقت سوچا ہماری معصوم گل اس شہر کے راستے کہاں جانتی ہے جو اتنے بڑے ہونٹل میں آئی۔ وہ کوئی اور لڑکی تھی اور جب ہم پھر سے سنبھل رہا تھا، تمہارا بھائی یکدم سے سامنے آ گیا اور نرمی سے بولا۔

”یہاں واقعی گل بھی ہو سکتی تھی کیونکہ ہم بدی چھپ کر کھتے پردوں میں کریں کبھی نہ کبھی وہ ہمارے گھر کا راستہ ضرور دیکھتی ہے ہمارے گھر کے اندر داخل ہو کر ہم پر ہستی سے اور کہتی ہے اب مگر جاؤ اگر مکر سکتے ہو کیوں بھول گئے اللہ کی بے آواز لاٹھی کو، اللہ کے مکافات عمل کو۔“

”ہم نے سنا اور ہم دیوار سے لگ گیا۔ پہلی بار زندگی نے بڑی طرح ذلیل کیا تھا آئینہ دکھایا تھا ہم نے سوچا اگر واقعی یہاں کسی دن گل کھڑی ہو اور اسے استعمال کرنے والا کوئی اور کمینہ آدمی ہو تب تمہارے بھائی نے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک بات کی تھی۔

”تم یہ کیوں نہیں سوچتے ہر لڑکی گل ہی ہوتی تھی گل ہی ہوتی ہے معصوم مجبور بے چاری سی۔ تم تو اس علاقے سے تعلق رکھتے ہو جہاں کے لوگ عورتوں کی عزت کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں اور علاقے قوم کی تخصیص نہیں کرتے سب عورتیں چاہے ان کا تعلق کہیں سے ہو تمہارے لیے قابل احترام ہیں اور یہی تمہاری اس جی داری کا غرور رہا کرتا ہے۔ کچھ بھی ہو جائے ہماری پشت پر ہمارے پٹھان

بھائی ہمیں کبھی غیر کے سامنے جھکنے اور ذلیل نہیں ہونے دیں گے۔

ہم اس دن بہت رویا تھا پھوٹ پھوٹ کر۔ ہم نے مرنے کی کوشش بھی کی مگر تمہارے بھائی نے ہمیں بانہوں میں لے کر روک لیا تھا پھر کما حرام موت ایک پکا مسلمان نہیں مرا کرتا توبہ کا در ہمیشہ کھلا ہوتا ہے۔ موت سے پہلے توبہ کر لی جائے تو وہ رب کائنات کبھی مایوس نہیں لوٹاتا۔

ہوٹل میں ہنگامے اور ہوٹل کے مہمان کی پٹائی پر ہم پریشان تھے کہ تمہارا بھائی یہاں بھی ہمارا ڈھال بن گیا اس نے اس مہمان کو ایک ویڈیو فلم دکھائی پھر سخت درشت لہجے میں بولا تھا ”اگر تم نے اس معاملے کی اطلاع انتظامیہ کو دی تو یہ ویڈیو فلم تمہاری بیوی کو بھیج دی جائے گی۔ میں نے سنا ہے وہ غصے میں قتل بھی کر دیا کرتی ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ تمہارے یہ سارے عیش و آرام اور عیاشی اسی کی دولت کے مرہون منت ہے۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے تم یہ عیش برقرار رکھنا چاہتے ہو یا گناہنا۔

تمہارے بھائی نے اتنے آرام سے ہمارا کیس حل کیا کہ ہماری نوکری بھی نہیں گئی اور آج ہم اپنی گل کی شادی کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یہ سارا انتظام اور چیز سب تمہارے بھائی کے ٹرسٹ نے دیا ہے۔ تم بہت خوش نصیب کہ اتنے فرشتے انسان کے ساتھ رہتے ہو ایسا لوگ ہی تو دھرتی کا حسن ہیں ان کی زندگی دشوار اور مخالفت سے بھری ہوتی ہوئی ہے مگر ان کے دامن دعاؤں اور محبتوں سے خالی نہیں ہوتے۔

دائم بہ روز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ شاہ میر کو ڈھونڈتا ہوا باہر آیا۔ وہ باہر مردوں کے ساتھ روایتی رقص میں مصروف تھے۔ مگر خوش مطمئن۔

”والو سرجی؟“ اس ملال بھری اطلاع نے اسے پوری طرح خوش نہیں ہونے دیا اور اس کے دل کو پھر سے گھسی میں لے لیا تھا۔

”یہ آدمی بہت کمال آدمی ہے۔“ وہ کرسی پر بیٹھنا ہی تھا کہ ایک نئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”آپ کون؟“ اس نے سوالیہ دیکھا۔ سامنے بیٹھا شخص مسکراتے لگا۔

”کسی زمانے میں مجھے گمان تھا کہ میں بہت اعلا پائے کا جیب کترا ہوں میں نے ایک بار اس شخص کی جیب صاف کی تھی۔ بہت بڑی رقم ہاتھ لگی تھی پندرہ دن آسانی سے کٹ گئے تھے پھر پندرہ دن بعد یہ وہیں کھڑا تھا۔ میں نے رش میں پھر اس کی جیب کاٹ لی۔ رقم اس بار بھی بری نہیں تھی پھر یہ معمول ہو گیا مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کیا شخص ہے اس کی ہر ماہ جیب کتنی ہے مگر یہ شور و اظہار نہیں کرتا آج کے دور میں تو امیر سے امیر آدمی بھی ”پورا نہیں پڑتا“ کی دہائیاں دیکھتا ہے۔ یہ کون سی فیری لینڈ کا قصبہ ہے جو یہاں اس دنیا میں آدھرا ہے یہ افسانوں کی بات سی مگر میں واقعی اس کے سامنے آن کھڑا ہوں۔

”سرا میں رفتی۔“ وہ ایک پٹھان کے ہوٹل پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس نے مجھے مسکراتے دیکھا اور کہا۔

”اچھا ہوا مفتی صاحب! آپ آگئے۔ پلیر میری چائے کا بل پے کر دیجیے کیونکہ آج غلطی سے میں ہسپتال کا وارنٹ لانا بھول گیا۔“

میرا تو وہ حال تھا کہ سر اٹھاؤں تو کیسے اس شخص نے میرا کندھا تھاما۔

”ہو جاتا ہے رفیق صاحب! جب انسان مجبور ہو اس پر ذمہ داریاں ہوں وہ پڑھا لکھا بھی ہو مگر پھر بھی اچھی نوکری نہ ملے تو انسان ایسے شارٹ کٹ مار ہی لیتا ہے پہلے میں بھی ایسے ہی کام کرتا تھا مگر پھر ایک دن ایسا ہوا کہ میں نے جس بوڑھے آدمی کا وارنٹ نکالا اس کے وارنٹ میں چند سو کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ اس کی بیوی کینسر کی مریضہ تھی اور وہ اس کے لیے ریڈ سیل کی بوتل لینے نکلا تھا۔ اس نے اس خط میں اپنے بیٹے کو گھر کے حالات سنائے تھے۔ اس کے دو بیٹے تھے اور دونوں ملک سے باہر سمیٹل اور وہ اتنا خوددار تھا کہ اس نے وہ خط لکھ تو لیا تھا۔ مگر پوسٹ نہیں کر پایا مجھے وہ چند سو نہیں سمندر جتنے آنسو لگے جو اس کی بے چاری

اور کم مائیگی نے بہائے تھے۔ میں نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا اور اس کے گھر پہنچا وہ بوڑھا آدمی اپنے گھر کے پھوٹے سے صحن میں اداس بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں وارنٹ دیا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

”شکریہ ایذا اگر تم نہ آتے تو میری تو شناخت ہی گم ہو گئی تھی۔ میں کسی کو کیسے بتاتا میرا کیا نام ہے میں کون ہوں کیا میں واقعی اس ملک کا شہری ہوں۔“

وہ چپ ہو گئے تب میں نے سوچا تھا یہ شخص نفسیات کی مار مار رہا تھا۔

”کیا میں واقعی اس ملک کا شہری ہوں۔ یہ ایک جملہ مجھ میں اٹک گیا۔ میں رونے لگا تھا۔ اس شخص نے میرے ہاتھ میں ایک کارڈ پکڑ لیا۔

”یہاں کل چلے جائیے گا۔ میرا ایک دوست ہے اس کو سیزور کر کی اشد ضرورت ہے۔ سیزور آپ کے کھانچوں سے کم ہوگی مگر عزت کی نمان بھرم کی اللہ کے حکم سے میں گارنٹی دیتا ہوں۔“

میں اٹھا اور اپنی جیب میں سے ان کا وارنٹ نکالنے لگا مگر وہ وارنٹ ان کے ہاتھ میں تھا۔

”مجھے لگا اب آپ کو ان پیسوں کی ضرورت نہیں اس لیے اپنا وارنٹ نکال لیا۔“

”آپ اتنے ماہر ہیں تو آپ۔“

تمہارا بھائی زور سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا میں باہر نکلا اور ایک پھیلے والے نے بتایا ”وہ جو بلیک گاڑی کھڑی ہے ناں اسی شخص کی ہے۔ بہت بڑا آدمی ہے جس من موچی سا ہے امیر غریب کا فرق نہیں کرتا۔“

میں نے سر ہلایا اور اسی راستے پر چل پڑا جس کا راستہ تمہارے بھائی نے بتایا تھا۔ بہت قدر کرتا اس کی۔ ایسے لوگ بہت کم کم دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔

اس نے دیکھا وہ ان سب باتوں سے بے بہرہ ابھی تک آگ کے شعلوں کے گرد رقص کر رہے تھے۔

”اس کی روح پاکیزہ ہے اسے دنیا داری سے کوئی مطلب نہیں۔ یہ جبران کے خیالات کا آدمی ہے۔ یہ بڑی باتیں ہمیں کرتا لمبی لمبی پریس کانفرنسیں نہیں کرتا چھوٹے چھوٹے عملی قدم اٹھاتا ہے یہ

جانتا ہے سخاوت کرنا کیا ہوتا ہے یہ جانتا ہے اگر آج ہم ہاتھ بھر بھر کے دیں گے تو ہمارا دنیاوی صندوق بھلے خالی رہ جائے مگر ہماری بھینگی کی جگہ پر سرسبز پھولوں کی کیا ریاں بنیں گی ہماری قبر پر آسمان خیم افشانی کرے گا اور ہم بہت سارے دلوں میں زندہ رہ جائیں گے زندگی کے بہت سارے قصوں میں آج کے سننے گئے اور ان سے ملتے جلتے بہت سارے قصوں میں امید کی طرح۔“

”شاہ میرا بہت دیر نہیں ہو گئی ہمیں۔“ اس نے رقص کرتے شاہ میر کا ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ وہ رک گئے۔ ان کے گندی رنگت میں سارے جسم کا خون لشکارے مار رہا تھا۔ بخار اور یہ رقص۔ دائم کو لگان کا نمیر پھر اور بڑھ گیا ہے۔

”آپ کا بخار بہت تیز ہو گیا ہے۔“ وہ فکر مند ہوا مگر انہیں پروا کب تھی۔ وہ شمال خان سے گلے مل رہے تھے رفیق سے ہاتھ ملارہے تھے۔

”آج کی تقریب میں مجھے یاد رکھ کر آپ نے میری عزت پر بھاری شاہ میر صاحب!“

رفیق نے تشکرانہ دیکھا اور وہ ہنس پڑے ہمیشہ کی طرح پھر مسکراتے ہوئے۔

”بہنیں تو سب کی سا بھنچی ہوتی ہیں رفیق صاحب!“

”آپ نے اپنی مصوفیت میں سے وقت نکالا یہ واقعی بڑی بات ہے ذکر نہ آج کل تو لوگوں کے پاس اپنے لیے بھی وقت نہیں ہے۔“

رفیق مسکراتے لگا اور وہ گاڑی میں آن بیٹھے۔ دائم کا دل چاہا وہ ہسپتال والی بات کا بھی پوچھے مگر موقع نہیں ملا۔ وہ گھر میں داخل ہوئے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔

”کہاں سے آرہے ہیں بر خور وار؟“

”باباجان! ایک دوست کی بہن کی شادی تھی۔“

”شام سے گئے ہوئے ہو اور اب آرہے ہو۔“ نیلو فر بھا بھی جھلپا کر بولیں۔

اور شاہ میر نرمی سے بولے ”شادی کے انتظامات بھی تو دیکھنے تھے باباجان! اس لیے دیر ہو گئی۔“

”تم دائم کو بگاڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے

ہم تینوں کئی کئی گھنٹے ساتھ گزارتے تھے۔ آپس میں
بٹنے بولتے رہتے تھے اور ایک دوسرے پر لطیفے فٹ
کر کے خوب مزالیتے تھے، مگر اب وہ بات نہ رہی تھی۔
راجہ نے ہمارے ساتھ بیٹھنا بہت کم کر دیا تھا۔ اگر
کبھی آتی بھی تو اس کا رویہ عجیب و غریب ناقابل فہم سا
ہوتا تھا۔

سکھ گریٹین



کچھ دنوں سے راجہ عجیب سی ہو رہی تھی، کبھی
بٹنے بٹنے خاموش ہو جاتی اور کبھی ایسی گم صمم جیسے وہ مجھ
سے اور شاعری سے کٹ کر لا تعلق سی ہو گئی ہو۔ ارد گرد کی
دنیا سے اس کا رابطہ برائے نام رہ گیا تھا۔ وہ نہ جانے
کن خیالات میں الجھی رہتی تھی۔ شاعری اور میں اس کی
یہ کیفیت سمجھنے سے قاصر تھیں۔ وہ پہلے ایسی نہ تھی۔

ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ تم واقعی زندگی کی خوب صورتی
ہو۔“

شاہ میر حیران اور دائم خوش ہو رہا تھا جیسے یہ ساری
تعریفیں اسی کی ہو رہی ہوں۔

”پتا ہے پورے بیس دانت ہیں اب اسے اندر
بھی کر لو۔“

وہ کان کے قریب گنگنائے۔ وہ جھینپ گیا۔ نیلو فر
بھا بھی بڑھانے لگیں۔ شاہ ہر روز مسکرانے لگے اور ہلکا
نے اچانک پوچھا۔

”تمہیں بخار ہو رہا ہے شاہ میر!“

”نہیں تو بابا! بھٹی پر روٹیاں لگا کر آ رہا ہوں اس لیے
گرم ہو رہا ہوں۔“ دائم پھر بٹنے لگا اور بابا نے شاہ میر کا
کان پکڑ لیا۔

”تالاق! اپنے بابا پر پوائنٹ مارتا ہے۔“ شاہ میر کا
نہیں بولے اور دائم نے سوچا ”کاش وہ شاہ میر کی بیٹی
فیصد ہی کالی کر سکتا تو دنیا اور آخرت دونوں شد
جائیں مگر اچھے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا بھی تو کم کمال
نہیں۔ اچھے لوگوں کو آج کل کون پسند کرتا ہے؟ کوئی
نہیں۔ اور وہ یہ کمال رکھتا تھا۔ اس لیے خوش تھا بہت
سی دعائیں اس کا بھی احاطہ کر رہی تھیں، دعائیں جو
قسمت، حال، مستقبل سب کچھ بدل دیتی ہیں۔
اور وہ سر سے پیر تک بدلنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔
وہ بابی گھر والوں کی طرح کفران نعمت نہیں کرنا چاہتا تھا
اور یہی صحیح فیصلہ تھا زندگی کا۔“

نہیں دینا چاہتے۔“ یہ جیابھا بھی تھیں۔

”بھلا دیر سے گھر آنے کا مطلب ہمیشہ بگڑ جانا ہی
کب ہوتا ہے ہو۔“

”بابا جان! اسے آپ کی اور اماں جان کی شہ ہے
جو یہ کسی کے اختیار میں نہیں آتا۔“

شاہ میر خود کو گزور محسوس کر رہے تھے، نہیں برا
لگتا تھا اگر ان کی وجہ سے ان کے اماں جان یا بابا کو سننا
پڑتا۔ وہ اس صورت حال سے بچنے کے لیے کوئی
معرکتہ الارا اقتباس سوچ ہی رہے تھے کہ بابا جان نے
انہیں یکدم سینے سے لگا لیا۔

”میں سمجھتا تھا میں نے سب کچھ گنوا دیا۔ شہری
زندگی نے مجھ سے میری مٹی کی خوشبو رشتے ناتے
سب چھین لیے، مگر آج جب بھائی جی کی طرف گیا تو
پورے گاؤں نے کسی وی وی آئی پی کی طرح ٹریٹ
کیا۔ ہر شخص شناسا، ہر شخص اپنا بن کے ملا سب ان
ذمہ داریوں کو احسن طور پر نبھانے پر میرا شکریہ ادا کر
رہے تھے جو میں نے شہر کی زندگی جینے کے باوجود
اوسوری اور لا تعلقی کی نذر نہیں کی تھیں۔“

آج بھائی جی کا فون آیا تھا وہ شہر آ رہے تھے۔ یہاں
کے ایک بڑے ہسپتال میں ان کے دل کی والو سرجری
تھی، میں اس لیے بھاگا گیا، شاہ میر! واقعی جب رشتے
آپ کے ارد گرد ہوں تو آپ کو لگتا ہی نہیں ہے یہ
سرکل کوئی توڑ سکتا ہے یا یہ سرکل ٹوٹ سکتا ہے مگر یہ
بیماریاں دکھ، یہ انسان کے اندر الارم بجادیتے ہیں۔
میں بھی پہلی بار ڈر گیا بھائی جی کو خود شہر لایا ہوں اور اس
وقت تمہارے سامنے کھڑا تمہارا جتنا شکریہ ادا کروں کم
ہے۔

تم نے جس طرح سے میری ذمہ داریاں اپنے
کندھوں پر لیں، نہیں نبھاتے رہے، ان سب کے
دلوں میں مجھے زندہ رکھا، وہ صرف تم ہی کر سکتے تھے
بزنیس ہر کوئی کر سکتا ہے۔ زندگی بھی بری یا بھلی، ہر کوئی
جی سکتا ہے مگر بزنیس میں رشتوں کی نگہ داری نبھا دینا،



کبھی ایسا لگتا کہ جیسے وہ خود کو ہم دونوں سے الگ اور برتر سمجھنے لگی ہے اور کبھی ہمارے درمیان رہتے ہوئے بھی وہ ہم سے دور ہوئی۔ ہماری باتوں پر وہ زیادہ توجہ نہ دیتی بلکہ ہمارے سے ہماری کوئی اہمیت ہی نہ رہی تھی۔ اس کے اس رویے سے ہم دونوں ہی بے چین ہو گئی تھیں۔

ہم تینوں کی تھکن سارے محلے اور خاندان میں مشہور تھی۔ میں یعنی نورین حمید ثناء اور رابعہ آپس میں کزنز بھی تھیں اور گہری دوست بھی۔ ہم تینوں کے گھر ایک ہی علاقے میں تھے۔ ہمارا بچپن ساتھ گزرا تھا۔ ہم بہت سی شرارتوں میں ایک دوسرے کی رازدار اور شریک تھیں۔ بہت سی ڈانٹیں ہم نے اجتماعی طور پر کھائی تھیں اور بہت سی حماقتیں مشترکہ طور پر سرانجام دے کر باجماعت شرمندگی بھی اٹھائی تھی۔ ایک دوسرے کو ہر تہوار خصوصاً عید اور سالگرہ وغیرہ پر تحفے تحائف دینا ہمارے بچپن کی معصوم سی روایت تھی۔ اس وقت کہ جب دل معصوم اور بے ریا ہوتے ہیں ایک دوسرے سے بے غرض محبتیں اور رابطے ہوتے ہیں ہم تینوں جب ہی سے ایک دوسرے سے نہتی تھے۔ ایک جیسے کپڑے ایک جیسے پرس اور ایک ہی فلیپور کی آکس کریم کھانا ہم تینوں کی معصوم سی ادا میں تھیں۔ بچپن بیٹنے کے بعد نوجوانی کا دور بھی ہم تینوں نے بہت مثالی اور یادگار طریقے سے گزارا۔ ہماری ہر تفریح اکٹھی ہوتی تھی۔ ایک ہی کالج میں داخلہ اور واپسی کے وقت ایک ساتھ راستے طے کرتے ہوئے ایک دوسرے پر شوخ فقرے اچھالتا ہماری عادت تھی۔

اکثر شام کی چائے ہم تینوں اکٹھے ہی پیتے تھے۔ کبھی میں اور ثناء رابعہ کے گھر چلی جاتیں کبھی رابعہ اور ثناء میرے گھر آ جاتی تھیں اور بھی میں اور رابعہ مل کر ثناء کے گھر پر دھاوا بول دیتی تھیں۔ وہ ساری شام ہلے گلے اور مزے میں گزرتی تھی۔ فلموں پر تبصرہ ڈراموں کا تذکرہ اور نئے فیشن میگزین دیکھنا ہمارا محبوب مشغلہ تھا یہاں تک کہ شاپنگ کا پروگرام بھی اکٹھے

ہی بنتا تھا۔ ایک دوسرے کی پسند اور انتخاب کو بد نظر رکھ کر ہم تینوں اپنی ہر قسم کی شاپنگ کیا کرتے تھے، مگر اب تو جیسے وہ بات ہی نہ رہی تھی۔

”پتا نہیں اسے ہماری کیا بات بری لگ گئی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ ایک دن ثناء نے مجھ سے کہا۔

”اوہ۔۔۔ محترمہ کچھ زیادہ ہی اونچی ہواؤں میں اڑنے لگی ہیں جب سے نکاح ہوا ہے دماغ ہی نہیں مل رہا جیسے دنیا میں ایک صرف اسی کا نکاح ہوا ہے۔“

میں نے اتنے روز سے دل میں پلنے والے جذبات کو زبان دے دی تھی تو یہ تھا کہ میری طرح اب ثناء بھی رابعہ کے اس سرسری و ثانوی سلوک سے بدگمان ہو گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی میری بات کی تائید کی۔

”ہاں۔۔۔ مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ رابعہ ایسی ٹونہ تھی۔ ثناء نے نفرت سے کہا۔

”حالانکہ اس کا شوہر اتنا بھی حسین نہیں۔“ میں نے دل کے پچھو لے پھو لے۔

”تو وہ خود کون سا اتنی خوب صورت ہے پھر بھی غرور کر رہی ہے۔ نکاح ہو گیا تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کر رہی۔“ ثناء نے میری بات کو مزید آگے بڑھایا۔

چھ سات ماہ قبل ہی رابعہ کا نکاح ہوا تھا اور وہ اس نکاح سے بہت خوش تھی۔ ہم دونوں نے اپنی دوستوں کی طرح اس کے نکاح میں شرکت کی بلکہ خوب رونق بھی بڑھائی تھی۔ ثناء نے مہندی شادی کے گیت ڈیک پر تیز والیوم میں چلائے تھے اور میں رابعہ کی ہتھیلیوں کی کوری لکیروں میں مہندی کے خوب صورت نقش و نگار سے اس کے شوہر کے نام کے رنگ بھرے تھے۔ نکاح والے دن ثناء نے اس کا میک اپ کیا تھا کیونکہ وہ گرومنگ کا کوریس کر چکی تھی اس کے ہاتھوں میں نفاست بھی بہت تھی۔ ہم تینوں نے اکٹھے تصویریں اتروائی تھیں۔ اس روز ثناء اور میں نے جی بھر کر رابعہ کو تنگ کیا تھا اور ڈھیر ساری

ملٹائی اسے ٹھونس ٹھونس کر کھلائی تھی۔ ہنستے گاتے اس کے نکاح میں شریک ہوئے تھے مگر اب اس کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کر ہم دونوں کو حقیقتاً بہت دکھ پہنچا تھا۔

”کوئی اتنی خاص جاب بھی نہیں ہے اس کے شوہر کی۔۔۔ سنا ہے کسی سچی کمپنی میں ایڈمن کے شعبے میں است کے طور پر کام کر رہا ہے نہ ہی اتنی شان دار رسالٹی ہے جس سو سو ہے رابعہ کے ساتھ زیادہ نیچے کا تو نہیں جس کام چل جائے گا۔“ میرے دل کے خار بدگمانی کی کونپلوں سے پھوٹ پڑے۔

”اور بننا ایسے ہے جیسے ہائی ووڈ کا ہیرو ہے۔ رابعہ بے وقوف اس شو آف برائتاں سمجھ گئی کہ ہماری دوستی کی ویلوی ہی ختم کر ڈالی۔“ ثناء نے افسردگی سے کہا۔ اس روز میں ثناء کے پاس سے گھر آئی تو کافی دیر تک اس ہاؤس پر سوچتی رہی۔ رابعہ کے دل دکھا دینے والے رویے نے مجھے گہری سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نکاح ہونے کے بعد سے کچھ خاص ہونے کے احساس سے اس میں عجیب سی نزاکت آ گئی تھی۔ اب میں اور ثناء جب بھی ملتے ہمارے پاس سوائے رابعہ کے موضوع کے کوئی دوسری بات نہ ہوتی تھی۔ ہم دونوں اس کے اس رویے پر دکھی بھی تھے اور شاکی بھی۔

اس شام میں بڑی خوش تھی۔ کافی دن بعد رابعہ نے صبح ہی فون کر کے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ آج شام وہ ہم دونوں کے ساتھ گزارے گی۔ شاید اس کھنچاؤ کو محسوس کر کے وہ اپنے بدلے ہوئے رویے کا ازالہ کرنا چاہ رہی تھی۔ میں شدت سے اس کی منتظر تھی مگر وہ نہ آئی۔ ثناء ایک نئی خبر کے ساتھ اکیلی ہی چلی آئی۔

”وہ محترمہ تو اپنے ہس بونڈ (Husband) کے ساتھ آؤٹنگ پر چلی گئی ہیں۔ باؤنڈ کر دیا ہے ان کو صوف نے اس کو اسی لیے میں نے اسے ہس بونڈ کہا ہے۔“ اس نے جملے کے انداز میں اطلاع کی۔

”واٹ۔۔۔ آؤٹنگ پر۔۔۔ وہ مائی گاڈ۔۔۔ کتنی آؤٹ آگئی ہے رابعہ۔“ میں سر پکڑ کر رہ گئی۔

”وہ تو بڑی مشرقی بنتی تھی۔۔۔ کہ میں شادی سے پہلے ان سے ملوں گی بھی نہیں بات بھی نہیں کروں گی۔ اور اب رخصتی بھی نہیں ہوئی اور محترمہ نے اڑاں بھر لی۔“ ثناء نے باقاعدہ نقل اتار کر اس کی باتیں دہرائیں۔

اسی دوران ہوا گرم گرم چائے کے ساتھ پکوڑے اور اسنیکس لے آئیں۔

”کون۔۔۔ کیا۔۔۔ کس کا ذکر ہو رہا ہے؟“ بوانے مداخلت کی۔

”رابعہ اور کون۔ ذرا دیکھیں تو کیسی بدل گئی ہے وہ۔“ میں نے بے زاری سے کہا۔

”ہاں۔۔۔ تھوڑا بہت فرق تو پڑ جاتا ہے۔“ بوانے مختصراً کہا۔

”تھوڑا بہت نہیں وہ بالکل ہی بدل گئی ہے ابھی تو اس کی رخصتی بھی نہیں ہوئی اور اس کے مزاج بدل گئے۔“ ثناء نے ناگواری سے کہا۔

بوانے کچھ جواب نہ دیا جس چپ چاپ چائے بناتی رہیں اور ہم دونوں اپنے دل کے پچھو لے پھو لے رہے۔

اب رابعہ ہاتھ سے گئی۔ اسے ہم سے کوئی سروکار نہیں رہا اتنی پرانی دوستی کو اس نے کس آسانی سے بھلا دیا۔ ثناء نے صدمے اور حیرت سے چور انداز میں مایوسی سے کہا۔

”ہاں بھئی۔۔۔ اونچی شے سمجھ رہی ہے خود کو۔ اب وہ ہم دونوں کو کیوں لفٹ کرائے گی۔ میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ اس بار ہم بھی اس کے بغیر شاپنگ کریں گے۔“ میں نے انتقامی انداز میں پروگرام ترتیب دیا۔

ہوا وہیں بیٹھی ہماری باتیں سنتی رہیں لیکن دوبارہ انہوں نے ہماری باتوں میں مداخلت نہ کی۔ ہم دونوں ناشتے کے سامان سے انصاف کر چکے تو وہ چپ چاپ ٹرے اٹھا کر لے گئیں کیونکہ ان کی نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ وہ برسوں سے ہمارے گھر میں مقیم تھیں اور ہم سب بسن بھائیوں کو پالنے پونے میں انہوں نے بڑا کردار ادا کیا تھا۔ ان سے ہمارا خون کا رشتہ نہ تھا مگر

محبت اور انسانیت کا رشتہ وقت کے ساتھ ساتھ پنپ کر اٹھ ہو گیا تھا۔

بوا کے جانے کے بعد بھی ہم دونوں دیر تک بیٹھے رابعہ کی باتیں کرتے رہے۔ ہم دونوں نے ہی طے کر لیا تھا کہ رابعہ کی بے رخی کا جواب بے رخی سے دیں گے اور اسے انہیں دلائل میں گے کہ وہ غلطی پر ہے۔

رمضان المبارک بھی قریب آرہے تھے۔ اس کے بعد عید تھی اور ہم تین بیٹھ اپنی رمضان اور عید کی تیاری مل کر کیا کرتے تھے۔ لیکن اس بار ہم نے رابعہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا، پھر ہم نے ایسا کیا بھی اپنی شاپنگ رابعہ کے بغیر کی۔ رابعہ نے ایک بار پوچھا تو اسے کوئی واضح جواب نہ دیا۔

ہر سال رابعہ رمضان کا چاند دیکھ کر ہمیں مبارک باد دینے آتی تھی، لیکن اس بار اس نے روکھے سوکھے انداز میں صرف ایس ایم ایس کر دیا۔ مجھے تو اتنا غصہ آیا کہ اسے جو ابی ایس ایم ایس بھی نہ کیا۔ اسی وقت شام چلی آئی وہ بھی رابعہ کے اس رویے پر کڑھ رہی تھی۔ ”سنائے بہت شاپنگ کرائی ہے اس بار اس کے شوہر نے۔ اب وہ کہاں ہم کو پوچھے گی۔“ شام نے ٹیکھے لہجے میں کہا۔

”بہت غور آگیا ہے اس میں۔ ابھی سے شوہر کو اپنے قابو میں کر لیا۔“ میں نے بھی جلتے لہجے میں کہا۔

اسی وقت بوا بھی ہاں پر آگئیں۔ دراصل ان کی نظر کمزور ہو رہی تھی۔ سو وہ مجھ سے سوئی میں دھاگا ڈھالنے آئی تھیں۔ ہاری باتوں پر ان کے چہرے پر بزرگانہ سی مسکراہٹ بکھر گئی، جیسے وہ ہماری باتوں کو بچکانہ پن پر محمول کر رہی ہوں۔ کچھ دنوں سے ویسے ہی وہ الٹی سیدھی حرکتیں کر رہی تھیں۔ میرے کمرے کی کھڑکی پٹی گلی میں تھکتی تھی اور وہاں سے بڑی ٹھنڈی اور تازہ ہوا آیا کرتی تھی مگر چند روز قبل وہاں کسی نے گنداکوڑا کرکٹ ڈال دیا تھا جس میں سے بوا اٹھ رہی تھی۔

”دو تین روز بعد اسی کوڑے پر کسی نے مزید کوڑا ڈال دیا جس سے اب بوا کے بھیکے اور لعن اٹھ رہا تھا۔ میں نے بوا سے ایک دوبار کہا بھی کہ کسی بھنگی کو بلا کر وہاں سے وہ گند ہٹوائیں، مگر وہ بدبودار کوڑا ابھی تک وہیں پڑا تھا اور اس کے لعن سے میرا کمرے میں بیٹھنا محال ہو رہا تھا۔“

”بوا! آخر کب تک یہ کوڑا پڑا سزا رہے گا؟“ میں نے بوا سے پوچھا۔

”خبر نہیں بیٹا۔ میں نے بھنگی کو بلوایا بھی تھا مگر وہ ہڈ حرام آیا ہی نہیں۔“ بوا معصوم بن گئیں۔

”لے لے لعن پھیل رہا ہے اس کا۔ پتا نہیں کون یہاں کوڑا ڈال رہا ہے۔“ میں نے کراہیت سے کہا۔

”معلوم نہیں بیٹی کون ہے؟“ بوا پھر سے معصوم بن گئیں۔

اور آج صبح میں نے خود بوا کو وہاں کوڑا ڈالتے دیکھا تو حیرت اور صدمے سے میرا برا حال ہو گیا۔ بوا کی یہ حرکت اور ایسی حرکتیں دیکھ کر مجھے بہت غصہ آیا۔ ان کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے اور وہ مجھ سے دیدہ دلیری سے سفید جھوٹ بولے جا رہی تھیں۔

”استغفر اللہ۔ اتنی صوم صلوٰۃ کی پابند اور کرکوت دیکھو۔“ مجھے بوا سے نفرت سی محسوس ہوئی۔

رمضان کے مبارک مہینے کا آغاز ہو گیا تھا۔ بوا شہد سے لازماً روزوں میں لگی ہوئی تھیں اور انہیں دیکھ دیکھ کر مجھے غصے کے ساتھ ساتھ ان سے شدید قسم کی نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اب رابعہ اور ہمارے درمیان مزید تناؤ بھی ڈھکا چھپا نہ رہا تھا۔ ہم دونوں نے رمضان کی شاپنگ مل کر کی تھی۔ بعد میں رابعہ نے ہم سے اس موضوع پر بات کرنے کی کوشش بھی کی، مگر ہم دونوں نے اپنے منصوبے کے مطابق اسے لفٹ ہی نہ اٹائی اور وہ اپنا سامنہ لے کر چلی گئی۔

ہر عید ہم تینوں ایک دوسرے کو سربراہنگت دیا کرتے تھے لیکن اس عید پر میرا اور شام کا اسے تحفہ دینے کا بالکل بھی ارادہ نہ تھا۔ ہم نے عید کی شاپنگ بھی رابعہ سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم دونوں اب اسے مل کر کھانا چاہتے تھے۔ رمضان المبارک کے روزے بے سبک گزر رہے تھے۔ روزہ داروں پر اب نے اپنی رحمتوں کی بارش کی ہوئی تھی۔ شام اور میں بھی روزے رکھنے کے ساتھ ساتھ پر جوش طریقے سے عید کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

اسی دوران ایک روز رابعہ نے مجھے عید کا تحفہ بھجوا دیا۔ مجھے اس پر اور بھی غصہ آیا۔ پتا نہیں کس بات پر اگر وہی گناہ پہلے ہمیشہ خود تحفہ لاتی تھی اور اس بار ہمارے کے ہاتھ بھجوا دیا۔ اس کا تحفہ بھی مجھے پسند نہ آیا، اسی وقت شام بھی آگئی۔

”دیکھ رہی ہو یہ کیا تحفہ بھجوا دیا ہے اس نے۔ خود تو اسے منگے شاپنگ سینٹر سے شاپنگ کرتی پھر رہی ہے اور ہمارے لیے یہ معمولی سی چیزیاں۔“

شام کی ٹل دیکھتے ہی میں نے دل کا غبار نکال ڈالا۔

”بوا! یہ کچھ اسی قسم کی کیفیت کا شکار تھی اور اسے بھی رابعہ کی اس حرکت کا دکھ ہو رہا تھا۔“

”مگر ہاتھ تو تحفہ ہوتا ہے، چھوٹا ہو یا بڑا۔“ بوا نے ہاتھ کب ہاں آن وارو ہوئیں۔

پر تو کھل ہی چکی تھی اس لیے میں نے ان کے نصیحت نامے کو نظر انداز کر دیا۔ مجھے ایسے دو غلے اور منافق لوگوں سے شدید جڑ ہوتی تھی جو اندر سے کچھ اور اوپر سے کچھ ہوتے ہیں۔

”مگر بوا۔۔۔ معیار بھی کوئی چیز ہے۔ اسے اتنا ستا۔ تحفہ بھیجے ہوئے سوچنا چاہیے تھا۔ آخر کیا سمجھتی ہے وہ ہمیں۔ بہت زیادہ گھمنڈ آگیا ہے اس میں۔ اس نے خود میں اور ہم میں فرق کرنا شروع کر دیا ہے۔“ شام بوا کی حقیقت سے بے خبر تھی اس لیے دل کھول کر اپنا غصہ باہر نکالنے لگی۔

”تو آپ ایسا کرونا کہ انہیں کوئی اچھا سا قیمتی تحفہ بھجوا دو۔“ بوا کے دوسرے حماقت بھرے مشورے پر میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”واہ! ہم فالتو میں اچھا تحفہ دیں اُسے۔“ مجھے غصہ آگیا۔

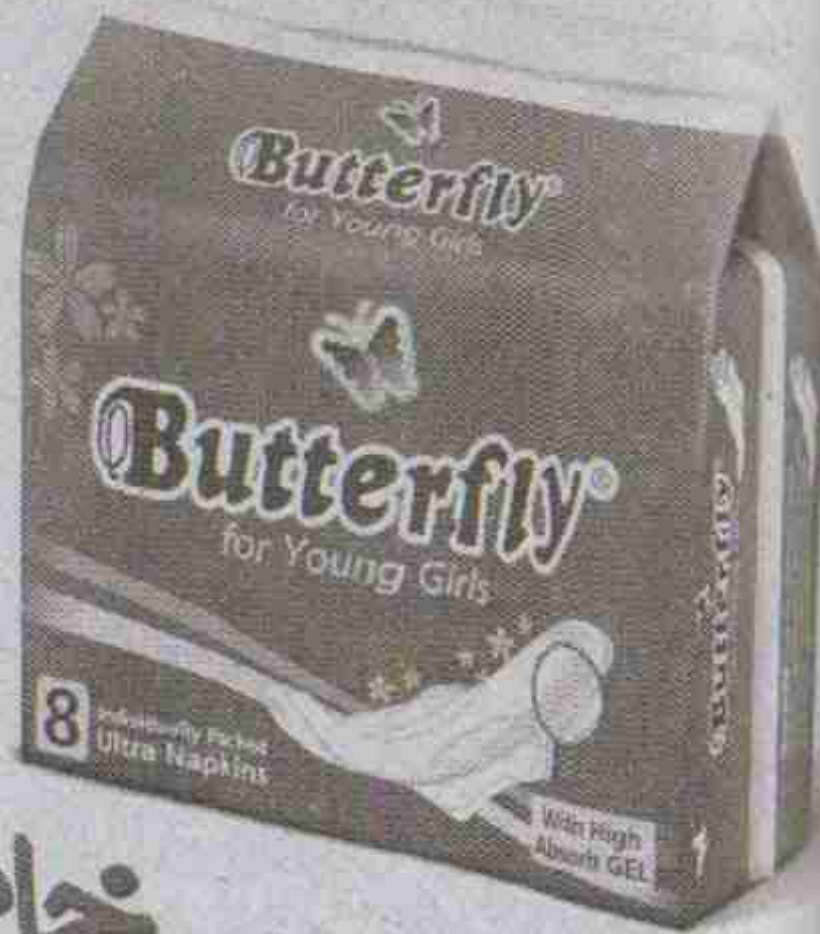
”مگر بیٹا! آپ دونوں اتنے روز سے یہ ہی تو کر رہی ہو۔ آپ دونوں رابعہ کو روزہ قیمتی تحفے بھجواتی ہو۔“ بوا یہ کہتے ہی وہاں سے چلی گئیں۔

”میرا خیال ہے کہ بوا کی عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔“ میں نے شام کی استفہامیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

بوا کے جانے کے بعد ہم دونوں عید کی شاپنگ کے بارے میں اپنا پروگرام طے کرنے لگے۔ اس بار ہم دونوں نے رابعہ کو جلانے کے لیے ایک جیسے سوٹ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ رمضان کے دوسرے عشرے کا آغاز ہو گیا تھا اور ہم نے اسی ہفتے شاپنگ نمٹانے کا پروگرام بنایا تھا، مگر ایک نئی مصروفیت نے ہمارا سارا پروگرام درہم برہم کر دیا۔

ہوا کچھ یوں کہ اچانک ہی میرا بہت اچھی جگہ سے رشتہ آگیا اور جھٹ پٹ سب طے ہو گیا۔ اسی عید پر میری منتی کے ساتھ پہلی عیدی کا پروگرام بھی سیٹ ہو گیا۔ میں اپنی زندگی میں آنے والے اس نئے اور اہم موڑ پر کچھ حیران اور کچھ خوش خوش سی بھی تھی۔ شام نے یہ خبر سنی تو بہت خوش ہوئی۔ رابعہ نے بھی

Now Butterfly® for Young Girls



ہم نے آسان بنایا اعلیٰ معیار کے نپکن کو صرف آپ کے لیے جس سے بچہ کم عمر لڑکیوں کو ایک نئے تحفظ کا احساس پاکیزگی کے ساتھ۔
پاکستان میں پہلی بار برفلائی ایک گریڈ انڈیا نپکن کم عمر لڑکیوں کی جسامت کو مد نظر رکھتے ہوئے تیار کئے گئے ہیں۔
تاکان کا اعتماد ہے 100% بحال۔ یقیناً جو ہر ماں چاہتی ہے۔

خاص میرے لئے

www.butterfly.com.pk

Santex

گال تھپتھپایا تو میں چونک پڑی۔

”بیٹا اتنے روزے میں ایک بات تمہیں سمجھانا چاہ رہی تھی، مگر تب تمہاری سمجھ میں میری کوئی بات نہ آرہی تھی۔ تم دونوں رابعہ سے بدظن ہو کر آپس میں اس کی برائیاں کر رہی تھیں اور بدلے میں اپنی نیکیوں کا تحفہ اسے دے رہی تھیں۔ دیکھو دنیا کی زندگی میں کوئی بھی انسان یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ اپنا نقصان کرے یا اپنے مال میں دوسروں کے حصے لگائے، لیکن غیبت جیسے عمل کا مرتکب ہو کر وہ خود ہی اپنے اعمال کے ساتھ کھائے کا سودا کر رہا ہوتا ہے، یعنی اپنے نیک اعمال خوشی خوشی اس شخص کے اکاؤنٹ میں جمع کروا رہا ہوتا ہے، جسے وہ ناپسند کرتا ہے یا ناخوش ہوتا ہے۔ وہ خود ہی اپنی نیکیاں اسے دے کر اپنا دامن خالی کر لیتا ہے۔ اس وقت تمہیں کھڑکی کے باہر سے اٹھنے والا نقش اور بدبو بری لگ رہی تھی تو سوچو کہ غیبت جیسا عمل ایسا ہی ہے، جیسے اپنے مرہ بھائی کا گوشت کھا لیا جائے۔ وہ نقش اور سرائند ہمارے اپنے اندر سے پھوٹنے لگتی ہے۔ تم اچانک میں اسی عمل کی مرتکب ہو رہی تھیں، میں نے اپنا فرض سمجھ کر تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ آگے تمہاری مرضی بیٹا!“

بوا کے لفظ لفظ میں روشنی تھی اور میں شرمندگی کے احساس تلے اپنا سر بھی نہ اٹھا پا رہی تھی۔
بوا کے سامنے مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا اور کم ظرف سا لگا۔ ایک معمولی بات کو سمجھنے کے بجائے میں نے اتنا اس میں اپنی بدگمانیوں سے پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں اور ایسی برائی کا شکار ہو گئی تھی جس کی ہمارے مذہب میں سختی سے ممانعت کی گئی ہے، مگر لوگ نماز روزے کے پابند ہونے کے باوجود اس برائی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

رمضان المبارک کے تیسرے عشرے کا آغاز ہو گیا تھا اور میری آنکھوں سے غفلت کا پردہ بھی ہٹ گیا تھا۔ اب مجھے پہلا کام یہ کرنا تھا کہ اپنی پیاری سی دوست رابعہ کو اس عید پر اچھا سا تحفہ بھیجنا تھا۔

مبارک باد کا فون کیا، مگر میں نے بڑے سرسری اور روکھے پھٹکے انداز میں اس سے بات کی۔

تیسرے عشرے کے آغاز میں شام چلی آئی، کیونکہ ہمارا شاپنگ کارپروگرام ادھورا رہ گیا تھا۔
”ٹھیک ہے، پھر کل چل کر ہم دونوں اپنے عید کے جوڑے خرید لیں گے۔“ شام نے فاسل بات نطے کر لی۔

”مگر اس بار تو نورین کا عید کا جوڑا اس کی سسرال کی طرف سے آئے گا اور یہ ہمارے ہاں کی روایت ہے کہ عید پر لڑکی کو سسرال سے آیا ہوا جوڑا پہننا ہوتا ہے۔“ امی نے سنا تو فوراً آگاہ کر دیا۔

اس نئے آرڈر پر شام کے ساتھ ساتھ میں بھی ششدر رہ گئی۔ اس طرح تو میرے اور اس کے بنے ہوئے پروگرام میں رخنہ پڑ رہا تھا۔

”مگر امی! میں نے کہنا چاہا۔“

”کوئی اگر مگر نہیں۔ بس اب تمہیں سسرال سے آنے والا جوڑا ہی عید کے دن پہننا ہے۔“ امی نے ڈیٹ دیا۔

میں باقاعدہ روٹھ گئی، مگر امی نے ذرا بھی توجہ نہ دی۔ البتہ رابعہ کو خبر ہوئی تو وہ میرا تماشادیکھنے چلی آئی۔ اسے دیکھ کر میرا منہ کڑوا گیا۔ اتنی بے وفا اور طیوٹا چشم دوست میری نظر سے اس سے پہلے نہ گزری تھی۔

”ایسا ہی ہوتا ہے نورین!“ اب مجھے دیکھو جب سے میرا شہزاد سے نکاح ہوا ہے، مجھے ان کی پسند ناپسند اور رائے کو فوقیت دینا پڑتی ہے، کیونکہ اب وہ زندگی کے راستوں پر میرے ہم سفر ہیں۔ اب مجھے ان کی بات کو زیادہ اہمیت دینا پڑتی ہے۔ اس بار تمہارا عید کا تحفہ بھی ان کی پسند کا تھا۔“ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی رابعہ نے مجھ پرانے انداز میں وضاحت دی۔

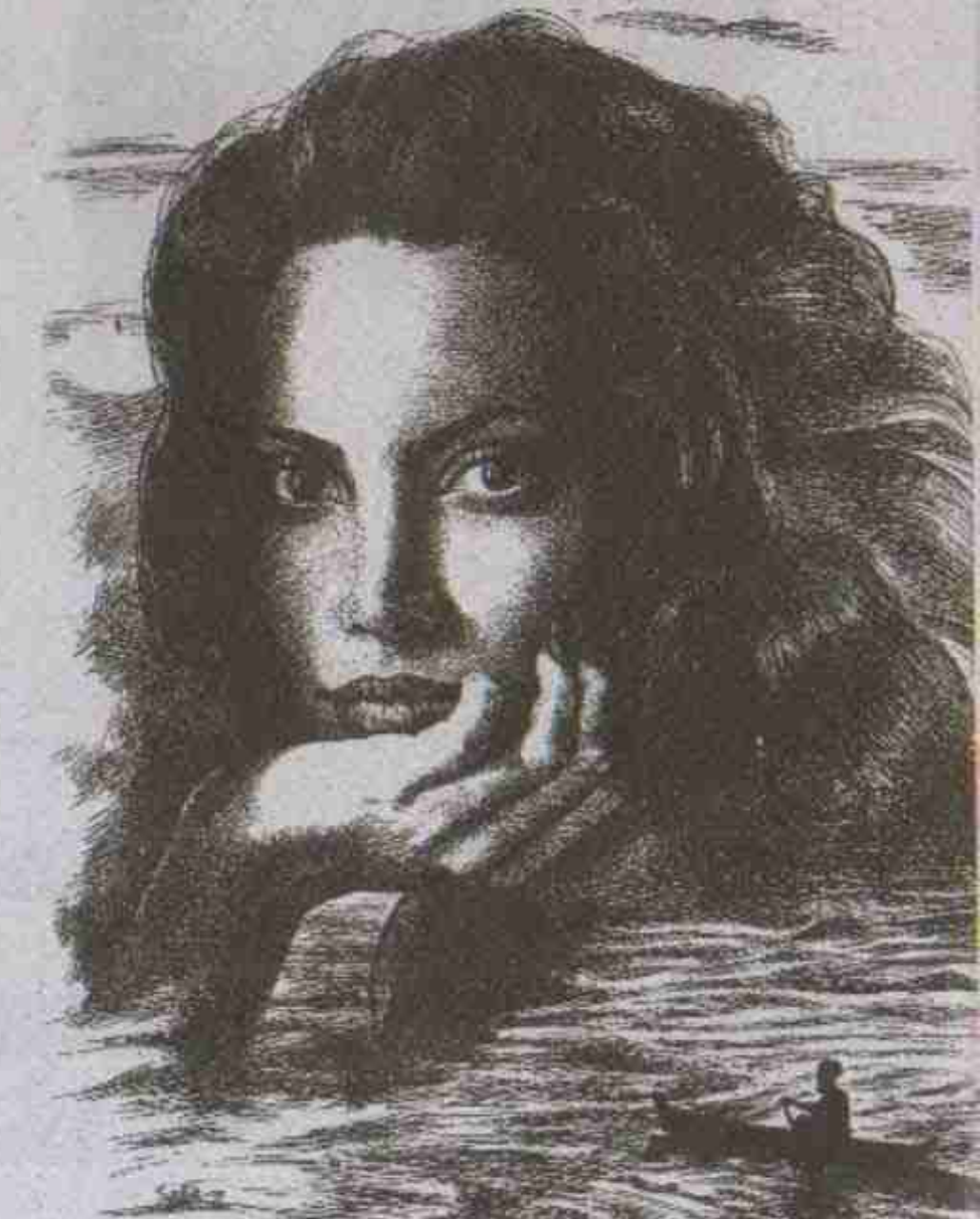
میں گم صدم اور پریشان سی خاموشی سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی رابعہ واقعی بدلی ہوئی اور کچھ بڑی بڑی سی لگی۔ وہ کب میرے پاس سے اٹھ کر گئی، مجھے خبر نہ ہوئی، جب بوا نے پیار سے میرا

مختصر کلاسک

”یہ منجھو پھر آگیا؟“ عظمیٰ نے تیوریاں چڑھا کر اس وجود کو اوپر سے نیچے تک دیکھا جسے اس نے منجھو سمیت نہ جانے اور کیا کیا نام دیے ہوئے تھے۔

”بھی تو تم گئے تھے دو گھنٹے بیٹھ کر۔“ عظمیٰ نے گھور کر اسے دیکھا جو صرف شکل سے ہی نہیں بلکہ حلیمے سے بھی سیدھا سا اور مسکین سا ہی لگتا تھا اور عظمیٰ کے سامنے تو وہ اور بھی دبا دبا اور سہا سہا ہو جاتا تھا۔

نکار دلچ



”میں اپنا موبائل بھول گیا تھا۔“

”تم اپنے سیل فون پر لڑکیوں سے باتیں کرتے ہو نا؟“ عظمیٰ نے اس پر بلاوجہ ہی ایک میزائل داغ دیا۔

”میں؟“ اس کی آنکھیں حیرت اور خجالت سے مزید پھیل گئیں۔

”تو اور کیا۔“ عظمیٰ نے اس کے چہرے کے تاثرات سے لطف اٹھایا۔

”میں کیا سمجھتی ہو مجھے کچھ معلوم نہیں ہے یہ سب سب سے چھپ چھپ کر دھیمی دھیمی آوازیں باتیں کرتے ہو گویا ہے وہ جلدی سے بتاؤ۔“ عظمیٰ ہوا میں تیر چلا رہی تھی۔

”کوئی بھی نہیں وہ تو بس ایسے ہی۔ ایک رانگ نمبر تھا تو۔“ علی اچھا خاصا بوکھلا گیا تھا اس تھا نے واری کی نفی تیش سے۔

”اچھا رانگ نمبر اور رائٹ گرل! ہوں۔“ عظمیٰ کی ہوں ”خاصی لمبی اور معنی خیز تھی۔“

”آپ بلاوجہ شک کر رہی ہیں ورنہ ایسی ویسی کالی بات نہیں ہے میں نے تو زیادہ بات بھی نہیں کی وہ وہ ہی زبردستی فری ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔“ علی نے ذرا جرات کا مظاہرہ کر کے اپنی صفائی پیش کی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں لڑکیاں چھوڑی ہوتی ہیں بد تمیز ہوتی ہیں۔“ عظمیٰ نے اپنی تیوریوں پر بل مزید ڈال لیے۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ وہ پھر بوکھلا گیا ایک لڑکی نہیں کیوں وہ عظمیٰ سے اتنا خائف کیوں رہتا تھا۔



”کہا تو نہیں مگر کہنا تو یہی چاہ رہے تھے نا۔“
”آپ سے بحث میں تو کوئی جیت ہی نہیں سکتا۔“
وہ آہستہ سے بولا۔

”صرف بحث میں؟“ اس نے آنکھیں چکائیں۔
”ہر معاملے میں۔“ علی نے اعتراف کیا۔
”اب اپنا موبائل اٹھاؤ اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔“
”میں تو وہ ہی لئے آیا تھا“ آپ نے باتوں میں الجھا لیا۔
”علی نے سادگی سے بولتے ہوئے اپنا موبائل صوفے پر سے اٹھایا۔

”اچھا بھئی، عظمیٰ ہو گئی ہم سے۔“ عظمیٰ کے مزاج پر چھائی افسردگی یکدم کہیں غائب ہو چکی تھی، وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔
علی کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر نہ جانے کیا سوچ سوچ کر مسکراتی رہی، پھر اپنا سیل فون آن کر کے ٹیم کھیلنے لگی۔

”بہت خوب، تم کام کرنے کے بجائے یہ کھلونالے کر بیٹھی ہوئی ہو۔“
”یاد ہے تم سے بڑی آپا نے کچھ کہا تھا نا، تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟“
”کیا کہا تھا؟“ سدا کی لاپرواہ اور بھلکڑ عظمیٰ نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔

”اب تم اپنے ننھے سے دماغ پر زور دینے کی زحمت مت کرو، میں بتا رہی ہوں۔ باتھ روم، واش روم اور صحن کی اچھی طرح صفائی اور دھلائی کر دو۔“ یمنی نے اسے وہ کام بتایا جسے بڑی آپا نے عظمیٰ کے سپرد کیا تھا اور وہ سب کچھ بھول بھال کر پہلے میچ دیکھنے، پھر علی کو زنج کرنے اور پھر اپنے سیل فون پر ٹیم کھیلنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

”کتی اچھی طرح؟“ وہ ٹیم میں مصروف لاپرواہی سے بولی۔

”عظمیٰ۔ اب تم پٹ جاؤ گی، اٹھ جاؤ شرافت سے۔“ یمنی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

”صوفے سے یا جہان سے؟“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بھی باز نہ آئی۔

”زبان کا غیر ضروری اور بے تحاشا استعمال بہت بڑا فتنہ ہے، قابو رکھا کرو اسے۔“ یمنی کے لہجے اور انداز میں امی کی تربیت اور قنوت بول رہی تھی، جس سے عظمیٰ اٹھ سال پہلے ہی محروم ہو گئی تھی وہ بارہ سال کی تھی جب ان کی امی کا انتقال ہوا تھا۔

”نو ٹیک پلینز۔“ بے زاری اور کوفت چہرے پہ سجائے باہر نکل گئی اور صحن میں جا کر بچوں کا پھیلاوا سمیٹنے لگی، فردا کی پرام احمد کی سائیکل۔ بڑی آپا آتیں تو بچوں کی چیزیں بھی ساتھ آتیں، بڑے بھائی جان کے جوتے، گھر کے سب ہی افراد کی چھیل، بالٹی، ٹب اور دوسرا الم غلم۔ اس نے ایک ایک کر کے سب چیزوں کو ٹھکانے سے لگایا، پھیلاوا سمیٹا اور باتھ روم دھوئے گھس گئی۔ وہ کام چور تو نہیں تھی مگر آج اس کا کوئی بھی کام کرنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک تو اسے آج شام ہونے والی تقریب سے ہی اختلاف تھا اور اس نے ابو کے سامنے اپنا احتجاج ریکارڈ کروا دیا تھا، مگر پھر بھی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ ابو نے اپنے تئیں تو اسے مطمئن کر دیا تھا مگر اسے یہی لگا کہ انہوں نے اسے نال دیا ہے۔ ابھی تک سب مجھے پئی سمجھتے ہیں، کوئی میری بات کو سیریس لیتا ہی نہیں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی اور جھاگ جھاگ سرف کو دیکھنے لگی۔

”مل بھر کی زندگی۔“ اس نے سرف میں کپڑا بٹکویا اور ٹائلز پر پھیرنے لگی۔ باتھ کام میں لگے ہوئے تھے اور دماغ آج رات ہونے والی تقریب میں الجھا ہوا تھا۔
”ابو کو کتنا سمجھایا مگر۔۔۔ یہ بڑے تو ہم چھوٹوں کو ہمیشہ نادان اور کم عقل ہی سمجھتے ہیں۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”بچھلے ہفتے یمنی نے کچن میں برتن دھوتے ہوئے اسے بتایا کہ ابو نے چھوٹی آپا کا رشتہ فاضل کر دیا ہے تو کچھ حیرانی اور کچھ صدمے سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”کیوں؟“
”کیوں کا کیا مطلب؟“ یمنی نے الٹا اس سے سوال کیا اور پٹیلی مانجھنے لگی۔

”پہلے بڑی آپا، اب چھوٹی آپا، کیا ہماری بہنوں کے لیے ایسے ہی رشتے رہ گئے ہیں؟“ عظمیٰ کا منہ بن گیا۔
”میں ابو سے بات کروں گی۔“ وہ یک دم ہی بہت بڑی بن گئی۔

”اچھا۔“ یمنی نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔
”بہت بڑی ہو گئی ہو تم۔“
”ہاں اتنی بڑی تو ہو گئی ہوں کہ ابو سے بات کر سکوں۔“ عظمیٰ نے بڑے فخر اور اطمینان سے جواب دیا تھا۔

شام میں موقع غنیمت جان کر وہ ابو کے پاس جا پہنچی۔ وہ ڈرائنگ روم میں اکیلے بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔

”ابو جی، آپ کیا کر رہے ہیں؟“ بغیر کسی تمہید کے وہ ان سے مخاطب ہوئی، آواز سے ناراضی جھلک رہی تھی۔

”اخبار پڑھ رہا ہوں۔“ انہوں نے مسکرا کر ایک نظر اسے دیکھا، اپنی بیٹی کے مزاج اور دل کی بات سے وہ اشرع تھے۔

”آپ نے چھوٹی آپا کے لیے ہاں کر دی؟“
”ہاں۔۔۔“
”کیوں؟“

”اس لیے کہ ان کی شادی کرنا ہے۔“
”یہاں کرنا ضروری ہے؟“

”کیا برائی ہے؟“ ابو نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔
”ان کا ایک بیٹا ہے چھوٹا سا۔“ عظمیٰ نے باپ کو ہاں بتایا جیسے وہ اس سے لاعلم ہوں۔

”ہوں۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔
”کیا ہماری آپا کے لیے ایسا ہی رشتہ رہ گیا ہے؟“ شادی شدہ بچے والا۔“ عظمیٰ کے لہجے اور لفظوں میں کڑواہٹ گھلی ہوئی تھی۔

”بات یہ ہے بیٹی کہ مراد صاحب ہر طرح سے ہماری آپا کے لیے موزوں ہیں۔ شریف النفس ہیں، ایک اطوار ہیں، برسرِ روزگار ہیں، عمر بھی ٹھیک ہے، نہ بہت زیادہ، نہ بہت کم، تمہاری آپا کے ساتھ بہت اچھا

جوڑ ہے۔“ ابو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
”اور بیٹا؟“

”بن ماں کے بچے، تو یوں بھی سب کو ترس آجاتا ہے، ہماری بیٹی اس بچے کی ماں بن کر اسے پالے گی، کتنا اجر ملے گا، یہ تو بہت ثواب کا کام ہے۔“

”بس رہنے دیں۔“ وہ فوراً ترخ گئی۔ ”بڑی آپا کی شادی پر بھی آپ نے یہ ہی کہا تھا نا اور دیکھا کیا ہوا؟ بات بات پر سوئی ماں ہونے کے طعنے ملتے رہتے ہیں۔ دونوں بچوں کو ان کی دادی، پھوپھی، کیسا سکھاتی پڑھاتی تھیں، گھل گھل کر آدمی ہو گئی تھیں ہماری آپا۔“ عظمیٰ نے اس میں یاد دلایا۔

”وہ طوفان گزر گئے بیٹا! اب تو وہ بچے اپنی ماں کے ہی ہیں نا، جو ہے تو سوئی مگر بچوں کے لیے تنگی ماں کی ہی طرح محترم ہے، اور بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں، نادان، نا سمجھ، عقل و شعور کو پیچھے تو اچھا برا خود ہی جان گئے، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔“ ابو کے مزاج کا تحمل اور بردباری ان کے بچوں کے مزاج میں بھی آئی تھی۔

”صبر کے ان صحراؤں کو پار کرتے کرتے انسان بے دم ہو جاتا ہے ابو۔“ عظمیٰ نے ڈانٹ لگ جھاڑا۔

”اگر ہماری قسمت میں صبر ہے تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ چاہے راضی سے کریں یا ناراضی سے، خود گواہی کی رضا پر چھوڑ دینے سے انسان سکھ میں رہتا ہے۔“

ابو نے ایک نظر اپنی تنگ مزاج بیٹی کو دیکھا جو بہت سی خامیوں کی مالک تھی مگر کچھ بھی ہو، اپنے گھر کے ایک ایک فرد سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی اور یہ اس کی محبت ہی تو تھی کہ وہ اپنی چھوٹی آپا کا مقدمہ لڑنے اپنے ابو کے پاس آ گئی تھی۔

”بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی کے کہنے سے ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، زندگی ہمیں خود سکھاتی ہے۔ تم میری بہت اچھی بیٹی ہو، اللہ تمہیں بہت سی خوشیوں سے نوازے۔“ ان کے لہجے میں باپ کی شفقت اور محبت بول رہی تھی۔

”آپ بہت اچھے ہیں ابو جی! سب کے ابو ایسے نہیں ہوتے۔“ عظمیٰ ان کے اور قریب ہو کر بیٹھ گئی۔

نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
 ”میری بیٹی بھی بہت خوب ہے، کبھی آگ، کبھی پانی۔“ ابو نے اس کا سر اپنے شانے سے لگا کر تھپکا اور ہنسنے لگے۔
 ”اچھا اب ایسا کرو جلدی سے مزے دار والی چائے کا ایک کپ لے آؤ۔“
 ”جی! وہ بڑی فرماں برداری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

باپ کی باتوں سے وقتی طور پر تو وہ بہل گئی اور خاموش ہو گئی، مگر نہ مطمئن تھی اور نہ ہی خوش متب ہی تو آج جب کہ چھوٹی آپا کا رشتہ طے ہونے جا رہا تھا، تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا مزاج برہم ہو رہا تھا۔
 ”کتنا رگڑو گی! بس چمک گئے سارے ٹائلز، آئینہ بن گئے، اب کچھ اور کام بھی دیکھ لو، بلکہ یہ جو باقی کام پڑا ہوا ہے، پہلے اسے مکمل کر لو۔“ یعنی نے آکر اندر جھانکا۔

”آ رہی ہوں۔“ اس نے جلدی سے بچا ہوا پانی ٹائلز پر بہایا اور باہر آ گئی۔
 ”گئے تو سیٹ کروالو، میری سمجھ میں نہیں آتا، کہاں کہاں رکھوں۔“ عظمیٰ نے ایک گہری سانس لے کر گھلوں کو دیکھا، جہاں رنگ برنگے پھول ہرے ہرے پتوں کے ساتھ مل کر عجیب بہار دکھا رہے تھے۔
 ”ارے اس میں تو کوئیل پھوٹ آئی۔“

یعنی اخیر سے بولتی ہوئی اس گیلے کی طرف جھک کر دیکھنے لگی، جس میں بیج ڈالے بہت دن گزر گئے تھے مگر کسی کوئیل نے سر ہی نہیں اٹھایا، اب تو یمنی بھی مایوس ہو گئی تھی، کل پرسوں ہی تو وہ کہہ رہی تھی کہ اس میں نئے سرے سے مٹی اور کھاؤ ڈال کر دوبارہ بیج ڈالے گی، مگر اس کی نوبت نہیں آئی، اس کے دبائے ہوئے بیجوں نے سچی مٹی کو نیپلوں کا تحفہ آج دے دیا تھا۔

”اچھا میری بہن، اب جلدی جلدی کام ختم کر لو، ٹائم کا پتا نہیں چلتا، یوں ہی شام ہو جاتی ہے، چلو آؤ یہ

گیلے رکھو ادوں۔“ یعنی گیلے کھسکانے لگی۔
 ”یہ تیل ماشاء اللہ کتنی جلدی بڑھی ہے۔“ یعنی نے بڑے پیار سے اس ہری بھری تیل کو دیکھا جو اپنے خوش رنگ پھولوں اور پتیوں کے ساتھ تیزی سے دیوار کے سہارے پھیل رہی تھیں۔

رات میں مہمان وقت پر آگئے تھے۔ بظاہر سبھی ہوئے مہذب لوگ تھے۔ تمیز، تہذیب اور قاعدے قرینے سے گفتگو کے آداب سے واقف۔ ابو کے ایک دوست نے یہ رشتہ کروایا تھا، جو ان کے پڑوسی تھے، انہوں نے بھی ابو سے سب گھر والوں کی خاص طور پر لڑکے کی بہت تعریف کی تھی، ابو ان لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے، اپنی دانست میں بہترین فیصلہ کر کے انہوں نے آگے کے معاملات اللہ پر چھوڑ دیے تھے۔

یعنی اور باسط بھائی عظمیٰ کو سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بے چاری کو کسی نہ کسی کام کے لیے دوڑا دیتے۔
 ”بڑی امی اور پھوپھو اوپر ہیں، انہیں نیچے بلا لو۔“
 ”اچھا۔“ عظمیٰ تقریباً پاؤں پٹختے ہوئے ہی اوپر گئی تھی۔

اوپر لاؤنج میں بڑی امی اور پھوپھو باتیں کر رہی تھیں۔
 ”اللہ بخشے ہماری بھابھی بھی بہت خوب تھیں۔“ ابو بھی پردے کی بو بو اور بیٹیوں کو بھی اپنے ہی رنگ میں رنگا۔ اب بھلا آج کل کے دور میں ایسی لڑکیاں کیسے کھینے والی ہیں۔ بھلا کتنی ہی اعلا تعلیم ہو، کون پوچھتا ہے۔ لڑکیوں میں ذرا چٹک، منک، ہونا چاہیے۔ کیوں؟“ پھوپھو نے بڑی امی کی طرف دیکھ کر تصدیق چاہی۔

”ہاں تو اور کیا، اب دیکھو نا اتنی اچھی لڑکیاں تھیں، دونوں نصیب میں شادی شدہ بیچوں والے مرد لگے تھے۔“ انہوں نے نند کی ہاں میں ہاں ملائی۔
 ”بس ایک عفران کی شادی ذرا ڈھنگ سے ہوئی۔“
 اچھا لڑکا ملا ہے، باقی یہ دو بے چاریاں تو بس۔“ انہوں نے

نے تاسف بھرا ایک گہرا سانس لیا اور خاموش ہو گئیں۔
 ”میرے عمران سے دو سال بڑی ہے طلعت، ورنہ اسے تو میں ہی لے لیتی۔“ پھوپھو نے چھوٹی آپا کا نام لیا اور کمرے میں گھڑی ڈھونڈتی عظمیٰ کی پیشانی کے بل اور گہرے ہو گئے۔

”دو سال ہی بڑی تھیں آپا، کوئی دو صدیاں نہیں،“ ابو نے بلا وجہ کی باتیں چھیڑنا۔ امیر کبیر ہو چاہیے، ”مل گئی اب یہاں بیٹھ کر یہ سب باتیں کیوں بکھار رہی ہیں، بڑا بہادر ہی کا بخار چڑھا ہوا ہے۔“
 اس نے اپنی پیشانی کے بل ذرا ٹھیک کر کے بڑی امی اور پھوپھو کو یعنی کا پیغام دے دیا تھا۔

شادی دو ماہ بعد ہونا قرار پائی تھی۔ اب روز بروز بازار کے چکر لگ رہے تھے۔ تیاریاں تھیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ کبھی بڑی آپا کہاں اور باسط پھر کچھ کام سمیٹ دیتیں کہ چلو بچوں کا ساتھ تھا، مگر پھر بھی جیسے تیسے وقت نکال ہی رہی ہیں۔ عفران بے چاری تو اپنے دو بچوں میں لگی رہتی، آئی تو وہ بڑے خلوص و محبت اور نیک نیتی کے ساتھ

خدا خدا کر کے تیاریاں بھی مکمل ہو ہی گئیں اور شادی کا دن آگیا۔ چھوٹی آپا رخصت ہو کر شوہر کے سنگ زندگی کے نئے سفر پر چل پڑیں۔

”اے خدا، شکر ہے تیرا، ٹھنڈا پانی بھی کیا نعمت ہے۔“ دو گلاس پانی پی کر عظمیٰ کی جان میں جان آئی، اگر نہ پیاس کے مارے اس کا برا حال تھا۔ آج آخری دن دے کر گھر آئی تھی، پیپر ختم ہوئے تو رزلٹ کی تیاریاں شروع ہو جائے گی۔
 ”اللہ جانے کیا آئے گا۔“ کپڑے بدل کر ہاتھ منہ دھوتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔
 ”ایسا پکایا ہے؟“ اس نے یعنی سے پوچھا۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL



- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے

قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیرائل 12 جزی بوتلوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں وقتی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں والے مٹی آڈر بھی کر کر جڑا پارسل سے منگوا لیں، رجسٹری سے منگوانے والے مٹی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے
- 3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
 دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں سے حاصل کریں
 بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
 مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
 فون نمبر: 32735021

”وال چاول۔“ وہ فریم میں اپنی قمیص پر کڑھائی کر رہی تھی۔ ”گرم کروں؟“

”نہیں“ میں نے لوں گی تم اپنے یہ پھول بوٹے بناؤ۔“ عظمیٰ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اپنے لیے کھانا گرم کر کے لے آئی۔

”بائی داوے“ یہ کون سے پھول ہیں؟ خزاں کے یا بہار کے؟“ چاولوں میں اہلی کی چٹنی ملائے ہوئے عظمیٰ پوچھنے لگی۔

”پھول تو بہار میں ہی کھلتے ہیں خزاں میں کون سے پھول ہوتے ہیں؟“ یمنی نے فریم سے سر اٹھا کر اس کی جانب یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت بر شک ہو۔

”خزاں میں بھی پھول کھلتے ہیں۔“ عظمیٰ نے اپنی بات پر زور دیا۔

”کہاں؟“

”سنا ہے دلوں میں کھلتے ہیں۔“ عظمیٰ بظاہر لاپرواہی سے بولی مگر اس کی دہلی دہلی شرارتی مسکراہٹ یمنی کو نظر آرہی تھی۔

”تم کچھ زیادہ ہی نہیں بولنے لگی ہو؟“ یمنی کچھ کنفیوز ہو گئی۔

”ہاں غالباً“ احسن بھائی کا اثر آگیا ہے۔“

”احسن بھائی بیچ میں کہاں سے آگئے؟“

”کہاں سے کیا مطلب خالہ کے گھر سے آئے ہیں اور کہاں سے تمہیں ہمارے درمیان سے اڑانے کے لیے۔“

عظمیٰ اطمینان سے کھانا کھاتے ہوئے اسے چھیڑ رہی تھی۔ چھوٹی آپا کی شادی کے دوران خالہ نے ابو کو عندیہ دیا تھا کہ شادی کے بعد وہ یمنی کا باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں گی۔ کل بھی ان کا فون آیا تھا۔ اس اتوار کو ان کی آمد متوقع تھی۔

”جو نصیب میں اور اللہ کا حکم ہو وہ ہی ہوگا“ پہلے سے اپنے خیالات بھٹکانے سے کیا فائدہ؟“ یمنی سنجیدہ ہوئی۔

”اللہ کا حکم ہے تب ہی آرہی ہیں“ رہی نصیب کی بات تو سنا ہے احسن بھائی بڑے ڈانڈلاگ مار رہے

تھے تمہیں اپنا نصیب بنالیں گے دل میں اور زندگی میں بسالیں گے وغیرہ وغیرہ۔“

”اچھا بس۔ اب چپ ہو جاؤ۔“

”چلو ہو گئی ویسے چٹنی بہت مزے دار بنائی ہے تم نے دل چاہ رہا ہے ساری کھا جاؤں۔“

”اللہ کے واسطے خود پر نہیں تو مجھ پر رحم کرو“ ٹانسلز کا مسئلہ رہتا ہے تمہیں خواہ مخواہ گلا خراب ہوگا اور شامت میری آئے گی ابو کی ڈانٹ بھی سنو اور تمہاری تہار داری بھی۔“ عظمیٰ کے ٹانسلز کے پیش نظر ابو نے منع کیا ہوا تھا کہ اہلی اور کھٹی چیزوں کا زیادہ استعمال نہ کرو۔ پھر بھی کبھی کبھار یمنی کچھ بنالیتی تو عظمیٰ سے پرہیز نہیں ہوتا تھا جب کبھی وہ بیمار ہوتی ڈانٹ دونوں کو پڑتی اسی لیے یمنی جو گناہو گئی تھی۔

”بے فکر رہو ساری چٹنی نہیں کھائی تھوڑی سی چھوڑ دی ہے۔“ عظمیٰ کو اس کی تشویش پر ہنسی آئی وہ ابھی کھانا کھا ہی رہی تھی کہ علی چلا آیا۔ سلام کر کے ہاتھ میں پکڑاؤ ڈنگا اس نے عظمیٰ کے سامنے رکھ دیا۔

”و علیکم السلام“ کیا لائے ہو؟“ عظمیٰ ڈونٹے کا ڈسکن کھول کر جائزہ لینے لگی۔

”پائے لائے ہو اتنی دیر میں جب میں نے کھانا کھالیا۔“ عظمیٰ نے ڈپٹ کر کہا۔

”بھابھی نے دیا ہی اب ہے میں کیا کرتا۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”بیٹھ جاؤ علی پلے یہ تو ایسے ہی فضول بولتی رہتی ہے۔“ یمنی نے سوئی سے ٹانگا بھرتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا۔

”خوش نصیب ہو“ بڑی اچھی بھابھی ملی ہیں تمہیں۔“ عظمیٰ اسے دیکھ کر کچھ نہ کچھ بولتی ہی رہتی تھی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ علی نے اس کی بات کی تائید کی۔

”اب تم بھی ایسی ہی اچھی بیوی لانا اچھا۔“ عظمیٰ نے بڑی بوڑھی بن کر اسے نصیحت کی۔

”جی۔“ روکنے کے باوجود بھی علی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”اوہو“ اپنی شادی کا ذکر سن کر بڑی خوشی ہو رہی ہے، کہیں کوئی پسند کر کے تو نہیں رکھی۔“ عظمیٰ نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”نہیں۔ نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ علی اک دم گھبرا گیا۔

”تو جب بھی ایسی ویسی کوئی بات ہو سب سے پہلے مجھے بتانا۔“

”جی! علی تقریباً“ ہر ایک سے ہی ایسی تابعداری سے بات کرتا تھا۔

”علی! ذرا ہمارے سنک کاٹل تو دیکھ لینا کل سے ٹپک رہا ہے اگر تم سے ٹھیک ہو جائے تو دیکھ لو ورنہ کسی پیمبر کو لے آؤ باسط بھائی نے ٹھیک کرنے کی کوشش کی مگر ان سے ہوا نہیں۔ رات میں دونوں دیر سے گھر آتے ہیں۔ پیمبر کو بلانا بھی ایک مسئلہ ہے ابو کا تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ جوڑوں کے درونے کہیں آنے جانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“ یمنی اپنی مروت کی عادت سے مجبور اس کے سامنے وضاحتیں پیش کر رہی تھی حالانکہ علی ان سے زیادہ منکر المزاج اور ہاموت تھا ہمیشہ کی طرح جھٹ سے ہائی بھر بیٹھا۔

”ابھی دیکھ لوں؟“ وہ مسکرایا۔

”نیکلی اور پوچھ پوچھ۔“ یمنی سے پہلے عظمیٰ نے اسے جواب دیا۔

”کیوں بلا وجہ بے چارے کو تنگ کرتی ہو؟“ علی کے کپڑے میں جانے کے بعد اس نے عظمیٰ کی کلاس لینا شروع کی جو وہ اشرافیہ تھی۔

”پتا نہیں کیوں اس کی اتنی یتیم مسکین شکل دیکھ کر اسے چھیڑنے کو دل کرتا ہے۔“ عظمیٰ مننے لگی۔

”کچھ خدا کا خوف کرو وہ بے چارہ یتیم مسکین ہی ہے۔“ یمنی نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

”افو“ میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔ میں اس سے مذاق کرتی ہوں مذاق اڑاتی نہیں ہوں۔“ عظمیٰ بھی ہائٹ صاف کرتے ہوئے سنجیدہ ہو گئی۔

”کسی کی سادگی اور مروت کا یوں مذاق نہیں بناتے“ ای بات ہے وہ بے چارہ کتنا کنفیوز ہو جاتا ہے

تمہارے سامنے۔“

”میں یہ ہی تو چاہتی ہوں کہ وہ کنفیوز نہ ہوا کرے“ دبدبو جواب دیا کرے ڈٹ کر مقابلہ کرے“ انسان کو اتنا بامروت اور اتنا اچھا نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی کچھ بھی کہے چپ چاپ سن لے کچھ بھی کرے“ چپ چاپ سہ لے تم از کم ایک مرد کو اتنا کمزور اور بودا نہیں ہونا چاہیے۔“

”زندگی سب کچھ سکھا دیتی ہے وقت اور حالات سے بڑا استاد کوئی نہیں۔ ان کے سکھائے اور پڑھائے ہوئے اسباق انسان کو ساری عمر زیر رہتے ہیں۔“ یمنی نے آخری ٹانگا مکمل کر کے اسے فینچی سے کاٹا۔

”دیکھو“ کیسا لگ رہا ہے؟“ یمنی نے بڑے فخر سے فریم اس کے آگے کیا۔ ابھی ایک تیل مکمل ہوئی تھی خوش رنگ ریشمی دھاگوں سے بہت نفاست اور صفائی سے کام کیا تھا۔

”جی جی۔ بہت خوب صورت لگ رہا ہے بالکل اصلی پھول لگ رہے ہیں۔“ عظمیٰ نے بہن کی محنت کو خراج تحسین پیش کیا جسے اس نے ایک جگمگاتی مسکراہٹ اور انیساری میں لپٹے شکریے سے قبول کیا۔

”بائی داوے“ ایک ایک ٹانگا بڑا دل لگا کے بھرا ہے۔“ عظمیٰ نے شرارتی انداز اختیار کیا۔

”جو بھی کام کرو محنت کے ساتھ دل لگا کے کرو۔“ یمنی نے بچپن میں پڑھا قاعدے کا آموختہ سنایا۔

”ہاں ضرور“ خاص طور پر وہ پھول تو بہت ہی محنت سے دل لگا کر بنائے چاہیں جو شاید کسی کے سرے میں سچیں۔“ عظمیٰ اپنی بہن کو چھیڑنے سے باز نہیں آرہی تھی۔

”اب یہ برتن اٹھاؤ جا کر اپنے ہاتھ دھوؤ اور یہ سالن فریج میں رکھ دینا۔“ یمنی نے بے ساختہ امنڈ آنے والی مسکراہٹ اپنے لبوں میں دبائی اور اسے حکم نامہ جاری کیا۔

”ہاں بھئی کوئی اور آرہا ہے زندگی میں اب ہمیں تو بھگاؤ کی ہی۔“ عظمیٰ نے برتن اٹھاتے ہوئے ایک

مصنوعی آہ بھری۔

وہ بچن میں گئی تو علی سنک ٹھیک کرنے میں لگا پڑا تھا۔

”کیا ہوا“ ٹھیک نہیں ہوا ابھی تک۔ ”عظمیٰ نے برتن کاؤنٹر کے سلیب پر رکھے۔

”لبا کام ہے ایک دو چیزیں آئیں گی میں لے آتا ہوں۔“ وہ ایک گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔

”اچھا! یعنی سے پیسے لے کر جانا۔“

”نہیں میں لے آؤں گا پیسے ہیں میرے پاس۔“

”جی نہیں آپ یعنی سے پیسے لے کر جائیے گا“

چیزوں کے لیے بلکہ اپنی مزدوری بھی لیتا پاگل ہو جو

فری میں کام کرو گے۔ ”عظمیٰ اسے پٹیاں پڑھا رہی تھی۔

”ایسی کیا بات ہے“ خالہ کا گھر ہے کسی غیر کا

تھوڑی میری ذرا سی محنت سے آپ کا کوئی کام سنور

جائے اس سے اچھی بات کیا ہوگی۔ ”وہ بہت دھیسے

لہجے میں معقول بات کر رہا تھا۔

”بس یہ ہی سارا مسئلہ ہے کہ تم دل کے بہت اچھے

ہو۔“ عظمیٰ نے سالن کا ڈوگرافٹ میں رکھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ اپنے بارے میں عظمیٰ کے اس

تجزیے پر حیران پریشان ہو گیا۔

”مطلب یہ کہ اتنا اچھا بننے اور ہونے کی ضرورت

نہیں ہے، تھوڑی سی چالاکی، تھوڑی سی ہوشیاری بلکہ

مکاری بھی سیکھو۔“ عظمیٰ بڑے نادور و نایاب مشورے

دے رہی تھی اسے۔

”کیوں؟“

”کیونکہ زندگی گزارنے کے لیے یہ سب ضروری

ہے۔“ عظمیٰ نے سمجھایا۔

”مگر میں تو ٹھیک ٹھاک زندگی گزار رہا ہوں ان کے

بغیر بھی۔“ علی نے اپنے اسی سادہ سے انداز میں جواب

دیا۔

”افوہ!“ عظمیٰ اپنے سر پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔ ”تمہیں

تو کچھ سمجھانا بھی بس بھینس کے آگے نہیں نیل

کے آگے بین بجاتا ہے۔“ اس نے سامنے کھڑے فرد

کے لحاظ سے محاورے میں تبدیلی کی۔

”پتا نہیں آپ کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہیں۔“

علی اکتا ہوا بچن سے باہر نکل گیا۔

”ارے واہ! ہماری ملی ہم ہی سے میاؤں۔“ عظمیٰ

اس کے تبصرے پہ جبرز ہو گئی۔

”تم کیا کھڑے ہو رہی ہو اتنی دیر سے؟“ یعنی

بچن میں داخل ہوئی تو عظمیٰ بڑے انہماک سے سر

جھکائے سموسوں کی پٹیوں میں فلنگی بھر بھر کے

سموسے بنا کر ایک طرف رکھتی جا رہی تھی۔

”تمہارے مہمانوں کی لذت کام و ذہن کا انتظام۔“

یعنی کو سلیس اردو میں مختصر جواب ملا۔

”مہمانوں کو خوش کرنا ہے، بھگانا نہیں ہے۔“

یعنی اس کی تیار کردہ فلنگی جیسے سے اٹھا کر چکھنے لگی۔

”ماشاء اللہ بڑی چمک رہی ہو آج۔“ عظمیٰ جتنی

تیزی سے کام نمٹا رہی تھی اتنی ہی پھرتی اس نے

جواب دینے میں دکھائی۔

”ابو نے ان تینوں کو پتا نہیں کیوں نہیں بلایا ہے

لوگ بھی آجائیں، کتنا مزہ آتا ہے نا۔“ عظمیٰ کا اشارہ

اپنی تینوں شادی شدہ بہنوں کی طرف تھا۔

”ابو کہہ رہے تھے کہ خالہ اور خالو بس دو افراد ہی

آ رہے ہیں بات آگے بڑھے تو سب کو بلا میں گے۔“

”بات تو آگے بڑھے گی ہی بھلا رکاوٹ ہی کیا ہے“

نہ کوئی ولن نہ کوئی ظالم سماج بالکل سیدھا سادا آسان

معاملہ ہے۔“ عظمیٰ لاپرواہی سے بول رہی تھی۔

”جن چیزوں اور معاملات کو ہم بہت آسان سمجھ

ہیں وہ کبھی کبھی مشکل بھی نکل آتے ہیں۔“ یعنی

انداز فلسفیانہ ہو گیا۔

”بہر حال یہاں تو سیدھی سیدھی شاہراہ دور تک

صاف جاتی نظر آتی ہے، کہیں کوئی روڑا، کنکر، پتھر نہیں

ہے۔“ عظمیٰ نے آخری سموسہ بنا کر ٹرے میں رکھا۔

”مہمان بہت دیر میں آئے خالو کو آفس میں

ہو گئی تھی باسٹ بھائی بھی گھر آگئے تھے۔ وہ ہاتھ

دھو کر کپڑے تبدیل کر رہے تھے، یعنی اور عظمیٰ دونوں

ارٹ ہو گئیں اور جلدی جلدی چائے کے اہتمام میں

لگ گئیں۔“

یعنی سنہری سنہری سموسے تل کر ٹشو پیپر پر رکھتی

ہماری تھی، عظمیٰ نے باقی اشیائے خورد و نوش ٹرالی میں

ایٹ کیں اور ڈرائنگ روم میں لے گئی، جہاں خالہ

خالو، ابو اور باسٹ بھائی باتیں کر رہے تھے۔

”ارے بھئی“ میری بیٹی کو تو بلاؤ اور یہ تم لوگوں نے

اتنا تکلف کیا کر لیا، ہم کوئی غیر تھوڑی ہیں۔“ خالہ

بڑے خوش گوار موڈ میں تھیں۔

”آپ کی بیٹی صاحبہ ابھی آرہی ہیں اور رہی بات

تکلفات کی تو آپ کی جگہ کوئی غیر ہوتے تو شاید اتنا

اتہام نہ کرتے، ایسے ہیں تب ہی تو کیا ہے۔“ عظمیٰ

نے ان کی باتوں کا بالترتیب جواب دیا اور سب کو چیزیں

دکھانے لگی۔

تھوڑی دیر میں یعنی ابھی چائے لے آتی تھی وہ

تکلفیوز ہو رہی تھی۔ سلام کر کے واپس جانے

کے لیے مڑی تو خالہ نے اپنے پاس بٹھالیا۔

”ارے تم کہاں جا رہی ہو، یہاں بیٹھو“ میرے

پاس۔“

”بس بھائی صاحب! ہماری آپا کی نشانی تو آپ ہمیں

دے دیں۔“ تھوڑی دیر بعد چائے پیتے ہوئے انہوں

نے ابو کو مخاطب کیا۔

”ہاں بھئی، ہم نے طے کیا ہے کہ یعنی کو آپ

ہماری بیٹی بنا دیں اور باسٹ کو ہمارا بیٹا۔“ خالو بڑے

اطمینان سے چائے کا گھونٹ بھر کے بولے۔

”یہ۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ خالہ کے منہ سے

ایک دم نکلا، ابو سمیت کمرے کے سارے نفوس

ان ہو کر انہیں دیکھنے لگے اور پھر یہ حیرانی بتدریج

انسانی میں ڈھلتی گئی۔

”باسٹ کے لیے تو اللہ بخشے مرحومہ آپا نے زرین کو

دیا تھا۔“ خالہ نے انک کر بولتے ہوئے کچھ

کاف ہو کر شوہر کو دکھا جن کا مزاج پل پل بدلتا تھا

کڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت۔

”تو کیا ہوا“ احسن کے لیے بھی میں نے اپنی بھتیجی کو

سوچ رکھا تھا، مگر اب اس نے یہاں کے لیے ضد پکڑ لی

تو ہم یہاں آگئے، آج کل کے بچے ماشاء اللہ ہوشیار

ہیں، اپنے لیے راستے خود ہی نکال لیتے ہیں۔ دوپٹے

گلے میں ڈالنے والیاں تو یوں ہی بدنام ہیں، لوگ تو

بروے میں رہ کر بھی کام دکھا جاتے ہیں۔“ خالو نے

ہنس کر سگریٹ سلگایا اور باقی سب کے چہرے اور دل

بچھ کر رکھ ہونے لگے۔

کچھ دیر کے لیے عجیب سی خاموشی کی چادر سب

کے درمیان پھیل گئی، جو اجنبیت اور دکھ کے تانے

بانے سے بنی ہوئی تھی۔

”ہمیں کچھ وقت دیجیے خالو! ہم سوچ کر جواب

دے دیں گے۔“ باسٹ بھائی نے اپنے نرم انداز اور

لفظوں سے اس چادر میں شگاف ڈالا۔

”ہاں ہاں صاحبزادے! بے شک جتنا چاہے ٹائم لو،

اچھی طرح سوچ سمجھ لو، پھر فیصلہ کر لیتا، ہمیں کوئی

جلدی نہیں۔“ خالو کے چہرے پہ عجیب سی مسکراہٹ

تھی۔

عظمیٰ کو شدید غصے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

یعنی کو گہرا صدمہ پہنچا تھا وہ وہاں سے اٹھ کر جانا چاہتی

تھی، مگر اچانک ہی اسے اپنے پاؤں من بھر کے محسوس

ہونے لگے تھے، سارا جسم بشمول دل جیسے پتھر کا بن گیا

تھا۔

قدموں تلے زمین کا سیرک جانا کیا ہوتا ہے، اسے

آج علم ہوا تھا۔

بھابھی اپنے میکے سے کل ہی واپس آئی تھیں، صحن

بچوں کی آوازوں، ہنسی اور شرارتوں سے بھرا ہوا تھا۔

بڑی محنت اور خوب صورتی سے سجے گلیوں کے پھولوں

اور بیلوں پر بہار آچکی تھی۔ رنگ برنگے کھلے ہوئے

پھول اور تروتازہ شاداب بیلکیں نظروں کو تراوٹ بخش

رہی تھیں، ہوا میں پھولوں کی خوشبو گھلی ملی تھی۔

”بہار آگئی۔ مگر۔“ یعنی نے خالی خالی نظروں سے

جھومتے پھولوں کو دیکھا۔

دل اور زندگی میں خزاں نے ڈیرے جمالیے تھے اور یوں بھی نہیں تھا کہ یہ کوئی افلاطونی عشق کا معاملہ تھا، بس ایک ان دیکھی اپنائیت کی زنجیر اور انجانے سے احساس کی ڈور نے دونوں کو جیسے باندھ لیا تھا۔ فقط ایک بار احسن نے ان جذبول کو زبان دی تھی۔

کچھ عرصہ پہلے ہی کی تو بات تھی جب بڑے ماموں کے اظفر بھائی کی شادی میں، یعنی کو شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ پل پل احسن کی نظروں کے گھیرے میں ہے اور پھر موقع پا کر اس نے یعنی کو مخاطب کیا۔

”بات سنو یعنی! ذرا یہ پکڑنا۔“ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک خوبصورت سا سرخ گلاب اسے تھمایا۔

”کیا کروں؟“ ایک لمحہ کو یعنی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا وہ پھول تھامے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”سنبھال کے رکھنا یہ میرا دل ہے۔“ احسن مسکرا کر بولتا ہوا اپٹ گیا۔
بس وہ ایک لمحہ تھا جس نے آج بھی اسے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا، آج جب کہ وہ پھول مر جھا چکا تھا اور شاید اس کا دل بھی وہ خالی خالی نظروں سے ان پھولوں کو دیکھے چلی گئی جو مسکرا مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے۔

ابو نے بڑی آیا اور چھوٹی آیا سے مشورہ کر کے خالو کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ خود یعنی بھی تو ان کے اس مطالبے سے خائف ہو گئی تھی اس نے خود بھی ابو سے منع کر دیا تھا زین نے بچپن سے ہی باسط کے خواب آنکھوں میں سجائے بیٹھی تھی بھلا اسے کیا حق تھا کہ اپنے دل کو شاد کرنے اور اپنے خوابوں کا نگر آباد کرنے کے لیے وہ زین کے خواب ان آنکھوں سے نوج ڈالتی۔ اسے بھلا گیا حق تھا کہ اپنی زندگی میں اجالے بکھیرنے کے لیے وہ زین اور باسط کی زندگی میں تاریکیاں بھر دیتی۔ ایسی خود غرض تو وہ کبھی نہ تھی مگر

اس کے قدم لگانے کو احسن پھر راہ میں آگیا تھا۔

”تم تھوڑا سا تو میرا ساتھ دو یعنی! انکل کو سمجھاؤ ایسی راضی ہیں ابو بھی راضی ہو ہی جائیں گے میں کوشش تو کر رہا ہوں۔“

”رہنے دیں احسن! اپنے بیٹوں سے بغاوت مست کریں ہو گا تو وہ ہی جو ہمارے نصیب میں ہے۔“ اس نے دھیرے سے احسن کو اور خود کو بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
”پلیز یعنی تم!“

”ہمارے بیٹوں کو فیصلہ کرنے دیں ہمیں ان کی باتیں کتنی ہی ناگوار گزریں، بہر حال وہ ہمارے خیر خواہ ہیں۔“ یعنی نے اس کی بات کاٹ کر اپنی بات مکمل کی اور پھر لائن کٹ دی تھی۔

”پتا نہیں کیوں سیدھی راہ چلتے چلتے ہم ان راستوں پر کیوں مڑ جاتے ہیں جو ہمارے راستے نہیں ہوتے، ان منزلوں کی کھوج کیوں کرتے لگتے ہیں ہمارا مقدر نہیں ہوتی ان بہاروں کی آرزو کیوں کرتے لگتے ہیں جو ہمارے لیے نہیں ہوتیں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی، خود کو سمجھانے کی کوشش بہت کمزور ہی تھی مگر یہ کوشش ضروری تھی کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔

”بہت بزدل اور بے وقوف ہو تم۔“ عظمیٰ اس کے پاس آن بیٹھی اور چاول چنے لگی۔

”ہو سکتا ہے۔“ یعنی نے اتنی دھیمی آواز میں جواب دیا کہ عظمیٰ بمشکل سن سکی۔
”تمہیں دکھ ہو رہا ہے یعنی؟“

”ہم اپنے نصیب سے نہیں لڑ سکتے۔“
”بزدلی اور بے بسی۔“ مقدر کو ملزم ٹھہرا کر خود بھی ہو جاتے ہیں۔“ عظمیٰ ترخ کر بولی تو یعنی کے لبوں پر ایک بے بسی مسکراہٹ ٹھہر گئی، کسی خزاں کا شام کی طرح پھکی پھکی ویران سی۔

”اب رو کیوں رہی ہو، شکل ٹھیک کرنا۔“ عظمیٰ کو غصہ آ رہا تھا۔
”میں ٹھیک ہوں، اگر نہیں بھی ہوں تو وہاں کی

تم پریشان مت ہو، لاؤ چاول ادھر دو، میں چن لیتی ہوں۔“ یعنی نے اس کے ہاتھ سے تھال لے لیا۔

”یہ لو۔“ عظمیٰ تو جیسے اس کے کمنے کا انتظار کر رہی تھی۔ جھٹ سے اسے تھال تھما دیا۔

”میرا رزلٹ آنے والا ہے۔“ کچھ دیر بعد عظمیٰ نے اسے اطلاع دی۔
”ہوں۔“

”مجھے رزلٹ کی بہت ٹینشن ہو رہی ہے۔“ عظمیٰ اندر لاری حالت میں اپنا ناخن چبانے لگی وہ پریشان آتی تو یہ ہی کرتی تھی۔

”تم ہر معاملے کو حد سے زیادہ خود پر موار کر لیتی ہو، اللہ پر چھوڑ دیا کرو، سکون سے رہو گی۔“ یعنی نے مشورہ دیا۔

”پتا ہے میں سوچتی ہوں کہ اکثر جو ہم چاہتے ہیں یا سچا چاہتے ہیں تو کیا کیوں نہیں ہوتا ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسا کیوں ہو جاتی ہے؟“

”ہر کام اور ہر معاملہ اللہ کے حکم سے وقوع پذیر ہوتا ہے، یہ بات سمجھ میں آجائے تو ساری پریشانیاں دور ہو جائیں۔“

”تم بہت سلجھی ہوئی اور سمجھ دار ہو میں ایسی نہیں ہوں نا۔“ عظمیٰ نے جسے اعتراضی بیان دیا۔

”تم نے ابو کے کپڑے دھو دیے؟“ یعنی نے موسوع بدلا۔

”ہاں ابھی کھنگالنے جا رہی ہوں، بہت دیر پہلے لٹائے تھے۔“ عظمیٰ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی لی۔

”کام کے نام پر تمہیں جمائیاں کیوں آنے لگتی ہیں؟“

”لو بھئی، اتنا تو کام کرتی ہوں گھر کا پھر بھی سننے کو ملتی ہے۔“ عظمیٰ کا موڈ کب کس بات پہ خراب ہو جائے، پتا نہیں چلتا تھا۔

”لاؤ دو۔“ عظمیٰ کھڑی ہو گئی اور چاولوں کے تھال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”یہ لو۔“
”بات سنو۔“ یعنی نے جالتے ہوئے اسے آواز دی۔

دی۔

”کیا؟“

”کھانا اچھے موڈ میں رکایا جائے تو اچھا پکتا ہے۔“

یعنی کی مسکراہٹ بہت واضح تھی۔
”مشورے کا شکریہ۔“ عظمیٰ مزید بھنا گئی اور یعنی کی ہنسی نکل گئی۔

”شکر ہے اتنے دنوں بعد تم کھل کر تو نہیں۔“ عظمیٰ اسے دیکھتے ہوئے بے ساختہ بولی۔ یعنی نے اپنے لب بھیج لیے۔

”درد کیسا بھی ہو، مسکراہٹ نہیں کھونا چاہیے۔“
”اچھا فقرا ہے۔“ عظمیٰ بھی مسکرا دی اور چن کی طرف چل پڑی۔



پورا گھر بھانت بھانت کی آوازوں، ہنسی اور لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑی آیا، چھوٹی آقا فرائیڈوں کے شوہر صاحبان اور بچے، پھر بڑی امی بھی اپنی دونوں بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ہمراہ آئی ہوئی تھیں۔

یعنی اور عظمیٰ تو صبح سے کچن میں مصروف تھیں، بڑی آیا بھی ان دونوں کے ساتھ لگ گئی تھیں۔ فرائیڈ خیر بچوں میں ہی الجھی رہتی تھی۔ چھوٹی آیا بھی اس مین سالہ بچے کو سنبھالنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھیں جو بقول عظمیٰ کے انہیں بری میں ملا تھا۔

گرمیاں آگئی تھیں، بجلی معمول کے مطابق اپنے وقت پر گئی تو تقریباً سب ہی لوگ چھت پر چلے گئے، سوائے ان دو تین افراد کے جو بس کچن کا کام آخری مراحل میں سمیٹ ہی رہے تھے۔

”خالو سے یہ امید نہیں تھی ہمیں۔“ بڑی آپانے برتن دھوتے ہوئے بے حد دل سوزی سے کہا۔
”احسن کا بھی فون آیا تھا میرے پاس، کہہ رہا تھا کہ میری ہیلپ کریں۔“

”چھوڑیں آپا! ختم کریں اس قصے کو، کوئی اور بات کریں۔“ عظمیٰ نے بے زاری سے کہا۔

”ختم تو ہو ہی گئی ہے بات، ہم کیا ختم کریں، اچھا بھلا

لڑکا تھا احسن، پھر خالہ کا گھر ہم تو بہت خوش تھے کہ ہماری بہن اپنوں میں جارہی ہے۔" آپا نے ایک آہ بھری۔

"جب آپ تینوں غیروں میں گئی ہیں تو یمنی کا بھی کچھ ایسا ہی بندوبست ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ احسن بھائی سے اچھا ہی لڑکا ملے گا ہماری یمنی کو خالو کو تو خدا سمجھے، پتا نہیں کیا سمجھنے لگے ہیں خود کو اترا تاتی شکل ہونہ۔" عظمیٰ نے رائے کے لیے وہی پھینٹتے ہوئے دل کی بھڑاس نکالی۔

"ہم ہر معاملے کو فقط اپنی نظر سے دیکھتے ہیں اسی لیے بہت آسانی سے کسی کو بھی اچھایا برا بنا دیتے ہیں۔ آپ لوگ تھوڑا سا غیر جانبدار ہو کر سوچیں ہر ماں باپ اپنی بیٹی کے لیے اچھا برا اور اچھا گھر چاہتے ہیں خالو نے بھی اسی خواہش کا اظہار کر دیا کہ اگر وہ اس گھر سے ایک لڑکی لے رہے ہیں تو ایک دے بھی دیں انہوں نے بھی تو یہی سوچا تھا کہ باسط بھائی اچھے لڑکے ہیں ہم لوگ دیکھے بھالے ہیں اب بات نہیں بنی تو۔" یمنی بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔

"کسی کا بھی کوئی قصور نہیں ہے، بس ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں ہیں۔" چند لمحوں بعد وہ دوبارہ بولی تو اس کا لہجہ ہموار اور ٹھہرا ہوا تھا۔

"اور چلیں! اپنا کام ختم کر کے وہ سک میں ہاتھ دھو رہی تھی۔

"ہاں تو اور کیا ذرا دیکھیں تائی امی نے تو اب تک چھوٹی آپا کا مفصل انٹرویو لے لیا ہوگا۔" عظمیٰ نے فوراً ہائی بھری۔

وہ تینوں اوپر گئیں تو چھت پر بچے الگ دھما چوڑی مچائے ہوئے تھے۔ زنانہ و مردانہ تحفیلیں الگ الگ جبی ہوئی تھیں۔ مردوں کے پاس ایک ہی موضوع تھا سیاست جس پر دھواں دھار بحث جاری تھی جب کہ خواتین کی محفل میں مختلف موضوعات زیر بحث تھے بات کہاں سے شروع ہوتی اور کہاں جا نکلتی۔ عظمیٰ کا خیال صحیح تھا۔ تائی امی چھوٹی آپا کو ہی گھیر کر بیٹھی ہوئی تھیں کہ ان کی شادی کے بعد سرسری ایک دو

ملاقاتیں تو ہوئی تھیں، مگر تفصیلی ملاقات اب ہوئی تھی۔

"ہاں۔ کسی کی اولاد پالنا آسان تھوڑی ہے، لوہے کے چنے چبانے کے برابر ہے، بڑا دل جکرا چاہے تمہاری ہمت کو شاباش ہے۔" وہ چھوٹی آپا سے اظہار ہمدردی کر رہی تھیں جب یہ تینوں ان کے پاس جا کر بیٹھیں۔

"عالیہ کی شادی میں کب بلا رہی ہیں بڑی امی؟" عظمیٰ نے بات کا آغاز کر کے موضوع تبدیل کیا۔

"بس بیٹا! کمیٹی کھلنے کا انتظار ہے۔ تین مہینے ملے گی تو پھر تاریخ دے دیں گے۔ اس کے سسرال والے تو کب سے اصرار کر رہے ہیں کہ جلدی کر دیں میں نے کہا کہاں سے کر دیں ہاتھ میں کچھ رقم ہو تو شادی کے لیے کھڑی ہوں خالی ہاتھ کیا کام ہوگا ہمارا منگائی نے تو ہم غریبوں کا خون ہی نچوڑ لیا ہے۔"

"ہاں یہ تو بے بڑی امی، منگائی واقعی حد سے زیادہ ہو گئی ہے، آئے دن کسی نہ کسی چیز پر پیسے خرچ رہتے ہیں خاص طور پر کھانے پینے کی چیزوں پر نہ کہ پوچھے والا ہے نہ روکنے والا۔"

بڑی آپا نے بھی دل کی بھڑاس نکالی۔ اس ہوش منگائی میں شوہر کی محدود آمدنی اور چار بچوں کے ساتھ وہ جس طرح گزارا کر رہی تھیں وہ ہی جانتی تھیں۔

"ہاں میں نے بھی یہ ہی سوچا ہے۔" "ارے خدیجہ! یہ تمہارے خالو کو بھلا کیا سوچ رہو سٹھیا تو نہیں گیا حالانکہ ابھی اتنا بڑھاپا بھی نہیں آیا۔" بڑی امی نے اچانک ہی بڑی آپا کو مخاطب کر کے میزائل دانغا تو باوجود موضوع کی سنجیدگی کے سب کو ہنسی آ گئی۔

"کیا کہہ سکتے ہیں بڑی امی! ان کی مرضی کہہ لیں نصیب بات نہیں بنی تھی سو نہیں بنی۔" انہوں نے سجاوٹ سے جواب دیا۔

"اچھا خاصا رشتہ ہو رہا تھا، بچ میں ٹانگ اڑا کر لایا ہو گیا۔ تمہاری خالہ بے چاری تو بڑی بھلی مانس ہے اچھا تھا یمنی وہیں کھپ جاتی مجھے تو وہ لڑکا بڑا ہی اچھا

لگتا ہے۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔ ہاں احسن، کیسی اچھی اولاد ہوئی۔" وہ عادت کے مطابق نان اسٹاپ بولے ہماری تھیں۔ لاکھ ضبط کرنے پر بھی یمنی کے چہرے پر تاریک ساسیہ لہراہی گئی۔ عظمیٰ نے بے چینی سے پہلو ہلا اور فرحین بول پڑی۔

"چھوڑیں نا امی! جو بات ختم ہو گئی اس کا بلا وجہ کیا کر، آپ بھی بس موقع محل دیکھے بغیر شروع ہو جاتی ہیں۔" اس نے خفیف ہو کر کہا۔

"اے۔۔۔ میں تو بس یوں ہی مجھے اچانک یاد آ گیا تو میں بول پڑی، اری بچی تو دل پر مت لے، ان شاء اللہ اس سے بھی اچھا برے ملے گا مجھے اور اس بڑھے سے اچھا سسر۔" ان کے اظہار ہمدردی پر سب کے ساتھ یمنی ہی بے ساختہ مسکرا دی۔

"جو اللہ کا حکم بڑی امی! اس سے زیادہ ہمارا خیر خواہ کون نہیں۔" یمنی ان سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔" انہوں نے فوراً ہاں میں ہاں ملی۔

کچھ دیر اور ادھر ادھر کی باتوں میں ڈیڑھ گھنٹہ پورا ہو گیا اور بجلی آ گئی۔ ساری لڑکیاں نیچے آگئیں اور کھانا کھانے لگیں۔

"کھانا کھا کر بڑی امی کی فیملی چلی گئی، گھر میں پھر بھی رونق تھی کہ تینوں لڑکیاں آج ویک اینڈ پر رکنے آئی ہوئی تھیں۔

یمنی نے بڑے سے لاؤنج میں سب کے بستر گاہ پر تھے رات بھگتی جارہی تھی مگر بہنوں کی آپس کی باتیں ختم نہیں ہو رہی تھیں، عفرہ کے بچے سوئے تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

"بچ آیا! میں تو اکثر سوچتی ہوں کہ ہمارے امی، ابو، ماشاء اللہ ہم سات بہن بھائیوں کو کیسے پالا وہ بھی اچھے تھے، ہم تو ان دو میں ہی چکرا کر رہ گئے۔" عفرہ لڑکی آپا سے مخاطب ہوئی۔

"پہلے کے بچے سیدھے سادے اللہ کی گائے آتے تھے۔ آج کل کی طرح نہیں کہ جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں۔" یمنی نے تبصرہ کیا۔

"ماؤنٹ ایورسٹ پر کسی کو برف بھی دیں۔" عظمیٰ نے ٹکڑا لگایا۔

"وقت کی رو بھی تو تیز ہو گئی ہے۔ انسانی دماغ کیوں نہ تیز ہو، چاہے بچوں کا ہی سہی۔ سال، مہینے بن گئے ہیں، مہینے دن اور دن گھنٹوں کی طرح جلدی جلدی گزر رہے ہیں، یہ ہی قرب قیامت ہے۔" بڑی آپا نے ایک گہری سانس لی بات کہاں سے نکلی اور کہاں پہنچ گئی۔

"اور چھوٹی آپا! آپ اپنی سناہیے! یمنی نے چھوٹی آپا کو مخاطب کیا۔

"بس گزر رہی ہے زندگی، کیا سناؤں؟" ان کا انداز سادہ سا تھا، نہ کوئی شکوہ، نہ شکایت، کوئی طنز نہ حکایت، پھر بھی جانے کیوں عظمیٰ اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ پتا نہیں ان تینوں نے بھی کچھ محسوس کیا ہے یا نہیں۔ وہ ایک ٹک چھوٹی آپ کا چہرہ دیکھتے ہوئے سوچنے لگی سانولی رنگت پر سادہ سے نقوش، ان کے دل اور زبان کی طرح۔

"پتا نہیں اللہ تعالیٰ نے میری اتنی اچھی بہنوں کے لیے یہ آزمائشیں کیوں رکھی ہیں۔" وہ بڑی آپا اور چھوٹی آپا کے ان بچوں کے متعلق سوچنے لگی جنہیں جنم ہی بے بغیرہ ان کی ماں میں بنی تھیں۔

"محسان کو سنبھال لیتی ہو آسانی سے؟" عفرہ چھوٹی آپا سے پوچھ رہی تھی۔

"بہت مشکل سے۔ بہت تنگ کرتا ہے۔ ابھی تک مانوس ہی نہیں ہوا مجھ سے۔" انہوں نے دل گرنے سے جواب دیا۔

"ہو جائے گا، آہستہ آہستہ ہوگا۔ کچھ وقت لگے گا، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ" بڑی آپا نے گویا تسلی دی۔

"ہاں میں بھی یہ ہی سوچتی ہوں، مگر کبھی کبھی بہت ناممکن لگنے لگتا ہے، اوپر سے لوگوں کی باتیں، ہمت ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے میری، اگر احمد اتنے تعاون کرنے والے نہ ہوتے تو پتا نہیں کیا ہوتا، دراصل۔۔۔" وہ کچھ سوچ کر رک گئیں، پھر دوبارہ کہنے لگیں۔ "دراصل گھر والوں سے زیادہ باہر کے لوگوں کو فکرات لاحق ہوتی

ہیں۔ سگی ماؤں کو اتنی تفتیشی نظروں سے نہیں جانچا جاتا، مگر ہم جیسی ماؤں کے لیے لوگ آنکھوں میں خوربین فٹ کر لیتے ہیں۔ ماں تو ماں ہوتی ہے، کیا سگی کیا سوسلی۔ کیا سگی ماں اپنے بچوں کو ڈانٹتی، مارتی نہیں؟ کبھی کسی معاملے میں لاروا نہیں ہوتیں؟ کیا وہ بچے کبھی بیمار نہیں ہوتے؟ لیکن انہیں اس طرح کانٹوں پر نہیں چلنا پڑتا، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں لوگوں کی باتوں کی وجہ سے اس بچے سے ہی متفرق ہو جاؤں پھر میں سوچتی ہوں کہ اس بچے چارے بچے کا کیا قصور ہے۔ لوگوں کی زبانیں جو آتش فشانی کرتی ہیں، میں وہ آگ خود پر تو جھیل رہی ہوں، بچے کو کیسے اس آگ کی نذر کر سکتی ہوں۔ ”چھوٹی آپا بہت بے بسی سے بول رہی تھیں۔“

”حوصلہ رکھو بیش! دل بڑا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، مگر ایک بار کر لوگی تو بہت آسان لگے گا، اگر اللہ نے ہمارے لیے یہ ذمہ داری لکھی ہے تو راضی سے یا ناراضی سے اس کا سامنا تو ہمیں کرنا ہی ہے۔ بہتر ہے کہ اللہ کی مرضی پر راضی ہوتے ہوئے اسی سے ہی مدد مانگتے رہیں۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے جو ہمارے راستے آسان کرے۔“ بڑی آپا دھیمے دھیمے سمجھاری تھیں۔

”ایک تو نیند بھی نہیں آرہی۔“ عظمیٰ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھی۔

”بے کار اور فضول خیالات سے دماغ خالی کرلو، بہت اچھی نیند آئے گی۔“ یمنی نے مشورہ دیا۔

”میرا دماغ خالی ہی ہے۔“ عظمیٰ نے جلدی سے جواب دیا، اس کا مطلب یہ ہی تھا کہ وہ کچھ بھی الٹا سیدھا نہیں سوچ رہی ہے، مگر وہ چاروں اس کی وضاحت سن کر بے ساختہ ہنس پڑی تھیں اور ان کی ہنسی سن کر عظمیٰ کو احساس ہوا کہ وہ کیا بول گئی ہے۔

”ہمیں پتا ہے بتانے کی ضرورت نہیں ہے اب آہٹا لکری اور چاروں قل پڑھو اور جو دعائیں یاد ہیں وہ پڑھو اور آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ بہت اچھی نیند آئے گی۔“

”ہاں۔ یہ سب مجھے بھی پتا ہے، مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔“ عظمیٰ کھیانی ہو کر لیٹ گئی اور جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

صبح کا اجالا دھیرے دھیرے ابھی پھیلنا شروع ہوا تھا، عظمیٰ تسبیح لے کر صحن میں بچے پر بیٹھ گئی۔ ”کیسی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہے۔“ اس نے بے اختیار سوچا۔

بڑی آپا تو نماز اور قرآن پڑھ کر بچن میں جا رہی تھیں۔ آج ناشتے میں حلوہ پوری اور کچوریاں کا پروگرام تھا۔ ابو اور بھائی لوگ تو بازار سے لانے کو تیار تھے۔

”بچے دو، تم کہاں ان۔“ جھنجھٹوں میں پڑوگی، شاوی سے پہلے کی بات اور تھی بچوں کے ساتھ سب کام کیسے کرو گی۔ ابو ہمدردی سے بولے اور بڑی آپا مسکرا دیں۔ ”کرلوں گی ابو! صبح تو یہ لوگ سو رہے ہوں گے، مسئلہ نہیں ہوگا، پھر یہ چاروں بھی تو ہیں ہاتھ بٹائیں گی نا۔“

بڑی آپا کو علم تھا کہ ابو کو ان کے ہاتھ کا گرما گرم خوشبودار حلوہ، خستہ پوریاں اور کچوریاں اور آلو چھو لے کی ترکاری کتنی پسند تھی اور سچ تو یہ ہے کہ بڑی آپا کے ہاتھ میں جو ذائقہ تھا وہ ان چاروں میں سے کسی کے ہاتھ میں نہیں تھا۔

”بھئی مجھے تو اس کتنی سے پاہر کریں۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ میری یہ لاڈلی اولاد سچ پانچ بجے ہی اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اب میں انہیں سنبالوں یا کام میں ہاتھ بٹاؤں، دونوں میں سے ایک کام ہو سکتا ہے۔“ عظمیٰ نے اعلان کیا۔

”پریشان مت ہو، میں کر لوں گی۔“ بڑی آپا نے جھٹ انہیں رخصت عنایت کی۔

اب وہ بچن میں گھسیں نمیدے میں لوازمات ملا کر گوندھ رہی تھیں۔ ابلے ہوئے چھو لے فریق

کال کر رہا ہر رکھ دیے تھے، ”الو ابل رہے تھے۔“ ”آپ کارو جیکٹ شروع ہو گیا؟“ عظمیٰ اندر آئی۔ ”بالکل ہو گیا۔“

”اچھا، میں سونے جا رہی ہوں۔ جب سب چیزیں تیار ہو جائیں تو مجھے جگا دیجیے گا۔“ عظمیٰ نے زوردار بھائی روکتے ہوئے کہا۔

”اب یہ کون سا وقت ہے سونے کا؟ اٹھ گئی ہو تو اٹھ کر ہو، کام کرو۔ پہلے چائے کاپانی رکھو جو لمبے پہ اور سوچی چھٹی ہوئی رکھی ہے اسے پھونو۔“ انہوں نے ہم نامہ جاری کیا۔

”یہ لیں چھوٹی آپا اور یمنی آگئی ہیں، یہ خدمات ان کے سپرد کریں۔“ دونوں بہنوں کو اندر آتا دیکھ کر عظمیٰ نے سکون اور اطمینان کی سانس لی۔

”ماں جی ہم کر لیں گے، آپ جائیے چھوٹی آپا نے دوسرا کوارٹر لیمے میں کہا۔

”بھئی کوئی اللہ کا بندہ مجھے چائے بنا کر دے دے۔“ ”ہاں، یوں ہمارا منہ کام نہیں ہوتا۔“ بڑی آپا میہ کوندھتے ہوئے بولیں۔

”میں بنا رہی ہوں۔“ یمنی نے آگے بڑھ کر چائے کی پتی کیبنٹ سے نکالی اور اسے کھگال کر چائے کاپانی بنا دیا۔ عظمیٰ موقع غنیمت جان کر وہاں سے کھسکی اور عفران کے پاس جا گھسی، جو اپنے دونوں بچوں کے ساتھ لگی پڑی تھی۔

”یار بات سنو۔“ تو لپے سے ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے عفرانے یمنی کو مخاطب کیا۔ ”ہوں۔“

”ہمارے پڑوس میں عالیہ آنٹی رہتی ہیں نا، ملی ہو گا تم ان سے۔“ ”اچھا!“ وہ عظمیٰ نے الفاظ کھینچتے ہوئے ادا کیے۔

”کیا ہوا؟“ ”ہوا کچھ نہیں، دراصل ان کا جو دوسرے نمبر کا بیٹا ہے، اس کے لیے لڑکی دیکھ رہی ہیں، عفرانے بتایا۔“

”انہوں نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ کوئی اچھی سی

لڑکی بتاؤ، تو میں سوچ رہی تھی کہ یمنی کے بارے میں بتاؤں انہیں۔ ہم تو خالہ کی طرف سے مطمئن تھے کہ وہ ہی لے جائیں گی یمنی کو، ورنہ میں تو بہت پہلے ہی کوئی نہ کوئی لڑکا بتاتی اس کے لیے، اب ان سے کہوں؟“

”ابو اور باقی گھر والوں سے پوچھو، میں کیا بتاؤں؟“ عظمیٰ گڑبڑا گئی۔

”ہاں۔ ہاں۔۔۔ سب سے پوچھ کر ہی بات کروں گی ان سے۔ وہ تو ابھی میرے ذہن میں بات آئی تھی تو تم سے کہہ دی۔“ عفرانے اپنی چوٹی کے بل کھولنے لگی۔

”ان کا بیٹا کرنا کیا ہے؟“ ”جی کام کیا ہوا ہے، کسی پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرتا ہے، ہماری طرح ڈبل کلاس ہیں اور عادت مزاج کے بھی اچھے ہیں۔“ عفرانے مزید تفصیل بتائی۔

”اللہ کرے یمنی کی یہاں بات ہو جائے، وہ بہت آپ سیٹ ہو گئی تھی۔ شکر ہے کہ اب ٹھیک ہے۔“

زندگی کے نئے راستے پہ چل پڑی تو اس کے لیے اور ہم سب کے لیے بہت اچھا ہو گا۔“ عظمیٰ نے مچلتے ہوئے اسد کو قابو کیا جو امی کے ہاتھ میں برش دیکھ کر مچل گیا تھا کہ اپنی امی کے بالوں میں کنگھا خور کرے گا۔

”حلوہ پوری تو دیکھ لو کہاں تک پہنچیں۔“ تھوڑی دیر بعد عفرانے کو خیال آیا۔

”خوشبو تو بہت زبردست آرہی ہے۔“ عظمیٰ نے چہرہ اوپر کر کے گہری سانس لی۔

”بھائی لوگ بھی اٹھ گئے آواز آرہی ہے۔“ تھوڑی دیر میں ہی گھر میں ہلچل ہو گئی تھی۔ گرم گرم پوریوں، خستہ کچوریوں، مزے دار ترکاری اور خوشبودار حلوے کا ناشتا بڑے اہتمام سے کیا گیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر یمنی اور عظمیٰ گھر کے کاموں میں لگ گئیں اور عفرانے بڑوں سے عالیہ آنٹی کے بیٹے کے متعلق ڈسکس کرنے لگی۔

”وہ مجھ سے ایک بار پوچھ بھی رہی تھیں، تمہاری کتنی بہنیں رہ گئی ہیں، کتنی بڑی ہیں، کیا کرتی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت میں نے اتنا دھیان ہی

نہیں دیا۔

”دیکھ لو مناسب انداز میں ذکر کر دینا اپنی بہن کا۔ آگے جو اللہ کا حکم۔“ ابو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

دوبہر میں علی اپنی بہن زرین کے ساتھ آگیا۔

”ہمیں پتا چلا کہ آج گھر میں رونقیں ہو رہی ہیں“

لہذا ہم آگے زرین شگفتہ کچے میں بولی۔

”رونقیں بھی ہیں رنگ اور خوشبو میں بھی۔“

عظمیٰ ہنسی ”یہ کن میں جا کر دیکھو۔“ علی کچھ دیر ابو اور

بھائیوں کے ساتھ باتیں کرتا رہا پھر بچوں کے ساتھ

لگ گیا وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ بہت انجوائے کرتا

تھا۔

”کیا کھاؤ گی؟“ عظمیٰ نے زرین سے سوال کیا۔

”کیا پکاری ہو؟“ اس نے الناسوال کیا۔

”تمہیں پکا کر تھوڑی کھلائیں گے۔“ عظمیٰ نے

آنکھیں منکائیں۔

”پھر؟“

”بھائی کی جیب ہلکی کر رہی ہے ان سے منگوائیں

گے تمہاری پسند کی چیز۔“ عظمیٰ اسے یوں ہی چھیڑتی

تھی۔

زرین کے چہرے پہ سرخی چھا گئی وہ لبوں پہ

بے اختیار آنے والی مسکراہٹ کو چھپانے کے جتن کرنے

لگی۔

”مسکراہٹ چھپانا نہیں چاہیے۔“ اور بھی وہ جو

دل سے نکلی ہو عظمیٰ نے بظاہر سنجیدگی سے مگر

مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا! مشورے کا شکریہ۔“ زرین مسکراہٹ

چھپاتے چھپاتے ہنس پڑی۔ باقاعدہ مثنوی تو نہیں ہوئی

تھی مگر پھر بھی ایک غیر رسمی بات طے تھی اور اب ابو کا

ارادہ تھا کہ زرین اور علی کے بڑے بھائی سے شادی کی

بات کریں۔ بہن بھائیوں کی رائے تھی کہ یمنی کا بھی

کیس رشتہ طے ہو جائے تو دونوں کی ساتھ کر دیں۔

”یہ بیٹی کی وجہ سے ہم دوسرے کی بیٹی کو تو بٹھا کر

نہیں رکھ سکتے۔ اگر سال چھ مہینے میں یمنی کی رخصتی

کا کچھ بندوبست ہو جاتا ہے تو ٹھیک ورنہ ہو تو گھر میں

لے ہی آئیں گے۔“ ابو کی بات بھی مناسب تھی مگر

اب عفرانے جو موضوع چھیڑا تھا تو سب انتظار میں

تھے کہ پردہ غیب سے کیا ظہور ہوتا ہے۔

عفرانے عالیہ آئی سے جیسے ہی یمنی کا ذکر کیا وہ

فورا ہی گھر آنے پر تیار ہو گئیں اور وہ گھر کیا آئیں

جھٹ پٹ چٹ ایک کے بعد ایک شادی کے سارے

مراحل طے ہوتے چلے گئے۔ ابو نے زرین کے لیے

بھی بات کر لی۔ دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں

ہونے لگیں۔

ان ہی امتگوں بھرے خوب صورت دنوں میں علی

کسی کام سے گھر آیا تھا۔ عظمیٰ یمنی کے ساتھ بیٹھی

جوڑے پیک کر رہی تھی۔ گھر کے کاموں سے فارغ

ہو کر وہ کام کرنے بیٹھ جاتی۔ کبھی جوڑیاں بھی جوڑے

کبھی کپڑے بیڈ شیٹس تھوڑا تھوڑا کر کے کام مکمل

ہو رہا تھا۔

”خالو سے کام تھا۔“ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کیا کام؟“ عظمیٰ نے تفتیش شروع کی۔

”ایک جگہ نوکری کے لیے کہا تھا اسی سلسلے میں

بات کرنا تھی۔“

”پیر کلینر ہو گئے تمہارے؟“

”تین سال ہو گئے مجھے بی ایس سی کیے ہوئے۔“

اس کا انداز حمانے والا تھا۔

”ہمیں کیا پتا تم نے کوئی مٹھائی کھلائی ہمیں؟“

عظمیٰ نے پھل میں پن لگاتے ہوئے کہا۔

”کھلائی تو تھی آپ بھول گئیں۔“ علی کو کڑوا

افسوس ہوا۔

”اچھا۔“ عظمیٰ نے تعجب کا اظہار کیا۔

”ہو سکتا ہے تم نے کھلائی ہو اور ہم بھول گئے

ہوں۔“ اس نے اپنی غلطی تسلیم کی۔

”تم پاگل تو نہیں ہو کیوں بے چارے کو تنگ

کر رہی ہو؟“ یمنی نے مداخلت کی۔

”یہ جو ہمارے علی صاحب ہیں نا اتنے بے چارے

بھی نہیں ہیں جتنے یہ زمین کے اوپر دکھائی دیتے ہیں نا

اتنے ہی اندر بھی ہیں۔“

”اچھا! خواجواہ کیوں فضول باتیں کر رہی ہو۔“

یمنی نے پھر اسے گھر کا۔

”تم سناؤ علی! ابو نے کون سی جاب کے متعلق بات

کی تھی۔“ یمنی اس سے مخاطب ہوئی۔

”اپنے آفس کا ہی کہہ رہے تھے کوئی ویکسینسی

ہے بس سرسری سی بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے

کہ فارغ ہو تو گھر آ جانا پھر تفصیل بتا دیں گے۔“

”اچھا۔“ یمنی نے سر ہلایا۔

”ویسے تو ابو اس وقت تک گھر آ جاتے ہیں۔ بس

کبھی کبھار ہی دیر ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے آنے والے

ہوں تم کچھ گرم لوگے یا ٹھنڈا۔“

”جو بھی پینا ہے یمن کاراستہ یہ ہے جاؤ بناؤ اور لے

آؤ۔ ہم بھی پیئیں گے۔“ عظمیٰ نے پھر ٹانگ اڑائی۔

”جب کرو تم۔“ یمنی نے اسے ڈانٹا۔

”ایسا کرو شربت بناؤ۔ نہیں۔“

علی شربت پیو گے یا چائے؟“ یمنی نے علی سے ہی

پوچھا۔

”چائے زیادہ اچھی نہیں لگتی مجھے۔“ علی نے سر

کھجایا۔

”خبردار چائے کو کچھ مت کہنا۔“ عظمیٰ نے اسے

تنبیہ کی۔

”چلیے آپ کی پسندیدہ معزز چائے مجھے زیادہ نہیں

ہماتی۔“ علی نے لفظوں میں ترمیم کی۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ عظمیٰ مطمئن ہو گئی۔

”اچھا یہ بتاؤ تمہارے موبائل میں بیلنس ہے؟“

اسے اچانک ہی کچھ یاد آیا۔

”کم ہے۔“

”غریب! جب موبائل رکھتے ہو تو بیلنس بھی رکھا

کرو۔“

”تمہیں شربت بنانے کو کہا تھا۔ موبائل سے کیا

کام رہے گا؟“

یمنی کو پھر نوکنا پڑا۔

”عفرانے کو فون کروں گی۔“

”کیوں؟“

”شاپنگ پہ جانا ہے نا وہ کہہ رہی تھی میرے ساتھ

چلنا اس کے بچوں کو بھی تو سنبھالنا ہو گا۔“

”تمہیں کچھ لینا ہے یا صرف بچے سنبھالنے ان کے

ساتھ جا رہی ہو؟“

”دیکھوں گی کچھ پسند آگیا تو لے لوں گی۔“ عظمیٰ

نے بے نیازی سے جواب دیتے ہوئے اچانک علی کی

طرف دیکھا۔

”تم موبائل تو دو۔“

”کب سے تو ہاتھ میں لے کر بیٹھا ہوں۔“ اس

نے چارگی سے بولتے ہوئے سیل فون اس کی طرف

برہمایا۔

”تم پہلے شربت بناؤ پھر آ کر بات کرنا۔“ یمنی نے

اس کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔

”سچ بہت ظالم ہو تم۔“ عظمیٰ نے منہ بناتے

ہوئے بہن کو دیکھا۔

”واٹس ایپ لگ نہیں کام کرو جاؤ۔“ یمنی نے اس

کے احتجاج کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

”جا رہی ہوں۔“ عظمیٰ غیر متوقع طور پر شرافت

سے کھڑی ہو گئی۔

”کچھ دیر بعد واپس آئی توڑے میں دو گلاس شربت

اور ایک چائے کا کپ رکھ کر لائی۔ شربت کے دو گلاس

اس نے علی اور یمنی کو تمہائے اور خود چائے کا کپ

لے کر بیٹھ گئی۔ اسی دوران ابو بھی آفس سے آگئے۔“

”السلام علیکم۔“ تینوں نے تقریباً ایک ساتھ ہی

انہیں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام! اچھا بھئی علی! میں تمہیں ابھی کال

کرنا اچھا ہوا کہ تم آگئے میں ذرا چیخ کر کے آتا ہوں

پھر بات کرتے ہیں۔“ سلام کا جواب دے کر وہ علی سے

مخاطب ہوئے۔

”جی۔“ اس نے بڑی تابعداری سے جواب دیا۔

ابو اندر چلے گئے اور علی نے شربت کا گلاس خالی کر کے

ٹرے میں رکھ دیا۔ اسے ابو کا انتظار تھا جن کے پاس

2011

شاید اس کے لیے کوئی اچھی خبر نہ تھی۔



”اللہ عفر! یہ تمہارے دونوں بھی نا ایک اور ایک دو نہیں بلکہ گیارہ ہیں۔ عظمیٰ ہاتھ چھڑانے کے لیے مچلتے ہوئے اسد کو مضبوطی سے پکڑتی ہوئی عفر سے مخاطب ہوئی۔ عروبہ بڑے مزے سے بایا کی گود میں سوار اوہرا دھر کے نظارے کر رہی تھیں۔ شاپنگ خیر سے مکمل ہو چکی تھی اور اب وہ لوگ گاڑی میں بیٹھنے جارہے تھے۔“

”میں سوچ رہی تھی گروسری بھی لے لوں۔ پھر آپ کو ہی زحمت کرنا پڑے گی دو چار دن بعد۔ سڑک پار نظر آتے اسٹور کو دیکھ کر عفر کو کچھ خیال آیا تو وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے رک گئی۔“

”پھر کیا خیال ہے چلیں؟“ وہ شوہر سے مخاطب ہوئی۔

”اف بیوی تم بھی بس۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

”عظمیٰ تم پلیران دونوں کا خیال رکھنا ہم لوگ بس تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔“ عفر اس سے مخاطب ہوئی۔

”جائیے جی ہم دیکھ لیں گے ان دونوں بد معاشوں کو۔“ عظمیٰ نے اندر بٹھ کر گاڑی کا دروازہ بند کیا۔

”دھیان سے رہنا تم بھی۔“ عفر اجاتے جاتے پھر پلٹ آئی۔

”توبہ ایسا لگ رہا ہے کہ کسی محاذ پر جارہی ہو اب جاؤ بھی تمہیں دیکھ دیکھ کر تمہارے بچے اور بدک رہے ہیں۔“ عظمیٰ نے اسے گھورا۔

”چلو ہم یمنی اتنی سے بات کرتے ہیں۔“ عظمیٰ نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر ملا کر اسٹیکر آن کر دیا۔

”اب ہم اتنی سے باتیں کریں گے ٹھیک ہے۔“

”کہاں ہو؟ اتنی دیر لگادی کب سے انتظار کر رہی ہوں تم لوگوں کا۔“ یمنی اس کی آواز سنتے ہی شروع ہو گئی۔

”ارے بس آرہے ابھی تھوڑی دیر میں دراصل خریداری تو سب ہو گئی تھی مگر ہماری بہن صاحبہ کو اپنے بچن کا بھی خیال آگیا تو وہ سودا لینے گئی ہیں تھوڑی دیر کا بول کر گئی تھیں اب دیکھو وہ تھوڑی دیر کتنی میں ہوئی ہے۔“ عظمیٰ ہنسی۔

”اسی وقت میں ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی ان کی گاڑی لرز اٹھی، عظمیٰ کو اپنے کانوں کے پردے بھٹتے ہوئے محسوس ہوئے اور ایسا لگا جیسے اک دم اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا ہو جائے۔ ایک لمحہ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے اور وہ کیا کرے؟

بے اختیار اس نے عروبہ اور اسد کو خود سے چمٹایا جن کے معصوم چہرے سم گئے تھے۔

موبائل اس کی گود سے نکل کر نیچے گر گیا تھا جہاں سے یمنی مسلسل ہیلو ہیلو کر رہی تھی۔

ہیلو، ہیلو، عظمیٰ تم ٹھیک تو ہونا یہ دھماکا کیسا ہے کچھ تو بولو عظمیٰ۔“ یمنی کی آواز سے بے حد پریشانی اور ڈر چھلک رہا تھا۔

عظمیٰ فون آف کر کے خالی خالی نظروں سے سڑک کے اس طرف دیکھنے لگی جہاں دھوئیں کے گہرے دھند چھائے ہوئے تھے اور آگ بھی بھڑک اٹھی تھی۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ ایسولینس سائرن آہاتی آرہی تھی۔ چاروں طرف ایک بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی اور سڑک کنارے گاڑی میں دو سہے ہوئے لوگوں کے ساتھ بیٹھی عظمیٰ کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ ایک نے کو اسے سارا منظر اور پس منظر میں اپنا آپ یکسر اپنی اور لا تعلق سا لگا۔

”یہ سب کیا ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے پھر اپنی دلی نظروں سے سامنے دیکھا۔ دور سڑک پار آگ و دھواں کا یہ منظر کچھ نیا تو نہیں تھا۔ اس نے باؤف ہوتے دیکھ کر زور ڈالا۔ ایسے کئی مناظر وہ لی وی اسکرین پر دیکھ چکی تھی مگر تب وہ اس قسم کے مناظر اور حادثات کا سامنا نہیں کرتی تھی اور اب۔۔۔ اب وہ بھی اس قیامت سے گزر رہی تھی۔

”میں کہاں ہوں؟ کہیں ہوں بھی یا نہیں۔“

تھوڑی دیر کو یہ وسیع و عریض کائنات اسے خالی لگی اور اہل جود اکیلا تھا۔

موت کے فرشتے چند قدم کے فاصلے پر اپنا کام کر رہے تھے۔ اگر وہ یہاں بھی پہنچ جاتے تو۔۔۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔

اپنی ارزاں، اتنی بے وقعت اور اتنی بے بھروسا زندگی۔۔۔ امدادی کارکن، تڑپتے زخمیوں اور لاشوں کو اٹھانے والے ہوئے انسانی اعضاء کو وہاں سے ایسولینس میں داخل کر رہے تھے۔

”میری ماما کہاں ہیں، ماما کو بلائیں۔“ عروبہ نے رونا شروع کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اسد بھی منہ اودرنے لگا۔

”ماما ماما۔“

عظمیٰ، یمنی کے پاس آگئی۔

”بچے سو گئے کیا؟“

”ہاں کتنا روتے، کتنی ضد کرتے۔۔۔ تھک بار کے بے چارے سو گئے۔“ یمنی کی آواز میں شکستگی در آئی۔

”اب ہم بھی چلیں گے بیٹی! اللہ صبر دے سب کو، چھوٹی پھپھو بھی وہیں آگئیں۔“ عظمیٰ اور یمنی کے سروں پہ باری باری ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”ایسی جوان موتیں۔۔۔ نگاہوں میں اب تک دونوں کے چہرے گھوم رہے ہیں اللہ کی مصلحت وہی جانے۔ بچوں کے لیے دل کڑھتا ہے، جانے ان کے ساتھ کیا ہو۔“

وہ اپنی ہی رو میں بولتی چلی گئیں، پھر عظمیٰ اور یمنی کے چہرے دیکھ کر انہیں یکایک اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لاکھ ضبط کرنے کے باوجود بھی دونوں کی آنکھوں سے بہن اور بہنوئی کی اچانک موت کا غم، آنسو بہن کر ٹپک پڑا۔

”صبر کرو بچو! اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے، یہ جان اس کی امانت ہے۔ ہر ایک کو اپنے وقت پر جانا ہے، ہمیں بھی تمہیں بھی کیا کریں جس نے غم دیا ہے اسی سے ہی مدد مانگیں گے، صبر مانگیں گے۔ پھپھو کی آواز بھی بھرا گئی، عفر اور اس کے شوہر کی ناگہانی اموات نے تو غیروں کو بھی آبدیدہ کر دیا تھا، وہ تو پھر سکی پھپھو تھیں۔“

ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ بڑی آیا، چھوٹی آیا بھی بھلا کتنے دن رکتیں، گھر تو جانا ہی تھا سو چلی گئیں۔ دکھی اور پریشان دل کے ساتھ سب ہی جیسے تیسے وقت گھسیٹ رہے تھے۔ بچے ابھی تک تو یہیں تھے۔ عفر کے ساس، مسر تو حیات نہیں تھے باقی دو جیسٹھ دو دیور اور تین ننڈیں سب شادی شدہ تھے۔ سارے ہی مڈل کلاس گھرانے تھے، اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے تھے۔ دونوں بچوں کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے ابھی تک کسی نے جھوٹے منہ بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر عظمیٰ فیصلہ کر چکی تھی۔

تھی۔ اس نے گھر میں سب کو آگاہ کر دیا تھا کہ عفرائے
بچوں کی ذمہ داری وہ اپنے کاندھوں پر لے رہی ہے۔
”جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو؟“ باسط بھائی چونک اٹھے۔

”جی۔“

”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے بیٹی! کل کو تمہاری
شادی ہوگی پھر؟“
ابو نے سمجھایا۔

میں شادی اس سے کروں گی ابو! جوان دونوں کے
ساتھ مجھے قبول کرے، ورنہ شادی کوئی اتنی ضروری
بھی نہیں عظمیٰ نے دھیرے سے مگر مضبوط لہجے میں
جواب دیا تھا۔

”میں اور زرین سنبھال لیں گے بچوں کو، تم ان کی
فکرمات کرو۔“

بھائی نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
عفرائے نے آخری بار مجھ سے یہی کہا تھا کہ بچوں کا
خیال رکھنا اور کیا پتا قدرت نے اس کے منہ سے یہ
کہلوا دیا ہو؟ ان دونوں کی ذمہ داری میں خود اٹھاؤں گی۔
عظمیٰ کا انداز اٹل تھا۔

”تم جذباتی ہو رہی ہو“ اچھی طرح سوچ سمجھ کر
فیصلہ کرنا چاہیے ویسے بھی زرین نے مجھ سے خود کہا
ہے کہ بچوں کے معاملے میں فکر مند ہونے کی
ضرورت نہیں۔ وہ ان کی ذمہ داری اٹھانے کو بخوشی
تیار ہے اور وہ کوئی غیر تو نہیں گھر کی بیٹی ہے۔ ہم بچپن
سے اسے جانتے ہیں وہ محبت کرنے والی پر خلوص لڑکی
ہے اور پھر یہ بات اس نے خود اپنی مرضی سے کہی ہے۔
ہم نے تو یہ بات سوچی بھی نہیں تھی کہ یہ ذمہ داری
اسے سونپ دیں، مگر اس نے خود ہی اس خواہش کا
اظہار کیا ہے اور رہی بات تمہاری تو بے شک ہم سب
تمہارے جذبات سمجھ سکتے ہیں، مگر بیٹی زندگی فقط
جذبات کے سہارے نہیں گزرتی، چاہے اپنے سگے ہی
کیوں نہ ہوں، کسی کی اولاد پالنا بڑی ٹھنڈی ذمہ داری
ہے۔“ ابو نے اسے سمجھانے کی پھر اپنی سی کوشش کی
مگر ان کی یہ کوشش بے سود رہی۔

”ہماری بہنیں بھی تو کسی اور کے بچے پال رہی ہیں
یہ تو پھر بھی میری سگی بہن کے بچے ہیں۔“ عظمیٰ کے
پاس ہر دلیل کا جواب موجود تھا۔

”چپ ہو جائیں، بحث بے کار ہے۔“ بھائی نے ابو
کو اشارے سے منع کیا۔

بیمنی کی رخصتی بے حد سادگی سے کر دی گئی تھی،
شادی آگے بڑھانے کا مسئلہ تھا، دونوں طرف سے
تیاریاں مکمل تھیں پھر ابو نے ہی کہا کہ ایک کام سال
چھ ماہ بعد بھی کرنا ہی سہرا تو وہاں بعد کیوں نہیں دواںہائی
عزیز زندگیاں ختم ہونے کا غم اپنی جگہ، مگر کب تک
سوگ مناتے یہ سوگ تو زندگی بھر کا تھا اور زندگی کے
معاملات کبھی رکتے بھی ہیں بھلا۔

بیمنی خوش نصیب تھی، جیون ساتھی اچھا ملا۔ اس
سے وابستہ تمام افراد خانہ بھی سنبھلے ہوئے تھے، سو وہ
اپنے پچھلے دور خزاں کو فراموش کر کے اس نئی آفتاب
والی بہار میں خوشیوں کے رنگا رنگ جھولے میں
جھول رہی تھی۔ ایک ایک کر کے سب کو ہی بہر حال
اپنی اپنی زندگیوں میں مگن اور مصروف ہو جاتا تھا۔
زرین بھی اچھی لڑکی تھی، گھر میں فوراً ہی کھل مل
گئی تھی۔ بچوں کو سنبھالنے اور دل جوئی کرنے کی
کوششیں سب ہی کرتے تھے مگر عظمیٰ تو اسی طرح ان
کی دیکھ بھال کر رہی تھی جس طرح ایک ماں پالتی ہے،
اور اسے اب علم ہوا تھا کہ ماں کے قدموں تلے جنت
کیوں رکھی گئی ہے۔ اتنی محبت مشقت کے کڑے
امتحان میں پورا اترنا بڑا ہی مشکل تھا۔ لاکھ کوششوں
کے باوجود بھی دونوں بچے ایک ہی کام ایک ہی وقت
میں کرنے سے قاصر تھے۔ ایک سو تا تو دوسرا اٹھ جاتا،
ایک کو بھوک لگتی تو دوسرے کو پیپہر کھلوانا یا بندھنا
ہوتا تھا، پھر اپنی ممانہ پیا کو یاد کر کے بچے الگ الگ
ہوئے جاتے تھے۔ اس وقت بچوں کو بھلا نا دنیا کا مشکل
ترین کام تھا مگر عظمیٰ گھر والوں کے تعاون کے ساتھ ان
کٹھنایوں سے گزر رہی رہی تھی۔

آج کا دن بڑا اداس اداس سا تھا، عظمیٰ کو ہی کچھ ایسا
غموں ہو رہا تھا۔ بیٹی کی لگائی ہوئی نیل کے پتے بھی
غاموشی سے دم سادھے پڑے تھے۔ عظمیٰ نے غور سے
کیلے کی طرف دیکھا۔

خزاں کا موسم اتنا طویل تو نہیں ہوتا، کبھی نہ کبھی
بار آتی جاتی ہے۔ پھر اس نے بیٹھے بیٹھے دونوں ہاتھ
ٹخنوں کے گرد باندھے اور گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکا کر چپ
ہاپ جانے کیا کیا سوچے چلی گئی۔

”زندگی اتنی عجیب کیوں ہے۔“ اس کا ذہن سوچتے
سوچتے ایک ہی نقطے پر ٹنگ گیا، ہم سب کے سینوں
میں دل کے بجائے پتھر دھڑک رہے ہیں۔

کل کچھ لوگ اسے دیکھنے آئے تھے۔ ایک تو اسے
”دیکھنا“ ہی بڑا عجیب بلکہ برا سا لگتا تھا۔

مہمان آئے، بے حد خوش اخلاقی اور ملنساری کے
ساتھ باتیں کیں، عظمیٰ انہیں قبول بھی مگر دونوں بچوں
کے ساتھ نہیں کھلا لاکھ انہیں پہلے ہی ساری صورت
مال سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ ہاں ایک آپشن ضرور دیا
انہوں نے دیکھیں، میں بغیر کسی لگی پٹی کے صرف اتنا
گنا چاہتی ہوں کہ جب آپ کی بیٹی ہمارے بھائی کو
ایک بیٹی کے ساتھ قبول کر رہی ہے تو آپ کی بیٹی کے
ساتھ ایک بچے کو ہم بھی قبول کریں گے۔ آپ اپنی
اواسی کو بے شک اپنے پاس رکھ لیں اور نواسے کو بیٹی
کے ساتھ رخصت کر دیں۔ ہمیں تو انصاف کی بات
لگتی ہے۔“ لڑکے کی بڑی بہن نے صاف گولی کا
ملا ہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہم سوچ کر جواب دے دیں گے۔“ کچھ دیر کے
غاموشی کے بعد ابو نے جواب دیا تھا۔

”ہاں ہاں بالکل، یہ تو آپ کا حق ہے۔ اچھی طرح
سوچ سمجھ لیں پھر ہمیں اپنے فیصلے سے آگاہ کریں۔“
عظمیٰ نے انکار کر دیا تھا، بات ختم ہو گئی، مگر تینا نہیں
ات ختم ہوئی تھی یا دراصل شروع اب ہوئی تھی۔
”بہت مشکل راستہ چلتا ہے تم نے۔“ زرین نے بھی

اسے سمجھانے کی اپنی سی کوشش کی۔ ”مشکل ہو یا
آسان، اب تو فیصلہ کر لیا۔“ عظمیٰ کے لہجے میں چٹان
جیسی مضبوطی تھی۔
”کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟“ علی کی بلند آواز سن کر وہ اک
دم ہڑپا گئی۔

”کیا ہوا؟“ وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ کیا ہوا؟ پچھلے دو منٹ
سے میں یہاں کھڑا آپ کو مخاطب کرنے کی کوشش کر
رہا ہوں مگر آپ ہیں کہ۔۔۔“ علی کرسی گھسیٹ کر وہیں
ٹنگ گیا۔ ”اچھا، مجھے پتا نہیں چلا، عظمیٰ سیدھی ہو کر بیٹھ
گئی۔ تمہاری آج چھٹی تھی کیا؟“ عظمیٰ نے بے وقت
اسے گھر پر دیکھا تو پوچھ بیٹھی۔

”ہاں ڈے تھا، ٹھوڑی دیر پہلے گھر آیا تھا، چینیج کر کے
یہاں آگیا۔“

”چائے پیو گے؟“

”نہیں، شربت۔“ علی نے اپنی چوائس بتائی۔

”میں بنا کر لاتی ہوں،“ عظمیٰ اٹھ کھڑی ہوئی۔

ٹھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے لیے چائے اور علی کے

شربت لے آئی، ”تمہاری حاب کیسی چل رہی ہے؟“

”بہت اچھی،“ علی گھونٹ گھونٹ شربت پی رہا تھا۔

”آپ کو دشواری نہیں ہوتی بچوں کو سنبھالنے

میں۔“ علی نے اچانک سوال کیا۔

”ہاں ہوتی تو ہے۔“ عظمیٰ نے چائے کا گرم گھونٹ

بھرتے ہوئے اعتراف کیا۔ ”مگر آہستہ آہستہ سب

سیٹ ہو جائے گا۔“

”اچھا۔“ علی نے اس گہرے یقین بھرے انداز پر

عظمیٰ کو بغور دیکھا، ”اور سب خیریت ہے نا؟“

”ہاں، کیوں؟“ عظمیٰ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔“ علی نے آہستہ

سے بولتے ہوئے خالی گلاس ٹرے میں رکھا۔

”میں؟ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”کوئی خاص بات نہیں، بس یوں ہی۔“

”آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔“ علی مسکرایا۔ ”اچھا

میں چلتا ہوں۔ ہو سکتا ہے رات میں چکر لگاؤں، انکل

”صلی اچھا لڑکا ہے“ سیدھا سادا ضرور ہے مگر بے وقوف نہیں۔ سلجھا ہوا، سمجھ دار لڑکا ہے، ہمدرد اور نرم مزاج بھی ہے۔ مجھے وہ تمہارے لیے پسند ہے اور مجھے یقین ہے کہ باقی سب گھروالوں کی رائے بھی اس کے حق میں ہوگی۔ اب اپنی بات ختم کر کے مختصر نظروں سے اسے دیکھنے لگے، جو کچھ حیران اور کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔

”میں سوچ کر جواب دوں گی۔“ عظمیٰ نے کچھ دیر بعد دھیرے سے کہا۔

”کوئی جلدی نہیں، اچھی طرح سوچو، غور کرو، پھر فیصلہ کرو، علی مجھے پسند ہے مگر یہ میری رائے اور مشورہ ہے تمہارے لیے، کوئی زبردستی نہیں۔ ٹھیک ہے؟“ انہوں نے شفقت سے اس کا سر تھپکا۔



اگلے روز اتوار تھا۔ ابو نے رات میں بیٹیوں کو فون کر کے آنے کو کہہ دیا تھا۔ تینوں دوسرے روز ایک ایک کر کے آگئیں۔

”میں کیا کروں آیا! کچھ تو بتائیں؟“ بچن میں مسالہ بھونتی آیا کو عظمیٰ نے مخاطب کیا۔

”کیا مطلب کیا کروں؟“ بھئی ابھی اتنا سارا کام باقی ہے۔ تم ایسا کرو، مسلا اور راستہ بنا کر کباب مل لو اور پہلے یہ چاول بھگو دو۔“ آیا بڑے مصروف انداز میں دستکچے میں چچہ چلا رہی تھیں۔

”افو! میں کام کی بات نہیں کر رہی۔“ عظمیٰ جھنجھلائی۔

”تو پھر؟“ آپا کی ساری توجہ ابھی بھی مسالہ بھوننے پر تھی۔ خشک ہوتے مسالے میں انہوں نے پانی کا چھینٹا دیا۔

”میں۔۔۔ علی کی بات کر رہی ہوں۔“ وہ دھیرے سے رُک رُک کر بولی۔

”صلی؟ کیا ہوا، بس ہاں کرو، اچھا لڑکا ہے، دیکھا بھالا ہے۔“ آیا نے جلدی جلدی بول کر مسالے میں دو گلاس پانی ڈالا۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، کیا فیصلہ کروں؟“ ”مگر تم تذبذب میں ہو تو استخارہ کر لو، اللہ بہتر کرے گا۔“ انہوں نے عظمیٰ کو مشورہ دیا اور چاول بھگونے لگیں۔

”میرے لیے استخارہ آپ کر دیں۔“ عظمیٰ نے جیسے ان سے درخواست کی۔

”جی نہیں، یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ اپنے معاملات میں خود استخارہ کرنے کے بجائے کسی اور سے کروالو؟ استخارہ دراصل اللہ تعالیٰ سے مشورہ ہے، جو

ہم اپنے کسی بھی اہم معاملے کے لیے اس سے لیتے ہیں، اسے خود ہی کرنا چاہیے، یہی درست اور احسن طریقہ ہے، یہ کوئی اتنا مشکل بھی نہیں ہے، دو رکعت نفل پڑھ کر استخارے کی مسنون دعا پڑھو اور اللہ سے

دعا کرو کہ جس معاملے میں بہتری ہو، اسی طرف رہنمائی کر دے۔“ آپا نے آگے مزید تفصیل سے بتایا۔

”ٹھیک ہے میں استخارہ کر لیتی ہوں۔“ عظمیٰ آہستہ سے جواب دے کر کھیرا کالنے لگی۔

”یعنی رُک گئی تھی۔ بڑی آیا اور چھوٹی آپا رات کا کھانا کھا کر اپنے اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ رخصت ہو گئی تھیں۔ زرین کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ جلدی سونے کے لیے چلی گئی۔ عظمیٰ اور یمنی رات دیر تک باتیں کرتیں رہیں یمنی سمیت گھر کے سب ہی افراد کا ووٹ علی کے حق میں تھا اور عظمیٰ؟ وہ متذبذب تھی، سوال فقط اس کے دل اور زندگی کا نہیں تھا، وہ

معصوم جانوں کا بھی تھا، جن کے لیے اس نے اپنے خوابوں اور امنگوں کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔

”زیادہ سوچ بچار کر کے خود کو ہلکان مت کرو۔“ وہ بے چارہ دونوں بچوں کی ذمہ داری کے ساتھ تمہیں قبول کرنے کو تیار ہے۔ یہ سراسر اللہ کی رحمت ہے اور مدد ہے تمہارے لیے، اسے ٹھکرانے کی غلطی مت

کرتا۔“ یمنی نے پر زور لہجے میں اسے تنبیہ کی تھی۔

”ہوں۔“ عظمیٰ نے ایک گہری سانس لے کر بہت

دیر تک چپ چاپ سوچتی رہی تھی علی! میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں، ٹائم ہے تمہارے پاس؟ اس نے علی کو فون کیا تھا۔

”میں فارغ ہوں۔“ بولیے تو گھر آ جاؤں؟ علی نے جواب دیا۔

”نہیں میں فون پر ہی بات کروں گی ابھی۔“ ”کہیے، میں سن رہا ہوں۔“

”تم، عظمیٰ ایک لمحے کو رُکی۔“ تم میرے اور بچوں کے ساتھ ہمدردی کر رہے ہو؟“

”ترس نہیں کھا رہا، ہمدردی کر رہا ہوں اور یہ کوئی بری بات نہیں۔ اچھی خالہ نے بھی تو ہمارے ساتھ

ہست ہمدردی کی تھی۔“ علی نے اس کا سوال سمجھ کر جواب دیا تھا۔

”پی! ابوی نیکی کا بدلہ اتار رہے ہو؟“ ”نہیں، ان کی نیکی کا بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔“

میری کیا مجال جو انہیں بدلہ دوں۔ میں تو بس اپنے بچے کے چراغ جلا رہا ہوں، علی کی انداز میں قطعیت تھی۔

”جانتے بھی ہو، کیا ذمہ داری اپنے سر لے رہے ہو۔“ کیا سوچ کر یہ فیصلہ کیا تم نے؟“

”آپ نے کیا سوچ کر بچوں کی ذمہ داری اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا؟“ علی نے الٹا عظمیٰ سے سوال کیا۔

وہ میری سگی بہن تھی علی! اور مجھے بہت عزیز تھی۔ عظمیٰ نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

”تو میں بھی تو اس گھر میں آپ سب کے درمیان پلا بڑھا ہوں، کیا مجھے وہ زرین کی طرح عزیز نہیں

ہو سکتیں؟ کیا ان کے بچوں سے میں اس طرح پیار نہیں کر سکتا جیسے آپ کرتی ہیں؟“ علی بہت مضبوط لہجے میں مدلل بات کر رہا تھا، عظمیٰ اسے سن کر حیران تھی۔

”کسی کی اولاد کو اپنا بنانا آسان نہیں ہوتا۔“ عظمیٰ کے لہجے میں اک دم ہی شکستگی اور ٹھکن در آئی تھی۔

”بڑی آیا اور چھوٹی آپا کی مثال میرے سامنے ہے۔“ علی اس سے برابر بحث کر رہا تھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بساط دل	آمنہ ریاض	500/-
ذرا دوسم	راحت جبین	600/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار رحمان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار رحمان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	400/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آنکھوں کا شہر	فاخرہ افتخار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فاخرہ افتخار	500/-
پھلاں دے رنگ کالے	فاخرہ افتخار	250/-
یہ گلیاں پہنچا رہے	فاخرہ افتخار	300/-
صحنے سے موت	غزالہ عزیز	200/-
دل آسے محفوظ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرنا جا نہیں خواب	آسیہ رزاقی	200/-
دھم کو خند تھی سہماں سے	فوزیہ یاسین	250/-
اماں کا چاند	بشری سعید	200/-
رنگ خوشبو ہوا بادل	افتخار آفریدی	450/-
درد کے قاسم	رضیہ جمیل	500/-
آج صبحن پرچا نہیں	رضیہ جمیل	200/-
درد کی منزل	رضیہ جمیل	200/-
میرے دل میرے مسافر	حیمہ حرقیشی	300/-
حیری راہ میں دل گئی	میونہ خورشید علی	225/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	400/-

ناول نگاروں کے لئے کتاب اک شرح - 30 روپے

نگاروں کا پتہ:

کتاب و عمران ڈائجسٹ - 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32216361

”کیا! یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ جمع اہل و عیال دو ہفتے پہلے ہی آرہے ہیں؟“ منائل کی سوال نہایت ”خبریں کر جھل کی آگ کی طرح پورے کھر میں پھیل چکی تھی۔ جس نے سنا اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔



”تم ٹھک کہتے ہو، میں واقعی پہلے کے مقابلے میں بہت بدل گئی ہوں۔ مگر۔۔۔“ عظمیٰ نے روانی سے بولتے ہوئے اس کی بات سے اتفاق کیا لیکن اس کے پہلے فقرے پر غور کرتے ہوئے وہ اک دم ٹھک گئی۔

”علی۔۔۔ تم نے کیا کہنے کی کوشش کی ہے؟“ عظمیٰ نے آہستہ سے رک رک کر پوچھا۔

”یہ بات تو سچ سچ میں نے دل سے کہی ہے اپنے بھی اور آپ کے بھی۔“ دو بارہ بہت ہولے سے بولا تھا۔
”اچھا علی! میں فون بند کر رہی ہوں۔“ عظمیٰ نے اپنے دل کے دروازے دھیرے دھیرے اس کے لیے کھلتے ہوئے محسوس کیے تھے۔
اور فون بند کرتے ہوئے عظمیٰ کو اندازہ ہو چلا تھا کہ آگے ایک خوب صورت زندگی اس کا انتظار کر رہی ہے۔

”آپ کسی اور پر نہ سہی، کم از کم مجھ پر تو بھروسہ کر سکتی ہیں، میں اتنا ناقابل اعتبار تو نہیں۔“ عظمیٰ کی خاموشی بروہہ دوبارہ بولا تھا۔

”علی! تم... تم ابھی چھوٹے ہو، اتنے بڑے نہیں ہو گئے، اتنے بڑے بڑے فیصلے کر سکو۔“ عظمیٰ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھائے۔

”جی۔“
”ٹھیک ہے علی! میں تم پر بھروسہ کرنے کو تیار ہوں۔
میرا اعتبار قائم رکھو گے؟“ عظمیٰ پر سکون انداز میں گویا
ہوئی۔
”اگر واقعی مجھ پر بھروسہ ہے تو یہ سوال کرنے کی
ضرورت نہیں اور میں زبان سے کیا دعوا کروں؟ میرا
عمل خود ہی اس سوال کا جواب دے دے گا۔“ علی
جس اعتماد سے بات کر رہا تھا، عظمیٰ کے لیے ایک نیا
خوش گوار احساس تھا۔
”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم وہی خاموش طبع علی ہو“

ساتھ بیٹھی علیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پھونک مارتے ہوئے دکھڑا دیا۔

”میرے منہ پر کیوں پھونکس مار رہی ہو۔“ علیہ نے چڑتے ہوئے اسے پرے دھکیلا۔

”کچھ نہیں ہوتا۔ اب وہ زبانی گئے جب ہماری ان کی وجہ سے شامت آیا کرتی تھی۔“ علیہ نے ان سب کو منہ لٹکائے دیکھ کر تسلی دی۔

”تم انہیں کان پر سے کبھی کی طرح نہ اڑاؤ۔ جب وہ ہر بات پر اعتراض اور شکایتوں کے انبار لگائیں گے اور رائی کا پھاڑیل میں گے تب پتا چلے گا۔“ غمخیز نے اس کے انداز پر کہا۔

”ایک تو تمہاری ہر بات میں دو تین محاورے ضرور ہوتے ہیں۔ کبھی تو کوئی بات اپنے الفاظ میں کر لیا کرو اور جو ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اس لیے کوئی اوٹ پٹانگ پلان بنا کر دادا کے غصے کو ہوانہ دو۔“ علیہ نے ان سب کو سر جوڑے بیٹھے دیکھ کر کہا تھا۔

”بی بی! آپ تو مایوں بیٹھی ہوں گی۔ اس محاذ پر اب ہمیں اکیلے ہی لڑنا ہے۔“ منصور نے پر سوچ انداز میں کہا۔

”آخر کو ہمارے خاندان کی دوسری شادی ہے اور اسے ہم پہلی کی طرح ان کی دہشت کی نذر نہیں ہونے دیں گے۔“ احمر کو اپنی شادی میں ان کی شرکت اب تک یاد تھی۔

”میں اب ان کے لیے دعا گو ہوں۔ تم لوگوں کے ارادے کافی ”نیک“ لگتے ہیں۔ مثال نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

علیہ اور عدیل کی شادی کا کارڈ ملتے ہی ساجد نے اپنی فیملی کے ساتھ دو ہفتے پہلے ہی آنے کی اطلاع دی تھی۔ نہ سننا تھا کہ ہر کوئی گھبرایا ہوا پھر رہا تھا۔ ایک سال پہلے احمر اور عمارہ کی شادی پر بھی وہ کچھ ہفتے پہلے ہی آگئے تھے اور ہر بات پر روٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔

شروع شروع میں سب نے بہت خیال رکھا مگر پھر ان کی اس عادت سے سب ہی چڑ گئے تھے لیکن کچھ کہہ نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ دادا کے چھوٹے بھائی کے اکلوتے بیٹے تھے اور بھائی بھانج کے انتقال کے بعد انہیں دادا نے ہی پالا تھا اس لیے وہ ہمیشہ سے دادا کے چیتے رہے تھے۔ شروع سے ہی اتنی اہمیت دی گئی تھی کہ وہ اب ہر بات میں بولنا اپنا فرض بلکہ حق سمجھتے تھے۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا مگر احمر کی شادی کے ہر فنکشن میں انہوں نے کوئی نہ کوئی بد مزگی ضرور کی تھی۔ اسی لیے گھر کا بچہ بچہ ان سے پریشان تھا۔ اس دفعہ دو لہما دہن دونوں خاندان کے ہی تھے علیہ اور عدیل کے چچا کی بیٹی تھی۔ اس لیے سرالیوں کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی مگر پھر بھی ساجد اور ان کی بہن شبنم کا منہ بھٹ انداز کسی کو بھی کسی کے بھی ساتھ شرمندہ کروا سکتا تھا۔

”اسٹیشن پر پورے آدھے گھنٹے انتظار کروایا ہے۔“ منصور نے۔

گھر آتے ہی سب سے پہلی شکایت منصور کی ہو گئی تھی جو اس گرم دوپہر میں ساجد بھائی اور ان کی فیملی کو اسٹیشن سے لینے گیا تھا۔ اوپر سے ان کا ڈھیر سا لانا تھا شبنم بھابھی نے پورے سال کا سامان ہی پیک کر لیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ساجد بھائی نے کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ منصور بے چارے کو ہی سب گاڑی میں رکھنا پڑا۔

”میں نے کہا بھی تھا کہ تین بجے تک پہنچ جانا۔“ اتنا لمبا سفر کر کے آرہے ہیں۔ اب اس گرمی میں اسٹیشن پر کھڑے رہے۔“ دادا نے منصور کو خشکیاں نظروں سے گھورا تھا اور منصور نے بچے کو۔

”دادا! میں تو پونے تین بجے ہی اسٹیشن پر پہنچ چکا تھا۔“ ساجد بھائی ہی دوسری طرف سے باہر نکل گئے تھے۔ انہیں ڈھونڈنے میں تھوڑا ناگم لگ گیا مگر تب بھی انہیں آئے مشکل سے چندہ منٹ ہی گزرے ہوں گے۔

منصور اپنی شکایت سن کر تھملا کر رہ گیا۔

”جانے دیں بڑے ایسا یہ نہیں سدھ سکتے۔ وہ ہم ای ہیں جو بیٹوں کے پہلے حکم پر دوڑ پڑتے تھے۔“ ساجد بھائی نے دادا کو تسلی دیتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اپنی تعریف کی تھی۔

”اپنے منہ میاں مٹھو۔ اپنی تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے بلکہ زبردستی کوئی نہ کوئی موقع تلاش کر لیتے ہیں۔“ منصور نے کمرے میں آتے ہی بھڑاس نکالی تھی۔

”یار احمر! تمہاری شادی والا سین نہ ہو۔ ہر بات پر پٹا۔ کچھ مجھ غریب پر رحم کرو۔ مجھ میں تم جتنی برداشت نہیں ہے۔“ عدیل کو اپنی ہی فکر لگی ہوئی تھی۔

”آپ فضول میں پریشان ہو رہے ہیں عدیل بھائی! ورنہ علیہ تو کافی پرسکون ہے۔“ غمخیز نے تپے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے اپنی بہن علیہ کو گھورا۔

”تم کہاں سے جلی بھنی آ رہی ہو؟“ عمارہ بھابی نے غم کو غصے میں آنا دیکھ کر پوچھا تھا۔

”میں نے سوچا یہ لوگ گرمی میں آئے ہیں تو انہیں کوئلہ ٹکس پیش کی جائیں۔ جھٹ پٹ کوک گلاسوں میں نکالی اور لے کر پہنچ گئی۔ اس پر شبنم نے فوراً ہی اعتراض کر دیا کہ کھانے کا پوچھنے کے بجائے کوک تمہارا دی۔ ناراض بھی ہو گئیں اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس بھی خالی کر گئیں۔ اسے کہتے ہیں ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔“ غمخیز بھی وہیں بیٹھ گئی تھی۔

”ہاتھی کے نہیں ہتھنی کے۔“ منصور نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا۔

”بچھلی دفعہ یاد ہے کتنا داویلا کیا تھا اتنی سردی میں آئے ہیں۔ کسی نے چائے کو پوچھنے کے بجائے زبردستی کھانا ٹھنوا دیا۔ اب کوئی پوچھے کہ کھانا سامنے رکھا تھا۔ ٹھونسا تو آپ نے اپنی مرضی سے ہے اور پھر کھانے کے بعد چائے بھی پی تھی مگر ساجد بھائی اسی

بات پر ناراض رہے کہ وہ کھانے کے بعد چائے نہیں پی سکتے۔ ان سے پہلے پوچھنا چاہیے تھا۔“ مثال نے آخر کی شادی کی بات یاد دلانی تو وہ سب ہی شروع ہو گئے۔

”بری بات ہے۔ اگر کسی بڑے نے تم لوگوں کی یہ باتیں سن لیں نا تو طوفان ہی آجائے گا۔ کوئی ہتھنی کہہ رہا ہے تو کوئی کھانا ٹھنوا رہا ہے۔“ عمارہ نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے ان لوگوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”ارے ہاں! احمر! تمہیں یاد ہے شادی والے دن ساجد بھائی اور ان کی فیملی اسٹیج پر جم رہی تھی۔ انہوں نے پورے آدھے گھنٹے مووی بنوائی تھی اور مستقل تمہیں ہدایتیں بھی دے جا رہے تھے کہ دو لہما دو ہر ادھر دیکھتا اچھا نہیں لگتا۔ ٹرپفوں کی طرح بیٹھو۔“ عدیل کی پریشانی سب سے سوا تھی۔

”ہاں جس پر میں نے کہا تھا کہ آپ گھونگھٹ کا بندوبست کر دیں میں وہ نکال کر بیٹھ جاتا ہوں۔“ احمر اپنی بات یاد کر کے خود ہی محفوظ ہوا۔

”یارو اب ہمارے ساتھ بھی ویسا ہی نہ ہو۔ انہیں اسٹیج سے دور ہی رکھنا۔ ایک دفعہ بیٹھ گئے تو آسانی سے نہیں اٹھنے والے۔“ عدیل نے پریشانی سے کہا۔

”اور وہ شبنم بھابھی نے منہ دی کے فنکشن میں میری دوستوں کے سامنے مجھ سے کہا کہ تم ہلکی آواز میں گانے گانا تمہاری آواز اچھی نہیں ہے اور پھر پورے فنکشن میں اپنی آواز کا ”جادو“ بلکہ باجا بجایا تھا۔ میری اچھی خاصی آواز کی برائی کر کے خود کو ملکہ ترنم سمجھ رہی تھیں۔“ مثال کو اس دن کی شرمندگی اب تک یاد تھی۔

”وہ نہیں یاد؟ عمارہ بھابی کی کزنز کے سامنے ہی میرے سوٹ کو کہہ دیا کہ پرانے اسٹائل کا ہے۔ میں نے تو اپنا آرڈر رینوایا ہے مگر ہر کوئی افورڈ نہیں کر سکتا۔ میرے اتنے قہنگے سوٹ کی شان میں اتنی بڑی گستاخی۔ اور میں لحاظ میں چپ رہ گئی تھی۔“ غمخیز کو ایک اور بات یاد آ گئی تھی۔

”اگر میں نہ ہوتا تو اس قوم کا کیا ہوتا۔“ منصور نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے ان سب کو دیکھا تھا۔

”تم نے ہوتے ہوئے کون سے تیر مار لیے ہیں بلکہ سب سے پہلا شکار تو تم ہی ہوئے ہو۔ آتے ہی سب سے پہلے تمہاری شکایت ہو گئی۔“ غنبر نے اس کا صاف مذاق اڑایا تھا۔

”اب دیکھنا۔ میں کیسے تیر مارتا ہوں۔“ ساجد بھائی نادانستگی میں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال بیٹھے ہیں۔ منصور کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر سب کا دل دھک سے رہ گیا تھا کیونکہ وہ کم ہی کوئی ماسٹر پلان بناتا تھا، مگر جب بھی بناتا تھا دوسرے کی درگت دیدنی ہوتی تھی۔

”ہم تمہارے ساتھ ہیں میرے بھائی۔“ عدیل کے سر سے سارا پوچھ ہی اتر گیا تھا اس نے پر جوش انداز میں منصور کو ہنسی دی تھی۔

”امی اور دادی! ذرا ایک سیکنڈ سکون سے بیٹھ کر میری بات سن لیں۔“ کمرے میں علیحدہ کا سامان پھیلائے بیٹھی اپنی امی اور دادی کو منصور بڑی مشکلوں سے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

”کیا بات ہے جلدی کہو۔ ابھی مجھے بہت کام کرنے ہیں۔“ دادی نے تنک آکر ہاتھ میں پکڑا سامان اپنی بہو کو پکڑا یا اور اس کی طرف دیکھا۔

”دادی! وہ ساجد بھائی کہہ رہے تھے کہ انہیں دل صدمہ پہنچا ہے کہ اب بزرگوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دینا چھوڑ دیا ہے۔ ورنہ پہلے سب بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیا کرتے تھے۔ بہت افسوس کر رہے تھے کہ بچے تو بچے بزرگ بھی پرانی قدریں بھلاتے جا رہے ہیں۔“ منصور نے اپنے لہجے میں دکھ

سموتے ہوئے بتایا اور دادی کسی سوچ میں گم ہو گئیں۔

”کہتا تو ٹھیک ہے مگر اس میں بزرگوں کی کوتاہی نہیں ہے۔ یہ نئی نسل ہی ہے جو سر پر ہاتھ رکھوانے

سے بدکتی ہے کہ جیل لگا کر کھڑے کیے بال بیٹھ جائیں گے۔“ دادی نے منصور کو گھورا کیونکہ ایسے اعتراضات وہی کیا کرتا تھا۔

”یہی تو میں کہہ رہا ہوں دادی کہ اگر ہم غلطی پر ہوتے ہیں تو آپ لوگ کیوں ہماری ہاں میں ہاں ملائے ہیں۔ آپ لوگوں کو پرانی اور خاندانی قدروں کو مضبوطی سے تھام کر رکھنا چاہیے۔ اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ آج سے صبح شام ہم سب بڑوں سے سر پر ہاتھ رکھوا کر دعائیں لیا کریں گے۔ پورا خاندان جمع ہے سب کو پتا چلنا چاہیے کہ آپ اور دادا نے اپنے بچوں کی کیسی تربیت کی ہے۔ بس آپ سب بڑوں کو کہہ دیں کہ بچوں کو سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دینی ہے، خاص کر ساجد بھائی کو۔ انہوں نے تو یہ بات دل پر ہی لے لی ہے۔“

منصور نے سعادت مندی کی انتہا کر دی تھی ورنہ اتنی محنت سے سیٹ کیے اپنے بالوں پر دادا کا وزنی ہاتھ رکھنا۔ اسے سوچ کر ہی جھرجھری آگئی تھی لیکن یہ کڑوا گھونٹ تو یہی تھی کہ اس کی امی منصور کو یہی گھر رہی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی تھیں وہ اتنا سیدھا تو نہیں تھا جتنا بن رہا تھا۔ منصور نے گھبرا کر دادی کی طرف دیکھا جو بہت محبت پاش نظروں سے اپنے سعادت مند پوتے کو دیکھ رہی تھیں۔

منندی والے دن صبح سے ہی گہما گہمی تھی۔ ساجد بھائی نے پورے دن باہر کی تیاریوں پر اتنی تنقید کی تھی کہ اب وہ جدھر جاتے سب لڑکے ادھر ادھر نکل جاتے تھے۔ دوسری طرف شبانہ بھابھی بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ لڑکیوں کی تیاری کے بارے میں پوچھ پوچھ کر انہیں پریشان کر دیا تھا۔ ابھی بھی منہاں کے پیچھے لگی ہوئی تھیں کہ وہی لپ اسٹک استعمال کریں گی جو اس نے کی ہے مگر وہ منہاں ہی کیا جو کسی کو اپنا اشارہ کالی کرنے دے۔

”تم پر یہ رنگ زیادہ سوٹ نہیں کر رہا۔ تم میری براؤن شیڈ والی یوز کر لو نا۔“ شبانہ بھابھی نے ایک اور حربہ آزمایا۔

”ابھی عمارہ بھابھی تو تعریف کر کے گئی ہیں اور میں ان پنک کپڑوں کے ساتھ براؤن لپ اسٹک لگا لوں؟“ منہاں نے ایک نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی دو سری پنک آئی شیڈز پر اور تیسری شبانہ بھابھی کے ہاتھ میں پکڑی وارک براؤن لپ اسٹک پر۔

”ہاں تو کیا ہوا؟ اچھی لگے گی۔ ذرا دکھانا یہ پنک والی اور تم نے مسکارا کون سا یوز کیا ہے یا نعلی پلکیں لگائی ہیں؟ آج کل تو بھئی لڑکیاں گھر میں ہی لگاتی ہیں میری نوٹس کر لیں یہ اتنی گھنیری ہیں کہ ضرورت ہی نہیں ہے۔“ شبانہ بھابھی نے اس کے ہاتھ سے لپ اسٹک لے کر اس کی کوشش کی جو شاید منہاں نے نہ دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”جی واقعی آپ کی پلکیں بہت ”گھنیری“ ہیں مگر آپ کو شش کیجئے گا کہ آنکھیں کم جھپکیں ورنہ یہ اپنی جگہ سے ہل بھی جاتی ہیں۔“ منہاں نے انہیں تھوڑی دیر پہلے بیوٹیشن سے پلکیں لگواتے دیکھا تھا۔ اپنی چہرے سمیٹتے ہوئے منہاں نے غنبر کو اشارہ کیا جس نے بسکل اپنی ہنسی روکی تھی۔

”بھابھی! بیوٹیشن سے گلیو لے لیجئے گا، اگر ہل ول ہائیں تو میں دوبارہ چپکا دوں گی۔“ غنبر نے ان کے چہرے کے بدلے رنگ دیکھے تو منہاں کا ہاتھ پکڑ کر باہر اٹھنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

”یار! آج اگر انہوں نے میری آواز کو کچھ کہنا تو میں ان کا نعلی پلکوں والا پول سب کے سامنے کھول دوں گی۔“ منہاں نے تپے ہوئے انداز میں کہا۔

”انہیں کیا فرق پڑے گا۔ تم رہنے دو، بس منصور سے کہہ دو وہ دیکھ لے گا۔ دیکھا نہیں عدیل بھائی سب کچھ اس پر چھوڑ کر کتنے پرسکون ہو گئے ہیں۔“ غنبر کی بات ابھی بچ میں ہی تھی کہ منصور بھی وہیں آیا۔

”کسی نے میرا نام لیا؟“ اس نے ان دونوں کو دیکھتے

ہوئے پوچھا۔

”ہاں شیطان کا نام لیا اور وہ حاضری۔“ غنبر جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی تعریف کر رہی تھی اب چڑانے سے باز نہیں آئی۔

”لگتا ہے تم باقی سب کی طرح پرسکون نہیں رہنا چاہتیں۔ اب میرے پاس اپنا کوئی مسئلہ لے کر مت آنا اور منہاں میری اچھی بہن! تمہیں پریشان ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ آج شبانہ بھابھی لگانے ہی نہیں گائیں گی۔ تم سکون سے انجوائے کرنا۔“ منصور نے اپنی بہن کو بالکل ایسے تسلی دی جیسے پتا نہیں کتنا گنبد مسئلہ ہو۔

”بھائی! یہ اپنے سارے مسئلے آپ کے پاس نہ بھی لائے تو بڑوں نے یہ سب سے بڑا مسئلہ آپ کے سر ہی ڈال دیا ہے اس لیے اگر آپ کو پرسکون رہنا ہے تو اسے پرسکون رکھنے کی پوری کوشش کیجئے گا ورنہ یہ آپ کو بھی پرسکون نہیں رہنے دے گی۔“ منہاں کے گھونٹنے کی پروا کیے بغیر کہا تھا اور آگے بڑھ گئی۔

”مجھے اپنے مسئلے خود سلجھانے آتے ہیں۔ آپ کی ضرورت نہیں ہے۔“ غنبر نے منصور کو مسکراتے دیکھا تو خود بھی منہاں کے پیچھے باہر نکل گئی۔

منندی کا فنکشن گھر کے لان میں تھا۔ سارا لان پورے دن کی محنت کے بعد جگمگ کر رہا تھا۔ سب مہمان باتوں میں مصروف تھے۔ پھولوں سے سجے جھولے پر عدیل اور علیحدہ کو بٹھا کر رسمیں کی جا رہی تھیں لیکن عدیل کی نظریں مستقل ساجد بھائی پر تھیں اور کان تھے کہ ان کی گوہر افشانیوں کی تاب نہیں لایا رہے تھے۔

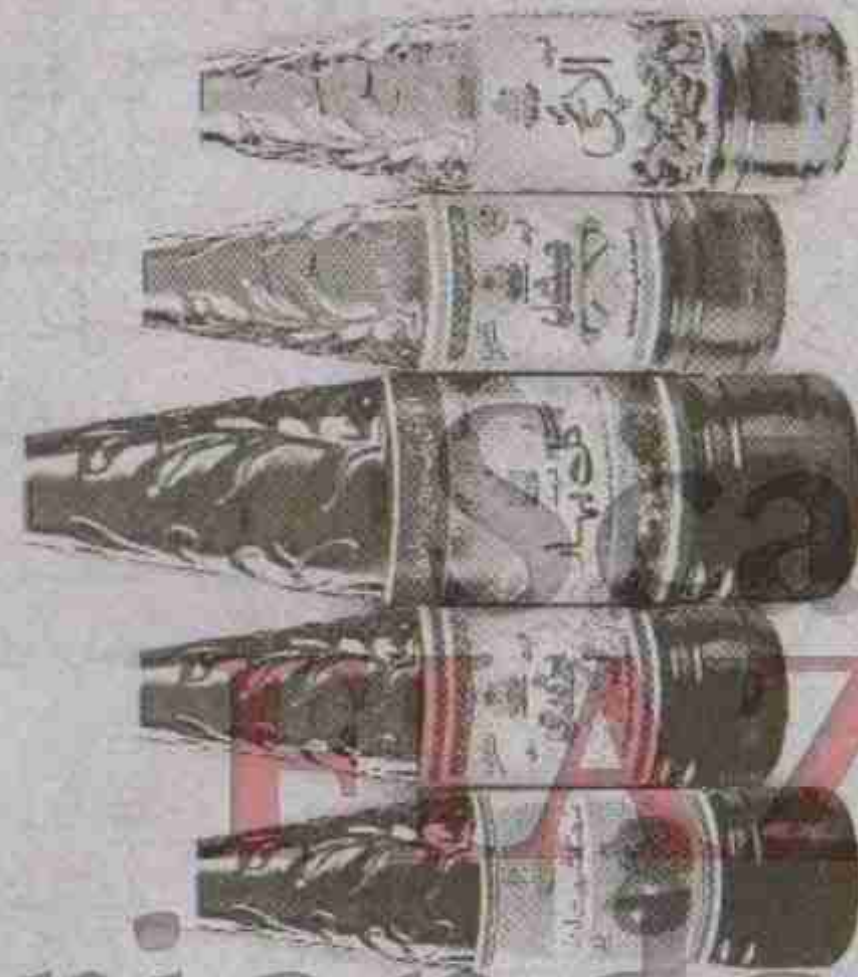
”منصور یار! ان کا کچھ کرو، بعد میں ہمارا ہی مذاق اڑے گا۔ مستقل پتا نہیں کیا کیا بتائے جا رہے ہیں۔ یہ بچپن کے قصے سنانے کا کون سا وقت ہے۔“ عدیل پتا نہیں کب سے بھرا بیٹھا تھا۔ اس کے توجہ دلانے پر



SINCE 1975

The Purity Discovered

قطرہ قطرہ خالص اجزاء کا احساس
مرتباً مشروبات



”میں کھا چکا ہوں بڑے ابا شکر یہ۔“ بے مروت
لہجے میں کہتے ہوئے وہ کونے والی میز کے قریب بڑی
کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گئے۔ دادا کو چہلی
دفعہ ان کا انداز برا لگا تھا۔

”یہ بچے اتنا بھی غلط نہیں کہتے۔ ساجد کا مزاج کچھ
زیادہ ہی تیز ہے۔“ ان کی بڑی ہاتھ پائیں کھڑے اصرار
نے سن لی اور منصور کو اس کے پلان کی کامیابی کی خوش
خبری دینے کے لیے اس کی تلاش میں نظر دوڑانے لگا۔

”آخر مسئلہ کیا ہے؟ سب نے میری چڑھائی ہے۔
جسے سلام کرو یا بات ہی کرو فوراً“ پاس بلا کر میرے پاس
خراب کر دیتے ہیں۔ یہ سر پر ہاتھ رکھنے کی کہاں تک
ہے۔“ اب ساجد کی برداشت کی حد ہو چکی تھی۔ شام
سے کوئی پچاسویں دفعہ ان کے سلام کرنے پر برہوں نے

سر پر ہاتھ رکھ کر عاتقیں دی تھیں اور ساجد کی جان پر
بن آئی تھی۔ اگر جوان کی وگ اپنی جگہ سے لڑھک
جاتی تو جوان کا حشر ہوتا یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے۔

بڑھاتے ہوئے ساتھ بیٹھی شانہ کی طرف دیکھا ہو
لپکتے ہی خیالوں میں گم تھیں۔

”وہ نہیں کہا ہوا ہے؟ ویسے تو پورا دن اپنی سرلی
آواز میں گنگنا گنگنا کر میرے سر میں درد کر دیتی ہو۔“

اب لڑکیاں بیٹھی گانے گارہی ہیں تو تم ادھر آکر کیوں
بیٹھ گئیں؟“ انہوں نے حیرت سے اپنی بیگم کی طرف
دیکھا۔

”ارے میں ان کی طرح بے وقوف تھوڑی ہوں، وہ
آج ہی گا کر اپنی آواز خراب کر لوں۔ کل کے فنکشن
میں ابراہیم الحق انوائٹڈ ہیں اور ان کو اپنے ساتھ گانے
کے لیے کسی سرلی آواز والی لڑکی کی ضرورت ہے۔
میں تو کل ہی گاؤں کی اور یہ سب جھلس رہی گی۔“ وہ
آج ہی کل کے خیالوں میں گم تھیں۔

”نہیں یہ کس نے بتا دیا؟“ ساجد بھائی نے
”سرلی آواز“ اور ”لڑکی“ کو بمشکل ہضم کرتے ہوئے
ان کی بات پر بے یقینی سے پوچھا۔

”منصور نے اور کس نے بڑا اچھا لڑکا ہے۔ یہی
ان سب میں ایک وہی معقول لگا۔ میں تو اپنی کمر

منصور نے اسے تسلی دی اور ساجد کی طرف بڑھ گیا۔
”ساجد بھائی! ادھر آئے گا ذرا۔“ ساجد کو اپنے
دوستوں کے ساتھ کھڑا دیکھ کر منصور نے ایک طرف بلا
لیا تھا۔

”کیا آفت ہے جو اس طرح بلا رہے ہو؟ تمیز نہیں
ہے کہ بڑے بات کر رہے ہوں تو بیچ میں ان کی بات
نہیں کاٹتے۔“ انہوں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”ساجد بھائی! بات ہی ایسی ہے۔ دیکھیں مجھے
اندازہ ہے یہ آپ کے لیے کافی حساس موضوع ہے مگر
آپ کی عزت ہماری عزت ہے۔ اب اگر کوئی آپ کا
مذاق اڑائے تو ہمارے دل پر تو پھریاں چلیں گی ہی۔“
منصور نے ان کے تیز لہجے کو برداشت کرتے ہوئے
بھرپور ایکٹنگ کی۔

”کیا اول فول بک رہے ہو؟ کیا بات ہے کھل کر
کہو۔“ ساجد میں برداشت کی ہمیشہ سے کمی تھی۔ اب
بھی فوراً بھڑک اٹھے تھے۔

”بات یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو اندازہ ہو گیا ہے کہ
آپ نے وگ پہنی ہوئی ہے۔ اس لیے آپ اسٹیج سے

دور ہی رہیں گے۔ یہ مودی والے بہت تیز ہوتے ہیں۔
ذرا جو انہیں اندازہ ہو گیا“ آپ سمجھتے ہیں تو بار بار آپ

کے بالوں پر فوکس کریں گے۔“ منصور نے رازدارانہ
انداز اپنایا۔

”کیا فضول باتیں ہیں! میں کوئی وگ نہیں پہنتا۔
خبردار جو تم نے کسی سے یہ کیا اس کی۔“ منصور نے ان
کی دھکتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ تھلا ہی گئے۔

”نیکی کا زمانہ ہی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے بھائی! جیسے
آپ کی مرضی میں نے تو بھائی سمجھ کر کہہ دیا تھا۔“

منصور نے انہیں ترحم بھری نظروں سے دیکھا اور وہ
اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بڑے ابا کی طرف
بڑھ گئے۔

”ساجد بیٹا! تم ادھر کھڑے ہو وہاں کھانا لگ چکا
ہے کچھ لونا۔“ دادا ابا نے پیار سے کہتے ہوئے ان کے
سر پر ہاتھ رکھا مگر اب ان کی برداشت کی حد ختم ہو چکی
تھی۔

سے کچھ کام ہے، علی اٹھ کھڑا ہوا۔
”اچھا، عظمیٰ نیم تو جی سے اسے دیکھنے لگی۔“

”گیت بند کر لیتا۔“
”ہاں۔“ عظمیٰ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پچھلے دس دنوں کے دوران محلے کے دو گھروں میں دن بھر ڈکیتیاں بڑچکی تھیں اس لیے محلے کے باقی لوگ بہت محتاط ہو گئے تھے۔

علی کے جانے کے بعد عظمیٰ دروازہ بند کر کے واپس اپنی سابقہ پوزیشن میں براہمان ہو گئی۔ عجیب سی دھند بھری اداسی نے اپنے گھرے میں لیا ہوا تھا۔ سامنے کا منظر کچھ واضح ہی نہیں ہو رہا تھا۔

”روشنی عطا کر مہیاں رب۔“ عظمیٰ کے دل سے خود بخود صدا نکل رہی تھی۔

”ہم دونوں بہت چھوٹے تھے جب ہمارے والدین کے بعد دیگرے انتقال کر گئے۔ ہم اتنے چھوٹے تھے کہ کچھ دھندلی دھندلی یادوں کے سوائے اور کچھ ٹھیک سے ہمیں یاد بھی نہیں۔ ہاں! مجھے یہ یاد ہے کہ میں روتا بہت تھا۔ زرین مجھ سے بھی ایک سال چھوٹی تھی، ہو سکتا ہے وہ بھی بہت روتی ہو، مجھے اس کا ٹھیک سے اندازہ نہیں مگر میں کافی بڑا ہو جانے کے بعد بھی بہت روتا تھا۔ بڑھائی کا معاملہ ہو، کھانے پینے کا، کہیں آنے جانے کا یا ہماری ضروریات کا، قدم قدم پر ماں باپ کی محرومی کا احساس ہوتا تھا گوکہ عظمیٰ کی امی بچنیں ہم اچھی خالہ کہہ کر پکارتے تھے، ہم سے بہت پیار کرتی تھیں۔ انہوں نے اور انکل نے ہمارا بہت خیال رکھا۔ اس گھب اندھیرے دور میں یہ گھرانا ہمارے لیے روشنی کی مشعل تھا۔ زرین تو رہتی ہی یہیں تھی، بس پتا نہیں کیوں، تمام تر محبتوں اور شفقتوں کے باوجود بھی میرا دل یہاں ذرا کم ہی لگتا تھا۔ مجھے اپنے گھر کا وہ بڑا کمرہ اچھا لگتا تھا، جو امی ابو کا تھا ان کی مسہری پر چیت لیٹا چھت کو گھورتے ہوئے میں گھنٹوں جانے لیا کیسا سوچتا تھا اور مزید بڑے ہونے کے

بعد اس محرومی کا احساس اور شدید ہو گیا کہ اللہ نے ہم سے ہماری کیا نعمت واپس لے لی ہے۔

پھر خالہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ ہم سب محبت و شفقت کی اس گھنی چھاؤں سے بھی محروم ہو گئے۔ میں اس وقت نویں جماعت میں تھا۔ پھر انکل، بڑی آپا اور چھوٹی آپا کا دست شفقت ہمارے سروں پر رکھا گیا انکل نے میرے بڑے بھائی کی پر بھائی اور نوکری میں مدد کی اور نوکری لگتے ہی کافی کم عمری میں ان کی شادی کر دی۔ بھابھی اچھی تھیں یا شاید ہمارے نصیب بہت اچھے تھے کہ ہماری زندگیوں سے محرومی اور اداسی کے جو گئے بچے چند نقوش باقی تھے وہ بھی مٹ گئے۔

اچھی خالہ کے گھرانے سے میرا صرف کزن کا رشتہ ہی نہیں بلکہ ایک قلبی تعلق بھی ہے، ایک ان مٹ اچھوتا اور خوب صورت رشتہ جو ول سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتا ہے جو اس گھر کے مینوں سے مجھے ہے بلکہ ہم بن بھائیوں کو ہے، اسی گھر کی ایک فرد عظمیٰ ہے، کبھی کبھی مغرور، ٹیکسی اور اکھڑ مزاج اور کبھی نرم، مہمان، خوش مزاج۔ ہاں! اچھی خاصی جذباتی بھی ہے۔ میں اس کے بارے میں اس لیے بات کرنے لگا ہوں کہ آج کل۔۔۔ نہیں بلکہ پچھلے کئی مہینوں سے میں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کیا،

یہ ہی میں سوچتا ہوں کہ آخر میں اس لڑکی کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوں اور کیوں؟

لوگ کہتے ہیں کہ میں ایک سیدھا سادا لڑکا ہوں۔ بقول عظمیٰ کافی حد تک بے وقوف، شائد وہ بھی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ آج کل سادگی کا دوسرا نام بے وقوفی ہی ہے، مگر میں کوئی اتنا سادہ مزاج یا زاہد خشک بھی نہیں، زندگی بہر حال اپنی تمام تر رعنائیوں اور لطافتوں کے ساتھ متوجہ کرتی ہی ہے۔ خواب دکھانے کو نہ سہی، مگر دیکھنے کو تو دل کرتا ہے اور آج کل تو دل کا عالم یہ ہے اور ہی ہے۔ بے شک کوئی افسانوی بے چینی وہ ہے قراری نہیں، کوئی ڈرامائی پوزیشن بھی نہیں، غیر معمولی دھڑکن دل بھی نہیں مگر پھر بھی، کچھ نہ کچھ مختلف اور

الو کھا ضرور ہے، جانے کہاں۔۔۔ اس دنیا میں یا دل کی دنیا میں؟

ہمارے اپنے جون بر کب کی آچکی، پھول نکلے بہت دن گزر گئے، خوشبو پھیل کر مشام دل و جان مہکا گئی، پھر بھی وہ لب مسکراہٹ سے بہت دور ہیں، جس کی ہنسی میں زندگی مسکراتی تھی، وہ خوشی کے دبیز چادر کی بکلی مار کے او اس کیوں بیٹھی ہے، میں اس کے لیے تارے توڑ کر نہیں لانا چاہتا کہ ستارے تو خود اس کی آنکھوں میں دھکتے ہیں نہ کلیوں کی ہنسی چرا کر اس کے ہونٹوں پہ جانے کی خواہش ہے کہ یہ سب اس کے شاہان شان نہیں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ اس کے راستے کے سارے کانٹے جن کر ان کی جگہ پھول رکھ دوں تاکہ اسے زندگی کا سفر طے کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ میری اس خواہش کو پذیرائی بخشے گی یا نہیں، اگر جواب ہاں میں ہو گا تو مجھے بہت خوشی ہوگی، اگر جواب انکار ہو تو افسوس تو ہو گا، بہت ہو گا، یا شاید بہت زیادہ ہو گا، مگر بہر حال زندگی تو یونہی رواں دواں رہے گی، اور جو اس کا ساتھ مل جائے تو۔۔۔ تو یقیناً زندگی میں اچھی خاصی روشنی آجائے گی، ویسی ہی جیسی عظمیٰ کی آنکھوں میں ہے۔

کبھی کبھی مجھے واقعی بہت سنجیدگی کے ساتھ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ زندگی کا سفر بہت خوب صورت اور انوکھا ہو گا، اس کے علاوہ کسی اور کا تصور۔ بہت مشکل ہے۔

”ابو جی! آپ کے لیے کھانا لے آؤں یا نماز پڑھ کر کھائیں گے؟“ عظمیٰ ابو سے پوچھنے آئی تھی۔

”کیا پکا ہے؟“

”کر لیے قیر۔“

”ہوں۔“ ابو نے ہنکارا بھرا۔

”نماز پڑھ کر سب کے ساتھ ہی کھالیں گے۔“

”اچھا۔“ وہ پلٹ کر جانے لگی۔

”اوھر آؤ بیٹا!“ ابو نے اسے پکارا۔

”جی۔“

”یہاں آؤ میرے پاس۔“ انہوں نے اپنے برابر جگہ کو ہاتھ سے تھپکا۔

”جی۔“ عظمیٰ ان کے برابر میں بیٹھ گئی۔

”کیا بات ہے بیٹی! پریشان کیوں ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ عظمیٰ کہنا چاہتی تھی مگر اس کے منہ سے لفظ نکلنے کے بجائے آنکھوں سے آنسو نکل پڑے،

فقط آنسو، جن کی اپنی ہی ایک الگ زبان ہوتی ہے،

انسان کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتا ہے۔

”کیا ہوا؟“ انہوں نے عظمیٰ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”کچھ نہیں، بس۔“ عظمیٰ اپنا گیلیا چہرہ صاف کرتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولی۔

”عروہ اور اسد کو دیکھ کر کبھی کبھی مجھے بہت رونا آتا ہے، شدت سے دل چاہتا ہے کہ کہیں سے بھی کیسے بھی، عفر اور بھائی جان کو ان کے سامنے لے آؤں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ابو!“

”اللہ ہمارے پیارے ہم سے کیوں چھین لیتا ہے؟“

”چھیننے کا کیا مطلب ہے بیٹی، اللہ اپنی ہی دی ہوئی نعمتیں ہم سے واپس لے لیتا ہے جب اور جیسے اس کی مرضی ہوتی ہے، ہمارا کام تو بس راضی برضا رہنا ہے، شکوے شکایت کا تو ہمیں حق ہی نہیں۔“ ابو نے ایک گہری سانس لی۔

”اچھا، اب میں ابک ضروری بات کروں اپنی بیٹی سے؟“

”جی، عظمیٰ نے کونہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

”سجاد میاں آئے تھے۔“ انہوں نے علی اور زرین کے بڑے بھائی کا نام لیا۔

”جی، شام میں میرے سامنے ہی تو آئے تھے، خیریت تو ہے نا۔“ عظمیٰ نے ابو کے غیر معمولی انداز پر چونک کر انہیں دیکھا۔

”وہ علی کا رشتہ نم سے کرنے کے خواہش مند ہیں۔“ ابو نے مختصر لفظوں میں بتایا۔

”جی؟“ عظمیٰ ان کی بات سن کر بھونچکا رہ گئی۔

”چلو تم فکر نہ کرو اینٹ پتھر دونوں سے دے دوں گا۔“ منصور نے اسے تسلی دی۔
”میں اپنی بات کب کر رہی تھی؟“

عمر نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا اور باقی سب ہنس دیے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اصل مسئلہ تو حل ہو چکا تھا۔ شاید ساجد بھائی اور شبانہ بھابی جیسے لوگوں کو روکنے کے لیے منصور جیسے شیطانی دماغ کی ہی ضرورت ہوتی ہے ورنہ ایسے لوگوں کو جب تک برداشت کرتے رہو وہ دوسروں کے احساسات کا خیال کے بغیر اپنی اہمیت جتاننا نہیں بھولتے۔ منصور نے بہت چالاکی سے ساجد بھائی اور شبانہ بھابی کو اپنے خاندان کی دوسری شادی میں ٹینشن پھیلانے سے روک دیا تھا بلکہ ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ ایک طرف ان دونوں کو ہریات میں مداخلت کرنے سے روکا تھا اور دوسری طرف اپنی منتنی بھی کروالی تھی اور اب ان دونوں کی نوک جھونک تو نہی چلتی رہی تھی۔

ساجد نے بڑے ابا سے بات کی تھی اور انہوں نے مدد کے لیے دیکھے والے دن ہی غیر اور منصور کی جھٹ پٹ منتنی کر دی۔



”مزا آگیا یا ر۔“ احمر نے منصور کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔ آج ولیمہ کا فنکشن بھی ہو گیا تھا اور اب وہ سارے کنز احمر بھائی اور عمارہ بھابی کے کمرے میں بیٹھے تھے۔

”میں نے کہا تھا نا میں نہ ہوتا تو اس قوم کا کیا ہوتا۔“ منصور اپنی تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں ہانے دیتا تھا۔

”مان گئے آپ کو اور خالی ہم ہی کیا بہت سے لوگ مان گئے۔ جدھر جاؤ منصور کی تعریفیں سننے کو مل رہی ہیں۔“ خاص کر شبانہ بھابی۔ کل تک بڑی تعریفیں کر رہی تھیں تمہاری تب ہی تو اپنی بہن کے لیے کہلوا دیا کہ اپنی غیرت تو بہت غصے میں تھی عمارہ بھابی نے منکراتے ہوئے کہا اور غیرت کی طرف دیکھا جواب بڑی سکون بیٹھی تھی۔

”اس میں غصہ کرنے کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔“ ہاں بیر ہو وہاں پتھریاں تو آتی ہی ہیں اور بیر بھی مجھ جیسا پنڈ سم۔“ منصور نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اڑا کر کہا۔

”جہاں بیر ہو وہاں پتھر آتے ہیں یہ ہے اصل عمارہ اور یہ لڑکیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے لڑکیوں کے لیے نہیں۔“ عمر جو بہت شرمیلی بنی بیٹھی تھی منصور کی بات پر ایک دفعہ پھر اپنے انڈی موڈ میں واپس آئی تھی۔

”اچھا! آئے تو کوئی پتھر۔ میں پتھر کا جواب اینٹ سے دوں گا۔“ منصور نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

”اف! پتھر کا جواب اینٹ سے نہیں اینٹ کا۔ اب پتھر سے دیا جاتا ہے۔“ محاوروں کا یہ حشر ہوتے ہی عمر کا دل چاہا کہ سر پیٹ لے اپنا نہیں منصور

جا رہا ہوں۔ ہریات اپنے پلان کو کامیاب کرنے کے لیے کسی ہے اور تم زیادہ نہ پوچھو میں انہیں بتا دوں گا کہ مجھے زبردستی تمہارا منگیتر ہونے کی ذمہ داری دی جا چکی ہے۔“ منصور نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا اور غیرتوں کی پٹنی وہاں سے چلی گئی تھی۔



حیرت انگیز طور پر شادی کا فنکشن مندی سے بھی زیادہ پرسکون رہا تھا۔ مینج ہال میں ہر طرف گھبراہٹ تھی۔ چھوڑے ہاتھ منصور اور احمر کے چہروں پر تھی مسکراہٹ ان کے پلان کے ہٹ بلکہ سپر ہٹ ہو جانے کی گواہی دے رہی تھی۔ اسٹیج پر بیٹھے عدیل نے بھی سکون کا سانس لیا کہ اس کی شادی میں احمر جیسی بد مزگی ہوئی نہ ہی ساجد بھائی نے زیادہ ٹکٹے چینی کی۔ وہ اور ان کی بیگم ایک طرف بیٹھے سب ہوتا دیکھتے رہے۔ دوا نے بھی اس دن والی بات کے بعد انہیں زیادہ لفٹ نہیں کروائی تھی۔ ایک طرف ساجد بھائی اپنی دیکھ کر مودی میکر سے پریشان تھے جو مستقل انہیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا (منصور کی ہدایت جو تھی) اور ہر تھوڑی دیر بعد کوئی بچہ آکر ان سے کہہ جاتا تھا ”اگلے آپ کے ہال اچھے لگ رہے ہیں۔“ اور ان کا اس نہیں چلتا تھا کہ اسے ایک زوردار کھپڑ رسید کر دیں۔ دوسری طرف شبانہ بھابی کو رہ رہ کر منصور کے جھوٹ پر غصہ آ رہا تھا کہ ابرار الحق مدعو ہے۔ مندی کے دوسرے فنکشن میں وہ کتنا دل لگا کر تیار ہوئی تھیں مگر فنکشن ختم بھی ہو گیا اور ابرار الحق کا دور دورہ تک نام و نشان نہیں تھا۔ ان کے پوچھنے پر منصور نے حیرت سے کہا تھا۔

”ارے وہ تو میں مذاق کر رہا تھا۔ ابرار الحق کو ہم ہال بھی لیتے تو وہ کون سا دوڑے چلے آتے۔“ اس پہلے کہ شبانہ بھابی اس جھوٹ پر اسے کچھ کہیں وہ ایک دفعہ پھر لوگوں کے ہجوم میں گم ہو چکا تھا۔

صرف یہی نہیں وہ غیر اور منصور کی باتوں پر انجمنٹ پر مزید برامان گئی تھیں۔ ان ہی کے

لیے سوچ رہی ہوں۔ کتنا چچے گا اس کے ساتھ۔ آپ بات کریں نا بڑے ابا سے۔“ شبانہ نے سامنے کھڑے منصور کو دیکھتے ہوئے کہا اور ان کے قریب اپنی دوستوں کو کھانے کا پوچھتی عمر کو تو جیسے تھلے لگ گئے تھے۔ وہ تیر کی طرح منصور کے پاس پہنچی تھی۔

”منصور! یہ شبانہ بھابی کے زیادہ آگے پیچھے پھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل مسئلہ ساجد بھائی ہیں۔“ شبانہ بھابی سے ہم خود نمٹ سکتے ہیں۔ ان سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے اور کل ان کی بہن بھی آئے گی۔ خبردار! جو مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کیں اس نے اپنا غصہ کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کیا فرق پڑ رہا ہے میرے مسکرانے سے۔ ویسے بھی میرے مسکرانے پر تو لوگ پٹ پٹ کرتے ہیں۔“ منصور نے فرضی کارا اڑائے۔

”تمہیں مسکراتے ہوئے دیکھتے ہیں تو مجھ پر ہشت سے پٹ پٹ کرتے ہیں کیونکہ انسان پٹ پٹ نہیں گرا کرتے دھڑ دھڑ کرتے ہیں اور وہ شبانہ بھابی کی کرن گریں گی۔ اگر میں نے اسے زیادہ فری ہوتے دیکھ لیا تو۔“ عمر نے اسے اپنی بات مذاق میں ٹالتے ہوئے دیکھا تو اسے غصہ آگیا۔

”آخر ہوا کیا ہے جو تم اس کی جان کو آگئی ہو؟“ منصور نے اس کے غصے سے لال ہوتے چہرے کی طرف دیکھا۔

”ہونا کیا ہے“ شبانہ بھابی کو آپ اپنی لاڈلی بہن کے لیے بہت پسند آگئے ہیں اور آگے پیچھے پھریں۔“ شبانہ بھابی! کھانا لیں نا۔“ شبانہ بھابی! آپ کی آواز بہت اچھی ہے کل ابرار الحق آپ کے ساتھ ہی گانا پسند کرے گا۔“ شبانہ بھابی! ساجد بھائی کو وگ کا خیال رکھنے کو کہیں ورنہ آپ کا ہی مذاق اڑے گا کہ کہاں آپ اتنی نفیس لڑکی کہاں وگ پہنے ساجد بھائی۔“ عمر نے اس کے انداز کی نقل اتاری اور منصور کا قہقہہ چھوٹ گیا۔

”اب خود ہی غور کر لو ان میں سے کون سی ایسی بات ہے جس سے لگے میں ان کی لاڈلی کی وجہ سے دیوانہ ہوا

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

ذرد موسم

راحت جبین



قیمت -/600 روپے



مکانات کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

Scan & PDF FIAZ AHMED Friends Korner.com

راکت جبین

گلستانِ صبر

مکمل ناول

دروازہ کھول کر پچھلے پر آمدے میں نکل آتی۔ آم کا ہر
جھڑتا، ننھی منی امیاں اس کی جگہ لے لیتیں۔
اور زیبا کی موج ہو جاتی وہ کچی کھٹی امیاں پھر
کھاتیں۔ خواتین ڈائجسٹ میں نئی آنے والی راکٹ
کو کب بخاری کے ٹاولٹ اور بشری رحمن کے ٹاول
پڑھتی رہتیں اور بیلا کے دانت خواجواہ کھٹے ہو
رہتے۔ اسے امیاں کبھی اچھی نہ لگیں۔ بس آموں
کے پکنے کا انتظار کرتی۔ پھر کبھی کوئی آم پٹ سے

آم کے درخت پر بور آنے کے ساتھ ہی کوئل کی
کوک سنسان وہ پہرے سینے میں چھید ڈالنے لگی۔
اس کی کتنی کوشش تھی کہ وہ صاحب آواز کو دیکھ لے،
مگر ناکام رہا۔ پھر وہ سفید پلیٹ میں نیچے گرے فالسے
اکٹھے کرتی گردن اٹھا اٹھا کر درخت کی شاخیں کھوجا
کرتی۔

آم پر بور آتا تو شہد کی مکھیاں ہلہ بول دیتیں۔ بچوں کو
اوسر آنے کا ممانعت ہوتی مگر وہ جیسے سے پکن کا پھینکا

فرش پر گر تا اور پھٹ جاتا تو اس کی دوڑ لگ جاتی۔
بچپن بیت گیا، مگر اس لیے پختہ آم کا زائقہ آج
بھی اس کے لبوں پر تازہ تھا۔ پھر بڑی امی آگے بڑھتی
جو بیلا کی تائی بھی تھیں اور خالہ بھی۔ کیا پھل درخت
سے اترتا، لکڑی کی بیٹیوں میں بند کر کے پال ڈالی
جاتی۔ بیٹیاں اسٹور میں چابی بڑی امی کے بٹوے
میں۔ تھوڑے دنوں میں سبز پر پیلا رنگ غالب آنے
لگتا تو یکے آموں کی خوشبو اسٹور کی کھڑکیوں
دروازے کی درزوں سے پھوٹتی کچن تک آنے لگتی۔
ذکی، فیضان اور سفیان کی آنکھوں آنکھوں میں
اشارے ہوتے اور بڑی امی سارے گھر میں اسٹور کی
چابی ڈھونڈتی پھرتیں جو کبھی وہاں سے نہ ملتی جہاں
انہوں نے رکھی ہوئی اور جب اسٹور سے بیٹیاں
نکلتیں تو ایک آدھ خالی ہوتی۔ جب تک حاجی زندہ
تھے ایسے میں پچھلے برآمدے میں پلنگ پر آ بیٹھتے کسی
کوٹ لینے بھگایا تو کسی کو برف بڑے سے ٹب میں
آم بھگو کر خود نگرانی کرتے۔
”نہ۔ نہ ابھی ان کی گرمی نکلے دو بڑی بسو کچی لمبی
کاڈول بنا لاؤ۔“

ٹب کے پہلو میں کچی لمبی کا سرخ ڈول رکھا جاتا۔ پھر
سب کو آوازیں پڑتیں۔ ذکی، فیضان اور سفیان حاجی کا
خوب ہی مقابلہ کرتے۔ فرح اور زیبا کی کوشش ہوتی
زیادہ سے زیادہ آم چھپا کر خفیہ ٹھکانے تک پہنچا دیں
ناکہ بعد میں اطمینان سے کھائے جاسکیں ورنہ لڑکوں
کی اسپید کا کون مقابلہ کر سکا۔ عاشر اور بیلا چھوٹے
ہونے کی بنا پر ایک ایک آم ہاتھ میں لیے عقب میں
بیٹھے گھٹلی چوستے رہتے پھر وہ بھی جو سب میں موجود
ہونے کے باوجود کہیں نہ ہوتی۔
پھر حاجی کو اپنے عقب میں بیٹھے وجود کا احساس ہوتا
تو پکارا اٹھتے۔

”گل صنوبر۔ تم بھی لوٹا۔“

مگر اسے خود سے ہاتھ بڑھا کر لینے کی عادت کہاں
تھی۔ بس دوپٹے میں چھپی مسکراتی جاتی۔ کوئی ہاتھ

میں تھماتا تو ہاتھ ہی میں پکڑا رہ جاتا یا وہ چپکے
عاشر اور بیلا کی سمت بڑھادیتی اور بیلا کو تو وہی آم اچھا
لگتا تھا جو درخت سے ٹکا ہوا نہ جانے کیوں اسے سب
کے درمیان بیٹھ کر کھانے کی عادت ہی نہ تھی۔
حالات تک پھل کسی بھی موسم کا ہو اسے بے حد مرغوب
تھا۔ اسی لیے بڑی امی اگر اس کا حصہ رکھنا بھول بھی
جاتیں تو امی کبھی نہیں بھولتی تھیں۔ پھر حاجی سب
لائن میں کھڑا کر دیتے۔

”آموں کی تاثیر گرم ہوتی ہے اور کچی لمبی اس
گرمی کا توڑ ہے۔“
بیلا کو یہ دورہ پانی اور نمک سے بنی لی زہر مانی
تھی سو فوراً ہی کھٹکتی مگر اس کا ہاتھ عاشر کے
ہاتھ میں جکڑا جاتا جو اس سے پورے ساڑھے تین
سال بڑا تھا اور گھر میں واحد بیلا بھی جس پر وہ اپنا
برے پن کا رعب جما سکتا تھا۔ حاجی سے شکایت کا
جاتی اور اسے سب کے سامنے کھڑے ہو کر پورا گلاس
پینا پڑتا پھر ذکی بھیا ہاتھ منہ صاف کرتے کھڑے
ہو جاتے۔

”اچھا ماما! ہمارا حصہ ہمارے گھر پہنچا دیجیے گا۔“

اور ان کا گھر آٹھ سیڑھیاں عبور کر کے اوپر والا
پورشن تھا۔ جہاں بیلا کی بوہ پچھو اپنے دو بیٹوں ذکی
اور عاشر اور بیٹی مریم کے ساتھ قیام پذیر تھیں۔
نچلے پورشن میں دونوں بھائی حاجی کی وفات کے بعد بھی
باہم سیر و شکر رہ رہے تھے کہ ان کی بیویاں آپس میں
بہنیں بھی تھیں۔ سو روایتی دیو رانی، جھٹانی والی
رقابت درمیان میں آئی ہی نہیں۔ وہ بڑی امی کہلاتی
تو یہ چھوٹی امی وہ بڑے ابو تو یہ چھوٹے ابو۔ سب
بڑی گل صنوبر پھر سفیان بھیا، فیضان بھائی اور آخر میں
زیبا۔ چھوٹے ابو اولاد نرینہ سے محروم رہے۔ وہ وہاں
بہنیں تھیں فرح اور بیلا پھر یوں ہوا کہ۔

ذکی بھیا کو اپنی تایا زاد شائستہ بھاگیں۔ وہ خاندان
کی پہلی لڑکی تھیں جو ایم بی اے کر رہی تھیں۔ خوب
صورت، طرح دار، اعلا تعلیم یافتہ، فر فر انگریزی بولتی

اور جدید فیشن سے آراستہ شائستہ کے سامنے خاندان
کی ساری لڑکیاں پانی بھرتیں اور بے حد معمولی دکھائی
دیتیں۔ پھر ذکی بھیا بھی تو ایسے تھے ایک دم دراز
لامت، جاذبِ غور و خال، ہالی ووڈ کے ہیرو جیسے شان دار
اعلا تعلیم یافتہ اور مزید تعلیم کے لیے باہر جانے کے
لیے کوشاں۔ اب پچھو کی بھلے اپنے جینے جھٹانی سے
بھی نہ بنی ہو مگر شائستہ اور ذکی ایک دوسرے کی فکر
کے تھے۔

سو دونوں کی شادی ہوئی اور دونوں باہر جا بسے اور
ایسے بے کہ پھراوٹ کرنے آئے۔ ہاں ان دونوں کی مزید
لامتیاہوں کی اطلاع کے ساتھ پچھو کے نام ڈرافٹ
خانہ کی سے پہنچے رہے۔

مریم بیاہ کر جدہ چلی گئی۔ عاشر نے اپنے لیے آری کا
پہنہ پسند کیا۔ اوپر کا پورشن بالکل ہی خالی ہو گیا تو پچھو
دونوں نے ساری زندگی دونوں بھائیوں کو کھاس نہ
الٹی تھی اوپر کی تنہائی سے گھبرا کر سارا دن نیچے
گزارنے لگیں۔ سفیان اور فیضان کے لیے خاندان
کی سے دلنشین پسند کی گئیں۔

فرح کو اس کے ماموں نے مانگ لیا۔ دونوں کی
شادی چھ ماہ قبل ایک ساتھ ایک ہی دن ہوئی۔ فیضان
کے ولیمہ والے دن فرح کی بارات تھی۔

حاجی دنیا سے رخصت ہوئے اور آم کے پیڑ نے
پل دنیا بند کر دیا تو ایک دن کٹوا دیا گیا۔ مگر اب بھی
اولیٰ میں آم کے درختوں پر پور آتا تو اس کی گھٹی
شاخوں میں کوئل کو کتی چلی جاتی۔

”مگر یہ کس کو پکارتی ہے؟“
”دور دیس میں بسنے والی۔ سکیوں کو آواز دیتی ہے
زیبا، فرح کو بہت یاد کرتی تھی۔“
”اوں ہوں۔ آنے والے سالوں کی راہ دیکھتی
ہے۔“

”سالوں کی یا سا جن کی؟“ اک معنی خیز سرگوشی
شرارتی تھی۔
”نہیں۔ کسی کے بھر میں کر لاتی ہے۔“

اس بیٹھی گل صنوبر گھبرا کر فریم ہاتھ سے رکھ کر
یوں دوپٹے کی بکلی میں چھپتی جیسے گھٹی شاخوں میں
کوئل۔ اسے لگتا اس کا وجود کوئل کی کوک میں ڈھل
کر آنے والے سالوں کی راہ دیکھتا ہے یا کسی کے بھر میں
کر لارہا ہے۔ یہ کر لارہٹ زیادہ بڑھتی تو وہ وضو کر کے پنج سو
کھول دیتی۔ اس کا وجود آم کی گھٹی شاخوں میں بدل
جانا جس میں کوئل کو کتی چلی جاتی۔

بالکونی کا دروازہ کھلا تو تازہ ہوا کے جھونکے کے
ساتھ کوئل کی کوک کمرے میں چکرانے لگی۔ اسے
ابھی اور سونا تھا سو تکیے میں سر گھسا دیا مگر تکیہ بھی کھینچ
لیا گیا۔

”اٹھ جاؤ۔ ورنہ مزے دار سے ناشتے سے محروم
رہ جاؤ گی۔“

”کیوں؟ سوتیا بھابھی میکے سے واپس آ گئیں؟“ اس
نے کسل مندی سے کروٹ بدلی۔

”ہاں۔ رات کو فیضان بھائی جا کر لے آئے تھے۔
تم تو کھانا کھا کر یوں مدہوش ہو میں کہ ساری رات
کروٹ بھی نہیں بدلی۔“
فرح کمرے میں بھری چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

کوئی ایسا اٹل دل ہو

فیصلہ حسن

قیمت --- 250/- روپے

مگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار، کراچی۔

رسالے، واک مین، برش، وائر کٹرز، ٹائٹ کریم۔۔۔ وہ سرعت سے ہر چیز ٹھکانے لگا رہی تھی۔ بیلا نے اپنے بکھرے بال سمیٹ کر تکیہ گود میں رکھا اور باہر جھانکنے لگی۔ اسے یہ کمرہ اور اس کا یہ نظارہ ہمیشہ سے بے حد پسند تھا۔ جہاں بیڈ پر بیٹھ کر باہر در تک پھیلے درختوں کا نظارہ ہو سکتا تھا۔ اس نے کھڑکیوں سے پردے ہٹا دیے، سامنے دورویہ درختوں میں گہری سڑک بے حد سیاہ محسوس ہوتی۔ کالونی کے درختوں، خوب صورت گھروں کی چھتوں پر ایک روشن خوش گوار صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔

”ایک اچھے دن کا آغاز۔“ امتحانوں کی طویل تھکا دینے والی روٹین کے بعد اس نے خود کو بے حد تروتازہ اور نشاط محسوس کیا۔ نیچے پچن میں ہنگامہ پاتا تھا۔ شن کی آواز سے پوری گھی میں پڑنی اور سوندھی سوندھی مہک سارے گھر میں منڈلانے لگتی۔ پوریاں بنانے میں جو مہارت سونیا کو تھی، کسی کو نہ تھی۔ کسی بیلن کی ضرورت نہیں بس ہاتھ سے جھٹک کر گھی میں اور نرم خستہ پوری تیار۔ ایک کڑاہی میں خوشبودار میوے والا حلوہ دوسری میں آلو کی بھجیا اور ایک چولہے پر لاپچی والی چائے دم پر۔ سونیا سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے چولہوں کے گرد چکرارہی تھی اور پوریوں کے لیے بے تاب افراد خانہ، جہاں جہاں ساسکے، ساسکے، کچھ ناشتے کی میز کے گرد تو کچھ نیچے بیڑیوں پر۔

بیلا دروازے میں ہی ٹھٹھک گئی۔ پوری کا نوالہ بناتے ہاتھ رکے اور عاشر نے چمکتی براؤن آنکھوں کے ساتھ دروازے میں استہادہ بیلے کی کلیوں کی نازک لڑکی کو دیکھا جس کے چہرے پر بخیر آمیز سادہ سی خوشی رقم تھی، جبکہ براؤن آنکھوں میں جہان شوق اٹھ آیا تھا۔

”تم کب آئے؟“ وہ اس سے پورے ساڑھے تین سال بڑا تھا مگر گھر کے دو چھوٹے افراد ہونے کی بنا پر ساری زندگی خود کو مظلوم عوام سمجھتے رہے۔ سو دونوں میں بچپن سے بلا کا ایک رہا۔ اس کے آنسو پوچھنے کے

لیے عاشر کو گڑیاں کھیلنے پڑیں تو عاشر کو بورت سے بچانے کے لیے بیلا کو بیٹ پکڑنا پڑتا۔

”تم ٹھیک ٹھاک نکھی ہو، دیکھو ناشتے کے لیے بھابھی کو ان کے میکے سے لاتا پڑا۔“ گویا وہ رات ہی آگیا۔

”خیال سے، نکمے پن کا یہ طعنہ صرف مجھے نہیں باقی سب گھروالوں کو بھی لگے گا۔“

”اوہو، بچی تو سیانی ہو گئی ہے۔“

”اب تم سیٹ خالی کرو، بچی نے بھی ناشتا کرنا ہے۔“

”ارے۔۔۔ ارے۔“ ایک ساتھ کئی آوازیں اس کی بدتمیزی و بدتمیزی پر ابھریں، جبکہ وہ سعادت مندی سے اٹھا۔ ایک فوجی سلوٹ اسے پیش کیا اور جبکہ خالی کر دی وہ پوری تمکنت اور وقار کے ساتھ خالی جبکہ بیٹھ گئی۔

”عاشر! اور لونا۔“

”نہیں بھابھی! بس کھا چکا۔“ وہ دروازے سے ہٹا۔

پھر فراسار کا وہ اسی کی پلیٹ میں اسی کی چھوڑی ہوئی پوری کھا رہی تھی۔ وہ باہر نکل کر واش بیسن پر ہاتھ دھونے لگا۔ سنبھل بھابھی ابرار کو کندھے سے لگا گھوم رہی تھیں، وہ خواجواہ ریس ریس کیے جا رہا تھا۔ اسے زیبانے لے لیا تاکہ وہ بھی ڈھٹک سے ناشتا کر سکیں۔ سونیا نے چولہے بند کیے، ترے میں بڑے اور چھوٹے ابو کے لیے چائے کے برتن رکھے، باہر اہلی توفیق خان آفس کے لیے جا رہے تھے۔

”ارے۔۔۔ آپ ناشتا تو کر لیں۔“

انہوں نے اک خفاسی نظر بوی پر ڈالی اور لیے۔

ڈگ بھرتے چلے گئے۔ سونیا اپنی جگہ حق دق رہ گئی۔

چھوٹی امی غالباً ”چائے ہی کے لیے کہنے آئی تھیں۔“

”کیا ہوا؟“

”پتا نہیں۔“

”بغیر ناشتے کے چلا گیا؟“

سونیا نے گردن جھکا لی، آنکھیں خواجواہ بھر آئیں۔

ابھی شادی کو کچھ ہی مہینے گزرے تھے کہ صاحب کے

تور بد لے لگے۔

”بیوی ناشتا نہیں کرنا چاہتا تھا، تو تم پوچھ کر کچھ ہلکا ہلکا بنا دیتیں۔“

سونیا کیا پوچھتی، وہ تو اپنے ہاتھوں کا جادو دکھانے کو انسان کے اٹھنے سے پہلے ہی پچن میں موجود تھی۔

”لاؤ مجھے ٹرے دو، تم بھی اچھی طرح ناشتا کرو، اس کی فکر نہ کرو، آفس میں کچھ کھالے گا۔“

انہوں نے نرمی سے تسلی دی، تو وہ پلکیں جھپکاتی پچن میں آگئی۔ جہاں سب ان کے ہاتھ کے ڈانٹے کے معترف ہو رہے تھے، اس کی آنکھ کی نمی خشک ہونے لگی۔

کھاتے کھاتے بیلا کا ہاتھ تھم گیا۔ اس نے ذرا سا ایک کرکٹ کی سے باہر جھانکا۔ وہیں زرد چنبیلی کے پتوں کے پاس وہ ہی سفید جھولا، جس کے جوڑ جوڑ میں رنگ کے بد نما داغ نمایاں ہونے لگے تھے۔ اب ہلتا تو انکھ میں چرخ، چوں کی بد صورت آوازیں ابھرتیں۔

گل صنوبر سر جھکائے تیکے کے سفید غلاف پر گلاب کے پھول کاڑھ رہی تھی۔

اتنا انہماک، تسلسل اور روانی۔

مگر۔۔۔ یہ تسلسل اور روانی۔۔۔ خود ان کی اپنی زندگی میں کیوں دکھائی نہیں دیتا؟

سوال کی سوئی ایک جگہ انک کر ذہن کی شفاف سطح تک ٹک کرنے لگی۔ اسے دیکھ کر بیلا کو ہمیشہ گھنے جھگل سے گزرتی ایسی ندی کا خیال آتا، جس پر سورج کی کرنوں نے کبھی قوس قزح نہ بکھیری ہو۔ جس کے دھند کو باہمی ڈباؤ ایسی گھاس نے ڈھانپ رکھا ہو، بیلا کو اس شدید گھراؤ سے ڈر لگتا، کہیں یہ شفاف،

”گھاسی، کنواری ندی، متعفن بدبودار دلدل میں نہ بدل جائے۔“

بہتاپانی ندی۔

گھراپانی دلدل۔

وہ ٹرے اٹھا کر پچھلے دروازے سے باہر آگئی۔

”میں ناشتا آپی گئے ساتھ کروں گی۔“

اس کے بیٹھنے سے جھولا چرخ، چوں، چرخ چوں

کرنے لگا، اس نے آلتی پالتی مار کر ٹرے درمیان میں رکھ لی۔ گل صنوبر نے قزیم میں سوئی اٹکالی اور قزیم کڑھائی والی چھوٹی سی بید کی نوکری میں رکھ دیا۔ اب وہ ہولے ہولے نوالے توڑنے لگی تھی۔ بیلا نے چور نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”ارے۔۔۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا، گل صنوبر نے چونک کر دیکھا۔ بیلا کی نظریں اس کے دوپٹے سے جھانکتے بالوں پر تھیں۔ جہاں سیاہی پر سفیدی غالب آ رہی تھی۔ اس نے ماتھے تک دوپٹہ پھینچ لیا۔ بیلا خاموشی سے اٹھ کر چائے لینے پچن میں چلی آئی۔ وہاں زیبا بکھرا سمیٹ رہی تھی۔ وہ ٹرے لے کر باہر آئی تو ٹھٹھک گئی۔

وہ زرد چنبیلی جیسی لڑکی وہاں کہیں نہ تھی۔ سفید جھولے کے عقب میں چنبیلی کے جھاڑ پر کوئی ایک پھول بھی نہ تھا۔ اسے لگا گل کا وجود اس جھاڑی میں ڈھل گیا ہے، جس پر خواہشوں کا کوئی پھول نہیں کھلتا۔

بیلا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

گھر میں ناشتے کے بعد کی افرا تفری تھی۔ گھر مختلف آوازوں سے گونج رہا تھا۔ افرا ایم نفیس یعنی بڑے ابو چونکہ ریشٹا ڈالا لف گزار رہے تھے، سوان کے کمرے کاٹی وی اک تو اتر کے ساتھ خبریں سن رہا تھا۔ پچن میں برتن دھونے کی کھٹ پٹ، صحن میں شواپ شواپ کی آوازیں، اندر ہی کہیں واشنگ مشین کی گھول، گھول، سب کمروں سے گندے کپڑے، چادریں اکٹھی کرتی زیبا کے چیلوں کی گھسٹ، گھسٹ عاشر نے دیکھا، ایک وہ ہی تھی، جو برآمدے میں کرسی پر براجمان اخبار دیکھ رہی تھی۔

”یہ ہفتہ کیسا ہے گا۔“

اس نے عقب میں کھڑے ہو کر یا آواز بلند رکھا۔ اس نے کھسکا کر اخبار لپیٹ دیا۔ ”تم لڑکیوں کو ان چیزوں میں کیا دلچسپی ہوتی ہے۔“

بغیر آستین بلاؤز والی ساڑھی میں لپٹا وجود حسن
تمکنت اور وقار کا مجموعہ تھا۔ انداز میں ٹھہراؤ اور
ہونٹوں پر ایسی دلچسپ مسکراہٹ جو دیکھنے والے کو
مسحور کرنے کے۔ ساتھ ساتھ مرعوب بھی کر دیتی
تھی۔

یہ سونیا کی ممتی تھیں۔ مسز منیبہ تو صیف ہمدانی
رسمی ملاقات کے بعد وہ سیدھی سونیا کے کمرے
میں چلی گئیں اور بڑی اماں نے ملازم کے لڑکے کو بیکری
دوڑا دیا۔ دنیا جہاں کے لوازمات جن کے بارے میں
سب جانتے تھے کہ ان میں سے صرف کولڈ ڈرنک
کے ایک دو سب لیے جائیں گے۔

تو پھر کیا ہوا؟
آخر وہ اس گھر کی بہو کی ماں اور ان کی سہ ماہی
تھیں۔

چھوٹی امی کے چہرے پر تفکر کی ہلکی سی لکیریں
تھیں۔ انہوں نے سونیا کی آنکھوں کو مس نہ کیا تھا اور
ناشتے کے بعد سے وہ کمرے سے باہر بھی نہیں نکلی
تھی۔ پون گھنٹے کے بعد جب ناشتے کے تمام لوازمات
میں سے حسب توقع کولڈ ڈرنک کے چند سب لینے
کے ساتھ ہی وہ رخصت ہوئیں، انہوں نے اپنے اندر
طمأنیت کا احساس ابھرتے دیکھا تو حیرت سے خود سے
سوال کیا۔

”کیا میں بھی ان سے مرعوب ہوں؟“

عاشق نے کھڑکی کھول کر نیچے جھانکا۔ یہ کھڑکی پچھلے
صحن کی طرف کھلتی تھی اور اس میں سلاخیں بھی
نہیں تھیں۔ وہ وہیں جھولے کے پاس چوکی پر بیٹھی
تھی اور گل صنوبر اس کے بالوں میں تیل کی ماش
کر رہی تھیں۔ نہ جانے کون سے قصے تھے جو وہ اسے
سنائے جا رہی تھی اور باتیں کرتے ہوئے حسب عادت
اس کے دونوں ہاتھ متحرک تھے۔ لاکھ ٹوکنے کے باوجود
وہ آدمی باتیں ہاتھوں کے اشارے سے کیا کرتی۔ عاشق
ہمیشہ اسے چھیڑتا۔ ”کیا انیٹنا ہلائے بغیر تمہاری آواز

صاف نہیں آتی۔“

تو کبھی کہتا۔ ”اس کے ہاتھ باندھ دو تو یہ بات کرنا ہی
بھول جائے گی۔“

لڑکھن میں ایسی ہی باتوں پر ان کی لڑائی ہو جاتی
تھی۔

عاشق نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا، انگلیوں کی
پوروں میں اس کی خواہش دلی تھی یا دل دھڑکتا تھا۔
اس نے اودھ کھلے گلاب کو لیوں سے چھو لیا۔ اسے ابھی
واپس جانا تھا اور وہ چاہتا تھا جانے سے پہلے اپنی اس
لاہروا سی کزن کو بتائے دن ہو یا رات کوئی بھی موسم یا
کیشی بھی رو میں جانے انجانے وہ اسی کو سوچنے لگا
تھا۔ وہ چھیلی کی خوشبو جیسی لڑکی کب اس کے حواس
پر چھاتی چلی گئی، خود عاشق کو بھی خبر نہ تھی وہ اس سے
پوچھنا چاہتا تھا۔

”کیا یہ محبت ہے؟“

اس نے کھڑکی بند کی اور خود اس کمرے میں آ گیا
زیبا اور بیلا کا مشترکہ تھا۔ بیلا کی ساری کتابیں ایک
ترتیب سے الماری میں لگی تھیں مگر ایک کتاب بیڈی
سائڈ پر اوندھی بڑی تھی۔ عاشق نے ہاتھ بڑھا کر کتاب
اٹھالی۔ پہلا صفحہ کھولا، اس پر بیلا کا نام جگمگا رہا تھا۔
کتاب پچھلی برتھ ڈے پر اس کی کسی سہیلی نے گفٹ
کی تھی۔ عاشق نے ٹائٹل پر نگاہ دوڑائی۔

”خانہ بدوش۔“ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے
لبوں پر بکھر گئی۔

”میں بھی خانہ بدوش ہوں، مگر یہ خانہ بدوشی
اس نہیں آتی اب کوئی ٹھکانا چاہتا ہوں۔“

اس نے وہ اودھ کھلا گلاب کتاب میں رکھا اور کتاب
بند کر کے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا
سے پہلے کسی کی نظر اس کتاب پر پڑے۔

اور جب وہ اس کتاب کو تلائے گی اور کھولے گی
تو۔

اک خوش گوار سے تصور کے ساتھ وہ تیزی سے
باہر نکلتا چلا گیا۔

زیبا کب سے نیٹ پر چھٹنگ میں مصروف تھی
اور وہ موبائل پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ سیمینگ
میں۔ پھر آگے موبائل ایک طرف رکھ کر زیبا کو دیکھنے
لگی، اس کے ہونٹوں پر پھیلی مدھر مسکان ان کے
انسانے سنار ہی تھی۔

”نہند بھائی ہیں؟“

”ہوں۔“ زیبا کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”میرا بھی سلام لکھ دو۔“

”لکھ دیا۔“ وہ بے توجہی سے بولی۔

”دو گھنٹے سے تم چھٹ کر رہی ہو۔ آخر وہ کون سی
باتیں ہیں جو ختم ہی نہیں ہو رہی ہیں۔“ زیبا کے انداز
سے وہ ذرا سی جھلس ہوئی۔

”تم ابھی بچی ہو۔“

”اور یہ نہند بھائی وہاں پڑھنے کا پہلا کر کے بیٹھے
ہیں۔ سارا وقت تو تمہارے ساتھ باتوں میں گزر جاتا
ہے۔“

”تم کیوں جھلس ہو رہی ہو۔“ وہ ہنسی۔

”میں کیوں جھلس ہوں گی ایسی ہی بے تابی تھی تو
نہیں بھی ساتھ لے جاتے نکاح تو ہو گیا تھا۔“

”سوئی! یہ محبت کے معاملے تمہاری سمجھ میں
نہیں آئیں گے، اس دوری میں بھی نزدیکیاں ہیں۔“

اس نے غالباً ”نہند کو گڈ ٹائٹ لکھ دیا تھا۔ تب ہی کمپیوٹر
شٹ ڈاؤن کر کے کلینز ر اٹھایا اور اپنے بیڈ پر بیٹھ
گئی۔

”اتنی فریش اسکن ہے، پھر بھی رگڑے لگاتی رہتی
ہو۔“

”اس لیے فریش ہے۔“ وہ ہنسی، جب بھی اس کی
لہ سے بات ہوتی، ہنسی بات بے بات لبوں سے
ہوتی۔“

”وہ واپس کب آئیں گے؟“

”اواکل سوما میں۔“

”پھر فوراً تمہاری رخصتی ہو جائے گی۔“ بیلا آلتی
آتی بار کر بیٹھ گئی۔

”ظاہر ہے۔“

”ایک بات تو بتاؤ، کیا یہ ضروری ہے کہ جس بندے
کے ساتھ شادی ہو، اس کے ساتھ محبت بھی
ہو جائے۔“ دونوں ہاتھوں کے پالے میں چہرہ سجاتے
ہوئے معصومیت سے سوال کیا، کیونکہ وہ جانتی تھی،
اگرچہ نہند ان کا رشتہ دار ہی تھا مگر زیبا اور اس کی
بے تکلفی نکاح کے بعد ہی شروع ہوئی تھی۔ اب دونوں کا
یہ حال تھا کہ ایک دوسرے سے بات کیے بنا نیند ہی نہ
آتی۔

”اللہ تعالیٰ نے اس رشتے میں ایک قدرتی کشش
رکھی ہے، بیلا ڈیر۔“

”مگر تمہارا نکاح نہند کی جگہ کسی اور سے ہوتا، تب
بھی تم اس سے ایسی ہی محبت کرتیں؟“

”اللہ نہ کرے، کیا بے تکی سوال کر رہی ہو۔“ زیبا
نے دہل کر کہا اور کلینز روپس ڈرائنگ ٹیبل پر رکھ
دیا۔

”تم سچ سچ ان سے محبت کرنے لگی ہو؟“ بیلا مسکرا
دی۔

”اب لائٹ بند کروں؟“ اس نے جواب دینے
کے بجائے سوال کیا۔

”کردو، میں نہیں چاہتی تمہارے خواب، ڈسٹرب
ہوں، ویسے خواب سن رہا ایسی کو مد نظر رکھ کر دیکھتی
ہونا، بیلا نے شرارت سے پوچھا۔

”ہمارے تو اب ڈراموں میں بھی کوئی سن رہا ایسی
نہیں رہی، تم خوابوں کی بات کرتی ہو۔“ زیبا نے لائٹ
بند کی تو وہ بھی تکیہ کھینچ کر لیٹ گئی۔ تب ہی ہاتھ کتاب
سے نکرایا۔ اس نے کروٹ بدلی اور کتاب کو اندھیرے
میں شایف میں گھسا دیا۔ کبھی کبھار باتیں ان کی ہی رہ
جاتی ہیں۔ گلاب کی خوشبو کتاب کے صفحوں میں مقید
ہو کر رہ گئی۔

زیبا کے لاکھ اکسائے کے باوجود وہ اس کے ساتھ
انسٹی ٹیوٹ جانے پر رضامند نہ ہوئی، جہاں زیبا
مختلف قسم کے کورسز کر کے ٹائم پاس کر رہی تھی۔

اسے تو گھر میں رہ کر سونیا بھابھی سے مختلف چائیز
انالین اور انگلش کھانے پکانا سیکھنے تھے۔ گل آبی سے
کشیدہ کاری سیکھنا تھی۔ اس کا آگے پڑھنے کا کوئی ارادہ
نہ تھا اور اس کے اس فیصلے کو سب سے زیادہ عاشر نے
سراہا۔ وہ جو اپنی سخت ترین روئین میں بھی سوچتا جب
اس نے کتاب میں اودھ کھلا گلاب دیکھا ہوگا تو کیا سوچا
ہوگا اور فون پر اس کے لمبے میں کچھ الگ کچھ ان کی
سی محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہاں تو وہ ہی
لا پرواہی اور اذلی بے نیازی تھی۔ بس جلدی جلدی
باتیں کیں اور ریسیور پھوپھو کو تھما دیا۔ یہ تک نہ پوچھا
کہ "عاشرا تم کب آؤ گے؟ یا ہم سب تمہیں بہت یاد
کر رہے ہیں۔" وہ خود ہی ان فکروں میں اپنے مطلب
کی بات چن لیتا مگر پیلہ کو تو سونیا بھابھی سے برائی کی
پوری ترکیب سیکھنا تھی۔

اور برائی کا مسالہ تیار کرتے ہوئے دونوں کو خبر بھی
نہ ہوئی کب گیٹ پر سیاہ گاڑی رکی کس نے دروازہ
کھولا اور کب مسز منیبہ تو صیغہ ہمدانی ان کے سر پر
کھڑی ہوئیں۔ چھوٹی اور بڑی امی دونوں کسی کی
عیادت کے لیے گئی تھیں۔

"مما۔" سونیا ٹھٹھکی پھر برائی کو آگے بڑھی۔
"یہ اتار کر کمرے میں آؤ۔" ان کا اشارہ ایپرن کی
طرف تھا۔ خود وہ تیزی سے پلٹ کر اس کے بیڈ روم
میں چلی گئیں۔ فضا میں کچھ لمبے ان کی ہیل کی ٹک
ٹک گو بجتی رہی۔ پھر سونیا کو ہوش آیا۔ اس نے ایپرن
اتار ہاتھ دھوئے اور ان کے پیچھے لگی۔

"اب میں کیا کروں۔" پیلہ نے اناڑی باورچی کی
طرح ارد گرد پھیلے سامان کو دیکھا۔ پھر خیال آیا۔ یوں
ہاتھ لٹکانے سے کچھ نہ ہوگا۔ عزت مآب مہمان کی
خاطر داری کرنا ہے اور گھر میں اس کے سوا کوئی
نہیں۔ منیبہ بھابھی بھی اپنے میکے گئی تھیں۔ اس
نے فریزر سے کباب نکال کر باہر رکھے۔ خود کمرشل
کے نفیس گلاس میں کولڈ ڈرنک اندلی۔ مگر سونیا
بھابھی کے کمرے میں داخل نہ ہو سکی کہ وہاں ماحول
کچھ اور تھا۔

"یہ کمرے کی حالت کیا بنا رکھی ہے؟"
"مما! آج ملازمہ ابھی تک نہیں آئی تو۔" وہ گڑبڑا
کر کمرے میں گئی۔
"ملازمہ نہیں آئی یا تمہیں بچن سے فرصت نہیں
ہی اپنا چلیہ دیکھا تھا۔" وہ کسی انسکشن آفسر کی طرح
چیز کو جانچ رہی تھیں۔ سونیا نے کچھ جھنجھلا کر کمرے
چھوڑا۔
"کیا ہوا ممما! سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے۔"

"تم نے فیضان سے بات کی؟"
"کس بارے میں۔" وہ لب بھینچے بیٹی کو گھور کر
رہیں۔ سونیا بیڈ پر بیٹھ گئی۔
"سونیا! میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔" انہوں
نے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے اس کے بالوں پر ہاتھ
پھیرا۔ "کیا تمہیں ابھی تک احساس نہیں ہوا کہ تم
نے کیا کچھ کھویا ہے۔"

"نہیں۔ کیونکہ یہ میرا اپنا فیصلہ تھا۔ میں نے
فیضان سے محبت کی ہے۔ اور اسے پانے کے لیے
بھی کھونے کو تیار بھی اور جہاں تک بات ہے علیحدہ کمرے
میں شفٹ ہونے کی تو وہ مجھ پر یہ بات واضح کر چکے تھے
کہ وہ ابھی علیحدہ نہیں ہو سکتے اور مجھے یہاں کوئی
تکلیف نہیں میں یہاں خوش ہوں، آپ بار بار ایک
ہی بات دہرا کر مجھے ڈسٹرب مت کریں۔" سونیا کو اگا
اسے ماں سے دو ٹوک بات کرنا ہی ہوگی۔
"یہ گھر ہے؟"

"اب یہ ہی میرا گھر ہے۔" سونیا نے اعتماد سے
جواب دیا۔ "یہاں کے لوگ مجھ سے محبت کرتے
ہیں مان دیتے ہیں اور میں یہاں بہت خوش ہوں۔"
"تو کمرن کر رہی ہو۔"

"ہائے گھر کا کام کرنے سے کون نوکر بنتا ہے۔"
"تمہیں تمہاری دادی نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔"
ورنہ اس لوڑ کلاس کے فیضان سے شادی نہ کرتیں۔
"ٹھیک۔" لیکن یہ سب آپ کو اس وقت
چاہیے تھا جب مجھے دادی کے پاس چھوڑ کر فاران
پر نکل گئی تھیں۔ بہر حال یہ لا حاصل بحث ہے۔ آپ

کولڈ ڈرنک لیں گی یا کافی؟"
تب ہی باہر کھڑی پیلہ کو ہوش آیا تو وہ ہڑبڑا کر اندر
داخل ہوئی۔ انہوں نے اک اچستی سی نگاہ اس پر ڈالی۔
"چلتی ہوں، لیکن زندگی میں جب کبھی اپنی حماقت
کا احساس ہو چلی آتا۔"
پیلہ کی موجودگی سے سونیا جھل سی ہو گئی۔ وہ اپنے
پچھے اک بو جھل سی خاموشی چھوڑ گئی تھیں۔ پیلہ نے
سونیا کو دیکھا۔
"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، کوپکن دیکھیں۔"
"بھابھی! آپ یہاں خوش تو ہیں ناں؟" پیلہ نے
فکر مندی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ہنس
اگئی۔
"ہاں، ابھی اب یہ کولڈ ڈرنک تو بے کار گئی۔"

"ایسی بے کار چیز اب میرے پیٹ میں ہی جائے
گی۔" پیلہ نے بے چارگی سے کہا اور گلاس منہ کولگا
لیا۔



فرح اپنے میاں کے ساتھ اچانک ہی وارد ہوئی۔
اس کے میاں کو یہاں کچھ کام تھا اور انہیں ایک ہفتہ
یہیں رکنا تھا۔ وہ صبح کا گیارہ بجے کو آتا اور فرح سارا دن
سرال میں گزرے پچھلے ماہ کے شب و روز انداز بدل
بدل کر سناتی، ہر روز رات کے کھانے کے بعد لاؤنج
میں محفل جم جاتی۔ وہ بھی بہت زندہ دل اپنے
قصوں میں کوئی نہ کوئی گیم نکال لیتی، منیبہ، ابراہیم
سلانے کے بہانے اٹھ جاتیں، گل صنوبر عشاء کے بعد
لاؤفل اور تنسیبہات میں مشغول ہو جاتیں، ایسے
میں سونیا اپنی بامروت طبیعت کی بنا پر پھنس جاتی۔
ایشان بیڈ روم میں تنہا غصے میں کھولتے کمرے میں بدلتے
رہتے اور جب تک سونیا اس سب سے جان چھڑا کر
کمرے میں آتی، ان کا موڈ بگڑ چکا ہوتا یا وہ سوچے
ہوتے اور سونیا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ گھر اور
شوہر کے درمیان توازن کیسے رکھے۔

"سونیا! فیضان کو دودھ کا گلاس دے دیا تھا۔"
فیضان کو بچن میں جاتے دیکھ کر چھوٹی امی نے نرمی سے
اسے ٹوکا وہ سب کے ساتھ کیرم کی بازی جملے بیٹھی
تھی۔ ہڑبڑا کر اٹھی۔ پیلہ بچن میں سب کے لیے چائے
بنارہی تھی اور فیضان فرج کھولے کھڑے تھے۔
"دودھ سا دھ لو گے یا۔" سونیا نے جلدی سے دودھ
کا برتن نکالا مگر فیضان نے جھپٹ لیا۔
"خود ہی لے لوں گا۔"

ان کا لہجہ بے حد سرد اور سپاٹ تھا۔ سونیا کی رنگت
متغیر ہو گئی۔ پیلہ دانستہ رخ بدل کر مک نکالنے لگی۔
فیضان نے دودھ گلاس میں نکالا، گلاس مانیکرو یو میں
رکھا، پھر او لٹین کا ڈبہ نکالنے لگے۔ سونیا تیزی سے
باہر نکل گئی۔

"کچھ گڑبڑ ہے۔" پیلہ کو شدت سے احساس ہوا۔
چائے لے کر لاؤنج میں گئی تو سونیا اور فیضان دونوں ہی
وہاں نہ تھے۔ وہ سونیا کا کپ لے کر دانستہ ان کے
کمرے کی طرف آگئی مگر وہاں بہت گہری چپ
دروازے کے دوسری طرف سرسرا رہی تھی۔ وہ
متنذب سی کھڑی رہی۔ دستک دے یا نہ دے پھر کچھ
سوچ کر واپس پلٹ آئی مگر اس رات ماں کے پہلو میں
دبک کر ساری بات ماں کے گوش گزار کر دی۔
"ہاں، محسوس تو۔" میں نے بھی کیا ہے، دونوں
کے درمیان کچھ فاصلے ہیں۔" ماں کے دوسری طرف
لیٹی فرح اٹھ بیٹھی، وہ تو سن کر ہی پریشان ہو گئیں۔
"آپ کہیں تو میں بات کروں۔" فرح نے اپنی
خدمات پیش کیں۔ شادی کے بعد وہ خود کو خاصا معتبر
اور سیانا تصور کرنے لگی تھی۔

"نہیں، ابھی تو کچھ بھی واضح نہیں میں دیکھ لوں
گی۔" انہوں نے منع کر دیا اور آگے چند دن جائزے
کے بعد انہیں مسئلے کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا۔
جو باتیں ابھی معمولی تھیں، آگے جا کر گاڑ کا باعث
بن سکتی تھیں۔ انہیں افسوس سا ہوا، کہیں نہ کہیں
چوک ہو گئی تھی۔ گھر کا توازن گھر کے بڑوں کے ہاتھ
ہوتا ہے اور یہاں توازن بگڑ رہا تھا۔ منیبہ اکثر ابرار

کے ہمارے اوہراوہر ہو کر ذمہ داری سے پلو بچا جاتی اور سونیا مروت میں بہت ذمہ داریاں خواہ مخواہ اپنے اوپر لیے بیٹھی تھی۔ اور وہ دونوں یعنی ثوبیہ اور ثمنہ گھر میں ہوئیں لاکر بے فکر ہو گئی تھیں۔ ثمنہ آپا کو بیرونی دروں سے فرصت نہ تھی اور خود انہوں نے نہ جانے کب کے سنبھال سنبھال کر رکھے شوق ابھی پورے کرنا تھے۔ ثمنہ آپا سے تو توقع ہی فضول تھی۔ وہ لاپرواہ خاتون تھیں اب جو کچھ کرنا تھا خود ان ہی کو کرنا تھا۔

”فیضی! تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟“ کھلی کھڑکی سے آواز باہر کو لپکی تو پچھلے برآمدے میں سب سے چھپ کر کھاتی بیلا کے کان کھڑے ہو گئے۔ ”مسئلہ مجھے تو لگتا ہے ہمارے درمیان اب کچھ رہا ہی نہیں۔“

”جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو۔“

”مجھے کچھ نہیں کہنا۔“

”واہ فیضان! وہ! میں تمہاری خاطر کیا سے کیا ہو گئی اور تم؟“

”تم نے جو کچھ کیا اپنی خوشی سے کیا اب بچھتا رہی ہو تو۔“

”میں نہیں بچھتا رہی ہاں تم اور تمہارا رویہ ضرور بچھتا رہے مجبور کرے گا۔“

”اور تمہارا رویہ؟“

”کیا ہوا میرے رویے کو؟“

”تم بدل گئی ہو سونیا بیگم۔ مجھ سے کتراتے اور بھاگتی ہو۔ تمہارے پاس وقت ہی نہیں میرے پاس بیٹھنے اور بات کرنے کا۔ کیا ثابت کرنا چاہتی ہو یہ صبح سے شام تک کچن میں گھس کر کہ ہم لوگ بہت ظالم ہیں۔ روایتی لوگوں کی طرح ساری ذمہ داریاں تم پر لا دے گی ہیں تمہارے۔“

”خدا کے لیے فیضان اتنی بدگمانی کچھ تو خیال کرو میں دو دو محاذوں پر نہیں لڑ سکتی ہوں۔“

”کون سے محاذ کھولے ہیں اور آواز دھیمی کرو۔“

اردی ٹوٹ جاتی ہے۔

”کوئی بات نہیں، ہم وہ ٹوٹا پھوٹا انڈا کھالیں گے، ہمیں یقین ہے وہ ہمارے پیٹ میں کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں بچائے گا۔“ زبانا نے دندیاں نکالتے ہوئے تسلی دی۔

”بڑے اباچھ بچے بیڈنی لیتے ہیں۔“ وہ روہانی اہلی۔

”اچھی بات ہے تمہاری فجر کی نماز نہیں چھوٹے گی جس کا آئے دن بہانا کرتی ہو۔“

”ہاں۔ تم تو پانچ وقت کی نماز ہو۔“ وہ لڑنے کو تیار ہوئی۔

”بیلا! مجھے لڑکیوں کا زیادہ بکواس کرنا پسند نہیں۔“

اس نے ”راجہ گدھ“ سے نظریں ہٹا کر سکون سے کہا اور اس کی بولتی بند ہو گئی اور یوں اک بڑا مسئلہ ثوبیہ کی مداخلت اور بروقت اقدام سے خود بخود دب گیا۔

شام کو سونیا تیار ہو کر ان سے دعا لینے آئی تو انہوں نے اس کی نظر اتارتے ہوئے پیار سے سمجھایا۔

”میں جانتی ہوں تم سب اس گھر کو اپنا بنانے کے لیے کر رہی تھیں، لیکن سونیا! تمہاری سسرال روایتی سسرال نہیں ہے، جہاں جگہ بنانے کے لیے ان رات گھن چکر بننا پڑے۔ یہاں کے مکین ہر آنے والے کو بعد احترام اس کی جگہ دے دیتے ہیں، تم ہم سب کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتی ہو، ہمیں بہت اچھا لگتا ہے، اور قدر بھی ہے۔ تم جو اتنی آسانشوں سے نکل کر یہاں ایڈجسٹ کر رہی ہو، لیکن ایک بات یاد رکھو، تمہاری اولین ذمہ داری تمہارا شوہر ہے، جس کے حوالے سے تم یہاں ہو، شوہر اور گھر میں توازن رکھنا سیکھ لو گی تو بہت خوش رہو گی۔“

”جی امی۔“ اس نے سعادت مندی سے کہا۔

”ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔“ فیضان کلائی پہ کمری باندھتا اندر آیا۔

”فیضی! آج میری بہو کو ڈنبا ہر کروانا۔“

”امی! آپ کا بیٹا خاصا غریب ہے۔“ اس نے دہائی دی۔

”ہاں۔ یہ غریب بیٹا مینے میں ایک دو ڈنر تو افورڈ کر سکتا ہے۔“

”بیلا! تم بھی چلو۔“ سونیا نے مروتا کہا، وہ جو ابھی تک خاموشی سے سب سن رہی تھی۔ پر جوش ہوا تھی، مگر اس کی ہاں ماں نے اپنے پیر سے دہائی تھی وہ لبوں سے اٹھتی چیخ کو دہائی سابقہ پوزیشن میں بیٹھ گئی۔

”کیا تھا جو میں چلی جاتی۔“ دونوں کے جانے کے بعد وہ اپنا پیر سہلاتے ہوئے بولی۔

”کباب میں ہڈی والا محاورہ سنا ہے؟“ ماں نے عینک کے پیچھے سے جھانکا۔ ”شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ جایا کرنا۔“

”اچھا۔ جو میری ساس آپ جیسی دیالونہ ہوئی تو یا میری شادی ہی نہ ہوئی۔“ وہ چمک کر بولی تو پاس ہی ابرار کے ساتھ مشغول ثمنہ تڑپ اٹھیں۔

”خدا نہ کرے، اللہ سب بچیوں کو اپنے گھریار کا کرے، وہ ایک بد نصیب کافی نہیں۔“ ان کی آواز بھرا سی گئی، بیلا نے چونک کر دونوں کو دیکھا۔ وہ یقیناً ”گل صنوبر کی بات کر رہی تھیں۔“

”بڑی اماں! آپ فکر نہ کریں۔ ان شاء اللہ گل آپ کی شادی بہت اچھی جگہ ہوگی۔“ اس نے نادانستگی میں ان کے زخم چھیڑ ڈالے۔

”گل اتنی بخت آور ہوتی تو وہ اسے یوں ٹھکراتا؟“ وہ زیر لب بریدیں۔ اس سے قبل کہ بیلا کوئی سوال کرتی ماں نے ڈانٹ کر اٹھا دیا۔

”جاؤ اپنی پھوپھو کو دیکھ آؤ، آج صبح سے نیچے نہیں آئیں۔“

وہ کچھ الجھتی اوپر گئی تو پھوپھو مزے سے خراٹے لے رہی تھیں۔ وہ دبے پاؤں واپس آگئی۔

فضا میں آتی بہار کی آہٹیں اور کلیوں کے چٹکنے کی صدا میں گھٹی ملی تھیں۔ دھوپ چلچلاتی اور کمروں میں خوش گوار ٹھنڈک کا احساس، ایسی خوش گوار ریت جس میں خواہ مخواہ آنکھیں بند ہونے لگتیں۔

پھوپھو نے آئیں تو ساتھ ہی ذکی کے پاکستان آنے کی خبر بھی آگئی۔ ان کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے آنکھیں نم۔ اتنے سالوں کے بعد بیٹا پردیس سے آ رہا تھا۔

”میں تو سمجھی تھی اب جیتے جی اس کی شکل نہیں دیکھ پاؤں گی۔“

”ایسا کیوں کہتی ہیں کیا شائستہ بھی ساتھ آ رہی ہے۔“ ثوبہ بیگم نے پوچھا۔

”نہیں ابھی تو اکیلا ہی آئے گا۔“ ایسا کہتے ہوئے ان کے لہجے میں ہلکی سی یاسیت گھل گئی۔ بیٹے کی بے اولادی کا دکھ انہیں اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔ شینہ خاموش سی تھیں۔ زبان سے اس خبر کو نازل ہی لیا جبکہ پیلا پر جوش تھی۔ وہ بچپن ہی سے ان سے بہت متاثر تھی۔

”گل آئی! آپ کو پتا ہے ذکی بھائی آ رہے ہیں۔“ انہیں اطلاع دینے والی پیلا ہی تھی۔ وہ کچھ لمحے ساکت سی رہ گئی۔ دور سے اذان کی آواز آرہی تھی۔ اس نے آہستگی سے دوپٹہ سر پر پھیلاتے ہوئے سوچا۔ ”میں جانتی تھی تم اسی موسم میں لوٹ کر آؤ گے۔“

”تم نے خانہ بدوش پڑھ لی۔“

وہ دونوں آج بھی اس گھر کے ننھے بچے تھے، جو سب کی نظر بچا کر پچھلے برآمدے میں ایک دوسرے سے زمانے بھر کی شکایتیں لگانے اکٹھے ہوئے تھے۔ سامنے جھولے پر صنوبر کا سامان بکھرا تھا اور پکین میں ہوتی کھٹ پٹ بتاتی تھی کہ صنوبر وہیں ہے۔

”مجھے سفر نامے اچھے نہیں لگتے۔ اچھا بھلا اپنا گھر چھوڑ کر مارے مارے پھرتے رہو۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔ چائے کا کپ اپنے اور اس کے درمیان رکھ لیا۔ اوپر کی منزل پر نیارنگ روغن کروایا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بڑی اماں کی بڑبڑاہٹیں اور غصہ بھی برہتا جا رہا تھا۔ خواجواہ سب سے اچھے لگتیں۔ ثوبہ بیگم چپکے

چپکے انہیں کچھ سمجھاتی رہتیں اور جب وہ اکتائیں تو خاندان کے دورے پر نکل جاتیں۔

”اچھا۔“ عاشر کے لہجے میں ہلکی سی مایوسی در آئی۔ اس نے گردن موڑ کر سبز کپڑوں میں ملبوس لاپرواہی لڑکی کو دیکھا، جو اس سے نیبا جہاں کی باتیں کر جاتی تھی مگر وہ اس سے اپنے جذبات ایک نئے اور اچھوتے احساس کو بیان نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے پیلا کا رکھا کپ اٹھا کر لبوں سے لگایا۔

”اوں ہوں۔ میری جھوٹی کیوں پی رہے ہو میں اور لاوتی ہوں۔“

”بچپن سے لے کر آج تک ہم نے ایک دوسرے کی ہر چیز شیئر کی ہے، خواہ وہ کسی کا ایک گلاس ہی کیوں نہ ہو پھر آج یہ احساس کیوں؟“ اس نے کپ نہیں رکھا۔

”امی کہتی ہیں اب تم بڑی ہو گئی ہو۔“

”ہاں۔۔۔ وہ تو ہے۔“ عاشر نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ اب وہ اس کے سامنے دوپٹہ خوب پھیلا کر اوڑھتی تھی۔

”دیکھو عاشر اپنی کلیاں چٹکنے لگی ہیں۔“

”ہاں وہ تو ہے۔“ اس کا لہجہ و انداز دونوں ہی بدلے۔

”پھر سفید اور پیلی تتلیاں آئیں گی یاد ہے تم مجھے تتلیاں پکڑ کر دیا کرتے تھے۔“

”ہاں وہ تو ہے۔“

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔“ پیلا نے مشکوک لگا ہوں سے دیکھا تو وہ سنبھل گیا۔

”اچھا عاشر! ذکی بھائی سے ایک موبائل کی فرمائش ہی کرو۔“

”کیوں میرے پاس تو آل ریڈی ہے۔“

”بدھو میرے لیے۔“

”آئندہ مجھ سے اس ٹون میں بات مت کرو ورنہ۔“ اس کا بدھو کہنا بہت برا لگا تھا۔

”سواری کہہ دو گے نا؟“

”دیکھوں گا۔“

”گھر میں سب کے پاس ہے۔“

”سب کو ضرورت ہے۔“ اس نے چائے ختم کی۔

”زیادہ کیا ضرورت ہے، سوائے سارا دن اپنے منگیتر کے ساتھ باتیں کرنے کے۔“

”تو تمہیں کیوں ضرورت پڑ گئی؟“

”تو میں بھی تو۔۔۔“ کچھ کہتے کہتے زبان لبوں تلے دبائی۔ عاشر کا تقہم بے ساختہ تھا۔

”واہ۔۔۔ منگنی ہوئی نہیں اور موبائل پہلے سے آرٹج کیا جا رہا ہے۔“

پیلا نے غصے و خجالت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کپ اس کے ہاتھ سے چھینا تو عاشر نے اس کا ہاتھ قحطام لیا، پھر بچوں کی طرح پکار کر بولا۔

”اچھا وعدہ، تمہیں موبائل میں گفت کر دوں گا۔“

”ہو نہ! مجھے نہیں چاہیے۔“ وہ ہاتھ چھڑا کر پچھلے دروازے سے کچن میں چلی گئی۔ عاشر نے دونوں ہاتھ

مقب میں رکھے اور پاؤں چھیلائے ہوئے گنگنانے لگا۔

تو ہی حقیقت خواب تو

ادھ کھلی چاندنی، خاموش فضا، ہوا چنبیلی کے جھاڑ میں پتے اوڑھے سو رہی تھی۔ اس کی ہلکی سی کروٹ پر پھول اوڑھے سفید تتلیاں کسمکساتیں، ہلکے سے پکڑ پکڑاتیں اور پھر سے محو خواب ہو جاتیں۔

”کیا تتلیاں بھی رات کو نیند اوڑھتی ہیں۔“

اس نے اک بے تے سے خیال کے ساتھ اپنی سوچ کے زاویوں کو بھٹکانا چاہا۔

”کیا ان کی آنکھیں بھی خواب دیکھتی ہیں۔“

ہلکی سی جنبش سے جھولا جس خچوں، چوں، کرنے لگا تو وہ اپنے ہی خیالوں سے چونکی اور گڑبڑا گئی سوال ہی

”تمہاری نیندوں نے پہلی بار خواب کا ذائقہ کب

پہلی اور آخری بار؟

اس نے ادھر ادھر دیکھا، ریشمی سفید دوپٹہ سر سے سرک گیا۔ اسے لگا وہ اپنے ہی سامنے بے نقاب ہو گئی ہے۔ اپنی دانست میں وہ بیان کے طاقے میں سارے چراغ بجھائے بیٹھی تھی تو آج یہ ہلکی سی روشنی کیوں؟

یہ کس نے بے خواب اندھیاری راتوں کی ویلیزیر دھرا، بجھا دیا، پھر سے جلا دیا تھا۔

وہ سمجھتی تھی کہ وہ سب کچھ بھول گئی، مگر سرہانے رکھے یادوں کے گلاب اب بھی تروتازہ تھے۔ پہلا خواب، یہیں اسی آنگن میں جب لیموں کے سفید پھولوں پر پیلی تتلیاں منڈلائی تھیں اور زرد چنبیلی اپنے جوں پر تھی۔ داجی نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اعلان کیا تھا۔

”یہ میرے ذکی کی دلہن بنے گی۔“

تب پہلی بار معصوم ہاتھوں نے گڑیا کو دلہن بناتے بناتے عمیکا اپنے ماتھے پر سجا کر دیکھا اور شرمائی تھی،

زیست کا ایک ایک پل، ایک ایک لمحہ، اس نے خود کو ذکی کی امانت سمجھا اور جب وقت آیا تو وہ سرے سے انکاری تھی۔ اک اضطرابی لہر اٹھی اور دوپٹہ کندھے سے پھسل کر گود میں آگرا۔ اس نے گھبرا کر ننگے پاؤں نیچے

رکھے وہاں اس کے ادھورے خواب کی کرسیاں بکھری تھیں۔ وہ چاہتی تو بھی خود کو لہو لہان ہونے سے بچانہ پاتی اور یہاں تو زخم بھی عزیز تھے اس نے کس حوصلے سے اپنے محبوب کو رخصت کیا۔

تم جاؤ

سمندر، سمندر اپنی پیاس بجھاؤ

جن آنکھوں میں اترو

جس دل میں ڈوبو

میری تنہائی تمہیں آواز نہ دے گی

اور اس نے آج تک اسے کبھی نہیں پکارا۔ کبھی

اپنی راکھ ہوتی جوانی کا حساب نہ مانگا کہ حساب کتاب تو

برابری میں ہوتا ہے۔ وہ تو در پر بیٹھی سوالی تھی، جسے

چاہو تو چند سکے دان کر دو، چاہو تو دھتکار دو۔ اور وہ دھتکار دی گئی تھی، اس کا کشکول خالی کا خالی رہا۔

”کہاں میں اور کہاں وہ ایف، اے پاس

بے وقوف سی لڑکی کیا میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکتی ہے؟ یوں بھی میں اس بچپن کی کمٹنی ونگٹی کو نہیں مانتا۔ میں شائستہ سے شادی کر رہا ہوں اور بس۔

اور اس ایف۔ اے پاس بے وقوف لڑکی نے یہ سب کس صبر اور حوصلے سے سنا، بنا آنکھ سے آنسو بہائے۔ محبت کی کتاب بند کر کے سنبھال کر دل کے طاق میں سجائی اور خود رب سے لو لگالی۔ حال دل محرم راز جان سکتا ہے اور رب سے برا محرم کون ہو سکتا تھا؟ لیکن آج لگاؤ تو صدیوں سے خود کو اور رب کو دھوکا دیتی آئی ہے۔ یا شاید صرف خود کو کہ رب کو دھوکا کون دے سکتا ہے۔ وہ تو اک ایسی ماں کی طرح جو بچے کی ہر غلطی اور نقصان کو جانتے بوجھتے انجان بننے کا ٹھیل کھیلتی، اپنے دامن میں سمیٹ کر تھکنے لگتی ہے، وہ بھی شفقت سے اسے اپنی پناہ میں لے کر مسکراتا رہا تھا۔ اسے ایک دم بے پناہ رائیگانی کے احساس نے نڈھال کر دیا تو گھٹنوں میں سر جھپا کر بے آواز سستی چلی گئی۔

”تو نے مجھے قبول ہی نہیں کیا۔ ورنہ وہ آج بھی میرے اندر کیوں بستا؟ یا میرے اندر ہی خلوص نہ تھا۔ میرے بچے ہی بے کار تھے۔ مجھے اپنا بنالے یا اسے مجھے بخش دے کہ میں دو کشتیوں میں سوار نہیں ہو سکتی۔“

وہ آپ ہی اپنی دعا پھٹک گئی۔ گزرے ماہ و سال میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا کہ اس نے رب سے ذکی کو مانگا ہو۔

یا شاید ہر لمحہ مانگا ہی اسی کو تھا۔

دل کا چور آج آنگن میں دندنا تا پھر رہا تھا۔

اودھ کھلی چاندنی میں تیز ہوتی کال بیل نے سوئے ہوئے مکینوں کو ہر بڑا دیا۔

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ دوپٹہ اس کے پیروں میں آ گرا تھا۔

☆ ☆ ☆

”گڈ مارنگ بلی۔“

وہ بڑی سرعت سے آلیٹ بنا بنا کر بڑی سی پلیٹ

میں رکھ رہی تھی، جب عقب میں آواز سن کر پلٹی۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں ملبوس ایک ہاتھ میں سگار دبائے فریش موڈ کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے۔

”گڈ مارنگ۔“ وہ مسکرائی۔ وہ آج بھی ویسے کے ویسے تھے شان دار اور چھابانے والے۔

”اس گھر میں پہلی صبح آپ کو خوش آمدید کہتی ہے۔“ وہ شرارت سے گویا ہوئی۔

”وہ تھینک یو لیڈی۔“ انہوں نے سر کو ہلکے سے خم کیا۔

”ناشتے میں کیا لیں گے؟ دیے آپ اتنی صبح کیسے اٹھ گئے؟“

”رات بھر نیند ہی نہیں آئی کئی ملے گی؟“

”ٹائمنگ کا فرق ہے نا۔“ اس نے آخری آلیٹ پلیٹ میں نکالا اور کینٹ کھول کر کافی کے لوازمات نکالنے لگی۔

”تم اپنا کام سیٹو، میں بنالیتا ہوں۔“

”میں بنا دیتی ہوں۔“ وہ جانتی تھی اگر کسی نے ذکی کو یوں پہلی صبح کچن میں کام کرتے دیکھ لیا تو اس کی خیر نہیں پھوہڑ بن کر مر لگ جائے گی۔

”مجھے کافی صرف اپنے ہاتھ کی اچھی لگتی ہے۔“

ذکی نے مک اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا اور پوچھنے لگے۔

”باقی لوگ اٹھے نہیں۔“

”اس گھر میں اگر کوئی کام کی بندی ہے تو وہ میں ہوں۔“ اس نے فخر سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ”اب یہی دیکھ لیں۔ صبح نماز کے فوراً بعد سب کو بیڈنی پر لٹا دیتا ہوں۔“

میرا کام ہے ناشتے کے اتنے ڈیڑھ مارے لوازمات بنانا کسی اور کے بس کی بات کہاں۔ اور۔۔۔“

وہ آلیٹ کے بعد اب دلیہ بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔ بات کرنے کے انداز میں بلا کی روانی اور بے ساختگی تھی۔ اک نپے تلے مائل سے نکل کر خالص پن اور جوش بڑے عرصے کے بعد نصیب ہوا تھا۔

وہ گھونٹ گھونٹ کافی پیتے پچسے سنتے رہے۔ اسے بولنے کا شوق تھا اور کافی ختم ہونے تک ذکی کو

خاندان کے بارے میں وہ ساری معلومات مل گئیں جو آج تک فون پر نہ مل سکی تھیں۔

”یہ کس کے لیے؟“ اس نے ٹرے میں صرف دلیہ اور دو دھتی کا مک رکھا تھا۔

”گل آبی کے لیے۔“ انہیں رات سے بہت تیز بخار ہے، دوا کھانا ہے۔“

”سنو! یہ بڑی اماں نے تمہاری گل آبی کی شادی کیوں نہیں کی ابھی تک؟“ بڑی سرعت سے سوال کیا گیا۔

بیلا نے ایک لمحے غور کیا، پھر لاعلمی سے کندھے اچکا دیے اور ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی جبکہ وہ خالی مک

تک میں رکھتے کچن کے اس دروازے پر آگئے، جو پچھلی طرف کھلتا تھا۔ لیموں کی ہلکی ترش مہک لیے

سید کلیاں، انار کے نارنجی پھول اور زرد چنبیلی۔ ہوا تیز تھی اور میچے ان پھولوں کا ایک فرش سا بچھا تھا اور وہ

جھولا جس کی ہر ہر کڑی کو زنگ کھانے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے اس جھولے کے پاس آکھڑے ہوئے۔

ان کے ارد گرد ان کا بچپن کھیلنے لگا۔ انہیں ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ بیمار گل کی مزاج پر سی ہی کر آئیں۔

یہاں تک کہ فیضان انہیں ناشتے کے لیے بلانے آگئے۔

☆ ☆ ☆

اگلے کچھ دن خاصے ہنگامہ خیز رہے۔ ذکی کی وجہ سے نت نئے پروگرام بنے۔ انواع و اقسام کے کھانے بنے۔ وہ سب کے لیے مختلف تحائف بھی لائے تھے۔

ایک عدد شان دار موبائل بھی۔ مگر وہ سیل فون عاشق کے لیے تھا، جو بھائی کی آمد کا سن کر محض دو گھنٹے کی

پہنسی لے سکا تھا۔ وہ بیلا کو ڈھونڈتا بڑی امی کے کمرے میں آیا۔ وہ گل کا سردیاری تھی۔ عاشق کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ بظاہر لا پروا نظر آنے والی لڑکی

سب کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ وہ دوسری طرف بیٹھ کر گل کی خیریت پوچھتا، کن اکھیوں سے بیلا کا پھولا

ہوا منہ دیکھ رہا تھا۔ وہ جب سے آیا تھا، بیلا یوں ہی

ناراض تھی۔ آخر اسے پوچھنا ہی پڑا۔

”یہ تم نے ناراض ملی جیسا منہ کیوں بنایا ہے؟“

بیلا نے غصے سے اسے گھورا۔ ”تم چیخو ہو۔“

”میں نے کسے چیخا کیا ہے؟“ وہ حیران ہوا۔

”تم نے ذکی بھائی سے سیل فون کی فرمائش کی مگر اپنے لیے۔ تم کتنے خود غرض ہو۔“ وہ غصے سے بول رہی تھی اور عاشر مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

گل صورتور نے دونوں کو ایک نظر دیکھا۔ پھر لاطعلقی سے چادر منہ تک کھینچ لی، عاشر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا اور ذرا آگے کو جھکتے ہوئے اس کی گود میں ڈال دیا۔ بیلا نے تحیر سے موبائل کو، پھر اسے دیکھا۔

”ہاں تم رکھ لو۔“

”نہیں، میں نہیں رکھ سکتی۔“

”رکھ لو، تمہیں اپنے منگیتر کے ساتھ لمبی لمبی باتیں نہیں کرنا کیا؟“

”بد تمیز مذاق اڑاتے ہو، میں نے تو یوں ہی ایک بات کی تھی۔“ وہ موبائل کو الٹ پلٹ رہی تھی، پھر مایوسی سے اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ بہت خوب صورت اور قیمتی ہے۔ میرے پاس کسی نے نہیں چھوڑنا۔ کوئی نہ کوئی لے لے گا۔“

”اودھ۔ تو پھر تم اپنے فیانی سے باتیں کیسے کرو گی؟“ وہ مصنوعی فکر مندی سے کہنے لگا۔

”تمہیں میرے فیانی کی اتنی فکر ہے تو اپنا پرانا موبائل مجھے دے دو، یہ تم رکھ لو۔“ اس نے آرام سے حل نکالا۔

”واقعی۔“

”ہاں۔“ کسی کو اعتراض بھی نہ ہو گا۔ میں کہوں گی، عاشر کے پاس فالتو رکھا تھا، اس نے مجھے دے دیا۔“ وہ خوش ہو کر بولی تو عاشر اک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

”میں تمہیں فالتو چیز نہیں دینا چاہتا دوست۔ پر اس وقت یہ ہی مناسب ہے۔“

شام کو وہ عاشر کے پرانے موبائل میں نئی سم ڈالے

اترا تلی پھر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

”جب سے گل کا بخار اتر رہا ہے بالکل ہی خاموش ہو گئی ہے۔“ تائی اماں فکر مندی سے کہہ رہی تھیں وہ جو تیل کی شیشی اٹھائے بال بکھرائے چلی آ رہی تھی فوراً ہی بول اٹھی۔

”وہ تو ہمیشہ ہی کم بولتی ہیں تیل لگا دیں۔“ اس نے ماں کی طرف شیشی بڑھائی۔

انہوں نے ”خاکم بدہن“ سے نظریں اٹھا کر پہلے آپا کو ایک ہونے نوازا پھر اسے حکم دیا۔

”گل سے لگو الو۔“

”آپ کا صبح پرچہ ہے؟“ وہ چڑ کر بولی تو انہوں نے گھور کے اسے دیکھا۔

”ساری عمر لگادی اس گھر کو سنبھالنے، مہمان داری اور تم لوگوں کو پالنے پوسنے میں تمہارے اسکولوں، کالجوں کے مسئلوں سے نمٹنے نمٹنے اس عمر میں اپنے شوق کی تسکین کرنے لگی ہوں تو بیٹی کو تکلیف ہو رہی ہے۔“

”چھالے تائی امی! آپ تو خیر ساری زندگی عیش ہی کرتی رہیں۔“ وہ ابھی تک گل کی چپ میں الجھی تھیں سو جواب نہ دیا البتہ ماں کی اک سنبیہ بھری نگاہ نے وہاں سے کھٹکنے پر مجبو کر دیا۔ گل ہاتھ میں فریم لیے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ پیلانے محسوس کیا وہ گل سے اسی ایک پھول پر آئی تھیں۔

”گل آئی! کیا ہوا ناںکا بھول گیا۔“ وہ جان بوجھ کر زور سے بولی تو گل چونک گئی پھر سر جھکا کر پھول کو گھورنے لگی۔

(دھیان کا ایک ناںکا بھی غلط لگ جائے تو جذبول کے پھول بے وقعت سے لگنے لگتے ہیں۔)

”کتنا خوب صورت دوپٹہ ہے نا۔“ پیلانے شیشی ایک طرف رکھی اور اس کا دوسرا پلو اٹھا کر دیکھنے لگی جو مکمل ہو چکا تھا۔ وہ یہ دوپٹہ زبا کے جینز کے لیے بنا رہی

تھیں۔

”ایسا ایک دوپٹہ اپنے جینز کے لیے بھی کاڑھیں۔“ اس نے عجیب سی فرمائش کی۔

”سرخ دوپٹے ہر کسی کا نصیب نہیں ہوتے پیلانے تمہارے لیے بنا دوں گی۔“

”خوا مخواہ۔“ پیلانے چمک کر کہا اور پھر اک عجیب سی حرکت کی۔ وہ سرخ دوپٹے کا پلو ان کے سر پر ڈال چکی تھی۔

”ارے واہ! آپ تو بتا سنگھار کے بھی دلہن لگتی ہیں۔“ وہ کھلکھلائی۔

گل اپنی جگہ ششدر سی رہ گئی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا چاہا پھر چہرے کا رنگ بالکل زرد ہو گیا۔ میٹھیوں کے کنارے ذکی کھڑے ان ہی کو دیکھ رہے تھے۔

سادہ نے اپنی چنری رنگ سازی گود میں پھینکی اور کہنے لگی۔

رنگ سازی میری چنری سرخ رنگ نہ رنگنا کہ سرخ ملن کا رنگ۔

اور میرا ریتیم سمندر پار ہے۔

اے رنگ سازی! میری چنری لا جو ردی نہ رنگنا کہ لا جو رد امید کا رنگ۔

اور میرے ساجن نے نہ لونے کی قسم کھائی ہے۔

ہاں! اسے سرمئی رنگ دے کہ سرمئی جبر کا رنگ۔

اور یہ ہی میرا سنگھار ہے۔

”دیکھا ذکی بھائی! گل آپ کی کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔“

”کیسی ہو گل! تمہارا بخار اتر گیا؟“ وہ عام سے لہجے میں کہتے قریب آئے۔

سرخ آچل ڈھلک کر گل کی گود میں آگرا وہ گہرا کر اپنا سرمئی دوپٹہ ٹھیک کرتی منہ ہی منہ میں بدیدائی۔

”ٹھیک ہوں۔“ پھر تیزی سے اٹھ کے کچن میں چلی گئی۔

”یہ تمہاری گل آپ کی کچھ بدل نہیں گئیں۔“ انہوں نے

نے وہ ہی دوپٹہ ہاتھ میں لے کر ادھورے پھول کی خالی پتی پر انگلی پھیری۔

”نہیں بچپن سے ایسی ہی ہیں۔“

”کس کے بچپن سے۔“

”میرے بچپن سے۔“ وہ ہنس دی۔

”اچھا۔“ تم بھی بچپن سے ایسی ہو۔“ انہوں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے شرارت سے پوچھا۔

”میں بچپن میں خاصی شریف ہوا کرتی تھی۔“

”اچھا تو اب؟“

”دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔“

کچن میں کانچ کا گلاس گل کے ہاتھ سے پھسل گیا۔

رات کو سفیان اور فیضان نے ذکی کو گھیر لیا۔

”سچ بتاؤ شائستہ نے تمہیں پاکستان آنے کی اجازت کیسے دے دی؟“

”مجھے اس کی اجازت کی ضرورت نہیں۔“

”جانے دو خوب جانتے ہیں تم کتنے پانی میں ہو۔“

”بھئی یہاں میری ماں ہے تم لوگ ہو میں بھی بھی آسکتا ہوں۔“

وہ اطمینان سے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے جو ابھی ابھی پیلا دے کر گئی تھی۔ اس کا ارادہ تو بیٹھنے کا تھا مگر فیضان کی گھوری نے اٹھنے پر مجبور کر دیا مگر دروازے سے کان لگانے پر اسے کون روک سکتا تھا۔

موضوع ہی ایسا تھا۔

”ماں ہمیشہ سے یہیں ہے اور میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں شروع سے خود غرض واقع ہوئے ہو۔ سچ بتاؤ ماں سے کون سا کام آن پڑا؟“

فیضان نے صاف صاف بتا دیا۔ مزید لقمہ سفیان نے دے دیا۔

”ہاں۔ شائستہ بھی اسی کی کالی ہے بنا مطلب کسی سے ہاتھ ملانے کی روادار نہ ہوتی تھی۔“

”یار! تم لوگ تو پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔“

”تم سچ اگل دو۔“

ذکی نے ایک نظر دونوں کو دیکھا پھر اک طویل سانس لے کر مگ رکھ دیا۔ گویا اب فرار ممکن نہ تھا۔

”دوسری شادی کرنے آیا ہوں۔“

دونوں نے تحیر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پیلانے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ کر باہر نکلتی آواز کا گلا گھونٹا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ شائستہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”مگر میڈیکل سائنس بہت ترقی کر چکی ہے ٹیسٹ ٹیوب بلی۔“

”نسب کچھ کر چکے ہیں۔“ ذکی نے تحمل سے بات قطع کی۔ ”مگر کچھ ایسی کمپلیکشنز ہیں کہ کچھ بھی ممکن نہیں۔“

”تو کوئی بے بی ایڈاپٹ کر لو۔“ کچھ دیر کے بعد سفیان نے مشورہ دیا۔

”وہ میرا خون ہوگا؟“ ذکی نے پوچھا تو وہ خاموش ہو گئے۔

”شائستہ جانتی ہے؟“

”ہوں۔۔۔ اس کی اجازت کے بغیر ممکن ہی کہاں ہے۔“

کچھ لمحے خاموشی ہی چھائی رہی گویا ہر کوئی اس معاملے کے ہر پہلو پر غور کر رہا تھا پھر سفیان نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے پھر یہ ہی مناسب ہے پھر تم دو بیویاں افورڈ بھی کر سکتے ہو ڈھونڈ کوئی اچھی سی لڑکی۔“

بلی تھلے سے باہر آچکی تھی اور پیلانے کے ہاتھ اک گرام گرم خبر وہ بکٹ بھاگ لی۔

کچن میں تائی کڑھی بنا رہی تھیں۔ اماں حسب معمول اپنے کمرے میں نماز میں مصروف۔ پیلانے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ماں نے نماز ختم کی تو پیلانے سوال کیا۔

”نماز پڑھ لی؟“

وہ آئیں بائیں شاٹل کرنے لگی۔

”پچھا کتنیوں کی طرح کن سوئیاں لینے سے

فرصت ملے تو نماز کا خیال آئے۔

”افسس پچھانچا کتنی تو نہ کہیں۔“ وہ تڑپ اٹھی۔
”اگر میں نہ ہوں تو آپ لوگوں کو خبر بھی نہ ہو کہ گھر میں ہو کیا رہا ہے؟“

”آج ہماری بیٹی کے پاس کون سی خبر ہے۔“ تائی ائی دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی آگئیں۔
”اسے اتنی شہ مت دیں یہ حرکتیں اچھی نہیں سرال میں۔“

”آنے والے ہر خطرے کے لیے تیار رہوں گی۔“
بیلا نے فخر و لاروائی سے جملہ مکمل کیا، پھر تائی کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھالیا۔

”پتا ہے ذکی بھیا پاکستان کیوں آئے ہیں۔“
”اللہ جانے“ یوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ بیٹھا ہے گویا واپسی کا ارادہ ہی نہیں۔“ تائی کے لہجے میں بے زاری تھی۔

”دوسری شادی کے لیے۔“ اس نے دھماکے کے ساتھ پوری تفصیل سنائی۔
”دونوں خواتین کم صم ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ پھر امی نے سنبھل کر بیٹی کو دیکھا اور آہستگی سے کہنے لگی۔

”بیلا! نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے پڑھ لو۔“
وہ یہ روکھا پھیکا رد عمل دیکھ کر بد مزہ ہوتی وضو کے لیے اٹھ گئی۔

کون سی رات تیرے نام لکھوں
جنوری کی صبح روشن کہ فروری کا بھرتا جوین
مارچ کھلا کھلا سا کہ اپریل دھلا دھلا سا
مئی کی آگتی ہوئی دھوپ کہ جون کا چھٹنا ہوا
سکوت

جولائی کا سرچڑھتا ہوا سورج کہ
اگست میں غلامی کا ڈھلتا ہوا سورج
ستمبر میں جنم لیتی کوئی خواہش کہ
اکتوبر میں پیار کی بارش

نومبر کی ساری رعنائیاں کہ دسمبر کی تنائیاں
کون سی رات تیرے نام لکھوں

وہ آرام سے بید پر دراز اپنی فرزند ارم کے میسج پڑھ رہی تھی، اک انجان نمبر سے ایسا میسج پڑھ کر چونک کر سیدھی ہو گئی۔

”ارے۔۔۔ دیکھو زیبا۔“ اس نے کمپیوٹر پر مصروف زیبا کے آنکھوں کے سامنے موبائل لہرایا۔
زیبا نے اک سرسری نگاہ ڈالی۔

”ایسے میسج آتے ہی رہتے ہیں۔“
”کوئی بنا جانے خواہ مخواہ بھیج رہا ہے، خواہ فون کسی واڈی مل کا ہو؟“

زیبا مصروف ہو چکی تھی مگر وہ پہلا پیغام نہ تھا۔ ہر صبح گڈ مارنگ اور ہر رات گڈ نائٹ کہتا نہ بھولتا اور پیغام بھی اتنے خوب صورت آچھوتے اور رومینٹک ایک دن تنگ آکر بیلا نے جواب دیا۔

”میں واڈی ہوں۔“
”کس کی؟“ ”جولہا“ ”وریاقت کیا گیا۔“
”ظاہر ہے کہ پتے پوتے پوتیوں کی۔“

”ماشاء اللہ! ویسے خاصی اچھی کھینڈ واڈی ہیں، کھٹ کھٹ جواب لکھ رہی ہیں۔“ بیلا کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا تو ذرا ٹھہر کر لکھا۔

”ہاں اچھے وقتوں میں میٹرک کیا تھا۔“
”لوہ تب ہی ورنہ ہمارے ابا کو تو سیل پر ایک لفظ لکھنا نہیں آتا۔“

”تو ابا کو پڑھا لینا تھا۔“ اس نے چڑ کر لکھا اور موبائل سر ہانے ڈال دیا۔ وہ بہت دیر تک بیل دیتا رہا۔
بیلا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بات شروع ہی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ اس نے چور نظروں سے زیبا کو دیکھا اور موبائل آف کر دیا۔ جس کا خمیازہ یوں بھگتا رہا کہ نماز قضا ہوئی۔ بڑے ابا کو چائے نہ ملی۔ ابو کے لیے ناشتا امی کو بنانا پڑا اور ذکی کے سامنے اچھی خاصی جھاڑا لگ پڑی۔

”تم کیوں منہ پھلائے بیٹھی ہو۔“ ہاتھ میں گاڑی کی چابی لیے ذکی تیار شیار باہر نکلے اسے دیکھا تو رک

گئے۔

”اس گھر میں میری کوئی قدر نہیں۔“
”ارے بھئی، ہم جو ہیں اس شہزادی کے قدروان، چلو آؤ اس کریم کھلا لاؤں۔“ وہ وہیں بیٹھی رہی۔

”کم آن بے لی۔“ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا پھر چونک کر اس کا ہاتھ دیکھنے لگے۔
”کیا ہوا؟“

”تمہارے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں۔“ انہوں نے دوسرا ہاتھ تھامنا چاہا، مگر بیلا نے جھینپ کر کھینچ لیا۔ بھلا اس گھر میں ایسی بے باکی کی گنجائش کہاں تھی۔

”آپ آؤں کریم گھر لے آئے گا، سب کے ساتھ مل کر کھائیں گے۔“ اس نے سادگی سے کہہ کر ان کی توجہ خود سے ہٹائی۔

”نہ جانے کیوں وہ غور غور سے دیکھ رہے تھے۔“
”گویا میری جیب کا کبڑا اگڑاؤ گی۔“
”اتنی کج بوسی تھوڑے ڈاکر کما لے ہیں؟“

”لوکے، صرف تمہاری خاطر۔“ وہ ہاتھ ہلا کر چلے گئے، بیلا حیران سی سوچتی رہ گئی۔
”میری خاطر کیوں؟ چلو کسی کو تو ہماری قدر ہے۔“

اسے از سر نو صبح والی ڈانٹ یاد آگئی تھی۔

”کتنے اچھے اچھے کپڑے یوں ہی پڑے پرانے ہو جاتے ہیں۔ ایک تو ہمارے ہاں کوئی فنکشن بھی نہیں آتا۔“ ساری الماری کے کپڑے بید پر ڈھیر تھے اور وہ سیاہ کلیوں والی فرائڈ خود سے لگائے افسوس کر رہی تھی۔ ایک ڈیزائن تخلیق کرتی زیبا نے اسکرین سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تمہیں ہی شوق تھا گھر بیٹھنے کا۔ میرے ساتھ ایڈمی جوائن کرتیں تو سارے کپڑے کام آجاتے۔“
”چھوڑو میں ایسے ہی ٹھیک ہوں، عاشر کہتا ہے۔“
”یہ عاشر تم سے کچھ زیادہ ہی نہیں کہتا۔“ زیبا نے شرارت سے پوچھا۔ وہ سٹپٹائی۔

”تمہیں پتا ہے ہم بچپن ہی سے۔“

”مس بیلا! اب آپ بڑی ہو گئی ہیں۔ تھوڑا اپنا زاویہ نگاہ وسیع کر کے دیکھیں، چیزوں کی ماہیت اور لوگوں کی حیثیت بدل رہی ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو۔“
”ذکی بھائی سے زیادہ فری مت ہو، کل تم ان کے ساتھ کچن میں بڑا بیک کر رہی تھیں۔ چھوٹے ابا وہاں گزرے تھے۔ مجھے لگا انہیں اچھا نہیں لگا۔“

”اچھا۔“ وہ ایک دم خفیف سی ہو گئی۔
”وہ تو بہت عرصہ باہر رہ کر آئے ہیں اور ہمارے ہاں اتنی بے تکلفی بھائیوں کے ساتھ بھی نہیں ہوتی۔ ہاں، عاشر کی بات اور ہے۔“ وہ پھر سے شوخ ہوئی۔ بیلا نے

آخری بات پر غور نہیں کیا۔ وہ پہلی میں ہی الجھی تھی۔ تب ہی ہلکی دستک کے ساتھ ذکی اندر آئے۔ بیلا کو ایک دم جھنجھلاہٹ نے گھیر لیا۔

”لگتا ہے آپ کو کوئی اور کام نہیں ہے، سوائے اوھر اوھر گھومنے کے۔“ قصور ان کا نہیں تھا۔ وہ تو دستک دے کر آئے تھے۔ وہ ہی کپڑوں کے ڈھیر میں دوپٹے گم کر بیٹھی تھی اور اب کلی فراک پٹے کی طرح لپیٹے کھڑی تھی۔

”کیوں کیا ہوا؟“ وہ ہٹھکتے گئے۔
”کچھ چاہیے؟“

ذکی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ماتھے پر شکن سی ابھری اور وہ ”کچھ نہیں“ کہتے چلے گئے۔

”اب اتنا روڈ ہونے کو بھی نہیں کہتا تھا۔“ زیبا کی بڑبڑاہٹ پر اس نے چڑ کر فراک پٹے کی اور اپنا دوپٹہ ڈھونڈنے لگی۔ آخری کپڑا تہ کر کے الماری میں رکھنے تک اک ہلکی سی پشیمانی کا احساس شدت اختیار کر گیا۔

اسے مہمان کے ساتھ اس طرح پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ تب ہی شام کو خاص طور پر بڑا نقل بنا کر اوپر لے گئی۔ ذکی فون پر بات کر رہے تھے اور پھوپھو کچھ

تصور میں ہاتھ میں لے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے فون بند کر کے اچھتی سی نگاہ اس پر ڈالی تو وہ جلدی سے بولی۔

”تو بھائی، عاشر کہتا ہے۔“ ہاتھ میں گاڑی کی چابی لیے ذکی تیار شیار باہر نکلے اسے دیکھا تو رک

”آپ کے لیے ٹرائفل لائی تھی۔“

”فرق میں رکھ دو، ٹھہر کر کھالے گا اور شائستہ کیا کہہ رہی تھی؟“ پھوپھو اس سے کہہ کر ذکی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”کچھ نہیں۔“ ذکی نے ٹالا۔

وہ ٹرائفل فرق میں رکھ کر وہیں بیٹھ گئی۔

”بتاؤ بھلا کیا کمی ہے ان لڑکیوں میں اس کی نظر میں کوئی ساقی ہی نہیں۔“ بیلا نے ایک تصویر اٹھا کر دیکھی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی اور نیچے کسی کو خبر ہی نہیں۔

”بتاتے کیوں نہیں۔“

انہوں نے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر لبوں میں دبائی اور لائٹر کی تلاش میں نیبل پر نگاہ دوڑائی۔ وہ بیلا کے داہنی طرف رہا تھا۔ اس نے اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا جسے ایک خشک سے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا گیا۔

”پی! میں جس سے بھی شادی کروں گا ساتھ لے کر نہیں جاؤں گا وہ یہیں رہے گی آپ کے پاس سو جو بھی ہو وہ باہر جانے کا خواب ساتھ لے کر مت آئے۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولے۔

یہ شائستہ کی شرط ہے؟

وہ ایک بل کو خاموش ہو کر سگریٹ سلگانے لگے۔ ”لیکن اس طرح کیسے چلے گا؟“ انہوں نے بیلا کو دیکھا۔

”میں چکر لگا رہی ہوں گا۔“ وہ لاپرواہی سے بولے۔ ”جیسے پہلے لگاتے رہے ہو۔“ پھوپھو نے طنز کیا۔ ”اسی لیے تو کہتا ہوں ایسی تو ہو کہ واپس آنے کو دل چاہے۔“ ان کے لہجے میں شرارت ور آئی۔ بیلا نے چاروں تصویریں اٹھا کر غور سے دیکھیں۔ اسے تو اچھی ہی لگیں۔

”ان میں کیا خرابی ہے؟“

انہوں نے کچھ لاپرواہی سے تصویریں اس کے ہاتھ سے لے کر نیبل پر ڈال دیں۔ بیلا کو بہت برا لگا۔ وہ اسے مسلسل نظر انداز کر رہے تھے۔

وہ کھڑی ہو گئی۔ تب ہی فیضان تیزی سے اندر آئے۔

”ذکی! فارغ ہو تو میرا اک کام تو کرو۔ سونیا کو اس کی امی کے ہاں سے پک کرنا ہے میں ذرا بڑی تھا اگر تمہیں۔“

ذکی نے چابی ان کے ہاتھ سے لی۔ دونوں باتیں کرتے باہر نکل گئے۔ پیچھے وہ رہ گئی پھوپھو کے دکھڑے سننے کے لیے۔

ذکی کو دیکھ کر سونیا کے چہرے پر جھنجھلاہٹ سی چھا گئی۔ وہ یقیناً فیضان کی منظر تھی گھر میں کچھ مہمان تھے۔ وہ غالباً ان ہی سے فیضان کو ملوایا جاتی تھی۔

تب ہی واپسی کے سفر میں خاموش سی تھی۔ ذکی نے ایک اچھٹی سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ ابھی ابھی اس کے گل نما گھر سے نکلا تھا۔ اس کی انتہائی ملامتوں مگر گریں فل ماں سے ملا تھا۔ سونیا کا اسٹیشن اس کے سامنے تھا۔

”فیضان نے زندگی میں بس ایک ہی کام ڈھنگ کا کیا ہے؟“ سونیا نے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔

”آپ سے شادی۔“ ذکی کے کہنے پر سونیا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”آپ دونوں کے اسٹیشن میں بہت فرق ہے۔“ ذکی کا لہجہ مختاط سا تھا۔

”یہ فرق تو آپ کے اور شائستہ کے مابین بھی ہے۔“ ذکی نے چونک کر سونیا کو دیکھا پھر ہلکی مسکراہٹ لبوں پر پھیلی۔

”آپ تو خاصی باخبر ہیں بھابھی!“

”رہتا پڑتا ہے۔“

”لیکن میں ایک بات نہیں سمجھ سکا۔ فیضان کو کنویں سے نکالنے کے بجائے آپ تو خود کنویں کی مکین بن گئیں؟ یہ تو محل سے جھوپڑے تک کا سفر ہے۔“ کبھی کبھی محل وہ خوشیاں نہیں دے پاتے ذکی

بھائی! جو۔“

”جانے دیں۔ زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے۔ پیچھے ہٹنے کا نہیں اور یہ ہی بات میں فیضان سے بہت بار کہہ چکا ہوں۔“

”وہ اپنی فیملی سے بہت کمینڈ ہیں۔“

”ہر گولی ہوتا ہے اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان آگے بڑھنا ہی بھول جائے توویری فرینک پی! یہ رشتے ناتے ہمارے لیے اتنے ہی اہم ہونے چاہئیں جتنا کہ ہم کو فائدہ پہنچا سکیں۔“ انہوں نے احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔ سونیا الجھ سی گئی۔

”آپ کے خیالات بہت عجیب ہیں۔ بالکل مٹی سے اب پتا چلا کہ آپ سے مل کر اتنا خوش کیوں ہوئی ہیں۔“

”شی! انوری ہائس دوس۔“ وہ مسکرائے۔

لی وی چل رہا تھا مگر سب باتوں میں مگن تھے۔ وہ کسی کو لینے والی کرسی پر دو ٹول پاؤں اوپر رکھے موبائل میں کچھ تھی۔ ساری مسیبتیں رابطے میں تھیں۔ بیبا اس کا کپ قریب ہی نیبل پر رکھ گئی۔ ذکی اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔

”یار! تم لوگ ترقی کرتا ہی نہیں چاہتے ہو۔ کنویں کا میڈیک بن کر رہ گئے ہو۔ اس ملک کے حالات دیکھ رہے ہو، منگانی، اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ روٹی وال کے چکروں میں پڑ کر رہ گئے ہیں۔ کاروبار کا کوئی حال نہیں، نوکری کی کوئی گارنٹی نہیں، آج قناعت کر کے بیٹھے ہو کل کا کیا ہو گا؟“

”یار! تم ٹھیک کہہ رہے ہو، پر کیا بھی کیا جاسکتا ہے۔“ سفیان بھائی نے کندھے اچکائے۔

”کچھ کرنے کی ٹھان لو، تب ہی رستے کھلیں گے۔“ اہماتم بتاؤ کل کو تم لوگوں کی اولادیں بڑی ہوں گی، ایک ایک بیڑ روم والے اس گھر میں گزارا ہو جائے گا، اس گھر کے حصے بخرے ہوں تو تم لوگوں کے ہاتھ اتنا ہی نہیں ہو گا کہ اپنے لیے ڈھنگ کا ایک گھر خرید

سکو۔“

”اللہ نہ کرے جو اس گھر کے حصے بخرے ہوں۔“ بڑی امی تڑپ اٹھیں۔

”پتا نہیں ذکی بھائی کی سوچ اتنی مادیت پرست کیوں ہے۔“ وہ کچھ جڑ کر اور کچھ اکٹا کر اپنا کپ اٹھائی باہر نکل آئی۔ باہر ہلکی چاندنی رات پھیلی تھی اور برآمدے میں گل صنوبر عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی۔

”یا اللہ! ایسا جذب مجھے بھی نصیب کر۔“

تب ہی مسیح ٹون بج اٹھی۔ وہ ہی انجان نہرو اب اتنا بھی انجان نہیں رہا تھا۔

اپنے ہونٹوں سے سجانا چاہتا ہوں

آجے میں گنگنا چاہتا ہوں

تھک گیا میں کرتے کرتے یاد تجھ کو اب تجھے میں یاد آنا چاہتا ہوں ”توبہ! یہ تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔“ اس نے جلدی سے ڈیلیٹ کر دیا پھر عاشر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ بہت دن ہوئے اس سے بات نہیں ہوئی تھی مگر اس کا نمبر بند تھا۔ تب ہی اس کے عقب میں اک سایہ سا لہرایا۔ وہ ایک دم گھبرا کر سیدھی کھڑی ہوئی۔

”ذکی بھائی! آپ نے تو مجھے ڈرا دیا۔ اتنا دسے پاؤں آنے کی کیا ضرورت تھی۔“

وہ خاموشی سے سگریٹ سلگاتے رہے۔

”آپ ابھی تک ناراض ہیں۔“ انہوں نے اک طویل کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا تو وہ ناک چڑھا کر بولی۔

”مجھے آپ کا سگریٹ پینا بالکل اچھا نہیں لگتا۔“

”چھوڑ دوں؟“ انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”جی۔۔۔“ وہ متحیر سی ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ”سگریٹ چھوڑ دوں؟“ ”مرضی ہے۔“ بیلا نے جھک کر کپ اٹھایا اور اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

وہ ان کی پشت کی طرف ذرا دیر کوری۔
”یہ سچ ہے کہ میں اپنی انسلٹ کبھی نہیں بھولتا
لیکن میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔“
وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

گل نے سلام پھیرا تو نگاہ ان پر ٹھہر گئی۔ وہ خاموش
کھڑے سگریٹ کو سلگتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ انہیں
احساس ہی نہ تھا کہ ان کے داہنی طرف کوئی اور
ذاتی نفس بھی موجود ہے۔
گل صنوبر نے دعا کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

گھٹا گھٹا گھور گھور

مور مچاؤے شور

مورے جن آجا

کیل کے دور میں نہ جانے کون تھا جو بی بی وی پر
نیو نور کو سن رہا تھا۔ اور وہ بھی کہ دونوں پاؤں جھولے پر
رکھے سر جھولے کی پشت سے ٹکائے اپنے وجود پر
بونڈوں کی گدگد اہٹ محسوس کرتی سر سے آواز ملا
رہی تھی۔ ابھی کل ہی تو گمری سے گھبرا کر اس نے زبا
سے کہا تھا۔ ”نند بھائی سے کوئی تھوڑے بادل ہمیں
بھی بھجوا دیں۔“

اس کا پیغام غالباً ”براہ راست اللہ میاں تک پہنچا
تھا۔ تب ہی تو آنکھ بادلوں بھری صبح میں کھلی اب وہ
تھی اور برستی بوندیں۔ گل صنوبر کو پادش سے الرجی
تھی، سوماں کے کمرے میں جا کھسی تھی اور جھولے پر
بیلا کا قبضہ تھا۔ اپنے عقب میں کھلی کتنی ہی کلیاں توڑ
کر اپنے آئینل میں جمع کر لیں جن کی خوشبو مٹی کی
خوشبو سے ہم آہنگ ہو کر مشام جاں کو مہکانے لگی
تھی۔ اس نے اک زرد کلی بالوں میں سجاتے ہوئے
فالے کے پیر کو دیکھا۔

فالہ ابھی کچا تھا۔ بچپن کی ایک میٹھی سی یاد نے
اس کا ہاتھ چوم لیا۔

اسے خبر ہی نہ تھی کوئی تھا جو بہت دیر سے اس کے
وجود کی رعنائیوں کو اپنی آنکھوں میں سمور رہا تھا۔ وہ بس

خود میں گم خود ہی مزا کر رہی تھی۔ تب ہی اوپر کی کدلی
کھلی اور زبیا نے جھانکا۔
”اے لڑکی! نند کا گفٹ ملا؟“
”مجھے نہیں پتا تھا، قدرت بھائی کا اس حد تک

ساتھ دیتی ہے۔“ وہ پکاری۔

”اچھا سنو، آج ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں فنکشن
ہے تمہاری بلیک فرائڈ پرین رہی ہوں۔“ پیغام کے
ساتھ ہی کھٹ سے کھڑکی بند۔

”ہائے نہیں۔“ وہ ایک دم جھولے سے کدلی
ہوئی۔ ساری کلیاں سبز گھاس پر بکھر گئیں۔

”زبیا! خبردار جو میری فرائڈ کو ہاتھ لگایا۔“

وہ پچھلے دروازے سے اندر کی طرف بھاگی۔ اس
کے لیے پاؤں برآمدے، پگن اور لاؤنج تک نشان
بناتے چلے گئے اور سیڑھیوں سے ایک قدم پہلے وہ بری
طرح کسی سے ٹکرائی۔ بلکہ اس آفراتفری میں کسی
اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ نہیں سانسے والا اس
ٹکرایا ہے اور ساتھ ہی اسے گرنے سے بچانے کے
لیے تھام بھی لیا۔

ایک ٹائیپے کو وہ حواس باختہ ہوئی۔
”اول ہوں اگر چوٹ لگ جاتی۔“

بیلا کی ساری حسات ایک دم چوکنہ ہوئیں وہ کسی
کے حصار میں تھی، مگر اس حصار میں نہ حفاظت تھی
نہ پناہ۔ ایک ٹائیپے کو دانستہ طول دے کر لمحوں پر مہیا
کرنا حصار۔ وہ ٹرپ کر اس کی گرفت سے نکلی اور
خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”کیا ہوا؟“ وہ بلا کا ادا کار تھا۔ ایک ہی بل بس اور
ذکی کا بت پاش پاش ہو کر قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ وہ اس
کے پہلو سے نکلتی سیڑھیاں پھلا نکلتی چلی گئی۔
ذکی کے لبوں پر محفوظ سی مسکراہٹ بکھری۔

یہ زرد چنبیلی کی خوشبو تھی یا کنوارے وجود
پھوٹی۔

ان کی گمری سانس وہی اٹک گئی۔
لاؤنج کے کھلے دروازے میں شائستہ ساکت سی
نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”شائستہ! تم؟“ وہ سامان کھینچتی عین ان کے
سامنے آکھڑی ہوئی اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں
گارتے ہوئے پوچھا۔
”یہ کیا ہو رہا تھا ذکی؟“

”کیا بات ہے، تم کچھ ابھی ابھی سی لگتی ہو۔“ زبیا
نے اس سے کئی بار پوچھا تھا۔ وہ کیا بتائی کتنی کترا گئی۔
ہاں امی نے بھی بڑی تشویش سے اس کا ہاتھ چھوا۔

”طبیعت ٹھیک ہے، مینا چمکنا کیوں بھول گئی۔“
اور امی وہ مجھتی تھیں کہ لڑکیاں اس عمر میں کئی

م کے فیز سے گزرتی ہیں اور اس صورت حال کا واحد
لاج مصروفیت ہے۔ سو وہ گھر کے کاموں سے فارغ
ہوتی تو کوئی نہ کوئی لان کا سوٹ دے کر بٹھا دیتیں کہ
منور سے کتنگ اور سلائی سیکھو۔ خود اس کی بھی
کوشش تھی کہ ذکی سے سامنا ہی نہ ہو۔ وحشت زدہ
ہی کی طرح چوکتا رہتی۔ وہ ایک لمحہ اس پر بہت کچھ
ملکشف کر گیا تھا۔

بھائی کہنے سے کوئی بھائی نہیں بن جاتا۔ رشتہ وہ ہی
دو خون کا ہو۔

”مگر کیوں یہ غلاظت کہاں سے ان کے ذہن میں آ
گئی۔“

شائستہ بہت دیر سے اسے چاچھی نگاہوں سے دیکھ
رہی تھی۔ گویا اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”شائستہ بھابھی! کچھ چاہیے؟“ بیلا اپنے خیالوں
سے چونکی تو وہ نظر آئی۔ شائستہ کئی میں سر ہلاتے اس
کے سامنے بیٹھ گئی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔
جن میں سرفہرست اس کی ذات سے متعلق سوالات
تھے۔

”آگے کیوں نہیں پڑھا؟“

”مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟“

”کیسے ملتی وغیرہ ہوئی؟“

یہ سچ تھا کہ شائستہ بہت خوب صورت اور چھا
ہانے والی شخصیت تھی۔ وہ کچھ نروس سی ان کے

سوالوں کا جواب دیتی رہی۔ سونیا آئی تو اس نے کچھ
سکون محسوس کیا۔ سونیا بھی اپنی مام کے ساتھ فارن
ٹریڈ پر جاتی رہی تھی۔ سو گفتگو پلٹ گئی۔ اب وہ بس
ہو نقول کی طرح ان کی معلومات کے تبادلے سن رہی
تھی۔

”شائستہ بھابھی! آپ کو پھوپھو یاد کر رہی ہیں۔“
”آئی ہوں۔“ شائستہ نے لاریوائی سے کہا اور

پھوپھو کو اچھا خاصا انتظار کروانے کے بعد اٹھی۔ سونیا
خاموشی سے بیٹھی ناخن پر لگی پالش کر پڑنے لگی۔ بلیکی
سوچ کی پرچھائیں اس کے چہرے پر چھائی تھیں۔

”کیا سوچ رہی ہیں بھابھی۔“
”مجھے لگتا ہے میں کہیں گم ہو گئی ہوں۔ میں سمجھ

نہیں پار رہی، کسی انسان کے لیے خود کو متبادل لینا کہ اپنا
چہرہ ہی اجنبی لگنے لگے کیا ٹھیک ہے؟“

”میں کچھ سمجھ نہیں پاتی۔“ بیلا نے ہونقوں کی
طرح ان کا چہرہ دیکھا۔ ”میری تو خود سمجھ میں نہیں آیا۔

تمہیں کیا سمجھاؤں۔“ وہ بے معنی سی ہنسی ہنس دی۔
”بھابھی! بہت دنوں سے آپ نے پڑا نہیں بتایا“
آج بنا میں نا۔“ بیلا نے یوں ہی ان کا دھیان ہٹانے کو

کہہ دیا۔
”آج موڈ نہیں ہے، پھر کبھی سی۔“ وہ کہہ کر چلی

گئی، بیلا کو یاد نہ تھا کہ آج سے قبل انہوں نے کبھی
کسی کی فرمائش کو یوں رد کیا ہو۔

”سب کام کاج چھوڑ کر یہاں ایک مہینے سے کیا
کر رہے ہو۔“ شائستہ نے جس طرح ذکی کے لتے لیے
تھے پھوپھو نے انگلی دانتوں میں دبالی اور شکر کیا کہ ہو

مستقل امریکہ میں رہتی ہے۔
”میں تم سے چوری چھپے تو نہیں آیا۔“ ذکی نے

جھنجھلا کر سگریٹ سلگائی۔
”ایک ماہ میں شادی تو کیا تم لڑکی بھی فاسٹل نہ

کر سکے اور چچی آپ۔“
”ارے میں نے تو بہت لڑکیاں دکھائیں، مگر یہ

ہی۔“ وہ گڑبڑا گئیں۔
”ہاں، یہ جن چکروں میں ہے اس کا مظاہرہ میں

نے آتے ہی دیکھ لیا۔ ”وہ چہاچہا کر بولی۔“

”فار گاؤسیک شائستہ! تم چاہتی کیا ہو۔“

”تمت بھولو میں نے تمہیں دوسری شادی کی اجازت دی ہے ورنہ وہاں کے قانون کی رو سے تم دوسری شادی نہیں کر سکتے۔“

پھوپھو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نقص تو شائستہ میں ہے پھر ان کا بیٹا اس طرح دب کر کیوں بات کر رہا تھا۔ تین لفظ کہہ کر جان چھڑائے اس چڑیل سے۔ وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ اس چڑیل سے جان چھڑانے کی پاداش میں ذکی کو بہت کچھ کھونا پڑتا جو انہیں گوارا نہ تھا۔

”تو۔“ ذکی نے سنجیدہ نظروں سے اپنی خوب صورت اور طرح دار بیوی کو دیکھا۔

”تو اپنی عمر دیکھو اور اپنی حرکتیں دیکھو۔“ وہ چیخ اٹھی۔

”تم مجھے دوسری شادی کی اجازت دے چکی ہو۔“ ذکی نے جتایا۔

”شادی کی اجازت تمہیں اپنے لیے شریک حیات منتخب کرنے کے لیے نہیں دی، اولاد کے لیے دی ہے اور یہ کام کوئی بھی کر سکتی ہے۔“

”کسی ماسی کی لڑکی سے شادی کر لوں؟“ وہ چڑ کر بولے۔

”کیوں۔ اس گھر میں تمہاری ایک سابقہ منگیتر بھی تو ہے۔“

ذکی اپنی جگہ ششدر سے رہ گئے۔ پھوپھو کا منہ کھل گیا وہ بڑبڑا میں۔ ”گل صنوبر؟“

”ہاں گل صنوبر۔ بے چاری اب تک کنواری بیٹھی ہے اس ڈھلتی عمر میں اسے کون بیاہنے آئے گا۔ اب کچھ کرنے ہی چلے ہو تو تھوڑا ثواب ہی کمالو اسے سہارا مل جائے گا اور تمہیں بچہ۔“ شائستہ نے آرام سے کندھے اچکائے۔

”تمہارا دماغ خراب ہے۔“ ذکی نے غصے سے سگریٹ مسل دیا۔

”میرا نہیں تمہارا۔ اپنی اڑان نیچی کرو اور چچی! آپ بڑے ابا سے گل صنوبر کے رشتے کی بات کریں مجھے یقین ہے انکار نہیں ہوگا۔“

وہ ذکی کو کھولتا اور پھوپھو کو ہکا بکا چھوڑ کر کھٹ کھٹ کرتی نیچے چلی گئی۔ ذکی ایک ہاتھ کا مکا دوسرے ہاتھ پر مار کر رہ گئے۔ پھوپھو نے غور سے بیٹے کے تیور دیکھے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”تو پھر کروں بھائی صاحب سے بات؟“

”ہی! آپ بھی۔“

”کیونکہ گل صنوبر بڑی سیدھی سادی ہے۔ اللہ بخشے تمہارے نانا کہا کرتے تھے میری گل بڑی اللہ لوک ہے۔ اسے دکھی کرنے والا کبھی سکھی نہیں رہے گا۔ مجھے تو ہمیشہ سے یہ ہی لگتا ہے کہ تمہاری بے اولادی اسی کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ یاد ہے جب بچپن میں سفیان نے ایک بار گل کو پھپھو مارا تھا تو اس کے ہاتھ پر شہد کی مکھی نے۔“

وہ نہ جانے کون سے قصے لے کر بیٹھ گئی تھیں حالانکہ جب شادی کی بات ہوئی تو سب سے پہلے وہ بیٹے کی ہمنوا ہوئی تھیں۔ تب شائستہ انہیں چودھویں کا چاند لگتی تھی اور گل۔ وہ غصے سے کھولتے کمرے سے باہر نکل گئے۔

صبح سے گھر کے بیٹوں کی سرگرمیاں خاصی برسرِ ار تھیں۔ بڑے ابا نے سب کو اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ ان بیٹوں میں فیضان اور سفیان بھی شامل تھے۔ بھابھیاں بھی شریک کر لی گئیں۔ باوجود کوشش کے وہاں کو کوئی سن گن نہ مل سکی۔ غصے سے پلاؤ کو دم پر رکھا اور کھیر میں چمچ چلانے لگی۔

”بلی کھیلے سے باہر آئی جائے گی تم کیوں فکر مند ہو۔“ دپہر کے کھانے میں ابھی تھوڑی دیر تھی اور ذکی انشی ٹیوٹ سے جلدی گھر آگئی تھی۔ سواب سینڈویچ بنا کر پیٹ پوجا کر رہی تھی۔

”ہاں سارے گھر کو جمع کر لیا ہم کسی کھاتے میں

”سب کو چھوڑ کر تم سے مشورہ کرتے۔“ زیبا

”تمہیں تو کسی بات کی فکر ہی نہیں ہوتی۔“

”میں خواہ مخواہ کی فکریں نہیں پالتی۔“ اس نے المیہ ناز سے کہا اور اپنا کپ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

شام تک اسے کسی بات کی سن گن نہ ملی۔ وہ گل کے پاس بیٹھی جلے دل کے پھوپھو لے پھوڑتی رہی۔

”آج کی شام بہت عجیب سی ہے۔“

”یہ لارہی تھی۔“

”شاید آندھی آنے والی ہے۔“ بیلا نے اپنے خیال

”اللہ ہمارے پھر موبائل پر آیا۔“ سب دیکھنے لگی۔

پھیلتی جارہی ہے خوشبو سی

دل میں کس کا خیال آیا ہے

”توبہ! یہ بندہ تو تھکتا ہی نہیں۔“ عاشق نے تو سم

ای بدلوادوں کی۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی پھسر اٹھ کر ماں

کے پاس آگئی۔

”خیریت امی! یہ سارا دن بڑے ابا کے کمرے میں

کیا ہوتا رہا ہے۔“

”تمہارے مطلب کی بات ہوئی تو سامنے آجائے

گی۔“ انہوں نے بیٹی کو گھور کر دیکھا۔ وہ منہ بنا کر رہ گئی۔ رات کو کھانے پر آخر کار دھماکا ہو ہی گیا۔ کم از کم

وہاں کے لیے تو دھماکا ہی تھا۔ جب بڑے ابا نے آرام و سہولت سے اعلان کیا کہ انہوں نے گل کا رشتہ ذکی سے طے کر دیا ہے اور یہ کہ جمعہ کو نکاح ہے۔

بیلا کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ اس نے تھیرو

استقبال سے ایک ایک کا چہرہ دیکھا۔ سب مطمئن

تھے، مسکرا رہے تھے۔ اس نے گل کی طرف دیکھا۔

پھوپھو اسے خود سے لپٹائے بلائیں لے رہی تھیں۔

گویا سب کچھ معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ گل کا چہرہ

اتنا جھکا ہوا تھا کہ وہ اس کے تاثرات نہ دیکھ سکی مگر خود

اس کے اندر آگ سی لگ گئی تھی۔

گل صنوبر اور ذکی۔

ذکی اور گل آئی۔

اک سلگتا ہوا لمس اک آگئی رہتا لمحہ۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ پلیٹ کھسکا کر کھڑی ہو گئی۔

امی نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھاما۔

دھن۔ دھن۔ دھن۔ سرخ مرچیں اڑا کر اس کی آنکھوں اور ناک کاٹس کر رہی تھیں، پر نہ ہاتھ رکھتا تھا نہ چھینکیں اور نہ آنکھوں سے ہتائیانی گویا اسے اپنا سارا غصہ ان ہی ثابت سرخ مرچوں کو کوٹ کوٹ کر نکالنا تھا۔

ہر کوئی روک روک کر تھک گیا۔ بڑی اماں الگ بچھتا میں۔ نہ وہ سوکنے کو ڈالتیں نہ بیلا کا یہ حشر ہوتا لیکن سوال یہ تھا کہ پھر اس کا غصہ کیسے نکلتا؟

وہ ایک ایک سے لڑی تھی مگر سب کے نزدیک وہ بالکل ناتجربہ بلکہ بے وقوف تھی سو کسی کے کان پر جوں تک نہ رہنگی۔ ہر کوئی یوں مطمئن شاداں و فرحاں جمعہ کو ہونے والے نکاح کی تیاریوں میں مگن تھا۔ ذکی کی دوسری مگر گل کی تو پہلی شادی تھی۔ اس کا

کوئی ارمان ادھورا نہ رہا۔ بنا بنایا خوب صورت فرنیچر اوپر کی منزل میں سیٹ ہو گیا۔ درزی کو بٹھا کر ہنگامی طور پر بلبوسات سلانے جارہے تھے۔ گھر کی آرائش، مہمانوں کو بلاوے۔ کھانے کا انتظام، پارلر کے چکر۔ سو کس کو فرصت تھی کہ بیلا کی اس

بے تکلی بات پر کان دھرے کہ ذکی کسی صورت گل کے قابل نہیں۔

سواب وہ تھی اور سرخ مرچیں۔

آنکھوں کی جلن۔

ایک تو اتار سے آتی چھینکیں۔

وہ حال سے بے حال ہو رہی تھی۔ مگر ہاتھ نہ روکتی تھی۔

تب ہی کسی نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر بلکہ گھسیٹ

تھیں۔

کر کھڑا کیا۔ وہ بجلی کی طرح تڑپی، مگر گرفت مضبوط تھی۔ موسل ہاتھ سے چھوٹ کر دور تک لڑھکتا گیا۔ وہ چیختی رہی، مگر اس نے گھسیٹ کر بیسن کے سامنے کھڑا کر دیا۔ وہ زیادہ بجلی تو چلو میں پانی لے کر چھپاک سے منہ پر دے مارا۔

”شرافت سے ہاتھ منہ دھو لو ورنہ گردن پکڑ کر تل کے نیچے کر دوں گا۔“ غصے بھرا تحکمانہ لہجہ بیلانے اس سے بھی زیادہ غصے سے گھورتا چاہا۔ مگر آنکھوں کی حالت زیادہ نازک ہو چکی تھی، سو وہ جھک کر اور بے حد غصے سے رگڑ رگڑ کر ہاتھ منہ دھونے لگی اور تب تک دھوتی رہی جب تک عاشر کا صبر ساتھ دیتا رہا۔ آخر تک اگر عاشر نے تل بند کیا۔ وہ بازو چھڑا کر صحن میں چار پانی پر جا بیٹھی۔ عاشر نے یکن سے آکس کی بور اور لٹو پیر لا کر اس کے قریب رکھ دیے۔

”تو اچھے بچوں کی طرح ٹکڑ کر دو۔“ اس نے واقعی اچھے بچوں کی طرح عمل شروع کر دیا۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ستون سے ٹیک لگائے اسے دیکھتا رہا۔

”تم کب آئے؟“ غصے اور جلن کا گراف نیچے آگیا تھا۔

”بھی۔۔۔ پوچھ سکتا ہوں یہ کیا ہو رہا تھا۔“ ”مجھ سے نہیں گھر والوں سے پوچھو۔“ اس کی آنکھیں بے بسی کے احساس کے ساتھ لبالب بھر آئیں۔

”گل آبی کی شادی ہو رہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کس کے ساتھ؟“ بیلانے تیکھی نظروں سے اسے گھورا۔ وہ بھائی کا نام لیتے لیتے رک گیا۔

”بیلانے! تمہیں بھائی پر اعتراض کیوں ہے۔“ ”وہ کسی بھی طرح گل آبی کے قابل نہیں۔ تم بتاؤ کیا گل آبی کے نصیب میں یہ ہے کہ کوئی ان سے دوسری شادی کرے اور وہ بھی اولاد کی خاطر۔“

”ہاں۔۔۔ لیکن۔۔۔“ عاشر کچھ کہہ نہ پایا۔ بظاہر اس میں کچھ حرج بھی نہ تھا۔ مگر وہ کچھ ایسا کہنا چاہتا تھا جس سے بیلانے کی نفی ہو سکے۔

”ہاں تم بھی ان ہی کا ساتھ دو گے“ آخر وہ تمہارا بھائی ہیں۔ تمہیں کسی لڑکی کے احساسات و جذبات کا کیا قدر۔“ وہ اسی پر الٹ پڑی۔

”بیلانے۔۔۔“ بڑی اماں پکار رہی تھیں۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی مگر نہ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مرے مرے قدموں سے ان کے پاس آئی۔ انہوں نے بازو سے پکڑا اور کمرے میں لے گئیں اور لے جا کر پچھلے برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی میں کھڑا کر دیا۔ قرآن پاک کی تفسیر پڑھتی امی نے حیرت سے دونوں دیکھا۔

”اسے غور سے دیکھو بیلانے لڑکی میری بیٹی ہے۔ میں جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس کوئی ایسا کن نہیں کہ کوئی اسے اپنے گھر لے جائے اور بیلانے کا سوچے۔“ بیلانے تڑپ کر انہیں دیکھا کہ وہ بڑی سفاکی سے سے کہہ رہی تھیں۔ ایسی سفاکی جس کے عقب سے درد ہی درد چھلک رہا تھا۔

”اس کی ذہنی عمر سرب کھرتی سفیدی، بغیر تیزی بخیر تیزی طراری ہو شکاری کے“ کون ہے یہ بیانیے آئے گا اور اگر کوئی ایسا دل والا ہو تا تو آج والدین کی دہلیز پر بیٹھی گل صنوبر بوڑھی نہ ہو رہی ہوتی۔

پھول مرجھا چکا ہے بیلانے! اس سے قبل کہ یہ خزاں کا مارا پھول اس ہتے ہتے گلشن کا بد نما داغ بن جائے۔ کسی کے نام ہو جانے دو۔ میں ماں ہوں، اس کی سولی مانگ میرا چین چین لیتی ہے۔ اس کی خالی کلاسیاں میرا دل نوچتی ہیں۔ اس کی ویران زندگی میری نیندیں مارنے لے گئی ہے۔ ہر ماں کی طرح میرا بھی یہ ہی ارمان ہے۔

میں اپنی بیٹی کو دکن بنا دیکھوں۔ اس کی مانگ میں افشاں سجاؤں، اسے سرخ جوڑے میں لپٹا دیکھوں۔ میں نے بہت عرصہ انتظار کیا ہے۔ تھک گئی ہوں۔

ماپوس ہو گئی تھی۔ آج اگر وہ دلہن بن رہی ہے تو بد شکونی کی باتیں مت کرو۔ ارے اس بد نصیب نے سینے میں بھی دل ہے، کیسی بہن ہو کہ بہن کی آنکھوں میں سچے سینے ہی دکھائی نہیں دے رہے۔ اسے جوڑا پہننے دو، اس کی کلاسیوں میں چوڑیاں پہنے دو۔

”اف وہ ہی مرغی کی ایک ٹانگ“ آخر تو کس مٹی

اس کی سونی مانگ میں افشاں چمکنے۔۔۔ بڑی اماں روتے روتے کہتی گئیں اور کہتے کہتے چلی گئیں۔

وہ اپنی جگہ دم بخود تھی۔ اس کے سامنے اک لڑکی تھی، جس کی مانگ سفید تھی مگر جس کے ہاتھوں میں اک سرخ دوپٹہ تھا۔ جس کی انگلیاں سنہری کرن ٹانگ رہی تھیں۔ یا ”خواب“ وہ ذرا سا لڑکھائی اور سہارے کے لیے کسی تھام لی۔

امی نے قرآن شریف بند کر کے ریک میں رکھا اور ایک تار کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئیں۔

”کبھی کبھی حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے، لیکن اس کی نام ترخی کے باوجود قبول کرنا پڑتا ہے اور پھر صنوبر نے تو بچپن سے اپنے نام کے ساتھ ذکی کا نام سنا ہے۔ یہ خواب اوھو راسی، مگر اس کی آس اس کا سہارا ہے۔“ ”سجھو کہ گل کی محبت اسے واپس آنے پر مجبور کرے گی۔“

بیلانے کے لیے ایک اور انکشاف اور اس کے بعد بیلانے کا کہ اب وہ کبھی اس رشتے کی مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہہ پائے گی۔

”لڑکیاں نیچے شفٹ ہو جائیں۔“ یہ بڑے ابا کا حکم تھا۔ بیلانے کو پہلا قلق اگر گل کی ذکی کے ساتھ شادی کا تھا تو دوسرا یہ کہ پھر چھوڑنے کا۔ وہ بے دلی سے اپنا چھوٹا موٹا سامان اٹھا رہی تھی۔ زیبا بھی الماری سے اپنے کپڑے اٹال رہی تھی۔ مریم تو اپنی جلدی آنہ سکتی تھی، البتہ اس سننے ہی آگئی۔ باقی مہمان بھی جمع ہو رہے تھے۔

”اسے اپنے والدین کے گھر جا چکی تھی۔“ ”تمہارا یہ سوچا ہوا منہ ٹھیک نہیں ہو سکتا، ماکہ“ ”اوی۔۔۔ تھوڑا مزہ آسکے۔“ فرح نے جھنجھلا کر کہا۔

”میں نے کسی سے کیا کہا ہے، کرو مزے۔۔۔ مجھے اس شادی سے کوئی خوشی نہیں ہو رہی تو میں کیا کروں؟“

”اف وہ ہی مرغی کی ایک ٹانگ“ آخر تو کس مٹی

سے بنی ہے۔“ ”جس میں خود غرضی شامل نہیں۔“ ”اور خود غرضی کون دکھا رہا ہے۔“

”آف کورس ذکی بھائی، وہ جانتے ہیں کہ وہ گل آبی سے کبھی محبت نہیں کر سکیں گے۔ وہ صرف اولاد کے لیے شادی کر رہے ہیں۔“

”یا گل! کبھی کبھی محبت اتنی ضروری نہیں ہوتی، زندگی گزارنے کے لیے کچھ اور سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ بیلانے۔۔۔ ماں، باپ کسی کے ہمیشہ نہیں رہتے۔ کم از کم گل کے ساتھ ذکی کے نام کا سہارا تو ہو گا۔“ فرح نے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے ذہن میں ایک ساتھ کئی سوال کلبلائے۔ تب ہی ذکی دووازے کھٹکھا کر اندر آگئے۔

”پیکنگ ہو رہی ہے؟“ ”نہیں شفٹنگ۔ دیکھ لیں آپ کی شادی نے ہم سے ہمارا کراچین لیا۔“

فرح ہنسی۔ انہوں نے اک اچھتی سی نگاہ بیلانے کی طرف اٹھائی۔ جو انہیں یکسر نظر انداز کیے کتابوں کا بکس کھولے اس میں مزید چیزیں بھرنے لگی تھی۔

”اوہ! تو لوگ اسی لیے مجھ سے خفا ہیں۔“ ”نہیں۔۔۔ خفا ہونے کی اور بھی وجوہات ہیں۔“ فرح شرارت سے گویا ہوئی۔

”کیوں بیلانے! رانی۔۔۔ سنا ہے آپ کو ہماری شادی پر سب سے زیادہ اعتراض ہے۔“ انہوں نے جھک کر بکس میں سے ایک کتاب اٹھائی۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ رکھائی سے بولی۔ ”تو پھر یہ بے اعتنائی کیسی؟“ انہوں نے کتاب کی ورق گردانی کرنا چاہی تو وہ عین وہاں سے کھلی جہاں اُدھ کھلا گلاب سوکھ کر باسی خوشبو چھوڑ رہا تھا۔

”اوہ تو بیلانے کو کتابوں میں پھول رکھنا پسند ہے۔“ بیلانے پلٹ کر دیکھا۔

”کسی کی نشانی یا کوئی چھوٹی سی یاد۔“ بیلانے جھپٹ کے پھول اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور چبا چبا کر بولی۔

ہر لڑکی کا ارمان ... گورا نکھرا رُوپ



بس یہی ارمان پورا کیا **انگلش** آئین ٹرمیک کریم نے۔ **انگلش** آئین ٹرمیک کریم میں شامل ہیں آئین، بلدی، صندل اور بے شہر حسن افزا جڑی بوٹیاں جس سے میری کالی رنگت گوری ہوئی کیل، مہاسے، جھانیاں دور ہوئیں آپ بھی میری طرح **انگلش** آئین ٹرمیک کریم استعمال کریں اور اپنی رنگت میں گورے رنگ کا نکھار پائیں۔

کیونکہ... خوبصورتی حق ہے آپ کا

بچائے۔
بیلا نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ تب ہی نگاہ عاشق پڑی۔ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دوپٹہ سنبھالتی تیز قدموں سے اس تک آئی۔
”عاشق! کھو کوئی مجھے تنگ کرتا ہے۔“ عاشق نے حنائی ہاتھ میں دبے سیل کو دیکھا۔
”کب سے چل رہا ہے؟“
”جب سے تم نے مجھے یہ سیل دیا ہے۔“
”تنگ کرتا ہے؟“
”نہیں۔۔۔ بس اچھے اچھے رومانٹک میسج بھیجتا ہے۔“ وہ شرارت سے ہنسی۔
”ہو سکتا ہے۔۔۔ واقعی تم سے محبت کرتا ہو۔“

”چھوڑو۔۔۔ موبائل ہو یا انٹرنیٹ سب جھوٹ ہوتا ہے۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔
”جھا اور اصل زندگی میں؟“ عاشق نے اس کی شفاف آنکھوں میں جھانکا۔
”میں نہیں پڑتی ان خرافات میں۔“
”خرافات کیوں؟“

”امی کہتی ہیں ۴ چھٹی لڑکیاں صرف اپنے شوہر سے محبت کرتی ہیں۔“ وہ برجستگی سے بولی۔ عاشق کا تہمتہ ابھرا تو وہ ناراض ہو گئی۔
”اچھا سنو۔ اگر کوئی سچ مجھ سے محبت کا اظہار کرنا چاہے تو۔“

”سر پھاڑ دوں گی۔ جسے مجھ سے محبت ہے سیدھے سیدھے اپنے گھر والوں کو بھیجے۔“
”ارے۔۔۔ تو وہ درمیانی رومانٹک پیرٹنر؟“
”مجھے نہیں پسند۔“ وہ تنگ کر کہتی اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔ عاشق نے ہاتھ میں پکڑا موبائل دیکھا پھر ہنس دیا۔

”بیلا رانی! گویا آپ سے محبت کروانے کے لیے پہلے آپ کا شوہر بننا پڑے گا۔“
”ہاں۔۔۔ مگر کس کا؟“ پاس سے گزرتی سونیا ٹھٹکا کر رکی۔
عاشق جھل سا ہو گیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس کا نام

”مجھے خوشبو کو قید کرنا پسند نہیں۔“
فرح نے کچھ محسوس کیا تو تیزی سے آگے بڑھی۔
”آئیں ذکی بھائی! نیچے چلتے ہیں۔ مزدور سال سے قالین وغیرہ اٹھوا لیں۔“
انہوں نے دزدیدہ نگاہوں سے بیلا کو دیکھا جو ان کی طرف پشت کیے مصروف ہو گئی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے پاہر نکل گئے اور کھڑکی کے نیچے کھڑے عاشق نے بے حد تحیر سے خود پر نچھاور ہوتی سوکھی پتیاں دیکھیں۔
پھر سر اٹھا کر اوپر کھڑکی کو۔ ”کیا یہ میری محبت کا جواب ہے؟“ وہ شذر سا کھڑا سوچ رہا تھا۔

دلہن بنی گل صنوبر کو دیکھ کر بیلا کو احساس ہوا کہ ہر ماں کے دل میں بیٹی کو دلہن بنا دیکھنے کی خواہش اتنی شدت سے کیوں پیدا ہوتی ہے۔ گل کا رنگ صاف تھا۔ اس کے نقش بھی خوب صورت تھے مگر وہ ہمیشہ بے رنگ اور بجمی سجھی سی لگتی تھی مگر آج یوں لگتا تھا سارے رنگ اس ایک وجود میں سمٹ آئے ہوں۔
بیلا نے مہمانوں کے ہجوم پر اک نگاہ دوڑائی۔ بڑی اماں کتنا ہنس رہی تھیں۔ گویا آج ساری دنیا کے سوالوں کا جواب دے دیا۔ بڑے ابا کتنے مطمئن اور مسرور سے پھر رہے تھے۔

”کیا بیٹی کی ذمہ داری واقعی اتنی بھاری ہوتی ہے۔“ عاشق نے دور سے فراک اور پاجامے میں ملبوس سچی سنوری بیلا کو دیکھا۔ اعصاب پر باسی پھولوں کی منک بو جھل پن برہا گئی۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا۔ وہ نہ جانے کس سوچ میں الجھی اسٹیج پر دولہا دلہن کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں نکاح کا مقدس فریضہ انجام دیا جا رہا تھا۔ کچھ بھی سوچے بنا اس نے موبائل نکال کر میسج کیا۔ بیلا نے چونک کر اپنے ہاتھ میں پکڑا سیل دیکھا۔

”تم جس رنگ کا کپڑا پہنو
وہ موسم کا رنگ۔۔۔
”کلیوں سی نازک لڑکی! خدا تمہیں نظربد سے

لیوں کی جنبش میں رہ گیا تھا، ورنہ بھانڈا چوک میں پھونٹا۔

بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ گھر والوں کے خوش و خرم چہرے، گل کی کھلی کھلی رنگت، ہونٹوں پر کھلتی شریکیں مسکان۔ ذکی کا رویہ بھی اچھا تھا، پھر وہ اکیلی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کیا بناتی۔ سب کچھ بھول کر ذکی کو ہونو کی حیثیت دینا ہی پڑی۔ گل زیادہ تر اوپر ہی رہتی۔ شاید یہ بڑی اماں کی پدایت تھی۔ نت نئے زرق برق ملبوسات میں وہ کتنی بدلی بدلی سی لگتی۔ جھولے پر اب بیلا کا قبضہ تھا۔ وہ فارغ وقت میں اے حید کا زرد گلاب منہ پر رکھے اوٹھتی رہتی۔

تب ہی ایک دن شائستہ چلی آئی۔ گل سب کچھ بھول کر اپنی سوکن کی خدمت میں مصروف ہو گئی۔ اسے تین دن کے بعد واپس جانا تھا۔ وہ اور ذکی تیار تیار ہو کر شاپنگ کے لیے نکل جاتے۔ پیچھے گل ان کے لیے نئے کھانے بناتی رہتی اور بیلا کو جلنے کڑھنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔

اس دن دونوں کے جانے کے بعد دو دو سیڑھیاں پھلانگتی اوپر آگئی۔ جہاں ساس، بہو راز و نیاز میں مصروف تھیں۔ گل ان کے بالوں میں تیل لگا رہی تھی اور پھوپھو انہیں ذکی کو قابو کرنے کے طریقے سمجھا رہی تھیں۔

(وقت وقت کی بات ہے۔) بیلا کندھے اچکاتی آگے بڑھی۔

”آپ ذکی بھائی کو روکتی کیوں نہیں ہیں، روز اس کے ساتھ نکل جاتے ہیں۔“

”اے ہے۔ کیسے، آخر وہ اس کی پہلی بیوی ہے۔“ پھوپھو بوکھلائی۔

”اور گل آئی کیا ہیں؟ کتنے دن ہو گئے ایک بار بھی انہیں شاپنگ گرانے یا کھانا کھلانے نہیں لے کر گئے۔“ وہ گویا لڑنے آئی تھی، پھوپھو ہنس دیں۔

”گل خود ایسی جگہوں سے گھبراتی ہے، پھر دو چار

دن کی تو بات ہے، وہ تو چلی ہی جائے گی۔“ وہ گویا پچھارتے ہوئے بولیں۔

”بس کہہ دیں ذکی بھائی سے ہمیں یہ نا انصافی اچھی نہیں لگتی۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔

”توبہ، یہ بڑی اماں کہاں سے آگئی۔ گل! اسے تو تم ہی سنبھالو۔“ وہ اٹھ کر واش روم میں چلی گئیں، گل نے مسکرا کر بیلا کو دیکھا۔

”گل آئی! آپ کو برا نہیں لگتا۔“

”پاگل، جو میرے نصیب کا ہے، وہ مجھے ہی ملے گا۔“

”آپ بھی ٹائپس اچھا اٹھیں، میں نے آپ کے ہاتھ کے پکڑے کھانے ہیں۔“ وہ انہیں گھسیٹتی کچن میں لے گئی۔

شام کو غالباً ”پھوپھو نے ان سے کہا تھا سب ہی گاڑی کی چابی گھماتے چلے آئے۔“

”چلو بھئی! آج ڈنر باہر کریں گے۔ سنا ہے لوگ تشویش کا شکار ہیں۔“ ان کے لہجے میں ہلکی سی شرارت تھی۔ بیلا نے ہونٹوں کھڑی گل کو دیکھا، جو سبز لباس میں تیار کھڑی تھی۔

”جب شائستہ آپ کے ساتھ جاتی ہیں، تب آپ سب کو لے کر جاتے ہیں؟“ یہ اچھی خاصی بد تمیزی تھی جو بیلا سے سرزد ہوئی۔ ذکی نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہ گل کی خواہش تھی۔“

وہ شرمندہ ہو گئی۔ سب اسے لعن طعن کرنے لگے۔

”میں گاڑی میں ہوں، جس نے جانا ہو، آجائے۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ اپنی شرمندگی مٹانے کو اسے زیبا کے ساتھ جانا پڑا۔

زندگی اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں تھی۔ سونیا امید سے تھی۔ سو زیادہ وقت اپنی ماما کی طرف گزارتی۔ فیضان پہلے وہاں قدم بھی نہ رکھتا تھا۔ اب

اکثر آفس سے واپسی پر وہیں پایا جاتا۔ بیلا نے گھر کی روٹین سے گھبرا کر کمپیوٹر سینٹر جوائن کر لیا۔ عاشر کا تاولہ کوہاٹ ہو گیا تھا، سو رابطہ صرف فون پر محدود ہو گیا۔ بڑی اماں اٹھتے بیٹھتے گل کے لیے دعا کرتیں اور شاید ان ہی کی دعاؤں کا ثمر تھا کہ شادی کے ڈھائی ماہ بعد ساون کے مہینے میں گل نے انہیں خوش خبری سنائی۔

”پتا ہے گل! مجھے اب بھی اعتبار نہیں آ رہا۔“ وہ دونوں جھولے پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ذکی کے ہاتھ میں فالسوں سے بھری پلیٹ تھی۔ گل آگے کوچک آنے والی شاخ کی پتیاں نوچ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا

وہ بے حد کمزور ہے۔ اسے اپنی غذا کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہو گا۔ مٹی وٹامنز، سپلیمنٹ، کیلشیم، ذکی اس کا بے حد خیال رکھتے۔ گل کو یقین ہی نہ آتا۔ یہ وہی ذکی ہیں، جنہوں نے کبھی اس سے شادی سے انکار کیا تھا۔

دودھ پھل، وہ خود کٹ کٹ کر اپنے ہاتھوں سے اسے کھلاتے۔

”میں نے پورے دس سال اس خوش خبری کا انتظار کیا ہے۔ دس سال کا عرصہ کم تو نہیں ہوتا۔ جو مجھے خبر ہوتی کہ مجھے یہ تحفہ تم سے ملنے والا ہے تو کبھی دیر نہ کرتا۔“ گل بدھم سا مسکرائی۔

”تم اتنا کم کیوں بولتی ہو، کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔“ انہوں نے اپنا بازو گل کے کندھے پر پھیلا دیا۔

”ہے نا۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور سرخ ہو گئی۔

”تو یار! کھل کر کہو نا۔ گل! کیسا ہو گا ہمارا بچہ۔“

تمہارے جیسا یا میرے جیسا۔ تمہارے جیسا تو بالکل نہ ہو، گھنٹوں گپ چپ بیٹھی رہتی ہو۔ شائستہ جیسا ہو تو کیا ہی بات ہے۔ کالڈنٹ اور جینٹلمن۔۔۔ تمہیں پتا ہے وہاں لوگ شائستہ کو۔“

گل نے کچھ اچھ لرا نہیں دیکھا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا، بہت خلوت میں بھی انہیں شائستہ یاد آ جاتی۔ حالانکہ شائستہ جیسی گرم ہوشی دکھانا گل جیسی لڑکی کے بس کی بات کہاں تھی۔ مگر اب تو وہ اپنے بچے کی بات کر رہے تھے۔ اپنے اور گل کے بچے کی اس میں شائستہ کہاں سے آگئی، مگر وہ مگن تھے۔

”گل! دعا کرو ہمارے ہاں پہلا بیٹا ہو، تمہاری تو اللہ کے ساتھ ڈائریکٹ ڈیلنگ ہوتی ہے۔ ہمہ وقت نماز و تسبیح میں لگی رہتی ہو۔ تمہاری بات تھوڑی ٹالے گا۔“

”ایسی باتیں مت کریں، جو اللہ کو منظور۔“ وہ اپنی جگہ کانپ سی گئی۔

”اچھا۔۔۔ یہ فالے کھاؤ۔ سنا ہے عورتیں ایسی حالت میں کھٹی بیٹھتی۔“ ان کا موبائل بجنے لگا۔ انہوں نے نمبر دیکھا، پھر پلیٹ گل کے ہاتھ میں تھما دی۔

”اس کا شربت بنا لاؤ۔“

وہ پلیٹ اٹھا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”کیسی ہو جان من۔“

”تمہارا کام ہو گیا۔ اب وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔“ شائستہ نے ترش کر پوچھا۔

ذکی اک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

”تم اتنا دوا کیوں ہو رہی ہو۔“ گل نے ان کی ساری پیکنگ چپ چاپ تے ہوئے چہرے کے ساتھ کی تھی۔

”مجھے جانا تو تھا ہی۔“ ذکی نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھالیا۔

”مت جاؤ۔ میرا دل گھبراتا ہے۔“ وہ اس کے کندھے سے لگ کر سسکا اٹھی۔ ذکی نے کوفت سے اسے دیکھا۔ عورتوں کا یہ جذباتی پن انہیں زہر لگاتا تھا۔

”جاؤں گا نہیں تو واپس کیسے آؤں گا۔ اتنے مہینوں کی غیر حاضری میں جو حرج اور نقصان ہوا، وہ اگلے پورے سال تک پورا ہو سکے گا۔“ انہوں نے بمشکل اپنے لہجے کو نرم رکھا۔

”تو کیا پورا سال نہیں آؤ گے۔“ گل نے گھبرا کر سر اٹھایا۔

”کیوں نہیں آؤں گا، جب بھی تم بلاؤ۔“

”ذکی! میں اکیلی۔“

”کیلی۔۔۔ سب گھروالے تمہارے پاس ہیں، کیلی تو وہاں شائستہ ہے، دیکھو کتنے دنوں سے میرے بغیر تنہا وہاں رہ رہی ہے۔“

گل کے سارے جذبوں پر اس بڑگئی۔ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹ کر آنسو صاف کرنے لگی تو وہ سکون کا سانس لے کر کھڑے ہو گئے۔

”اُف۔۔۔ نیچے سب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔“

دونوں ساتھ ساتھ نیچے اتر آئے۔ جہاں سب گھر والے جمع تھے۔ پھوپھو، بیٹے کو گلے لگا کر رو دیں۔

”اتنے سالوں کے بعد شکل دکھائی، اب ایسا نہ کرنا۔“

بڑے بابا نے آگے بڑھ کر بہن کو پیچھے ہٹایا اور آہستگی سے بولے۔

”اب تم پر دہری ذمہ داری ہے بیٹا! ان میں توازن رکھنا۔“

”ماموں! آپ بالکل فکر مت کریں۔ ان شاء اللہ کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔“

کچھ دن قبل ہی وہ گل کو لے کر بینک گئے تھے۔ اس کے نام اکاؤنٹ کھلوا دیا تھا کہ گل کے خرچے کے لیے وہ

الگ سے رقم بھجوائیں گے۔ سب سے مل کر بیلا کے سامنے رکے، جو گل کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی۔

”اچھا بیلا رانی! تمہیں ہم سے بہت شکایتیں سہی۔ پر اپنی امانت چھوڑے جا رہا ہوں۔ میری سزا کا خیال رکھنا۔“

اور بیلا سب کچھ بھول کر ان کے بازو سے آگئی وہ ہنس دیے۔

”شکر ہے تمہارا اعتبار تو جیتا۔“

اک جذباتی سے سین کے بعد وہ گھر سے روانہ ہوئے۔ گل پلٹ کر ماں کے کمرے میں جا کھسی۔

فیضان انہیں چھوڑنے جا رہے تھے۔ باقی سب کو انہوں نے خود ہی ایر پورٹ آنے سے منع کر دیا تھا۔

یوں وہ جس طرح اچانک آئے تھے، اسی طرح لوٹ گئے۔ گل کے پاس پہلے ان کا انتظار تھا اور اب بھی۔

بس یہ تھا کہ اب اس انتظار میں وہ تنہا نہ تھی۔ اپنے اندر سانس لیتے وجود کا احساس اسے دسرا ہٹ دیتا۔ گل کے لیے نہ سہی، ذکی کو اپنے بچے کے لیے تو لوٹ کر آتا تھا۔

”مجھے تیور احمد کہتے ہیں۔“

وہ دونوں ابھی انسٹی ٹیوٹ سے باہر نکلی ہی تھیں، جب سر تیور عین سامنے آکھڑے ہوئے۔ دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر زبان بولی۔

”جی، ہم جانتے ہیں۔“ سر تیور کو یہ انسٹی ٹیوٹ جو ان کے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ وہ بیک تھے اور اسماٹ بھی سولہ کیوں میں خاصے مقبول بھی تھے۔

”دراصل یہ بات ایسی نہیں کہ یوں سربراہ کی جائے۔ مگر مجبوری ہے میں بلا وجہ آپ کو اپنے آفس میں بلانا نہیں چاہتا۔“

دراصل میں مس رائیل کے لیے اپنے گھر والوں کو بھیجنا چاہتا ہوں، اگر یہ کہیں ایکجہ نہ ہوں تو۔“

”بجیہ چہرہ پر متانت لہجہ آدوئوں ہکا بکا رہ گئیں۔ خصوصاً“ بیلا کا تو اچھا خاصا منہ کھل گیا تھا۔

”آئی ایم سوری، شاید آپ کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔“ وہ ان کے رد عمل پر شرمندہ ہو گئے۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ بلا آخر زبیا سنبھلی۔

”دراصل ہمارے ہاں خاندان سے باہر رشتے نہیں ہوتے۔“ وہ بیلا کا ہاتھ پکڑ کر آگے نکل گئی۔ جبکہ وہ

حسرت زدہ چہرے کے ساتھ انہیں دیکھتے رہ گئے تھے۔ بیلا کچھ دیر خاموشی سے چلتی رہی، پھر ایک دم ہنس پڑی۔

”خیریت۔۔۔ زبیا ٹھنک کر رکی، جبکہ وہ ہنستی چلی گئی، پھر بمشکل بولی۔

”اسی لیے میں گھر سے باہر نہیں نکلتی، لوگ دیدہ و دل فرس راہ کیے رہتے ہیں۔

لوگ کیا کریں، حسن جہاں سوز کی تاب لانا ممکن کہاں؟“

”انعامت پھیلو۔“ زبیا نے برا سامنہ بنایا۔ ”سر

تیور کی نزدیک کی نظر کمزور ہے۔“

”تب ہی تو نظر نزدیک نہیں دور پڑی ہے۔“ وہ مزید اٹھلائی کہ زبان کی سٹوڈنٹ رہ چکی تھی۔

”لیکن سنو! تم نے منہ پھاڑ کر انکار کیسے کر دیا۔“ بیلا کے قدم ایک دم رکے۔

”کیونکہ بڑی بہن ہونے کے ناتے مجھے پتا ہے، تمہارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔“

”اچھا تو کیا یہ پروپوزل میرے لیے اچھا نہیں تھا۔“ بیلا نے مایوسی سے پوچھا۔

”سر تیور کی طرح تمہاری بھی نزدیک کی نظر کمزور ہے۔“ زبیا کہہ کر رکی نہیں۔ پوائنٹ کی طرف بڑھ گئی، جبکہ اس کا جملہ بیلا کے سر پر گزر گیا تھا۔

ان ہی دنوں گھر میں نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تو وہ بھول بھال گئی۔ فیضان نے اچانک ہی باہر جانے کا اعلان کر دیا۔ سب ششدر رہ گئے۔ بالائی بالاسارے

انتظامات کر کے انہیں صرف بتایا جا رہا تھا۔ مارے مددے کے بڑے ایسا کچھ بول ہی نہ سکے۔ فیضان سر جھکائے بیٹھے تھے۔

”میں بہت مجبور ہو گیا ہوں ابو۔۔۔ سونیا۔۔۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا، اب ساری وضاحتیں بے کار تھیں۔

بڑی امی پچھک پچھک کر رونے لگیں۔

”آخر تمہاری سسرال کا رنگ تم پر چڑھ ہی گیا۔ مجھے تو اسی دن سمجھ جانا چاہیے تھا، جب اس بڑے گھر کی لڑکی سے شادی کی تھی۔“

”اب کیا ہو سکتا ہے۔ جب پرندے اڑان بھرنا کچھ لیں تو انہیں گھوٹسلوں تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔

انہیں نئی پرواز بھرنے دیں بھائی صاحب! ابو نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ڈھارس بندھائی۔ فیضان سرخ آنکھوں کے ساتھ اٹھ گئے۔ یہ تو وہ ہی جانتے تھے کہ وہ یہ فیصلہ کس مجبوری میں کر رہے تھے۔ یہ ان کی اولاد کے مستقبل کا سوال تھا۔ ورنہ سونیا نے

علیحدگی کی دھمکی دی تھی۔

عجیب سی بے چینی تھی، جو اسے سونے نہ دیتی تھی۔ ایسے سی کی خنکی کے باوجود پینے میں نہائے جارہی تھی۔ اچانک لگا دم گھٹ رہا ہے۔ کمرے میں آکسیجن کم ہے۔ اس نے گردن موڑ کر پاس سوئی

پھوپھو کو دیکھا۔ وہ منہ کھولے ہوئے خراٹے لے رہی تھیں، وہ اٹھ بیٹھی۔ دو گھونٹ پانی پیا، پھر چل پھن کر باہر نکل آئی، پھر کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے چکر لگانے لگی۔

اواسٹل جون کی رات تھی، مگر خوش گواہ۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر آدھے چاند کو دیکھا، جو تھا تو ادھورا

مگر بے حد روشن تھا۔ کتنے موسم مٹے۔

سلاون پت پتھر، سرما اپنی گلابی ٹھنڈک بانٹ کر چلا گیا۔

اب پھر سے وہ ہی موسم ہے، جب تم لوٹ کر آئے تھے۔

جب تم نے مجھے اپنا بتایا۔ میرے ادھورے وجود کو اپنی روشنی سے بھر دیا۔

”اب آجاؤ پھر سے آجاؤ درد کے اس صحرا کو میں اکیلے کیسے پار کر پاؤں گی۔“

اس کے وجود میں ہلکی ہلکی ٹیسس اٹھنے لگیں۔ اس پورے عرصے میں ذکی کے فون متواتر آتے رہے تھے، مگر انہوں نے کبھی گل کا حال نہ پوچھا تھا۔ ان کی

ساری فکریں اپنے بچے کے گرد گھومتیں اور آخر میں کہتے۔

”میری امانت کا خیال رکھنا۔“

گل کا جی چاہتا! وہ کبھی تو پوچھے۔ ”میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ تمہاری زندگی میں میری حیثیت کیا ہے؟“

مگر سارے سوال اندر ہی سر بٹختے رہ جاتے، اسے سوال جواب کی عادت ہی کہاں تھی۔ کبھی لگتا یہ گزرا

وقت اک حسین خواب کے سوا کچھ بھی نہیں ابھی آنکھ کھلے گی اور وہ سہم جاتی مگر اس کے وجود میں ہوتی آہیں بتاتیں یہ پتنا نہیں حقیقت ہے۔
درد کی اک لہر اٹھی اس نے لب بھینچ کر دیوار سے سر نکا دیا۔ ایک پل کو لگا اک بھاری گرم ہاتھ اس کی پیشانی پر آ رہا ہو۔
وہ ہلکا سا مسکرائی لیکن۔۔۔
درد کی انتہا پر اس نے خدا کے بعد اسی کو پکارا تھا۔
پھوپھو ہڑ ہڑا کر جا میں۔

ابرار کے لیے وہ ننھا سا وجود عجیب کشش رکھتا تھا۔ وہ بار بار اپنی انگلی سے اس کی آنکھ کی پتلی چھو کر دیکھتا چاہتا۔ وہ خود اس کے گلابی رونی سے پیروں کو گدگد کر خوش ہو رہی تھی۔ فیضان کے بیٹے کی تو صرف تصویریں دیکھنے کو ملی تھیں مگر یہ جتنا جانتا کھلونا تو سب کے ہاتھوں میں سفر کر رہا تھا۔ ہر کوئی اسے گود میں لے کر بیٹھنا چاہتا، بڑی امی شکرانے کے نفل پر جھٹکتی تھکتیں، انہیں لگتا ان کی بیٹی ماں بن کر معتبر ہو گئی ہے۔ پھوپھو پورے خاندان میں مٹھائی بانٹ رہی تھیں۔ آخر ان کا پہلا پوتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے پورے دس سال کے بعد نوازا تھا۔ ذکی بھائی کو اسی وقت فون کیا گیا۔ نیٹ پر بچے کی تصویریں بھیجی گئیں۔ عاشق کو سب سے پہلے بیلا کا پیغام ملا کہ وہ چچا بن گیا ہے۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ اڑ کر پہنچ جائے۔ ذکی کی بھی یہی کیفیت تھی۔ انہوں نے گل سے بھی بات کی اور پہلی دستیاب فلائٹ سے آنے کا وعدہ بھی۔

فد نے واپس آکر پاکستان میں ہی جاب شروع کی تو سب نے سکون کا سانس لیا۔ زبانے کور سزا دھورے چھوڑ کر شادی کی تیاری شروع کر دی۔ وہ اپنے ملبوسات خود ڈیزائن کر رہی تھی سو مصروف تھی۔ کہاں ذکی کہتا تھا کہ بس بھاگا آ رہا ہوں اور کہاں تین ماہ گزر گئے، آنے کا نام ہی نہیں۔ بیلا ابھی ابھی واپس

آئی تھی، بیگ جرنل ایک طرف رکھ کر جوتے اتارنے لگی۔
”باہر کے سو بکھیرے، اب ہم ان چکروں کو کیا جانیں۔“ بڑی امی بس اسی بات پر راضی تھیں کہ بیٹی شادی شدہ بھی تھی اور اولاد والی بھی۔ اس سے آگے وہ سارے سمجھوتے بخوشی کرنے کو تیار تھیں۔ بیلا ٹھنڈے فرش پر تنگے پاؤں چلتی گل کے کمرے میں چلی آئی۔ واپس آکر جب تک صائم کو نہ دیکھ لیتی بچیں نہ پڑتا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔
”ارے تم کب آئے؟“
وہی بے ساختہ خوشی جو عاشق کی ساری تھکن مٹا دیتی۔ وہ جوتے کو سینے پر لٹائے اسے گدگد رہا تھا۔
سیدھا ہو بیٹھا۔ بیڑ پر وہ تمام کھلونے بکھرے تھے جو وہ صائم کے لیے لایا تھا۔
”اس بار کتنے مہینوں کے بعد آئے ہو۔“
”بہت نف ڈیوٹی ہے محترمہ! چھٹی بالکل نہیں ملتی۔“
”تم تو کال بھی ریسیو نہیں کرتے۔“
”بتایا نا۔ تم سناؤ کیا ہو رہا ہے؟“ وہ صائم کے ننھے منے ہاتھوں کو تھام کر تالی بجوا رہا تھا اور صائم کھلکھلا رہا۔ بیلا پاس بیٹھ کر دلچسپی سے دیکھنے لگی۔
”وہی کچھ، تمہیں اپنا بھتیجا کیسا لگا؟“
”یہ میرا تمہارا کیا ہوتا ہے۔“ عاشق نے جس لمحے میں پوچھا، بیلا شرمندہ سی ہو گئی۔
”باری! میرے پاس آؤ، کو آئی گندی ہے، چاچو چاکلیٹ دے گا۔“ ابرار نے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھا۔ آئی کا چومیس گھنے کا ساتھ تھا اور چاچو کبھی کبھار نظر آنے والا چاند سو وہ آئی سے لپٹ گیا۔

”دیکھا جو ہم سے پیار کرتے ہیں وہ پارٹی نہیں بدلتے۔“ وہ اتر آئی۔
”بدل کر جائیں گے کہاں؟“ عاشق بڑبڑایا۔ تب ہی صنوبر و اش روم سے باہر نکل آئی۔
بیلا آگئی ہو کھانا کھالیا؟ جیسے سوال کرنے لگی، عاشق نے محسوس کیا، گل اب پہلے کی طرح کم صم نہیں رہتی

تھی۔ اس کی شخصیت میں اعتماد کی جھلک دکھائی دیتی۔ ضرورت کے مطابق اچھے طریقے سے بات چیت کرتی۔
”میں صائم سے ملنے آئی تھی، یہ تو چاچو کی گود سے ہی نہیں نکل رہا۔“
”میں کھانا گرم کرتی ہوں، تم دونوں آ جاؤ۔“ عاشق نے بھی نہیں کھلایا۔
”وہ باہر نکل گئی۔ کھانا کھاتے ہوئے بیلا نے عاشق کو گزرے تمام دنوں کی روداد سنائی۔ اس نے کھانا کم کھایا اور بیلا کو سنا اور دیکھا زیادہ تھا۔ لیکن اس کے دیکھنے میں اتنی سادگی تھی کہ بیلا کو کبھی کچھ خاص محسوس ہی نہ ہوا۔
یہی چہرہ ہے میری محبت کا خوب صورت چہرہ جو پر خطر گھڑی میں مجھے زندگی کی طرف کھینچ لیتا ہے۔
یہی تو اواز ہے میری محبت کی آواز جو ہر تاریکی میں روشنی بن کے لپکتی ہے۔
اے خدا! میری محبت کا چہرہ ہی جگمگا تا رہے۔
اس کی آواز کی خوشبو یوں ہی میرے وجود کے گرد اپنا حصار باندھے رکھے۔ جدائیوں کی خلیج کبھی ہمارے درمیان حائل نہ ہونے پائے۔
”میں پوچھ رہی ہوں تمہارا ذکی بھائی سے کوئی رابطہ ہے یا نہیں۔ چار ماہ ہو گئے ہیں۔ وہ آ کیوں نہیں رہے۔“
”میرا خیال ہے تم تصور میں زیادہ خوب صورت لگتی ہو۔“ وہ ہنستا کر بولا۔
”اس بات کا مطلب؟“ بیلا نے چمچہ پٹ کر گھورا۔
”کچھ نہیں۔ آج فون کرتے ہیں بھائی کو۔“ عاشق نے بد مزہ سا ہو کر پانی کا گلاس منہ کو لگا لیا۔

نومبر کی رعنائیاں اپنے جون پر تھیں۔ وہ ایک خوب روشن اور چمک دار سادن تھا۔ بڑی امی نے صائم کو ننھا دھلا کر سفید کر ڈھائی والا کرتا یا جامہ پہنا کر پر ام میں بٹھایا تھا۔ اب وہ خوب آوازیں نکالتا، ہنستا، مانوس ہرے دیکھ کر کلکاریاں مارتا۔ سیفٹی بیلت لگا کر وہ فیڈر

لینے کچن میں چلی گئیں۔ وہ اپنے سامنے اک اجنبی چہرہ دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گیا۔ وہ ایک ٹمک اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر جھک کر ہولے سے اس کے گلابی پھولے پھولے گالوں کو چھوا۔ انہیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ ان کا اپنا بیٹا ہے اور وہ اتنے ماہ اس سے دور کیسے رہ لیے۔ صائم کھلکھلا اٹھا۔ انہوں نے بے اختیار اٹھا کر اسے سینے میں بچھینچ لیا۔ اندر باہر لگی انگ پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار برسی۔

”ذکی۔“ اپنی دھن میں باہر آتی بڑی امی ٹھٹک کر رکیں۔ آن واحد میں سب گھروالے جمع ہو گئے۔ وہ اکیلے نہیں تھے۔ ساتھ شائستہ بھی آئی تھی۔ پھوپھو نے وہیں ان کے لئے لینے شروع کر دیے۔ صنوبر نما کر نکلی تھی۔ جب بیلا نے اطلاع دی۔ گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتے وہ تھم سی گئی۔ پھر تولیہ ایک طرف رکھ کر سر پر دوپٹہ لیتی باہر آگئی۔ پہلی نظر شائستہ پر پڑی اور شائستہ کی اس پر شائستہ ٹھٹک سی گئی۔

یہ ایسی روشنی اور ملاحات تھی جو گل کے چہرے کو تابناکی بخش رہی تھی۔ کیا ماں بننے کا خروغور ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو سر تپا بیدل دے۔

گل ذکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
”کیسے ہیں؟“
”ہوں۔۔۔ ٹھیک ہوں۔“ نہ جانے کیوں جواب دیتے ہوئے وہ نظریں چرا گئے۔

بیلا نے کچھ حیرت سے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھا۔

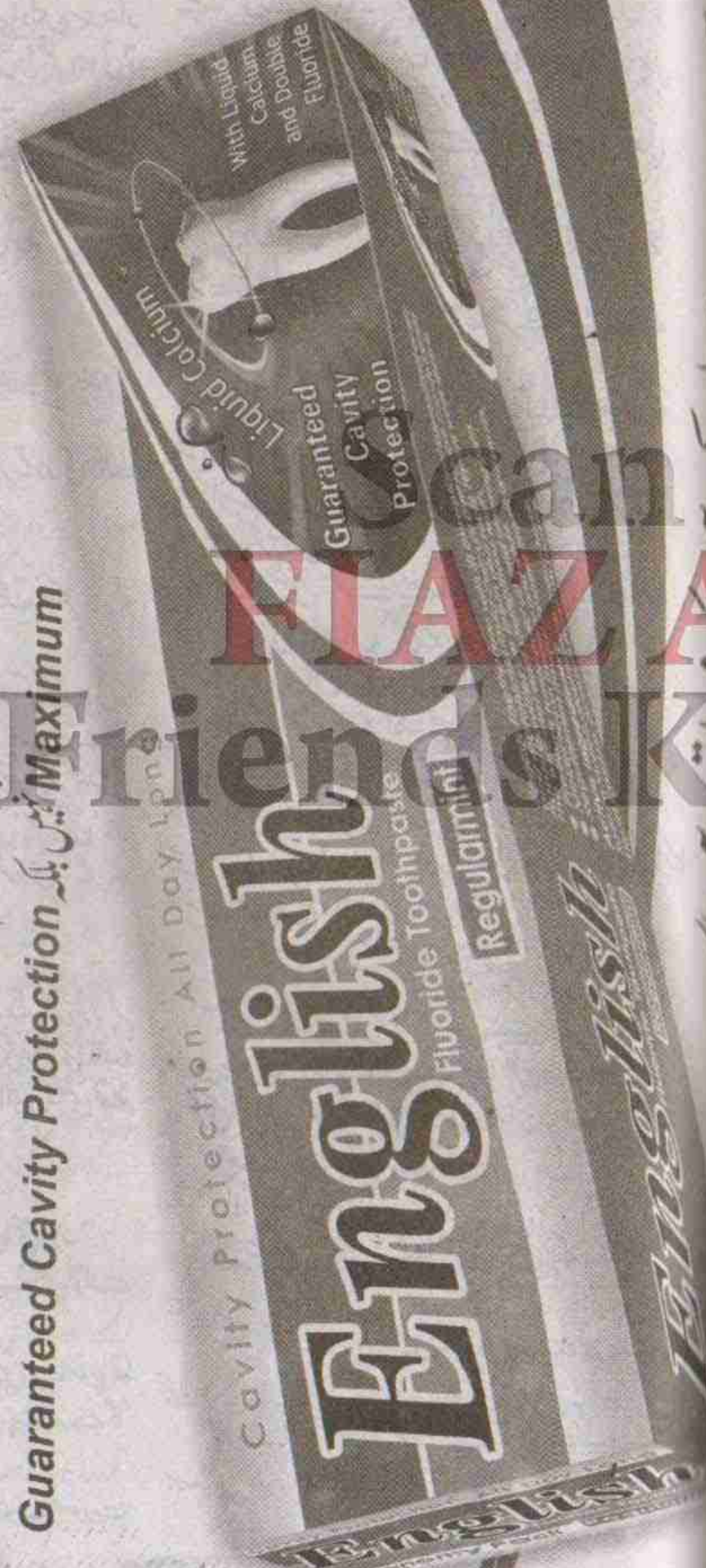
”یہ کیا پن رہی ہیں؟“ بیلا نے اس کے ہاتھ سے براؤن سوٹ لے کر ایک طرف رکھ دیا اور خود اوڑھوب کھول کر کھڑی ہو گئی۔ پھر سرخ کڑھائی والا سوٹ نکال لیا، جس کے دوپٹے پر بہت خوب صورت بلیں کڑھی ہوئی تھیں۔

”آپ یہ پہنیں گی، ہر وقت رب کو راضی کرنے میں لگی رہتی ہیں۔ آخر وہ بھی آپ کے مجازی خدا

دُنیا کا بہترین ٹوتھ پیسٹ انگلش

کیونکہ اس میں ہے لیکوئیڈ کلسیم کے ساتھ ڈبل فلوراائیڈ، تاکہ آپ کے دانتوں کو ملے

Maximum ہیں بلکہ Guaranteed Cavity Protection



آئے صائم وہاں نہیں تھا اور گل آئینے کے سامنے کھڑی اپنے لمبے بال سلجھا رہی تھی، دوپٹہ پیڈ پر پڑا تھا۔ ماں بننے کے بعد بھی اس کا جسم بے ڈول نہیں ہوا تھا۔ سرخ رنگ میں گوری رنگت دکھ رہی تھی۔ گل نے آئینے میں ذکی کا عکس دیکھا۔ کچھ جھینپ کر اپنا دوپٹہ اٹھانے کو مڑی، مگر بغیر دوپٹہ اٹھائے سیدھی ہو کر ذکی کو دیکھنے لگی۔

وہ اس کے شوہر تھے، مگر یوں نظریں پھیرے کھڑے تھے۔ گویا وہ ان کی بیوی نہیں کوئی نامحرم ہو، حالانکہ وہ بہت مہینوں کے بعد مل رہے تھے اور ایسا پہلی بار نہ تھا۔ وہ جب سے لوٹے تھے اس سے یوں ہی کترا رہے تھے۔ بیڈ روم میں ہوتے تو صائم میں کھوئے رہتے۔ کوئی صائم کو لے جاتا تو خود بھی بدک کر بھاگتے۔ گل کی چھٹی جس جا گئے تھی۔

اس نے ذکی کو بہت انتظار کے بعد پایا تھا۔ اب کھونے کی ہمت نہ تھی۔ وہ قدم قدم چلتی ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ”کیسی لگ رہی ہوں۔“ یہ اس کی سرشت نہ تھی۔ مگر سامنے کھڑا شخص کوئی غیر نہیں اس کا شوہر تھا۔

”ہوں۔“ ذکی نے نظریں اٹھا کر اسے بس ایک ہی بل کو دیکھا۔ پھر ہاتھ میں پکڑا کیس اس کی سمت بڑھا دیا۔

”یہ تمہارے لیے لایا تھا۔“ گل نے نظریں جھکا کر دیکھا۔ اس کے اور ذکی کے بیچ صرف ایک کیس کا فاصلہ تھا۔ اگر وہ یہ فاصلہ خود سے پاٹ دے گل کے اندر کی عورت انگڑائی لے کر سیدار ہوئی۔ اس نے ڈپہ پکڑ لیا مگر ذکی تیزی سے مڑ کر باہر نکل گئے تھے۔

وہ شدید سی کھڑی ڈپے کو گھورتی رہی۔ پھر اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ نہ جانے کیوں؟

”ہیں۔“ وہ گل۔ اگر رب راضی ہو جائے تو۔“ ”میں کچھ نہیں سنوں گی۔ اتنے عرصے کے بعد ذکی بھائی آئے ہیں، آپ بن سنور کر رہا کریں اور ہاں پہ پیغام میرا نہیں، آپ کی ساس کا ہے۔“ اس نے صائم کو گود میں بھر لیا۔

”اسے لے جا رہی ہوں، آپ اچھی طرح حصار ہو کر آئیے گا۔“ وہ تیز تیز کہتی باہر نکل گئی۔ گل نے کپڑے اٹھا کر دیکھے، پھر ڈرنک روم میں چلی گئی، ذکی بھائی صائم کے لیے بہت سامان لائے تھے۔ شائستہ دونوں یہاں رکی پھر اپنے میکے چلی گئی۔

”تم گل کے لیے کیا لائے ہو۔“ نہ جانے کیوں ماں نے ایسا سوال کیا تھا۔ ذکی گڑبڑ سے گئے۔ کتنی عجیب بات تھی صائم کے لیے بہت کچھ خریدتے ہوئے ایک بار بھی خیال نہ آیا کہ انہیں گل کے لیے بھی کچھ خریدنا چاہیے۔ وہ ان کی بیوی ہی نہیں بچے کی ماں بھی تھی۔

ماں کچھ لمبے بیٹے کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر اک طویل سانس لے کر اٹھیں۔ الماری کھول کر ایک سرخ کیس نکالا، پھر ذکی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

”یہ صنوبر کو دے دینا، مت بتانا کہ میں نے دیا ہے۔“ ذکی نے کھول کر دیکھا، وہ اک خوب صورت لاکٹ سیٹ تھا۔

”ذکی! دو بیویاں بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہیں۔ ان میں انصاف اور توازن رکھو، پھر گل تو تمہارے بچے کی ماں بھی ہے۔ اس کا پلڑا یوں بھی بھاری ہے۔ بیوی کی حیثیت سے نہیں تو صائم کی ماں کی حیثیت سے اسے توجہ اور مان دو۔ ٹھیک ہے اسے ساتھ نہیں لے جا سکتے، مگر مجھے میرے بھائی کے سامنے تو شرمندہ مت کرو۔“

وہ سرخ کیس پر نظریں جمائے خاموشی سے کچھ سوچتے رہے۔

”جاؤ اسے دے دو، صائم کو میرے پاس بھجوا دو۔“ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتے اپنے بیڈ روم میں

”مجھے تو لگتا ہے مجھ سے پہلے تم پادیس سدھار جاؤ گی۔“ جھنجھلائی ہوئی زیبا کمرے میں داخل ہوئی تو بیلا نے رسالہ رکھ کر اس کی سمت دیکھا۔

”اب فہد صاحب نے شادی چند ماہ لیٹ کر دی تو اس میں میرا کیا قصور۔“

”اٹھو، ٹھیک ٹھاک ہی ہو، اٹھ کر مل لو۔“

”کس سے؟“

”اپنی ہونے والی ساس سے۔“

”ہائیں۔“ وہ اچھل کر بیٹھ گئی۔ ”میں ہاتھ منہ دھو لوں۔“

”بگو اس مت کرو وہ بیٹھی ہیں، سر تیمور کی والدہ محترمہ۔“

”ارے۔۔۔ انہیں تو تم نے۔۔۔“

”بھگا دیا مگر انہیں بتا چلا کہ تم اب تک سنبھل ہو، تو قسمت آزمائے کو اماں بھیج دی۔“

”تو تم کیوں جل بھن رہی ہو۔“ وہ کھلکھلائی۔

آئینے کے سامنے بال ٹھیک ٹھاک کیے۔ کپڑے تو تھوڑی دیر قبل ہی نہا کر تبدیل کیے تھے، پھر گنگناہی ہوئی پگن میں منہ بھا بھی کے پاس چلی گئی جو مہمانوں کے لیے چائے کا بندوبست کر رہی تھیں۔

جبکہ زیبا سر پکڑ کر رہ گئی۔

”یا اللہ! کیسی بے خبر لڑکی ہے۔“

مہمانوں کے جانے کے بعد گھروالے سر جوڑ کر غور و خوض کرنے لگے۔ کیونکہ سر تیمور کی والدہ باقاعدہ رشتہ ڈال گئی تھیں۔ ظاہر ہے جب بیٹائی راضی تھا تو انہیں کیا اعتراض ہوتا۔

عاشق کو زیبا نے فون کیا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے تم اچھی طرح جانتی ہو۔“

”میں جانتی ہوں، مگر وہ احمق۔ تم نے بھی تو اسے

کچھ نہیں بتایا۔“

”اس کی کچھ سمجھ میں بھی تو آئے، میں نے سوچا تھا اس احمق اور اول جلول سی لڑکی کو کون پسند کرے گا“

سوائے میرے۔“

”وہ اول جلول لڑکی اچھی خاصی خوب صورت

ہے۔“ زیبا نے جتایا۔

”اچھا۔ مجھے تو کبھی نہیں لگی۔“ وہ ہنسا۔

”پھر خواجہ دل ہارے پھر رہے ہو۔“

”وہ تو بچپن سے اسے دیکھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔“

”خیال رہے عادتیں بدلی بھی جاسکتی ہیں۔“ زیبا

نے دھمکی دی۔

”ہاں۔۔۔ مگر محبتیں نہیں۔“ عاشق نے دھیرے سے

کہہ کر لائن کاٹ دی۔

”سنو! گھر والوں نے سر تیمور کو کیا کہا۔“ شام کو بیلا

بڑی رازداری سے زیبا سے پوچھ رہی تھی۔

”بہت جلدی ہے تو کل ہی نکاح پڑھوا دوں؟“ زیبا

جل بھن کر رہ گئی۔

”ہائے نہیں، تم سے پہلے اچھی لگوں گی؟“ وہ شرما

گئی۔ ”زیبا بس مٹھیاں بھیج کر رہ گئی۔ گھر میں کچھ دن

رُاسرار سرگرمیاں چلتی رہیں۔ باوجود کن سوئیاں لینے

کے بیلا کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ پھر بتا چلا سر تیمور کو انکار

کر دیا گیا ہے اور ایک شام پھوپھو نے اسے ووج کر

خوب بلا میں لیں۔ پانچ ہزار ہاتھ پر رکھے۔ مٹھائی منہ

میں ٹھونکی۔ وہ نوٹ ہاتھ اور مٹھائی منہ میں لیے ہکا بکا

سب کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے میں دنیا کا سب سے خوش نصیب

انسان ہوں۔“ بیلا نے کان سے موبائل ہٹا کر گھورا۔

عاشق اس ٹون کو ہضم کرنا اتنا بھی آسان نہ تھا۔

”اچھا۔“ بیلا کو گویا شک تھا۔

”بیلا! تم خوش ہو۔“

”ہاں بہت۔“ اس نے عاشق کی تسلی کے لیے کہہ

دیا۔

”لیکن مجھ سے زیادہ نہیں۔“ وہ پورے وثوق سے

بولتا۔

”ہاں۔۔۔ تم تو تھوڑا تھوڑا کھسکے ہوئے لگ رہے ہو۔“

”بیلا! تم نیند میں ہو؟“ کچھ چپ رہنے کے بعد

عاشق کو پوچھنا پڑا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں تو پوری طرح جاگ رہی

ہوں۔“ اس نے بدقت جمالی روکی۔ حقیقت تو یہ تھی

کہ وہ اچھا خاصا خواب خرگوش کے مزے لے رہی

تھی جب عاشق کی کال آئی۔

”بیلا! چاند کیا کہہ رہا ہے۔“

”چاند۔۔۔“ بیلا نے سر اٹھا کر چاند کو دیکھا۔

چودھویں کا چاند عین دیوار پر کسی چوڑے تھال کی طرح

پڑا تھا۔ ”کانسی کا ایسا تھال جسے اچھی طرح ہاتھ نہ گیا

ہو۔۔۔ اف! بیلا کی پکی! بری پھنسی، زیبا کے موبائل سے

چند روپے ایک اشعار ہی چراتی۔ ساری زندگی تو عاشق

کو عاشق سمجھ کر بات کی، اب منگیتر سمجھ کر بات کیسے

کر دوں۔“

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرتی

کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ تیرا

”ہائے اللہ! ایسا دل دھوؤں سے بھرا چہرہ۔ عاشق!

لگتا ہے تم نے مجھے کبھی غور سے نہیں دیکھا۔“ وہ

بدک کر بولی۔

”میں نے تو ساری عمر تمہارے سوا اور کسی کو دیکھا

ہی نہیں۔ پتا ہے جب تمہارے میں تھیں۔۔۔“

”پالنے میں؟“ وہ چلائی۔

”مطلب۔۔۔ جب تمہارے پاؤں پاؤں۔۔۔“

”گو یا تمہاری نیت بچپن سے ہی خراب تھی۔“

”تم چپ کر کے اظہار محبت نہیں سن سکتیں؟“

”تم نے ہی پالنے اور پاؤں پاؤں چلنے کا ذکر شروع

کر دیا۔ گویا کسی ہیمو کا اشتہار ہو۔“

”تم انتہائی بے ہودہ لڑکی ہو اور جب میں نے کتاب

میں پھول رکھا تو۔۔۔“

”اچھا تو وہ فضول حرکت تمہاری تھی؟“

وہ ایک بل کو بالکل خاموش ہو گیا۔ پھر ٹھہرے

ہوئے لمبے میں بولا۔

”بیلا! میرا دل چاہتا ہے، سامنے والی دیوار سے سر

نکرا دوں۔“

”تمہارے پاس بینڈج کا سامان تو ہے نا۔“ اس نے

ازراہ احتیاط دریافت کیا۔

”بیلا! میں جا رہا ہوں۔“

”نکرا مارنے؟“

”اوہ یو شٹ اپ۔“

”اچھا عاشق! غصہ مت کرو۔ وہ ایسا ہے کہ میں بچپن

سے تمہیں ایک دوست کی حیثیت سے دیکھتی آئی

ہوں۔ اب ایک دم منگیتر کی حیثیت سے تمہاری

رومانک گفتگو مجھے ہضم نہیں ہو رہی، اب تھوڑا

ٹائم تو۔۔۔“

”گڈ نائٹ بیلا! اور ہو سکے تو اس رشتے کی خوب

صورتی اور لطافت کو محسوس کرنے کی کوشش کرنا۔“

لائن کٹ گئی تھی۔ وہ کچھ لمحے خاموشی سے بیٹھی

رہی، پھر عقب میں جھولے پر سر ٹکا کر پورے چاند کو

دیکھنے لگی۔ خنک ہوا میں موتیا و چیلی کی باس گھلی ملی

تھی۔ خوشبوؤں سے بو بھل رات ہو لے ہو لے

سرگوشیاں کرنے لگی وہ ہولے سے مسکرائی۔

”میں اتنی بھی بے وقوف نہیں عاشق صاحب کہ

اس رشتے کی لطافت و خوب صورتی کو محسوس نہ

کر سکوں۔“

اس نے نظروں کا زاویہ بدلا تو نگاہوں میں کھلی

کھڑکی میں ایستادہ وجود آگیا۔ وہ نہ جانے کب سے

وہاں کھڑے سرگٹ پھونک رہے تھے۔

”ذکی بھائی! نیند نہیں آرہی؟“ اس نے ننگے پاؤں

نیچے گھاس پر رکھے وہ کچھ نہیں بولے، البتہ کھڑکی

سے ہٹ گئے تھے۔ بیلا الجھ سی گئی۔

”امی! آپ کو نہیں لگتا، ذکی بھائی کچھ پریشان اور

الجھے ہوئے ہیں۔“ بیلا کو عادت تھی، جودل میں ہوتا

فورا ”اگل دیتی۔ امی نے گھور کر اسے دیکھا۔

”سوچتی ہوں، زیبا کے ساتھ اس کی بھی شادی

کر دوں۔“ سب نے اس غیر متوقع بات پر انہیں

حیرت سے دیکھا۔

”کم از کم میرے سر سے یہ بلا تو ملے۔“
 ”ہاں۔۔۔ شادی کے بعد بھی یہ بلا آپ کے سر
 رہے گی۔ آخر مجھے جانا ہی کہاں ہے؟“ وہ کھلکھلائی
 بڑی امی ہنس دیں۔

”بھئی یہ تو اس گھر کی رونق ہے اور کتنی بھی ٹھیک
 ہے۔ نہ کوئی ہنسی نہ مذاق جب سے آیا ہے یوں ہی
 سنجیدہ سا اندر رہا ہر پھر رہا ہے حالانکہ بیٹے کی خوشی میں تو
 اس کے پاؤں زمین پر نہیں لگنے چاہیے تھے۔“

”میں پھوپھو سے پوچھوں گی۔“
 ”خبردار۔۔۔ تمہیں کوئی ضرورت نہیں دوسروں کے
 معاملات میں ٹانگ اڑانے کی۔“ امی نے گھر کا ”اور“
 یہ بھی یاد رکھو تمہارا ان کے ساتھ اب دہرا رشتہ ہے
 سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔“

”اسی لیے تو ان کے تمام مسائل کو میں اپنے
 مسائل سمجھتی ہوں۔“ بیلا اترائی تو وہ سر پر ہاتھ مار کر
 رہ گئیں۔

”کیا کروں اس لڑکی کا؟“ زیبا بھی تو ہے موقع محل
 حساب کتاب دیکھ کر بات کرتی ہے اسے تو پتا ہی نہیں
 چلتا کون سی بات کہاں کرنا ہے۔“

”اچھا۔۔۔ وہ کون سا غیروں میں جا رہی ہے؟ یہیں
 آنکھوں کے سامنے رہے گی۔“

”اٹھ کر بچن دیکھو! سنیعہ اکیلی لگی ہوئی ہے۔“
 امی نے حسب دستور اسے مصروف کرنا چاہا۔

”لیکن میری بات تو درمیان میں ہی رہ گئی۔“ بیلا
 کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ ماں کے تیور دیکھ کر بچن میں
 بھاگی اور بڑی اماں کو اور کچھ ہونہ ہو بیلا کی باتوں پر
 یقین ضرور تھا تب ہی صنوبر کو بلا کر پوچھنے لگیں۔

”ذکی ٹھیک تو ہے کچھ پریشان ہے تمہیں کچھ
 بتایا؟“

”ایسی کوئی بات نہیں امی! سب ٹھیک ہے۔“ گل
 نے آہستگی سے کہہ کر بات پلٹی۔
 ”اللہ کرے سب ٹھیک ٹھاک ہی رہے۔“

وہ جھولے پر بیٹھے بالکل خاموش اور کسی گہری سوچ

میں مستغرق تھے۔ ماتھے پر گہری ہوتی شکنیں ان کی
 پریشان خیالی کی غماز تھیں۔ تب ہی ان کا سیل فون
 گنگنا اٹھا۔ انہوں نے چونک کر اسکرین پر چمکتے نام کو
 دیکھا۔ پھر اک طویل سانس لے کر آن پر انگلی رکھ دی۔

”تم نے گل سے بات کی۔۔۔؟“ شائستہ نے
 چھوٹے ہی پوچھا۔

”نہیں! لیکن میں جلد ہی۔۔۔“
 ”کیا جلد ہی۔۔۔ ذکی ہمارے پاس اتنا وقت نہیں
 ہے۔ کتنے دنوں سے تم اس کے گھٹنے سے لگے بیٹھے ہو۔“

ابھی تک بات نہیں کر سکے۔
 ”شائستہ! یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“

”میں تمہاری بیوی ہوں۔۔۔ تمہیں بہت اچھی
 طرح جانتی ہوں۔ تمہارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں
 خاص طور پر وہ بات جس میں تمہارا فائدہ ہو۔“ اس
 کے استہزاء نے لہجے پر ذکی لب پہنچ کر رہ گئے۔

”بہر حال تم آج ہی اس سے بات کرو۔ حتیٰ اور
 نتیجہ خیز بات۔“

اسکرین بجھ گئی۔ مگر وہ ہیں بیٹھے رہے۔ شام گرد
 آلود ہو رہی تھی۔

”آندھی آئے گی۔ لڑکیوں! سمیٹا سمیٹی کر لو۔“
 بڑی امی کی آواز آئی۔ ذکی نے سر اٹھا کر گرے ہوتے
 آسمان کو دیکھا۔

”سفیان! ذکی تمہیں بتا کر گیا ہے۔“ ماں کی آواز
 اوپری صحن سے ابھری۔ وہ اٹھے اور چوروں کی طرح
 بچن کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔

”فد کی امی کا فون آیا ہے کہہ رہی تھیں شادی کی
 تاریخ طے کر لیں۔“ وہ سب کی نظروں سے بچ کر اوپر
 جانا چاہتے تھے۔

”امی! پہلے دروازے کھریاں بند کر لیں۔“ بیلا کی
 جھنجھلائی ہوئی آواز آئی۔ گل بیٹھی بچے کو دودھ پلا رہی
 تھی۔ انہیں دیکھا تو دوشہ ٹھیک کرنے لگی۔
 ”طوفان آنے والا ہے۔“ بلا ارادہ ذکی کے منہ سے
 نکلا۔

”ہاں۔۔۔ آندھی کے آثار ہیں۔ کھڑکی تو بند کر
 دیں۔“

ذکی نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی۔ کچھ لمحے
 متذبذب سے بند کھڑکی کے سامنے کھڑے رہے۔

”آپ کچھ پریشان ہیں۔“ گل کو پوچھنا ہی پڑا۔
 ”ہوں، نہیں۔“ ان کے اندر سگریٹ کی طلب
 اٹھی۔ جسے دباتے ہوئے وہ اس کے قریب آ بیٹھے۔

گل سمٹ سی گئی۔ بچہ دودھ پیتے پیتے سو گیا تھا۔ انہوں
 نے احتیاط سے اس کا سر ہٹاتے ہوئے قمیص برابر کی
 ذکی آہستہ آہستہ بچے کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

گل کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ آج
 بہت دنوں کے بعد وہ یوں اس کے قریب بیٹھے تھے۔
 تب ہی انہوں نے اچانک پوچھا۔

”گل! مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو؟“
 گل کی سمجھ میں نہ آیا وہ کون سا پیمانہ ہو جس سے
 وہ اپنی محبت ناپ کر بتا سکے۔ ذکی نے آہستگی سے گردن
 موڑ کر اسے دیکھا۔

”بہت۔“ گل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
 ”محبت قربانی مانگتی ہے۔“ انہوں نے ایک بازو
 پھیلا کر اسے خود سے اور قریب کر لیا۔

”کیسی قربانی؟“ گل کا دل دہل سا گیا۔
 ”دے سکو گی؟“ ذکی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”کیسی قربانی؟“ گل نے دہرایا۔ اس کا لہجہ اور
 آنکھیں دونوں خوف زدہ تھیں۔

”صائم مجھے دے دو۔“
 بہت زور کی آندھی اٹھی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ
 اک آواز سے کھل کر دیواروں سے ٹکرائے۔

”مجھے اور شائستہ کو۔۔۔ یہ وہاں امریکہ میں ملے گا
 وہاں کی نیشنلسٹی طے کی۔ کہاں سے کہاں پہنچ
 جائے گا۔ اس کا بہتر مستقبل۔“

”اور میں۔۔۔“ گرد کا طوفان بیڈ روم میں گھس کر ہر
 شے کو آلودہ کرنے لگا۔
 ”تم دوبارہ ماں بن سکتی ہو۔ صائم کے بعد اور بچے

بھی ہوں گے۔ میں آتا جاتا رہوں گا۔“
 گل نے بے یقینی سے ذکی کو۔۔۔ پھر سر جھکا کر گود

میں سوئے بچے کو دیکھا اور اسے ایک دم سے سینے میں
 بچھ لیا۔ اور تیزی سے دور ہٹ گئی۔

کوئی۔۔۔ اپنا کلیجہ نوج کر کسی دوسرے کو دے سکتا
 ہے۔؟ پھر ایک ماں سے اس کی اولاد۔۔۔ یہ کیسا سنگ
 دل انسان تھا۔۔۔ وہ لب بستہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

”خدا کے لیے گل۔۔۔ تمہیں تو اللہ سے بہت
 محبت ہے، اسی کی خاطر ہماری طرف دیکھو۔ ہم نے
 اک طویل عرصہ اولاد کے لیے ترستے ہوئے گزارا ہے

۔۔۔ تم عورت ہو، اس عورت کی محرومی محسوس کرو جو
 کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ تمہیں اللہ اور اولاد دے
 گا۔ یہ بچہ ہمیں دے دے۔ میں اس کے بدلے تمہیں

کچھ بھی دینے کو تیار ہوں۔۔۔ تم کو تو یہ گھر تمہارے
 نام کروں۔۔۔ اس گھر میں جو حصہ ہمارا ہے وہ میں
 تمہیں دے دوں گا اس کے علاوہ بھی۔۔۔“ وہ فریاد کر

رہے تھے۔۔۔ رورہے تھے اور گل کا دل چاہ رہا تھا۔
 اپنے بچے کو کھینچے سے لگا کر یہاں سے دور بھاگ جائے
 ۔۔۔ اسے ذکی سے گھن سی آئی۔ وہ اس کا بچہ خریدنا

چاہتے تھے۔
 ”گل! انہوں نے گل کا پلو پکڑ لیا۔۔۔ تم مجھ سے
 محبت کرتی ہو۔۔۔ تمہیں اسی محبت کا واسطہ۔۔۔ اپنے
 ذکی کو ماپوس مت کرنا۔“

”ذکی! چلے جاؤ۔“ وہ بچے سمیت بیڈ سے نیچے اتر
 گئی۔ ذکی کے ہاتھ سے اس کا پلو چھوٹ گیا، وہ کچھ لمحے
 چہرہ جھکائے یو کی بیٹھے رہے پھر آہستگی سے سر اٹھایا تو

چہرے کے تاثرات جلد سے اور بولے تو آواز میں بلا کا
 گھراؤ۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ اٹھ کر
 اس کے مقابل آکھڑے ہوئے۔ گل سم کر پیچھے
 ہٹی۔

”شائستہ نے مجھے تم سے شادی کی اجازت صرف
 اسی شرط پر دی تھی کہ میں تمہارا پہلا بچہ اس کی گود میں
 ڈالوں گا۔ اب یہ نہیں ہوا۔۔۔ تو میں پاکستان میں نہیں

رہتا ہوں کہ جہاں ایک وقت میں دو دیوہیاں رکھ سکوں۔ وہ میرے خلاف کورٹ میں بھی جاسکتی ہے۔ بلکہ جائے گی۔ سو میرے پاس اس کے سوا اور کوئی آپشن نہیں کہ تمہیں طلاق دے دوں۔

انہوں نے اتنے آرام اور سکون سے کہا گویا طلاق نہیں کوئی نیا سوٹ دلانے کی بات کر رہے ہیں۔ گل دم بخود فکر فکری کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ہواؤں کی شوریدہ سری میں اضافہ ہو گیا تھا۔ گل کو لگا تیز ہوا سے اڑائے لے جا رہی ہے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر ہواؤں میں بکھر رہا تھا اور وہ دم بخود کھڑی تھی۔

”اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد بچے کی لیگل کسٹڈی کا کیس کروا دیا گیا۔ کب تک اسے اپنے پاس رکھوں گی۔ آخر کو اسے میرے پاس ہی آنا ہے۔ فیصلہ تمہارا ہے۔ اب دو گی یا طلاق کے بعد۔“

گرد سے گل کی آنکھیں اٹ گئیں۔ اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔

بچہ اس کی گود میں زور سے کسمسلا۔

”میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”کیا کھا کر اس سانپ کو جنم دیا تھا۔ جو اپنے ہی گھر میں نقب لگانے سے باز نہ آیا۔ اپنے ہی خونی رشتوں کو ڈستے ہوئے اسے ذرا حیا نہ آئی۔“

”کیا بے غیرت و بے جس انسان ہے۔ اک ماں کی گود سے بچہ چھین کر لے گیا۔“

ہر کوئی بھرا ہوا تھا۔ ذکی سامنے ہوتے تو نجانے کیا کر ڈالتے۔ پھپھو گل سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگ رہی تھیں۔ حالانکہ اس پورے قصبے میں ان کا ذرا بھی ہاتھ نہ تھا۔ انہیں تو رنی بھر خیر نہ تھی کہ بیٹا کیا کچھ سوچے بیٹھا ہے۔ بھٹک بھی پڑ جائی تو کیا ایسا ہونے دیتیں؟

شائستہ اور وہ دونوں ہی غائب تھے اور ان کے موبائل بھی بند تھے۔

”کیوں کیا۔ گل! تو نے کیوں اپنا بچہ اسے دے دیا

۔۔۔ ارے کچھ ہمیں بتایا ہوتا۔ آواز تو دی ہوتی۔۔۔ کیسے اپنا کاجیج نکال کر اپنی سو کن کو سونپ دیا۔ گل! تو انسان ہے یا پتھر۔۔۔ بڑی امی اسی کو دودھ پلانے لگیں۔۔۔ جویوں چپ اور گم صم تھی۔ گویا نہ کچھ دیکھتی ہو نہ سنتی اور اس کی چپ سے سب کو خوف آ رہا تھا۔ صبح معمول کے مطابق ہی ہوئی تھی۔ گھر کی خواتین نے رات کی آندھی کی وجہ سے اٹھتے ہی دھلائیوں شروع کر دی تھیں۔ پھپھو نے تشویش سے گل کے کمرے کی طرف دیکھا۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ گل نے فجر کے وقت اٹھ کر کمرے کا دروازہ نہ کھولا ہو۔

”ابھی تک سو رہے ہیں۔“ وہ فکر مند تو تھیں مگر کچھ سوچ کر مسکرا دیں۔ تھوڑی دیر میں بیلا اور آئی اور آتے ہی دروازہ دھڑ دھڑا دیا۔ صائم کو دیکھے بناس کی صبح ہی کہاں ہوتی تھی۔ دروازہ لاک نہ تھا کھلا پلا گیا وہاں نہ صائم تھا نہ ذکی بس گل کی بے جان میت کی طرح بیٹھی تھی۔ بیلا کے بار بار جھنجھوڑنے پر اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔

”وہ صائم کو لے گیا۔“

”کیوں اس بد نصیب کو ستاتی ہو۔ میرا بیٹا ہی ذلیل اور کمینہ نکلا کاش لوہ واپس ہی نہ آیا ہوتا۔“ پھپھو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بڑے ابا بے جان سے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

”لیکن ہم یوں خاموش ہو کر تو نہیں بیٹھ سکتے۔

ہم اس کے خلاف کیس کریں گے ابو۔۔۔ وہ اتنے چھوٹے بچے کو ماں سے الگ نہیں کر سکتا۔“ سفیان بہت غصے میں تھے۔

”گل بیٹا! اس نے تم سے کچھ کاغذ وغیرہ تو سائن نہیں کروائے۔“ پھپھو نے ابو بار بار پوچھ رہے تھے۔ گل نے باری باری اپنے پیاروں کے پریشان چہروں کو دیکھا۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ وضو کر کے باہر نکلی۔ دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھا اور سائیڈ سے جائے نماز اٹھا کر بچھانے لگی۔ وہ سب دو کون سے دیل سے مشورہ کریں، ڈسکس کر رہے تھے۔ ایک دم چپ ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

پھپھو اپنی جگہ لرز کر رہ گئیں۔

گل نے اپنا مقدمہ رب کے حضور پیش کر دیا تھا۔

جس زندہ دونوں کا سلسلہ تھا۔ اداسی گھر کی دیواروں پر مکاری کی طرح پھسکڑا مارے بیٹھی رہتی۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے نظریں چرائے پھرتا۔۔۔ کبھی کبھی بڑی امی ضبط نہ کر پاتیں تو سکیوں سے رونے لگتیں اور بیلا بے حسی سے سوچتی۔

”انہیں تو اور رونا چاہیے۔“

وہ سب کو گل کا محرم سمجھتی تھی۔ ان سب نے گل کو گل کو برباد کیا تھا۔۔۔ نجانے اسے کس کس پر غصہ تھا کہ سب کام چھوڑے بیٹھی تھی اور پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔ سنا تھا ذکی کا فون پھپھو کے پاس آیا تھا۔ بہت معافی تلافی کر رہے تھے۔ پتا نہیں پھپھو نے کیا کہا۔ بیلا کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ جو ظلم ہوتا تھا وہ ہو چکا۔ کیسی معافی اور تلافی تو ممکن ہی نہ تھی۔

گل کئی دن بے حس و حرکت جھولے پر پڑی رہی۔ بہت دن بخار ہی نہ اترتا تھا۔ اس کے اندر رزق کا دریا خشک ہو کر صحرا ہو گیا تھا۔

”اب وہ ڈبے کا دودھ پیتا ہو گا۔“ وہ اپنے خشک سینے پر ہاتھ رکھ کر ہوتی۔

”کیا وہ شائستہ کو دیکھ کر اسی طرح ہمتا ہو گا۔۔۔ جیسے مجھ دیکھ کر۔“

”پتا نہیں وہ اسے شہد بھی چٹاتی ہو گی یا نہیں۔“

قریب ہی آجٹ ہوئی پھر بیلا کی آواز آئی۔

”آئی! کھانا کھالیں۔“

”یہ سب لوگ مجھے تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔“ گل نے بے حد چڑ کر سوچا مگر خاموشی سے اٹھ بیٹھی۔ بیلا نے شرے اس کے سامنے رکھ دی۔ شملہ مرچ اور قیتے کا سالن تھا۔ کھیر کی پلیٹ، سلاد راستہ۔۔۔

اس نے بے دلی سے توالہ بنایا۔

”آئی! آپ نے صائم ان کو کیوں دیا؟“ اس سوال کا

جواب مل کے ہی نہ دیتا تھا۔

”جاؤ۔۔۔ بیلا! میرے لیے کھانا مت لایا کرو۔ بھوک ہو گی تو کچن سے لے لوں گی۔“ بیلا کے لاکھ اصرار پر بھی اس نے دوسرا توالہ نہ توڑا۔ وہ کچھ تاتی ہوئی شرے کچن میں بیچ کر کمرے میں آ گئی۔

”بے وقت تذکرہ چھیڑا۔“

”ہر وقت جھنجھلاتی رہتی ہو۔ اس طرح صائم واپس آجائے گا؟“ زیبا نے ٹوکا۔ اس کے جواب دینے سے قبل ہی بیڈ پر پڑا اس کا موبائل بجنے لگا۔

”عاشق! بار بار کال کر رہا ہے۔“ زیبا غالباً پہلے ہی اس کا نام پڑھ چکی تھی۔ بیلا نے موبائل اٹھا کر آف کیا اور الماری میں ڈال دیا۔ زیبا نے تعجب سے بیلا کے اس طرز عمل کو دیکھا۔

”تم عاشق کو کیوں آگور کر رہی ہو۔“ بیلا نے جواب نہیں دیا۔ مڑ کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔

”اس کا دل غ کچھ زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے۔“ زیبا زور لب بڑبڑلاتی، پھر اپنے موبائل سے عاشق کا نمبر ملائے لگی۔

کوئی کب تک بیٹھ کر ایک ہی دکھ کو روئے۔۔۔ انسانی فطرت ہے۔ سو سب ہی دھیرے دھیرے اپنی اپنی زندگیوں کی طرف پلٹنے لگے۔ اب یہ تو ماں کا دل جانتا ہو گا جس نے اپنی نیڈیں اپنے تخت جگر کی کاٹ میں رکھ دی تھیں اور اب دن رات مصلیٰ پر بیٹھی اپنے رب سے مناجات کرتی تھی۔

سنا تھا کہ ذکی نے گل سے بات کرنے کے لیے فون کیا تھا مگر اس نے انکار کر دیا۔ اب کوئی بھی بچا اس کے لگائے زخم کو سکون نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے الفاظ گل کے سینے میں امی کی طرح گڑے تھے۔ اس نے ذکی سے محبت کی تھی اور ذکی نے اسے صرف استعمال کیا تھا۔

”کیا رشتوں کو بھی چیزوں کی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے؟“ عاشق کو چھٹی نہیں ملی تھی۔ مگر گل کے

لیے بے حد دکھی تھا، اوپر سے بیلا کی یہ رخی جو موبائل بند کر کے اسے یکسر نظر انداز کر رہی تھی۔
”آخر وہ چاہتی کیا ہے۔۔۔“ اس نے جھنجھلا کر زیبا سے پوچھا۔

”ذکی بھائی کا غصہ تم پر نکال رہی ہے۔ تھوڑا وقت گزرے گا تو ٹھیک ہو جائے گی۔“ زیبا نے تسلی دی۔
”نعمد کے والدین تاریخ طے کرنا چاہتے ہیں۔“
بڑی امی نے بڑے ابو سے کہا۔ رات کے کھانے پر سب ہی موجود تھے۔ بڑے ابو کی نظریں بے اختیار گل کی طرف اٹھیں۔ گل نے بغیر نظریں اٹھائے آہستگی سے کہا۔

”بلا لیں ابو۔۔۔ کب تک ٹالیں گے۔“
”ہوں۔“ انہوں نے چھوٹے بھائی کو دیکھا۔
”اتوار کو بلا لیں۔۔۔“ انہوں نے گویا سہارا دیا۔
پچھو نے اضطرابی انداز میں پہلو بدلا پانی کا گلاس بھرا۔ ذرا سا کھنکھاریں۔

”وہ عاشر چاہ رہا تھا۔ زیبا کی شادی میں اس کا اور بیلا کا نکاح بھی ہو جائے تو۔“
ذکی نے انہیں بھائیوں کے سامنے ٹکوتا دیا تھا۔ باقی سب نے صلاح کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بیلا نے چیخ اک آواز کے ساتھ پلیٹ میں پٹخا زیبا نے گھبرا کر اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا جسے بیلا نے تیزی سے جھٹک دیا۔

”ابو۔“ اس نے سب کو چھوڑ کر براہ راست باپ کو مخاطب کیا۔ ”زیبا کی شادی طے کریں میری نہیں۔“
”کیا حرج ہے اگر۔۔۔“ پچھو نے کچھ کہنا چاہا۔ اس نے تیزی سے بات کاٹ دی۔
”حرج ہے پچھو! کیونکہ مجھے عاشر سے شادی نہیں کرنا ہے۔“

اس نے صاف لہجہ و آواز میں کہا اور دسترخوان سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ سب اپنی جگہ متحیر رہ گئے تھے۔



ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا مگر

اس کی نہ ہاں میں نہ بدلی۔ وہ ضدی تو کبھی بھی نہ تھی مگر اب ضد کر رہی تھی۔
”تم عاشر کو کھو کر بچھتاؤ گی۔“ زیبا نے لتاڑا۔
”میں پا کر بچھتا نا نہیں چاہتی۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولی۔

”سب کو ایک ہی لاٹھی سے کیوں ہانک رہی ہو۔۔۔“ عاشر ایسا نہیں ہے۔“
”اچھا۔۔۔ کیا گارنٹی ہے۔۔۔؟“ اس نے طنزاً پوچھا۔

”تمہارا دماغ خراب ہے؟“ زیبا چڑ گئی۔
”تم خاموشی سے اپنی شادی کی تیاری کرو۔۔۔ میری فکر چھوڑ دو۔“ وہ آرام سے اٹھ کر نہانے چل دی۔
”لیکن عاشر میں برائی کیا ہے۔“ زیبا نے چلا کر پوچھا۔

”یہی کہ وہ ذکی کا بھائی ہے۔“ اس نے دھاڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ عاشر نے فون پر سنا تو خوب ہنسا۔
”یہ بننے کی بات ہے؟“ زیبا نے اچھٹکے سے دریافت کیا۔

”اس کی عقل پر ہنسی آرہی ہے۔“
”تم یہ سوچو کہ اس کے عقل ٹھکانے کیسے لائی جائے۔“
”فکر نہ کرو۔۔۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ ابھی غصے نے ہر جذبے پر پردہ ڈال دیا ہے۔۔۔ تھوڑا وقت گزرے گا تو سب کچھ صاف صاف دکھائی دینے لگے گا۔ میں بھی اور میری محبت بھی۔“

”گویا تم نکاح کے فیصلے سے دستبردار ہو رہے ہو؟“
”ہوناڑے گا۔ میں زبردستی اسے اپنی زندگی میں شامل نہیں کرنا چاہتا خود غرض کہلاؤں گا۔“
”اور اگر وہ۔۔۔“ زیبا کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”وہ جذباتی ہے“ بے وقوف نہیں۔۔۔ مجھے اپنے رب اور اپنی محبت پر یوراثتیں ہیں۔“
”اچھا بھئی جیسے تم لوگوں کی مرضی شادی میں تو آو گے نا۔۔۔“

”دکوشش کروں گا، چھٹی ملنا بہت مشکل ہے۔ گل

اپنی کیسی ہیں؟“
”بظاہر تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔“ زیبا نے اک طویل سانس لے کر کہا۔



گھر میں شادی کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔
ناریاں تو دونوں گھروں میں بہت عرصے سے ہو رہی تھیں، پھر بھی چھوٹے چھوٹے کام نکلتے چلے آرہے تھے۔ گل نے کئی سوٹ اپنے ہاتھوں سے کاڑھے تھے۔ بس ایک ہی دل دکھائی بات تھی کہ ہر آنے والا مہمان گل سے بچنے کی بابت ضرور دریافت کرتا، مگر تبصرے، حیرانی، وہ کس حوصلے سے یہ سب سہار رہی تھی۔

وہ مہندی کی رات تھی۔
خوشبو بھرا ہنگامہ عروج پر تھا۔ بیلا کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں رکھنے کمرے میں آئی تھی، جہاں خواتین جمع ہیں۔

”بھئی! اب بیلا کے بارے میں سوچو۔۔۔ لڑکیوں کا مناسب عمر میں رشتہ ہو جائے تو اچھا ہے۔“
بیلا نے پلیٹ کر اس خاتون کو دیکھا جو اس کی ماں کو گھیرے بیٹھی تھی۔

”جو اللہ کو منظور۔“ وہ ہلکے ہلکے مسکرا رہی تھیں۔
بیلا کو عجیب سے احساس نے گھیر لیا۔ اس نے پہلی بار اپنے معاملے کو ماں کے حوالے سے دیکھا تو ندامت سی محسوس ہوئی۔ اس کے انکار نے انہیں کس مشکل سے دوچار کیا ہے، اس کا احساس بھی اسی لمحے ہوا۔
وہ ٹال رہی تھیں اور خاتون کو بیلا کے سوا اور کوئی موضوع ہی نہ مل رہا تھا۔ بیلا جھنجھلا کر باہر نکلی تو درازے میں کسی سے ٹکرائی۔

”سنجھل کر یا۔۔۔“
”تم۔“ وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ عاشر کو افسوس سا ہوا۔ اس کا وہ بے ساختہ اظہار آج مفقود تھا۔

”تو بیلا بی بی! میری رسائی ابھی تک آپ کے دل تک نہیں ہوئی۔“ عاشر نے سوچا، بیلا کتنا کر نکل گئی۔

عاشر خواتین کے گھیرے میں تھا۔۔۔ مریم اور فرح کے آنے سے شادی کی رونق دوبالا ہو گئی۔ فیضان اور سونیا آتو نہ کے مگر زیبا کے لیے بہت سے گفتنیسی بھجوائے تھے۔ خصوصاً فیضان کو شادی میں شریک نہ ہونے کا بے حد افسوس تھا جس کا اظہار اس نے بار بار فون کر کے کیا۔

فون کی ٹیل بھر سے بج رہی تھی۔
بیلا نے چونکا اٹھایا۔۔۔ مگر دوسری طرف ذکی تھے۔ بیلا کی طبیعت مکرر ہو گئی۔ وہ چونکا رکھنا چاہتی تھی۔۔۔ مگر ذکی بول اٹھے۔
”پلیز بیلا! فون بند مت کرنا۔“

”میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتی۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ”میں تو شروع سے جان چکی تھی، اب انتہائی خود غرض اور بے حس انسان ہیں۔“
نجانے گھروالے کس خوش فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ ذکی اس کے لہجے کے تنقیر پر ایک پل کو خاموش ہو گئے۔ پھر قدرے ناگوار مری سے بولے۔

”وہ میرا بچہ ہے۔۔۔ میرے ساتھ رہ رہا ہے۔“
”اچھا اور گل آئی۔۔۔؟ اس پورے ڈرائے میں ان کا کردار ادا کیا تھا۔ وہ صرف بچہ پیدا کرنے کی مشین تھیں۔“ وہ پھٹ پڑی۔ ”ایک ماں کا بچہ تو پتے ہوئے آپ کو ذرا بھی خوف خدا نہ آیا۔۔۔ ذکی صاحب! آپ کو بد دعاؤں سے خوف نہیں آتا۔“

عقب سے کسی نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ریپور تھاں لیا۔ وہ پٹی پھر گل کو دیکھ کر ساکت ہو گئی۔

”گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے بیلا۔۔۔ جاؤ باہر مہندی کی رسم شروع ہو رہی ہے۔“ بیلا متذبذب سی اسے دیکھتی باہر نکل گئی۔

”گل! کیسی ہو۔۔۔؟“ ذکی غالباً اس کی آواز سن چکے تھے۔ وہ خاموش ہی رہی۔

”انے بیٹے کے یارے میں نہیں پوچھو گی۔“
گویا زخم دے کر زخم کھینچنے کی عادت بھی تھی۔
”وہ تمہارا بیٹا ہے۔“ گل کا لہجہ سپاٹ تھا۔ باہر

ڈیک فل آواز میں جلنے لگا۔
”تم نے شادی کے لیے کپڑے بنوا لیے۔۔۔ میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں۔۔۔“

گل کو لگا اس کے کان بند ہو رہے ہیں اور وہ کہہ رہے تھے۔

”تم میری بیوی ہو۔۔۔ تمہاری ضروریات کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔۔۔ اور جو احسان تم نے ہم پر کیا ہے۔۔۔ یقین جانو۔۔۔ ہمارا اپارٹمنٹ خوشیوں سے بھر گیا ہے۔“

وہ اب یہ سب کیوں کہہ رہے تھے اور کس لیے؟ کیا یہ ان کے اندر کا احساس ندامت تھا۔

گل نے ریسیور پٹا اور تیز تیز چلتی اندر چلی گئی۔ باہر ہنگامہ تھا شور اور خوشیاں۔ اندر وہ تھی۔۔۔ اپنی آہوں کو دباتی نجانے آج ہوا کیا تھا کہ وہ قطرہ قطرہ پھسل رہی تھی۔ اس کا اندر کٹ کٹ کر گر رہا تھا۔

اب یہی تھا اس کے اور ذکی کے مابین رشتہ۔۔۔ وہ دنیا کی نظر میں ان کی بیوی تھی اور وہ اس کے رشتے کو روپے سے تول رہے تھے۔

وہ مطمئن تھے کہ ان کا گھر خوشیوں کا گوارہ تھا۔ اور یہ بھول گئے کہ ان خوشیوں کے لیے انہوں نے کسی کی گود پر ان کی تھی۔

آج صائم اس کی گود میں ہوتا تو کیا وہ یوں دنیا کی ترحم بھری نگاہوں کا سامنا کر رہی ہوتی۔۔۔ اس کا خیال تھا۔ اسے صبر آ گیا ہے۔ وہ خود کو سنبھال چکی ہے۔ مگر آج اس خوشیوں بھرے ماحول میں اس نے خود کو کس قدر تنہا اور ویران محسوس کیا تھا۔ اس کا صائم۔۔۔ اس کا تخت جگر۔

اس کی کل کاریاں کھٹکھٹلا بیٹیں۔
اک ہوک تھی جو دل سے اٹھ کر پورے وجود میں پھیل رہی تھی۔

اک درد تھا جو ہمت ڈھا رہا تھا۔
اک آہ تھی جو عرش تک جا رہی تھی۔
ایسی آہ جو ظلم کرنے والے کے ظلم کا حساب لیتی ہے۔

ایسی آہ جو نہ چاہتے ہوئے بھی بددعا بن کر لوگوں سے لپٹ جاتی ہے۔

دوبچے کا عالم تھا۔۔۔ تھکن کی ماری خواتین لڑکیاں اور بچے یہاں وہاں لڑھک گئے۔ بیلا نے بھی جلدی جلدی مٹھائیوں کے ڈبے وغیرہ سنبھالے۔۔۔

چائے کا کپ امی کو دینا تھا۔ اس کے بعد وہ فوراً سو جانا چاہتی تھی۔ اس نے چائے کپ میں نکالی، پگن کی لائٹ اور دروازہ بند کیا۔۔۔ اور چائے لے کر باہر کمرے میں آگئی جہاں دیگر خواتین محو خواب تھیں۔

”جیتی رہو بیٹی۔۔۔ اب تم بھی سو جاؤ۔۔۔ ورنہ آج تم نہیں کھلے گی۔“ انہوں نے نرمی و شفقت سے کہا تو وہ جاتے جاتے پٹی اور بچھکے ہوئے پوچھنے لگی۔

”امی! آپ مجھ سے ناراض تو نہیں۔“
”کس لیے؟“ وہ چونکی۔
”وہ میں نے جاسٹر کے۔۔۔“ اس نے دانستہ جملہ ادا دھور اچھوڑا۔ انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔

پھر پوچھا۔
”تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے؟“
”غلطی! اس نے تحیر سے ماں کو دیکھا۔“ مجھے نہیں لگتا میں غلطی پر ہوں۔“

”والدین اپنی اولاد کا برا چاہ سکتے ہیں؟“ انہوں نے رسالت سے دریافت کیا۔
”لیکن ان کے فیصلے غلط تو ہو سکتے ہیں۔“ اس نے واضح انداز میں ان سب کے ایک غلط فیصلے کو جتایا تھا۔ وہ خاموش سی ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں آپ سب کی رضا میں راضی ہوں لیکن۔۔۔“ اک رشتے دار خاتون نے کروش بدلی وہ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور اوپر آگئی جہاں بیڈ پر زیبا، مریم ان کے بچے کھم گتھا سو رہے تھے نیچے فرج اور اس کی ننگ گدے بچھائے پڑی تھیں اسے بھی انہیں کے درمیان جگہ بنانا تھی۔ مگر چینی سی تھی۔ تب ہی لینے کے بجائے وہ موبائل

کھال کر بیٹھ گئی۔ شادی کی وجہ سے اسے اپنا موبائل دوبارہ آن کرنا پڑا تھا ورنہ اس کا ارادہ تھا کہ وہ یہ سیل ماسٹر کو واپس کر دے گی۔

وہاں اسی نمبر سے SMS منتظر تھا۔
بیلا نے نہ چاہتے ہوئے بھی کھول لیا۔
”کیا تم بھی پھر

شام کی دہلیز پر آس کی آہٹ پر دروازے کی جانب بھاگے جاتے ہو

کیا تم بھی درد چھپانے کی کوشش کرتے

اکثر تھک جاتے ہو اور بن کارن مسکاتے ہو کیا تم بھی نیند سے پہلے پلوں پر ڈھیروں خواب سجاتے ہو یا پھر بے خواب چیزوں میں روتے روتے سو جاتے ہو کیا تم بھی؟

”میں اس وقت کا انتظار کروں گا جب میری محبت تمہارے دل پر یقین بن کر اترے۔“
”گل آپ پر بھی یہ محبت یقین بن کر اتری تھی۔“

اس نے بیزاری سے موبائل ایک طرف ڈال دیا۔
”محبت ذکی نے نہیں گل نے کی تھی۔“ کوئی اس کے اندر بولا۔

”تب بھی کیا گل صنوبر اس رویے کی حقدار تھی جو ذکی نے اس کے ساتھ روا رکھا۔“
”ذکی اور عاشر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“ دل

امی ہو رہا تھا۔
”سب مرد ایک سے ہوتے ہیں۔“
”ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں؟“

”میں انگلیوں کی بات نہیں کر رہی۔“
”ایک ماں کی پانچ اولادیں اپنی عادات، خیالات و ہذبات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ تم

ماسٹر اور ذکی کو ایک پلڑے میں کیسے رکھ سکتی ہو؟“
”تم کو اس بند کرو۔“
”اچھا آخری بات، محبت کو ٹھکرانے والے

بے عیب ہوتے ہیں۔ بالکل ذکی کی طرح۔“

وہ دم بخود رہ گئی۔ کیا وہ بھی ہاشم کی مرتکب ہو رہی ہے جس طرح ذکی ہوئے۔ کمرے میں ٹھٹھن بڑھ گئی یا اس کے اندر اضطراب۔

اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی، پھر ٹھٹھ گئی۔
سامنے اندھیرے میں دو نفوس تھیں۔

ایک آنسو بہاتا، دوسرا آنسو پوچھتا ہوا۔
وہ دونوں اس کے دل کے بے حد قریب تھیں۔

”اب بولو! کیا اس حساس دل کو تمہیں پہنچا کر خوش رہ پاؤ گی؟“

اس نے بے جان ہاتھوں سے کھڑکی بند کر دی۔

اسٹیج پر بیٹھی زیبا کے چہرے پر الوہی خوشیوں کا عکس چھلکتا تھا۔
وہ لیمہ کی دلہن تھی، شو شراہٹ کی جگہ مسکراہٹ اور گہرا ہٹ کی جگہ خود اعتمادی نے لے لی تھی۔ پہلو

میں بیٹھا فمد شاداں و فرحال دکھائی دیتا تھا۔ ہلکی پھلکی آپس میں گفتگو بھی جاری و ساری تھی۔
”ابھی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں۔۔۔ کچھ عرصے

کے بعد آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔“ ساڑھی سنبھالتی فرح نے چڑ کر کہا۔ اس کی ساس کی فرمائش تھی کہ وہ شادی میں سارا زور پٹنے۔۔۔ سو وہ لدی پھندی ہنزار بیٹھی تھی۔ بیلا کو ہنسی آگئی۔

”سچ کہتی ہوں بیلا! شادی کے بعد سب کچھ بدل جاتا ہے۔“

اس سے پہلے کہ وہ مزید روشنی ڈالتی۔۔۔ امی نے بیلا کو آواز دے دی۔
”گل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ ہم ابھی گھر

چلتے ہیں۔ کھانا تو کھا ہی چکے ہیں۔ میرے بھی سر میں درد ہے۔“
”ٹھیک ہے۔“ وہ زیبا سے لے اسٹیج کی طرف چلی گئی۔ باہر آئی تو عاشر گاڑی لیے منتظر تھا۔ اسے بھی ابھی واپس جانا تھا۔ سارا راستہ اور امی باتیں کرتے



آئے، جبکہ بیلا گاڑی سے باہر جھانکتی رہی۔ عاشق کا دل چاہا وہ اس کی تعریف کرے۔ وہ آف وائٹ فرائڈ اور پاجامے میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی مگر ایک تو مملانی کا لحاظ مانع تھا۔ دوسرا اس کے خیال میں وہ پہلے ہی خاصی بگڑی ہوئی تھی۔ گھر آکر امی نے گل کو دیکھا۔ وہ تڑھال سی لیٹی تھی۔ حالانکہ بخار بھی نہ تھا۔ بس گل سے یونہی پڑی تھی۔

”میں کپڑے بدل لوں۔ گل کو کھانا کھلا دو۔“

”میں کھالوں گی، آپ فکر نہ کریں۔“ گل اٹھ کر بیٹھ گئی۔ امی گئیں تو اس نے بیلا کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔

”ابھی رہنے دو۔۔۔ بعد میں کھالوں گی۔۔۔ تم بتاؤ۔“

”زیادہ کیسی لگ رہی تھی؟“

”بہت پیاری۔۔۔“ وہ اسے چھوٹی چھوٹی باتیں بتانے لگی۔ تب ہی عاشق آگیا۔

”اچھا گل آبی! اب مجھے اجازت دیں۔“

”اتنی جلدی؟“

”جی، اتنی ہی چھٹی ملی تھی۔“ وہ ان کی دوسری طرف پر بیٹھ گیا۔ بیلا اٹھنے کے لیے برتن لے گئی۔ گل نے بیلا کا ہاتھ پکڑ لیا اور نرمی سے پوچھنے لگی۔

”ابھی تک عاشق سے خفا ہو۔۔۔“

”میں کسی سے خفا نہیں ہوں۔۔۔“ وہ جبر ہو گئی۔ عاشق کے سامنے جواب طلبی کی توقع ہی کہاں تھی۔ عاشق مبہم سا مسکرایا۔

”محبت کو ناراض نہیں کرتے۔“

”مجھے کسی سے محبت نہیں۔“ بیلا نظریں چرا گئی۔ عاشق بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

”اسے تو ہے۔۔۔“

”آبی! مجھے جانے دیں۔“ وہ بے بس ہو کر بولی۔

”جاؤ۔۔۔ لیکن میری بات سنو۔۔۔“

”آپ بتائیں۔ کیا آپ کو صبر آگیا ہے؟“ بیلا نے تیزی سے بات قطع کی۔

”بار بار ایک ہی بات کیوں کرتی ہو۔ محبت نے قربانی مانگی تھی میں نے دے دی۔“

”اولاد کی قربانی؟“ بیلا سے قبل عاشق بول اٹھا۔ گل صنوبر چپ سی ہو گئی پھر دھیمے سے بولی۔

”بیلا۔۔۔ عاشق! مجھے صرف ایک بات کا یقین ہے۔ میرا خدا نا انصافی نہیں کرتا۔ جو میرا ہے اسے لوٹ کر میرے ہی پاس آتا ہے۔“

گل صنوبر کا لہجہ پرسکون تھا۔ فون کی گھنٹی اک ٹوڑ سے بجنے لگی تھی۔ پھر آواز آتا ہند ہو گئی۔ یقیناً امی نے فون ریسیور کر لیا تھا۔

”آبی! یہ لاجبک میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کب صائم بڑا ہو گا۔ کب اسے پتا چلے گا کہ اس کی ماں شائستہ نہیں گل صنوبر ہے۔“

”گل صنوبر۔۔۔ امی افتاب و خیزاں کمرے میں داخل ہوئیں۔

”کچھ سناؤ ذکی کا فون تھا۔ وہ شائستہ۔ شائستہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں۔۔۔ ان کا گلارندہ گیا۔“

”ذکی۔۔۔ ڈیڈ باڈی کے ساتھ کل پاکستان آ رہا ہے۔“

وہ سب دم بخود تھے۔ گل صنوبر ساکت و صامت تھی۔

اس نے تو ایک بار بھی شائستہ کے بارے میں ایسا نہیں سوچا تھا۔ اس کا اس قصے میں کیا کردار ہے۔۔۔ اس نے تو کسی کو بد دعا نہیں دی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ شائستہ کی جواں مرگی پر افسوس کرے یا بیٹے اور شوہر کی واپسی کی خوشی منائے۔

وہ آہستہ سے اٹھی اور وضو کرنے چلی گئی۔ امی رو رہی تھیں۔

عاشق اپنے موبائل پر کسی کا نمبر ملا رہا تھا۔ بیلا نے پلٹ کر دیکھا۔

گل صنوبر جائے نماز بچھا رہی تھی۔ اس نے ابھی کہا تھا۔

”مجھے خدا کے انصاف پر پورا یقین ہے۔ جو میرا ہے اسے لوٹ کر میرے ہی پاس آتا ہے۔“

250ml میں بھی دستیاب ہے۔

Scan & PDF FIAZ AHMED Friends Korney.com

سکون علی بیٹ

دلالت حسنہ

مکمل ناول

کہانی کا آغاز اس شخص سے ہوتا ہے جو شدید دکھ پریشانی اور ذہنی اذیت کی کیفیت میں ہے۔ وہ اس کیفیت سے نکلنے کے لیے کسی کو فون کرنے کے لیے نمبر ڈائل کرتا ہے۔
ایک ماں اپنے بچے کی خاطر دوسرے شادی کرتی ہے لیکن اس کا شوہر بچے کو رکھنے سے انکار کر دیتا ہے مجبوراً "وہ بچے کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔
کہانی کا تیسرا ٹریک وہ ادھیڑ عمر عورت ہے جو ایک قبرستان میں رہتی ہے اور ایک قبر پر پھول چڑھانے کے لیے خریدتی ہے۔

ماہم اور شاہم کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ماہم کی شادی اس کے چچا زاد بھائی منصور سے ہوئی ہے اور اس نے اپنی چھوٹی بہن شاہم کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ منصور شاہم کو پوری شدتوں سے چاہتا ہے لیکن شاہم کا رویہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہے وہ ماضی میں کسی کو چاہتی رہی ہے۔ وہ شخص کا شاہم ایک دن اچانک کا شاہم سے نظر آتا ہے تو ایرانی چاہت بے دار ہو

جائی ہے۔ کاشا ایک انتہائی اکڑ مزاج نوجوان ہے۔ جو ہر طرح کا شہ کرتا ہے اور اس کے کئی لڑکیوں سے تعلقات بھی ہیں۔ اس کی چھوٹی بہن شاہم ایک نوجوان ارسل کو چاہتی ہے۔ ارسل کی ماں اس رشتے پر رضامند نہیں اپنے باپ کے مشورے پر ارسل اپنا گھر چھوڑ کر ایک فلیٹ لے کر اس میں رہنے لگتا ہے تاکہ اس کی جدائی ماں کو یہ رشتہ قبول کر سکے۔ مجبور کر دے۔

ماہم منصور کی محبت اپنے بچوں، شوہر، عزت سب کو بھلا کر کاشا کو فون کر کے ملنے کے لیے کہتی ہے۔ کاشا کو ماہم سے صرف اس لیے دلچسپی ہے کہ منصور نے اس کے نام ڈیفنس میں گھر کر رکھا ہے لیکن ماہم کے لیے کاشا سب کچھ ہے۔ وہ بہانے بنا کر کاشا سے ملتی ہے۔ منصور جانتا ہے لیکن خاموش رہتا ہے لیکن ایک دن ماہم کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے۔ منصور ایک دم سکتے میں آ جاتا ہے ماہم روتی ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا اس لیے اس کا مطالبہ پورا کر دیتا ہے اور خود شہر سے باہر چلا جاتا ہے۔ شاہم کو گھر کے ملازمین سے پتا چلتا ہے کہ ماہم طلاق لے کر جا چکی ہے۔

چوتھی قسط

اسے یاد آیا کہ وہ تین دن سے بھوکا ہے، کتنی بار کھانا سامنے لا کر کھا اور اصرار کیا گیا خود کا ہر زاویے سے بے تاثر سا جائزہ لینے کے بعد وہ میکائی انداز میں وارڈروب کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا شعور متحرک سا ہو گیا تھا۔ انگریز میں لگتے کپڑوں کو تنقیدی نظروں سے اٹھاتے پلٹے اس نے سیاہ شلوار قمیض منتخب کر لی۔ شاور پوری رفتار سے کھولے وہ ٹھنڈے من پانی کے نیچے پندرہ منٹ کھڑا رہا تھا۔ بر فیلا پانی اس کے مازہ گرم زخموں کو اذیت نہیں دے رہا تھا۔ ایک طویل غسل لے کر وہ بالوں سے پانی انگلیوں سے جھٹکتا باہر آیا۔ ہاتھ لینے سے اس کا شعور حواس قائم کر چکا تھا۔ کیونکہ اسے بھوکے پیٹ کا احساس شدت سے جاگا تھا۔ لیکن فریج میں رات کا بنایا گیا کھانا پڑا تھا کھانے کے ڈونگے دیکھتے ہی اس کا جی پھر سے اچاٹ ہو گیا۔ ہاتھ میں پکڑا ڈونگا واپس رکھ کے اس نے دودھ کا ڈبہ نکال لیا اور چائے بنانے لگا۔ اس دوران اس کے ذہن میں کتنی ہی یادیں ابھرنے لگی تھیں۔ کسی کا وجود باتیں، تہمتیں، چھیڑ چھاڑ اسے خود سے بے گانہ کرنے لگے، ان تکلیف دہ سوچوں سے فرار پانے کے لیے برز کی آج تیز کر دی۔ دھیان بٹانے کے لیے وہ بلاوجہ ہی کیبنٹ کھول کھول کر

خالی دل
خالی دماغ
خالی جسم
اور خالی روح

چائے کے آخری گھونٹ تک ان الفاظ کی گردان اس کے ذہن میں چلتی رہی۔ اچانک کسی کی یاد اس کے اندر ابھری تھی وہ جلدی سے مگ رکھ کر بکھری چیزوں کو مزید بکھیرنا اپنا موبائل ڈھونڈنے لگا، تھوڑی سی کوشش کے بعد موبائل اسے مل گیا۔ اس شخصیت سے بات کرنے کے لیے شاید بڑا حوصلہ درکار تھا اس نے اپنے اندر کی ٹھن کی کھن کو باہر پھینکنے کے لیے

لڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ "ارسل۔۔۔" دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

مطیع الرحمن کی بے تابانہ آواز نے اس کی اندر کی گھن کو خاصا کم کیا تھا۔ رات کے گزرتے اس آخری ہفتے میں بھی انہوں نے دوسری بیل پر فون اٹھایا تھا۔ وہ اپنا "پریشانی میں گھرے رات بھر سو نہیں سکے تھے۔ جہاں اس کے اندر یہ سکون اترتا تھا کہ ابھی بھی کوئی ایسا ہے جو اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کے انتظار میں رات بھر سے جاگ رہا ہے وہیں ان کی پریشانی کے خیال نے اسے پشیمانی میں گھیر لیا۔

"بابا۔۔۔ جانی۔۔۔" وہ بہت ٹوٹ گیا تھا۔ "ارسل میری جان میرے بیٹے کہاں ہو تم؟ تین دن سے تمہاری شکل نہیں دیکھی۔" ان کی آواز میں بے چینیال ہلک رہی تھیں۔

"میں آؤٹ آف شہ تھا بابا جانی!" اس نے وہی سابقہ جھوٹ دہرایا جو ملازم ناصر ہر بار مطیع الرحمن کی کال آنے پر ان سے بولتا رہا تھا۔ اسے ایسا کہنے کو ارسل نے ہی کہا تھا۔

"اتنا بڑا ہو گیا ہے، مگر تجھے اپنے بابا سے جھوٹ بھی نہیں بولنا آیا، بے وقوف۔" ان کی ڈانٹ میں بھی محبت کی شیرینی تھی۔

"آپ کیسے ہیں؟" کھڑکی کے کھلے ہوئے پٹ سے "ٹھکے ہوئے انداز میں پشت جوڑ کر اس نے بات ہی بدل دی تھی۔

"جس باپ کا جوان بیٹا تین روز سے بغیر بتائے غائب ہو، اس باپ کی حالت نہ پوچھو۔"

"ماما کیسی ہیں؟ میرا پوچھا تھا؟" اسے یک دم ماں کی یاد بھی آ گئی تھی۔

مطیع الرحمن نے بیڈ پر خواب خرگوش کے مزے لیتی بیوی کو تاسف سے دیکھا۔ مطیع الرحمن بیٹے کے لیے اتنے پریشان تھے انہوں نے سارے بھی تذکرہ کیا تھا کہ ارسل بغیر بتائے کہیں غائب ہو گیا ہے مگر

انہوں نے ارسل کے ہونے یا نہ ہونے کو قطعاً اہمیت نہیں دی۔

"ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ تمہاری ماں بھی بہت پریشان ہے تمہارے لیے ابھی تو سو رہی ہے۔" انہوں نے بہت ٹھہر ٹھہر کے اسے جواب دیا۔ وہ ارسل کا ماں کے حوالے سے دل برا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ارسل کافی دیر پھکی سی ہنسی ہنستا رہا۔

"آپ بھی اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں بابا جانی، مگر آپ کو بھی اب تک جھوٹ بولنا نہیں آیا۔" لہجے میں ہلکی سی شکستگی لا تا وہ ان کا جواب ان ہی کو لوٹا گیا۔ وہ ہمیشہ سے بابا کو ماما کو ایسی چھوٹی بڑی فیور دیتے دیکھتا آیا تھا۔

"فیکٹ از دس میری جان کہ ہم دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بول سکتے۔" انہوں نے اپنی غلط بیانی کا اعتراف کرتے اسے بتایا۔ "ہاں۔۔۔ شاید۔" اس کی کھوٹی کھوٹی سی آواز ابھری۔

"ارسل! تم ٹھیک تو ہونا، کیا براہم ہے؟" مطیع الرحمن نے پوچھا تھا جبکہ ابھی کچھ دیر قبل وہ باپ بیٹا یہ تسلیم کر چکے تھے کہ وہ ایک دوسرے سے کچھ چھپا نہیں سکتے، غلط بیانی یا جھوٹ کو جان بوجھ کر نظر انداز کر جائیں وہ الگ بات ہے۔

وہ باپ کے اس سوال سے بچنا چاہتا تھا۔ "بابا! میں صبح آؤں گا گھر آپ سے اور ماما سے ملنے۔" اس نے بہت ہوشیاری سے موضوع ان کے من کی مراد کی طرف موڑ دیا۔

"جہم جہم آؤ، تمہارا اپنا گھر ہے میری جان۔" اس کے آنے کا سن کر وہ کھل اٹھے تھے۔

"بابا آپ میرا ایک کام کریں گے۔" پتا نہیں کیا سوچ کر وہ پوچھنے لگا۔

"تمہیں بھلا پوچھنے کی ضرورت ہے، بولو تو سہی۔" انہوں نے بڑے دلار سے کہا۔

"آپ۔۔۔ آپ نے مجھے ماما سے معافی دلوانی ہے، میں بہت برا ہوں بابا، میں نے ماما کا بہت دل توڑا ہے،

انہیں ناراض کیا، انکار کیا، اپنی ضد پہ اڑ کر ان سے دور رہ کر بڑی تکلیف پہنچائی ہے میں نے انہیں ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہوتی ہے اور میں کتاب بد بخت بیٹا ہوں، میں ان کے پیروں میں ہی بیٹھ کر معافی مانگوں گا، وہ معاف نہیں کریں گی، ڈانٹیں گی، آپ ان سے میری سفارش کریں گے تو ضرور مان جائیں گی، وہ صرف ایک بار میرے تمام قصور معاف کر دیں، میں آئندہ کبھی بھی ان کا کہا نہیں ٹالوں گا، ان کی کسی بات پر انکار بھی نہیں کروں گا، وہ مجھے معاف کر دیں گی نا بتائیں بابا۔

مطیع الرحمن بہت خاموشی اور بے یقینی سے ارسل کی بات بغور سن رہے تھے۔ اس کے چپ ہونے پر انہوں نے سوئی ہوئی بیوی کو دیکھا جو جتنی دنیا مافیہا سے بے خبر تھی اتنی ہی بیٹے سے بھی۔ انہیں یہ سب سنتے اس کے لہجے کی نمی کا بھی بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ انہیں ارسل کو کن الفاظ میں تسلی دینی ہے، کیا جواب میں کہیں وہ کچھ نہیں جانتے تھے، بالکل خاموش تھے۔

”پلیز بابا! بتائیں نا، چپ کیوں کر گئے؟“ وہ تھوڑی دیر ان کے بولنے کا انتظار کر کے بے قرار ہوا تھا۔

ارسل کی ساری بے قراریاں ان کے اندر سرایت کر گئیں۔

”بس تم اتنا ضرور تمہیں معافی دلوا دوں گا۔“

بمشکل وہ کہنے کے قابل ہوئے تھے۔ وہ ارسل سے اس کے خم لہجے کا استفسار کرنا چاہتے تھے مگر اسے اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ٹال جائے گا، انہوں نے کل اس کی آمد پر پوچھنے کے خیال سے مزید کوئی سوال نہ کیا۔

”میں ضرور آؤں گا۔“ اس نے اپنی آنکھوں کو رگڑتے کہا۔ ”اچھا بابا جانی فون رکھتا ہوں، اب سو جائیے، ڈونٹ وری اینڈ آئی لو یو سوچ۔“

”سنو ارسل!“ وہ اللہ حافظ کہنے ہی والا تھا کہ وہ بول پڑے۔

”مرد۔۔۔ مرد رویا نہیں کرتے، نہیں رویا کرتے

میری جان۔“

یہ کہتے وہ خود رو پڑے تھے۔

فون بند کر کے وہ یوں ہی کھڑکی کے پار اندھیرے میں کسی غیر مرئی نقطے کو تلاشتا رہا۔ ہوا کے دوش پہ سرسراہٹ آواز اس کے قریب آ کر رک گئی۔

”اے لڑکی! ایک تو میں تمہیں اس مشکل گھڑی میں رہنے کو اپنی چھت مہیا کر رہا ہوں، اوپر سے تم مجھے گالیاں دے رہی ہو، اب ایک لفظ بھی بولیں تو کھڑکی سے اٹھا کر ڈال دیتا ہوں۔“

یہ وہ ہی کھڑکی تھی، اس نے لمبا سانس خارج کر کے اس کے دونوں ہٹ بند کر دیے۔ بیڈ کرائون کی دراز میں سے اس نے سیاہ رنگ کی خالی ڈائری پین نکال لیا۔ وہ اپنے دل میں دواؤں کرتے شور اور جسم میں ماتم کنال پین کا کتھار کس لکھ رہا تھا۔ بنا سوچے سمجھے وہ قلم چلاتا جا رہا تھا۔

اس طرح لکھنے سے اس کے اندر ہلکی سی طمانیت پھری لہر دوڑ رہی تھی۔ اس نے کبھی ڈائری نہیں لکھی تھی۔ یہ بھی یوں ہی لا کر رکھی تھی۔

تم کیا جانو، سزا میں کیا ہوتی ہیں؟

تم کیا جانو سزا میں کیا ہوتی ہیں؟

تمہارے لیے تو یہ اک فقط لفظ ہے

تم کیا جانو سزا میں کیا ہوتی ہیں؟

دل کو چٹکیوں سے کوئی مسلتا ہو جیسے

روح کو تمہاری اپنے قدموں تلے روندنا ہو جیسے

خوابوں کو ریزہ ریزہ کرنا ہو جیسے

تم کیا جانو سزا میں کیا ہوتی ہیں؟

کوئی شرارتی بچہ تمہارا کھلونا توڑ دے جیسے

کوئی اجنبی تمہارا ریت کا گھر روندنا توڑ دے جیسے

کوئی مہربان یک دم نامہربان ہو جائے جیسے

کوئی چھت بھی تمہارے سر پر نہ رہے جیسے

کوئی خواب بھی تمہاری نیند میں نہ ابھرے جیسے

کوئی جذبہ بھی دل میں نہ جگہ پاسکے

تم کیا جانو سزا میں کیا ہوتی ہیں؟

قد میں کوئی پرندہ سر ٹکراتا ہو جیسے

پہل کوئی اندھیرے سے گھبراتا ہو جیسے

پتہ کوئی اپنی ماں سے چمچڑ جاتا ہو جیسے

دودھ کا پھرا فیزر گر کر ٹوٹ جاتا ہو جیسے

تم کیا جانو سزا میں کیا ہوتی ہیں؟

روح کو خشک پتوں کی مانند اڑا دیں

وہ سرد ہوا میں کیا ہوتی ہیں؟

تم کیا جانو سزا میں کیا ہوتی ہیں؟

وہ نیچے کارپٹ پر بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

ڈائری لکھنا بھی کتنا عجیب مشغلہ تھا۔ وہ آخری سطریں بار بار لکھ رہا تھا۔

روح کو خشک پتوں کی مانند اڑا دیں

وہ سرد ہوا میں کیا ہوتی ہیں؟

ڈائری نیچے رکھ کے اس پہ پین بھی رکھ دیا۔ دونوں گھٹنے کھڑے کر کے کہنیاں ان پہ جما کے اپنی ہتھیلیاں آنکھوں پہ رکھ لیں۔ وہ رو رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا۔

”مرد بھی رویا کرتے ہیں۔“

وہ کافی کے مگ کو پورے ہاتھ کی ہتھیلی میں چکڑے صوفے پر نیم دراز تھا۔ اس کی قسمت بری تھی کہ آفس سے واپسی پر اس نے کاشا کو کال کی نمبر بڑی جا رہا تھا۔ فراغت سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ ریس کورس چلا گیا۔ چھ کا ہندسہ ہمیشہ سے اس کا لکی نمبر تھا۔ اس کو لے کر وہ زی لی وی بی بیٹھا رہا۔ جب یہاں بات نہ بنی تو غصے اور مایوسی سے گنگ کارڈ پہ طبع آزمائی کرنے لگا۔ بارہ بجے تک وہ چھپتر ہزار کا کباڑہ کرچکا تھا۔ گھر آ کر دواش روم میں فل شاؤر کے نیچے آدھا گھنٹہ کھڑا ہو کر اس نے اپنا کھولنا داغ ٹھنڈا کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ سلیننگ گاؤن لپیٹ کر اسے پینے کا خیال اچانک آ گیا تھا۔ آسکاج کے دو جام چڑھا کر کٹنی پیتے ہی وہ سونا چاہتا تھا۔ کافی کے آخری گھونٹ تھے کہ سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ اسکرین پہ کاشا کے نام نے جلتی پہ تیل کا کام کیا۔

”کیا تکلیف ہے تجھے نیند نہیں آتی؟“ وہ غصے میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ ابھی صرف ڈسٹھ بج رہا ہے اور کاشا مرغ کی پہلی بانگ سن کر بستر پر لیٹا ہے۔

”اچھا، بات سن، ماہم کے پاس چلا جا، وہیں رات ٹھہر، سیکورٹی گارڈ چھٹی پہ اسے ڈر لگ رہا ہے، بار بار مجھے ڈسٹرب کر رہی ہے۔“ کاشا نے اپنا مدعا بیان کیا۔

”تم کہاں ہو؟“ غنی کے لیے یہ نئی مصیبت تھی۔

”میں کسی اور کے ساتھ بڑی ہوں، صبح آکر ڈیٹیل (تفصیل) بتاؤں گا، ابھی نہیں۔“ کاشا نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے کاشا، مجھے اپنے بیڈ کے علاوہ کہیں نیند نہیں آتی۔“

”اسی لیے کہتا ہوں عادت ڈال، کبھی کبھی کہیں اور سو جانے میں ہرج نہیں، بٹ اپنی وے، صبح ہونے میں ٹائم ہی کتنا رہ گیا ہے، آئی پرامس سیون او کلاک، آجاؤں گا۔“

کاشا نے اپنی کہہ کر جلدی سے خون بند کر دیا۔

غنی موبائل کو گھور کے رہ گیا۔

”تو نہیں سدھرے گا خبیث۔“

موبائل گاڑی کی چابی اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر وہ جانے کے لیے اٹھ گیا۔ غنی کی آمد پہ ماہم نے اس کے لیے کمرہ کھول دیا اور خود جاکے آرام سے سو گئی۔ اسے نیند کہاں آئی تھی۔ وہ ساری رات لی وی لاؤنج میں بیٹھا چیلر بدلتا رہا۔ بونے سات بجے وہ ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ کاشا اس کے ساتھ وعدے کا پکا تھا۔ ٹھیک دس منٹ بعد اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ غنی نے سلائیڈ ہٹا کر اسے باہر دیکھا۔

”اٹھ اور ایک بھیجی ڈال دے۔“ کاشا نے ڈرائنگ روم کے دروازے میں گھسٹا ہوا بازو پھیلائے کہا۔

”نہ۔۔۔ نہ مجھے تیری نیت خراب لگ رہی ہے۔“

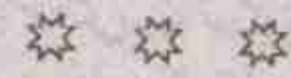
غنی نے قہقہہ لگاتے اسے چمڑا۔

”بیک نہ۔“ کاشا نے اسے گلے سے لگالیا۔

غنی نے چند لمحوں میں ایکٹنگ کرتے اسے پھرتی سے خود سے الگ کر دیا۔
 ”تو صاف پاک ہے نا۔“ اس نے قریب ہو کر کاشا کو سونگھا۔
 ”ہٹ ذلیل، خود تو دودھ سے نہاتا ہے۔“ اس نے اسے زور کی دھپ ماری۔
 ”میری نیند غارت کرنے والے تیرا آوارہ پن ختم کیوں نہیں ہوتا۔“
 ”اس گزری رات کی آوارہ گردی نے میرے خوابوں کی تعبیر مجھے دے دی۔“
 اتنے میں ملازم ٹرائی گھیسے اندر آگیا۔ جس میں بوتلیں تھیں۔
 ”کتنی بار منع کیا ہے پارا نہار پیٹ اس منحوس کو منہ مت لگا یا کر۔“ غنی کو اس کے صبح سویرے پینے سے بہت چڑھتی تھی۔
 ”رات لیلیٰ کے ساتھ تھا، سربراہ رنگ نیوز اڈوس کہ اس نے مجھے پروپوز کیا ہے۔“ اس نے غنی کو بتایا۔ لیلیٰ کی واپسی کا ذکر اس نے غنی سے بھی لیا تھا۔
 ”پھر؟“ غنی نے نا سنجھی سے اسے دیکھا۔
 ”پھر۔ پھر یہ کہ امریکہ جانا میرا خواب ہے اور لیلیٰ کے پاس۔ گرین کارڈ ہے، نیشنلٹی ہو لڈ۔ پروپوزل جانے دینے والا تو نہیں۔“ کاشا گھونٹ پہ گھونٹ بھر رہا تھا۔
 ”اوائے مت بھول، تو شادی شدہ ہے اور تیری بیوی زندہ ہے۔“ غنی بے ساختہ بولا۔
 ”لیلیٰ سے شادی کر کے امریکہ جانے کا چانس پکا ہے۔“
 ”لیلیٰ کی مدد کے بغیر بھی امریکہ جایا جاسکتا ہے۔“ غنی خاصا سنجیدہ ہو گیا۔
 ”صرف جایا جاسکتا ہے، مگر میٹل نہیں ہوا جاسکتا۔ میں اپنے لائف اسٹائل اور اسٹینڈس کو کیسے ریجیمٹ کروں؟ نیشنلٹی کے لیے دھکے کھاؤں؟

محنت مزدوری کروں؟ پر کیوں؟ جب میری لک بھگ گولڈن چالس دے رہی ہے تو میں اسے Avail (حاصل) کیوں نہ کروں؟ لیلیٰ لاکھوں ڈالر کی اونر ہے، وہ سب اپنی مرضی سے میری جھولی میں ڈال رہی ہے، میں ناشکری کیوں کروں؟ اسے لات کیوں ماروں؟“
 اس نے کون سا غنی کی مانی تھی۔ اس کی اپنی وضاحتیں تھیں۔
 ”پر کاشا ایسے ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔“
 ”یا“ نہیں ہوتا ہو گا سب کچھ، کبھی جائزہ لینا غنی اکتے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں لوگ اپنے گھروں میں اپنی حفاظت کے لیے پالتے ہیں۔ مالک کے ٹکڑے کھا کے اس کی رکھوالی میں لڑتے ہیں۔ دوسری قسم گلی کے کتوں کی ہوتی ہے، ان کے گلے میں کوئی پٹہ نہیں ہوتا، نہ ان کا کوئی مالک، نہ یہ کسی کے رکھوالے، یہ کتے صرف اور صرف اپنی ہڈی کے لیے لڑتے ہیں۔ میرا اشارہ ان دوسری قسم کے کتوں میں ہوتا ہے، مجھے اپنی ہڈی کے لیے لڑنا اور جدوجہد کرنا ہے۔ وہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔ اس کا کمال لفظ لفظ سچ تھا۔
 ”تو ناشکرا ہی ہے کاشا! کس چیز کی کمی ہے تیرے پاس کیا۔“
 ”کیا ہے میرے پاس؟ وہ ڈالر کی بھیک، جو میری ماں اپنے شوہر کے چراگے اس سے چھپا کے میرے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے، اپنا گھر نہیں ہے میرے پاس، وہ گھر جس میں اب تو رہ رہا ہے وہ بھی اس شخص کا ہے ابھی۔ یہ جو بانی سوسائٹی کی لڑکیاں میرے آگے پیچھے منڈلاتی ہیں سب کچھ مجھ سے چھن گیا تو ایک بھی دور دور تک نظر نہیں آئے گی، اس سے پہلے کہ میں اپنی اصلی اوقات میں آجاؤں، پانی پانی کا محتاج ہو جاؤں، میں اپنا کوئی بندوبست کرنا چاہتا ہوں، ساری زندگی ڈالر تو نازل نہیں ہوں گے، آخر اس سلسلے کو کبھی تو بند ہونا ہی ہے، میں جو کر رہا ہوں کرنے دو مجھے۔“
 اس کا اپنا موقف بہت مضبوط تھا۔ ایسے معاملات

اس نے کبھی کبھی نہیں سنا تھا۔ ابھی بھی غنی کو کچھ کہنا بیکار رہا تھا۔



گھر واپسی کے لیے وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ بہت سی باتیں، باتیں، قصے اس کے ذہن کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ چوتھا دن تھا، وہ ابھی بھی بے یقین ہو رہا تھا کہ واپسی کا سفر وہ تنہا کاٹ رہا ہے۔ سب کچھ کتنا اہانک ہو گزرا تھا، اسے شک بھی نہ ہوا تھا کہ اس کی بہت منزل کے اتنا قریب لا کر اسے دھوکا دے گی۔ زندگی اتنی محبت سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لے گی۔ اسے اس سے گلہ کرنا تھا شاہم سے؟ جسے ابھی بھی وہ است اور اپنی ارادے پر صحیح کرنا تھا۔ قسمت سے اس کے لکھاری سے؟ اس کی محبت یا نیت میں بھی ایسی کھوٹ نہیں رہی تھی۔ اس نے کبھی اپنے رشتے میں جھوٹ کا سہارا نہیں لیا تھا۔ اسے اپنی ذات سے اور برابر بھی زک نہیں پہنچائی تھی۔ پھر ایسا کیوں؟ ان دونوں کے کس عمل کی عزا تھی یہ سب؟ جانتے ہوئے وہ بھی رو رہی تھی۔ یہ بھی رو رہا تھا۔ اس نے یہ فیصلہ سکھایا ہو کر نہیں کیا تھا۔ اس کی اذیت کا اندازہ بھی ارسال کو تھا۔ اس جیسی حساس لڑکی کو ایسا ہی کرنا ہمارے لیے تھا۔ اگر وہ اس کی جگہ ہوتا تو وہ بھی یہ ہی کرتا۔ ان دونوں لاپرواہ اور کھلنڈرے نظر آنے والوں کی سوچ اتنی سطحی نہیں تھی۔
 شاہم کے کردار پر شک تو اس نے ماہم کی حرکت پر ہی نہیں کیا تھا۔ اب کیونکر کرتا؟ اگر اس نے کہا تھا کہ وہ یہ سب بچوں کی خاطر کر رہی ہے تو سچ کہہ رہی ہوگی۔ ان کی دوری کا سبب یہ بچے ہی ہوں گے۔ خواب جب تو نہیں تو فیند کیوں نہیں آتی؟ اس نے بہت سوچا تھا۔ زندگی کو کہاں سے شروع کرنا ہے، کیسے جینا ہے، اسے کیسے بھولنا ہے؟ کتنے لاتعداد سوالات تھے اور جواب نہ دار۔
 اسے شاہم سے کی گئی پہلی ملاقات یاد آنے لگی۔

طنز و مزاح سے بھرپور کالم

باتیں انشاء جی کی

ابن انشاء



باتیں انشاء جی کی

ابن انشاء



قیمت: -/300 روپے

ڈاک خرچ: -/30 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

وہ یونیورسٹی کسی کام سے آیا تھا۔ کھانے کا وقفہ تھا۔ آفس میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ وقت گزاری کے لیے درختوں کے جھنڈ میں بیچ پر آ بیٹھا تھا۔ تب نظر اس لڑکی پر پڑی تھی جو پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر گھوم کر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ کبھی بیگ کھول کر دیکھتی۔ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔ اس سے رہانہ گیا۔

”ہیلو۔۔۔ ہیلو“ ایکسکیوز میم، اپنی پرابلم ویو؟“ اس کے بار بار پکارنے پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ چند ساعتوں کے لیے وہ مبسوت رہ گیا تھا۔ سفید مرمرین رنگت، آنکھوں میں ہلکی سی نمی، کھلے بالوں نے آدھا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔

”کیا ہے؟“ وہ جتنی خوب صورت تھی بمبلی اتنی ہی برا تھا۔

”آپ کو کوئی پریشانی لاحق ہے؟“ وہ ذرا سہم سا گیا۔

”آپ کو کیا تکلیف ہے؟“ وہ کافی درشتی سے بولی۔

”مجھے تو تکلیف نہیں ہے۔ میں تو آپ کی تکلیف رفع کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ جانے کیوں اتنی تسلی سے تھا۔ وہ اس یونیورسٹی کا اولڈ اسٹوڈنٹ تھا۔ اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ یونیورسٹی کسی کام سے آیا تھا۔

”دیکھیں آپ اپنے کام سے کام رکھیں، میں آل ریڈی ڈسٹرب ہوں۔“

”کیوں ڈسٹرب ہیں، یہ ہی تو جاننا چاہتا ہوں۔“ اس نے آنکھوں میں آنی نمی کو ہاتھ سے رگڑا۔

”یہ ٹشو پیپر لے لیں۔“ اس نے جیب سے ٹشو نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے خفیف سا ہوتے بڑھا ہوا ٹشو پیپر پکڑ لیا۔

”اب بتائیں مسئلہ کیا ہے؟“ اس نے دوبارہ اتنی نرمی اور توجہ سے پوچھا کہ اس نے بتانا شروع کر دیا۔

”صبح منصور بھائی نے ایک ہزار دیے تھے کورس کی دو بکس کے لیے، پیسے کہیں گم گئے ہیں یا پھر کسی نے نکال لیے ہیں۔“

”پھر کیا ہوا؟“ اتنی سی بات پر اس پریشانی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”نہیں وہ کیا سوچیں گے کہ میں اتنی غیر ذمہ دار اور لاپرواہ ہوں۔“ اس نے اپنا وہم بتایا۔

آپ کو بتا ہے، میں صبح ناشتہ نہیں کرتی، یونیورسٹی سے کچھ کھا لیتی ہوں، میں صبح سے بھوکے ہوں۔“

اچانک اپنی بھوک کا بھی احساس ہوا تھا۔

”وہی بھائی، بھائی کا مسئلہ، ظالم بھائی، بھائی بیوی کا ظلام، زن مرید، مظلوم بیچاری ہیں۔“

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ آپ کیا کہتے جارہے ہیں۔“ اس کی غلطی فحشی کو رو کر دیا۔

”آپ کی امی بے چاری تو پچھن کے رہ گئی ہوں گی، بہو اور بیوی کے بیچ، آپ کے ابو زندہ ہیں؟“ وہ بلا تکان ہانکتا جا رہا تھا۔

”پلیز چپ کریں۔“ اس نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے اسے چپ کر دیا۔

”میرا کوئی بھائی نہیں ہے، ہم صرف دو بہنیں ہیں، منصور بھائی میری سسر کے عزیز ہیں اور میرے بچا زاد ہیں، میرے پیرنس کی ڈنٹہ ہو چکی ہے۔“ اس کے بولنے کے پیش نظر اس نے ایک ہی سانس میں اپنی بات پوری کی۔

”اوہ۔۔۔ ایم سو سو ری۔“ اسے حقیقتاً افسوس ہوا۔

وہ یوں پہلی بار کسی لڑکی کے اتنا قریب بیٹھا تھا۔ شاید اس کے اندر اچانک کچھ بدلا تھا۔

”منصور بھائی بہت اچھے ہیں، پھر بھی مجھے دوبارہ مانگتے شرم آئے گی، وہ واپسی پر بکس کا ضرور پوچھیں گے۔“ اسے پھر سے کتابوں کی پریشانی ستانے لگی۔

”ماہم باجی تو مجھے پہلے ہی لاپرواہ کہتی ہیں۔“

”آپ ایسا کریں، مجھ سے لے لیں، جب باکس منی ملے گی لوٹا دیجئے گا۔“ اس نے سارے مسئلے کا آسان سا حال بتایا۔

”اچھا۔۔۔؟“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

شکل سے وہ کافی معقول اور شریف سا ہی لگ رہا تھا۔

”میں آپ کو ادھر ادھر رہا ہوں، واپس کر دیجئے گا۔“

”مجھے پانچ دن بعد باکس منی ملنا ہے، میں لوٹا دوں گی۔“ بالکل ٹھیک ہے؟“

اس نے کتے والٹ نکال کے کھول کر اس کی طرف بڑھا دیا اور نظریں اس کے صبح چہرے پہ لگی رہنے لگیں۔

”کافی ہیں۔“ شاہم نے جتنی جلدی تو قرار مت ہو۔۔۔ مم، میرا مطلب ہے جاؤ۔“ پچھلی زبان پر قابو پا کر اس نے بے دلی سے کہا۔

”پانچ دن بعد۔“ چلتے چلتے اس نے یاد دہانی کروائی۔

”ٹھیک اسی جگہ۔“ پانچ دن بعد، بھولنا نہیں۔“ اسے اپنی گہری نظروں میں قید کرتے وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا تھا۔

اس کی حالت کبھی ایسی نہیں ہوئی تھی۔ لڑکیوں کے معاملے میں وہ بہت محتاط تھا۔

اگلے دو دن میں اس نے پوری سچائی سے خود سے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ بے نام لڑکی اس کے لیے بہت خاص ہے۔ تیسرے دن اس نے اسے لائبریری کے کوریڈور میں چالیا۔

”رو کو ایک سیکنڈ، میری بات سنو۔“ وہ بھاگتا ہوا اس کے سامنے رکتا ہوا۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔“ شاہم گھبرا گئی۔

”دو دن نظر نہیں آئیں، ڈھونڈ ڈھونڈ کے پاگل ہو گیا، اب صبح سے تعاقب کر رہا ہوں، رکتی نہیں ہو، ٹائٹیں ہیں یا سپرنگ، چلتی جاتی ہو چلتی جاتی ہو۔“ اپنے پھولے سانس کو بحال کرنے کے ساتھ وہ بولتا تھا۔

بھی جا رہا تھا۔

جب کہ وہ اور اس کی دوستیں بے حد حیرانی سے اس کے انداز مخاطب کو ملاحظہ کر رہی تھیں۔

”یہ کون ہے شاہم؟“ اس کی ساتھی دوست نے کندھا مار کر پوچھا۔

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔“ شاہم کی سوئی اٹک گئی۔

اس کے ہوا نیال اڑے چہرے کو دیکھ کر وہ پھر سے اشارت ہو گیا۔

”میں ان کا کزن ہوں، بتاؤ ناشانی۔“ اس نے اپنے جھوٹ میں شاہم کو بھی گھسیٹا۔

شاہم اس کے اس رویے پر بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ وہ کس طرح بات سے بات نکالتا جا رہا تھا اور کتنے مزے سے اسے شاہم سے شامی بناؤ والا تھا۔

”تم نے اپنے اس کزن کا ذکر کبھی نہیں کیا۔“ ایک دوسری لڑکی نے دلچسپی سے اس کو دیکھا۔

”کیوں؟ میں کیا امر کی صدر کا شیر ہوں، جس کا ہر کسی سے تعارف کروانا ضروری ہے۔“

”ہاں بولو، کیا بات ہے؟“ شاہم نے اسے اپنی دوست سے الجھتا پا کر بات سنبھالنا چاہی۔ شاہم اس پہلی ملاقات اور اب اس موجودہ صورت حال سے جان گئی تھی کہ اسے بے جا، لمبی بات بڑھانے کی عادت ہے۔

”بات تو بہت ضروری ہے، سب کے بیچ نہیں آگے آؤناں۔“ اس نے ہاتھ اور آنکھوں سے پرے جانے کا اشارہ دیا۔

شاہم خود پر ضبط کرتی، فریڈز سے معذرت کر کے اس کے ساتھ آگئی۔

”میں نے پانچ روز کا کام کیا تھا، تم تین دن بعد ہی کیوں ٹپک پڑے ہو۔“ تنہائی ملتے ہی وہ اس پر برس پڑی۔

”میں نے تم سے پیسے مانگے ہیں؟“ وہ الٹا اس سے پوچھ رہا تھا۔

”تو پھر کیا پر اہلیم ہے۔“

”پر اہلیم۔“ اس نے سر کھجائے لفظ دہرایا۔

2011

2011

Doctor Toothpaste

ٹاپ سیلڈ، جراثیم سے محفوظ!

Top Sealed
For Total Germs Protection

وہ اسو علی

جس ماحول کو جزائیم سے پاک رکھنا اتنا ضروری ہے تو۔۔۔

چھر مٹھ کو کیتھا ضرور کی جھوگا!

کتابخانه جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند

چونچرا نیمے ایک سے تاکر آب کا قند، مسو لے

اور دانست رہیں جرائم کے مظہر ترین اثرات سے محفوظ رہیں۔

ماہنامہ کیف کا مکمل علاج

ہاں۔“ یاد آنے پر اس نے الٹی ہتھیلی کی سیدھے ہاتھ پر تالی بجائی۔

”جب سے تم سے ملا ہوں، ٹھیک سے نیند نہیں آتی، دل کی دھک، دھک، دھک معمول سے ہٹ کر تیز ہو گئی ہے اور۔۔۔ اور جسم بے جان رہنے لگا ہے۔“

اس نے اپنی کیفیت اتنے بھونڈے انداز میں بیان کی تھی کہ شاہم کا جی چاہا کہ اس کے سر کے سارے بال نوچ ڈالے۔

”جسم بے جان ہونالی پی شوٹ کر جانے کی علامت ہے۔ تم بلڈ پریشر کے مریض ہو گئے ہو۔“

”اور۔۔۔ اور میرا دل دھک، دھک۔۔۔ دھک، دھک۔“ اس نے اپنے دل پر ہاتھ اس انداز میں رکھا جیسے ہارٹ اٹیک ہو گیا ہو۔

”کسی ہارٹ اسپیشلسٹ سے کنسلٹ کرو، دل کا والوینڈ ہو گیا ہو گا۔“ اس نے مزید مفید مشورہ دیا۔

”پیسے تمہیں دو دن بعد ملیں گے، کچھ خاص کہنا ہے تو کہو ورنہ میں جارہی ہوں۔“ وہ سچ مچ مڑ گئی۔

”ہاں خاص ہی کہنا ہے، بلکہ بہت خاص۔۔۔ وہ کیا ہے ناں، مجھے مجھے تم سے، آئی لو یو یار، بس۔۔۔ اتنی سی تو بات تھی، تھوڑی سی جرات چاہیے تھی۔ یوں ہی میں باؤلا ہو رہا تھا، کچھ بھی نہیں ہوا۔“

اپنی بات کہہ کر وہ فرضی کالر جھاڑتا، خود ہی اپنا کندھا تھپتھا کر خود کو داد دے رہا تھا۔ شاہم حیرت سے ہونقوں کی طرح منہ کھولے اس سر پھرے کو تکی بہہ گئی۔

”کیا کہا تم نے؟“ اس نے غصے سے اس کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

”کیا پھر سے کہوں؟ دوبارہ سننا چاہتی ہو؟“ وہ بڑی تسلی سے مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”جسٹ شٹ اپ، میں تمہیں مار دوں گی، فضول انسان۔۔۔“ وہ غصے میں اس کے بال نوچنے کو لپکی۔

سامنے سے آتی گاڑی سے اس کی ٹکر ہوتے ہوتے پکی۔ وہ اپنے خیالات سے واپس لوٹ آیا۔

”مار ہی تو دیا ہے تم نے مجھے۔“ نم آنکھوں سے وہ

برہنہ پایا۔

اسے دکھ تھا کہ شاہم نے اسے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ وہ اتنا آگے کا سوچنے سے پہلے اس سے ایک بار کہتی تو سہی، اسے کب بچوں سے انکار تھا۔ وہ اپنی کمشنٹ کا پکا تھا۔ اس نے اپنی ماں، گھر کو چھوڑا تھا، شاہم سے کیے گئے وعدے نہیں توڑے تھے۔ اب شاہم کو کوئی عہد دے کر، کیونکر وہ نہ نبھاتا۔

شاہم کی بے بسی، مجبوری اور دکھ اس نے تب بھی اپنا ہی دیکھ جانا تھا، جب وہ اس کے سامنے آنے لگتا تھی۔ جب اسے نہانے کی رسوائیوں کا اندازہ تھا، وہ گھر کے ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ لوگوں سے ملنے سے کتراتی تھی۔ تب وہ ہی واحد شخص تھا جس نے اسے دلاسا دیا۔ اس سے کسی بھی قسم کی وضاحت نہ مانگی، ایک لفظ تک سننے کا روادار نہیں تھا۔ اس روتے بڑھال وجود کو سمیٹا اگر تب یہ ہی شخص اس کے بارے میں مشکوک ہو جاتا تو وہ کیا کرتی، شاید مڑ ہی جاتی، اس ایک کاٹک اور نفرت ساری دنیا پر بھاری تھی۔

جیسے اب اس سے اس کے شک کا بھار برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس سے ایسا کیا کیا تھا کہ اسے لگا کہ وہ مستقبل میں اسے اپنا ہم سفر منتخب کر کے بہت سی رکاوٹوں کا باعث بنائے گا۔ وہ کیوں اسے بچوں اور اپنے بیچ دیوار لگنے لگا تھا۔

وہ اس سے ہفتوں ملنے نہیں آتی تھی، اس نے بھی کبھی اصرار نہیں کیا۔ وہ اکثر اوقات مصروف ہوتی، اس کی کال ریسپونڈ کر پاتی، وہ لامتناہی بار ٹرائی کرتا، شکوہ تب بھی اس کی نوک زبان پہ نہ آتا، اس گفتگو کا زیادہ حصہ صرف بچوں کے نام ہو جاتا، وہ دلچسپی اور مسکراہٹ سے سب سنتا۔

”شاہم کتنی بدل گئی ہے۔“ اس نے بہت بار سوچا تھا۔ اسے پہلے والی شاہم بڑھونڈنے سے بھی نہ ملتی، کبھی کبھی اسے شاہم کی یہ تبدیلی اچھی لگتی، بہت ذمہ دار، مستقل مزاج، مگر، سن سی شاہم۔ اس حادثے نے اسے کیا سے کیا کر دیا تھا۔ ورنہ اس سے اس سوچنا تھا کہ

شادی کے بعد مجھے اسے انگلی پکڑ کر سب سکھانا پڑے گا۔ مگر اس لاپرواہانٹ کھٹ روئے دھونے والی لڑکی نے اپنی سوچ اور مرضی سے کیا کیا کچھ سیکھ لیا تھا۔ منصور جان پایا نہ ہی ارسل۔ اس نے زندگی کی تلخیوں کو اس رخ سے کب محسوس کرنا شروع کیا۔ ارسل کو خبر کیوں نہ ہو سکی۔ وہ تو اپنی ہر بات، ہر سوچ، ہر خواہش تک اس سے شیز کیا کرتی تھی۔ ان تینوں میں سے بے خبر کون تھا؟

شاہم غیر محسوس انداز میں بچوں کے قریب ہوتی چلی گئی۔ ان پہ محبتیں نچھاور کرتے اسے بہت سے قرض اور قرض دار یاد آگئے۔ منصور نے شاہم کی اس قدر توجہ پر اپنا دھیان بٹالیا۔ وہ غفلت برتنے لگا تھا اور ارسل۔ شاہم کے منتظر ارسل کا کہاں کیا قصور دکھاتا تھا؟

شاہم کی محبت کا وہ بھی حق دار تھا۔ اس نے اپنے قرض داروں کی فہرست میں سے اس کا نام کیوں خارج کر دیا؟ یا وہ مجھتی تھی کہ میں نے بھی ارسل سے محبت کر کے حق ادا کر دیا۔ اس سارے قصے میں گھانا کس کے کھاتے میں آیا؟ گھائے میں کوئی بھی رہا ہو، خالی ہاتھ، خالی دل تو ارسل رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلی سے آنکھ کی نمی رگڑی تھی اور یہ ہی وہ پل تھا جب سامنے سے آتے ٹرالر نے اس بے خبر مرد ہوش کو پھل ڈالا تھا۔

مطیع الرحمن اور سائرہ رحمان ارسل کا انتظار کر رہے تھے۔ مطیع الرحمن نے سائرہ کو رات ارسل سے ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو کا بتایا تھا۔ وہ تب سے اندر ہی اندر بہت نہال تھیں۔

ارسل کتنے عرصہ سے گھر سے نکلا ان سے ناراض تھا۔ انہوں نے بھی اسے منانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب مطیع الرحمن کے منہ سے معافی کا ذکر سن کر انہیں یقین تھا کہ کچھ انہوں نے ہو گیا ہے ورنہ وہ ارسل کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ باپ کا لاڈلا، ان دنوں

اسے بھلا ماں کی یاد کیسے آگئی۔ سائرہ رحمان نے اپنی آج کی تمام مصروفیات مینسل کر دی تھیں۔ وہ پہلی بار اتنی بے تالی سے ارسل کے انتظار میں مطیع الرحمن کی برابر کی شریک تھیں۔

”سائرہ! میں پھر بتائے دیتا ہوں، ارسل کی طبیعت مجھے کچھ بہتر محسوس نہیں ہو رہی تھی، تم کچھ بھی اس کے مزاج کے خلاف نہیں کہو گی، اور۔۔۔ اور اگر وہ معافی مانگے تو معاف کر دینا، آخر وہ بھی بیٹا ہے ہمارا۔“

مطیع الرحمن نے کوئی ساتویں بار سائرہ رحمان سے یہ سب کہا۔

”آپ بھی حد کرتے ہیں مطیع! اتنی سمجھ تو مجھے بھی ہے، میں بھلا اسے کیوں معاف نہیں کروں گی؟ غلطیاں بچوں سے ہو جاتی ہیں۔ والدین کو اپنا دل اور طرف وسیع کرنا پڑتا ہے، وہ میری اولاد ہے۔“ انہوں نے نہایت سنجیدگی سے انہیں رام کیا۔

ارسل سے مطیع الرحمن جتنا تو نہیں مگر یہ تو وہ بھی کرتی تھیں۔ ”ابھی تک پہنچا نہیں، آجانا چاہیے۔“ مطیع الرحمن کو یک دم بے چینی نے گھیر لیا۔ وہ موبائل پہ اس کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔

”کیا ہوا، پک نہیں کر رہا؟“ سائرہ نے اٹھ کر ان کے قریب آکر پوچھا۔

”موبائل آف کیوں ہے؟ عجیب لڑکا ہے یہ بھی، کہیں پھر سے غائب نہ ہو جائے۔“ انہوں نے موبائل بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

”مطیع آپ معاذ کو کال کریں، وہ آجائے پتا نہیں کیوں؟ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔“ وہ بھی ہاتھ مسلنے لگی تھیں۔

انہیں اپنی اس عجیب ہوتی حالت میں بڑے بیٹے کا خیال آیا تھا۔

”ڈونٹ وری، آتما ہی ہو۔۔۔“ ان کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ باہر کسی انجان گاڑی کا ہارن بجا، چوکیدار نے باہر جا کر دیکھا۔ چند لمحوں بعد

گیٹ وا کر دیا۔

سائرہ اور مطیع الرحمن اتنے میں یا ہر آگئے تھے۔ گیٹ سے ایسیو لینس داخل ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے حواس اڑنے چروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ چوکیدار، دو سیکیورٹی گارڈ اور مالی سب ایسیو لینس سے سفید چادر کے نیچے وجود کو تھامے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان سب کے سر کی بوجھ تلے جھک گئے تھے۔ سفید چادر سے ڈھکا وجود اب مطیع الرحمن کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔

”لگ۔۔۔ لگ۔ کیا ہے یہ؟“ انہوں نے انگلی سے ایسیو لینس کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ کیا ہے لگ۔۔۔ کون ہے یہ؟“ ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

وہاں موجود کوئی بھی کچھ بھی نہیں بولا۔ ”مم۔۔۔ مطیع آپ معاذ کو کال کیوں نہیں کرتے وہ سائرہ ابھی بول ہی رہی تھیں کہ کھلے گیٹ سے معاذ کی گاڑی اتر ہوئی۔ وہ بہت تیزی سے گاڑی سے نکلا۔ اس کے حواسوں سے بھی لگ رہا تھا کہ اسے یہ خبر مل چکی ہے۔

”معاذ۔۔۔ میرے بیٹے۔“ سائرہ اس کی پانہوں میں سما کر رونے لگیں۔

”مم۔۔۔ معاذ! یہ۔۔۔“ مطیع الرحمن کی آنکھوں اور آواز میں نمی تھی۔

”پلیز ماما جان۔“ معاذ ماں کو نرمی سے خود سے الگ کر باپ کی طرف بڑھا۔

”پاپا۔۔۔“ اس نے باپ کو ساتھ لگاتے تھوڑا سا جھک کر سفید چادر کو چہرے سے ہٹا دیا۔

”نہیں۔“ انہوں نے بڑے بیٹے کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

”مطیع آ۔۔۔ آپ نے کہا تھا کہ ارسل آ رہا ہے مجھ سے ملنے، معافی مانگنے۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا، پھر اب کیوں؟ میرا ارسل کہاں ہے، وہ کیوں نہیں آیا۔ ارسل! اٹھ میرے لعل تیری

ماں تڑپ رہی ہے تجھے سینے سے لگانے کے لیے، اتنی بھی ناراضگی کیا بیٹا! ماں سے بولے بغیر ہی چلا جائے گا۔“

سائرہ نیچے گر کر بہت بے دردی سے رو رہی تھیں۔ وہ اسے جھجھوڑنے لگی تھیں۔

”ماما جان! سنبھالیں خود کو پلیز، ایسا مت کریں۔“ معاذ باپ کو چھوڑ کر اب پھر ماں کو سنبھالنے لگا تھا۔

اس نے سائرہ کے دونوں بازو مضبوطی سے پکڑ لیے۔ مطیع الرحمن دو تین قدم لڑکھڑائے اور زمین پہ ڈھے کر دھائیں مار مار کر رونے لگے۔

آج صبح سے ہی اس کے پورے جسم میں یک گونہ خاموشی کا سیرا تھا۔ ایسے جیسے دور تک صحرائیں ڈیرے ڈال لیے ہوں، تاحد نگاہ دھندلا سا غبار ہی غبار ہو۔ عمیر اور حمزہ کو اسکول بھیجا۔ انہوں نے اس سے کیا باتیں کیں۔ کس چیز پہ بے جا ضد کی، ان کے منہ میں کیا تھا۔ اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ دعا کو نرم غذا اٹھا کے ماجدہ کے حوالے کر کے وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرے میں چکر لگاتے اس کی سوچ اور ہاتھ ہلکے ہلکے کپکپا رہے تھے۔ اس کا سر بھی بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے پین کلر لینے اور چائے کا کپ پینے کا ارادہ کیا تاکہ اس سرور سے جان چھڑائی جاسکے۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے موبائل کی ہسپ بھی اتنی منحوس نہیں لگی تھی جتنی ابھی لگ رہی تھی۔

گوگو کی کیفیت میں گھرے اس نے دھیرے دھیرے قدم واپس بڑھائے۔

”ہیلو۔“ کافی توقف کر کے اس نے مرگوشی کے انداز میں کہا۔

اور جو کچھ اس کی سماعت سے گزرا، وہ اس کی ہمت سے بہت زیادہ تھا۔ زندگی کی اس ناہموار مسافت پہ وہ بہت بری طرح لٹ گئی تھی۔ قربانی کی نیت اس نے

باندھی تھی وہ کیوں خود کو قربان کر گیا تھا۔ زندگی سے اس نے نظریں چرائی تھیں اور وہ منہ ہی پھیر گیا تھا۔ وہ فون بھینک کر تیزی سے بھاگی۔

ارسل کے گھر کا پتا اسے معلوم تھا مگر اندر جانے کا حوصلہ وہ کہاں سے لاتی؟

مطیع الرحمن نے اسے خود کال کی تھی۔ انہوں نے اسے ارسل کے آخری دیدار کے لیے بلوایا تھا۔ وہ ارسل کی میت کو شاہم کی روتی نگاہوں سے محروم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ شاہم کی محبت کا اتنا حق تو بننا تھا۔

گھر سے تھوڑی دور اس نے گاڑی روک دی۔ یاہر لاتعداد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ابھی بھی بہت سے رشتے دار آرہے تھے۔ مرد زیادہ تر باہری حزن و ملال میں گھرے کھڑے تھے۔ بہت رشتہ تھا۔ اس کے موبائل کی بپ پھر سے ہونے لگی۔ مطیع الرحمن کا نمبر تھا وہ اسے اندر بلانا چاہتے تھے۔ اس نے فون کاٹ دیا۔ وہ اندر نہیں جاسکتی تھی۔ وہ بہت دفعہ ٹوٹی تھی اور سمٹ گئی تھی۔ اس بار بکھری تو اسے سنبھالنے والا دلا سا دے کر چپ کروانے والا بھی نہیں رہا تھا۔ اس کندھے کو جس پر وہ سر رکھ کر پرسکون ہو جایا کرتی تھی اسے آج خود چار کندھوں کی ضرورت تھی۔

اس کی گاڑی کے قریب سے دو عورتیں باتیں کرتی گزر رہی تھیں۔ وہ شاید جنازے والے گھر سے ہی آ رہی تھیں۔

”اس کے باپ کی حالت نیم دیوانوں جیسی ہو گئی ہے۔ خدا کسی کو جوان اولاد کا دکھ نہ دے، بڑے ہی بد نصیب ہوتے ہیں وہ ماں باپ جو اس عمر میں اپنی اولاد کو دفن کرتے ہیں۔“ بولنے والی کے لہجے میں بہت درد پھوٹ رہا تھا۔

”بس جی۔ ہم انسانوں کی کیا اوقات“ مغرب کے بعد جنازہ ہے، تمہارے بھائی جان کو کموں کی شرکت کریں۔“

آوازیں دور ہوتی چلی گئیں وہ وہیں رہ گئی۔

”میں نے تمہیں خود کو چھوڑنے کو کہا تھا ارسل! تم نے دنیا ہی چھوڑ دی۔“ اسٹیئرنگ پر سر رکھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”تم نے ہمیشہ میرا ہر کہا مانا“ اس بار ٹال دیتے۔ کوئی اس طرح سے جاتا ہے بھلا۔ مجھے ایک بار پاتھ پکڑ کر رو کا تو ہوتا ارسل! میں کب اتنی دور جا رہی تھی جتنی دور تم چلے گئے ہو۔ میری بے وفائی کی اتنی بڑی سزا، پلیز ارسل۔۔۔ لوٹ آؤ۔۔۔ میں کبھی بھی کہیں نہیں جاؤں گی۔۔۔“

اس کے سارے حوصلے ڈھے چکے تھے وہ آنسوؤں کے ویلے میں بہتی جا رہی تھی۔ اپنی آنکھوں میں محبت اور ایسے میں نرمی سمونے اپنی آنکھوں کی پوریوں سے اس کے آنسو صاف کرنے والا اب کہیں نہیں تھا۔ وہ جا چکا تھا وہاں جہاں جا کر کوئی بھی نہیں لوٹتا۔ مگر اسے تو لوٹنا ہی تھا۔ وہ بھی خالی خالی گھر لوٹ آئی تھی۔ یہی اس کا ٹھکانہ تھا۔ اس گھر کی بہتری کے لیے اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا سب کچھ۔

”ماجدہ! اوپر آؤ۔“ اس نے انٹرکام پر ماجدہ کو بلوایا۔ تھوڑی دیر میں وہ حاضر تھی۔ ”جی شاہم بی۔“

”منصور کو آٹس کال کرو، کو جلدی گھر آئیں، میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ بے تاثر بیٹھے غیر مرئی نقطے کو گھورتے اس نے ماجدہ کو حکم دیا۔

ماجدہ نے عجیب سی نظروں سے اس کے تتکھم بھرے انداز کو دیکھا اور سر ہلاتی چلی گئی۔

منصور پہلے ہی شاہم کی اس نئی حرکت سے تالاں تھا۔ اب اس نئی افتادہ اسے کوفت ہونے لگی۔ وہ اس سے بہت کٹنے لگا تھا۔ شاہم کا نقطہ نظر اپنی جگہ سو فیصد درست سہی مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو اس بے وفا کو بھولتا ہی نہیں تھا۔ وہ کسی نئی وفا کی راہیں کیسے ہموار کرتا پھر بھی وہ سب کچھ چھوڑ چھا کر آ گیا تھا۔

”کدھر ہے شاہم؟“ اس نے نیچے صفائی کرتی ماجدہ سے پوچھا۔

”اوپر اپنے کمرے میں۔“ اس نے رک کر جواب دیا اور پھر کام کرنے لگی۔

وہ کارپٹ پر اجڑی بکھری بیٹھی تھی۔ منصور بھی اس کے پاس نیچے بیٹھ گیا۔

”آؤ اوکے؟“ جانے کیوں اسے اپنا یہ سوال بہت احمقانہ سا لگا۔

شاہم کے چہرے کے تاثرات اور پتھریلی آنکھوں نے اسے اندر سے سہا دیا تھا۔

”مجھے شادی کب کریں گے؟“ وہ امیجوری شاہم کہاں گھو گئی ہے؟ یہ اجنبی سی اتنی دور اندیش کون ہے؟ منصور نے اس پر نظریں کاڑے ہو چکا۔

”اور ارسل۔۔۔؟“ منصور نے ٹریک بدلا۔

”Sacrifice (ایثار) کے لیے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے، مجھ میں ابھی سکت ہے۔“ وہ بہت شکست خوردہ سہی مگر ہارنے کو قطعاً سہیا نہیں تھی۔

”ہمت ٹوٹ جائے تو سب سے پہلا احساس غلطی کا ہوتا ہے، پھر واپس بلانے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچتا، اپنی طاقت سے زیادہ خود کو مت آزماؤ۔“

منصور کی سوچ بہت دور کی تھی۔

”واپس تب مڑا جاتا ہے جب پیچھے رہ جانے والے منتظر ہوں، میں نے اپنے ماضی کی راہوں میں کسی کو منتظر نہیں چھوڑا۔ جو تھا، وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا ہے۔“ وہیما لوجہ کھو سا گیا تھا۔

”کیا مطلب۔۔۔؟“ منصور جان نہ پایا۔

”ارسل۔۔۔ ارسل مر گیا ہے۔“

اس کے اس جملے نے منصور کو ہلا کر رکھ دیا۔ اسے شاہم کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔ اس نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ صبح اسے بھلی چٹنی چھوڑ کر گیا تھا۔ اب اس کی آنکھیں روٹی، سرخ سی اور چہرہ صدیوں کا تھکن زدہ تھا۔ اس کی بربادی کے آثار بہت واضح تھے۔

”قسم کھا کر کہتی ہوں، میرے پاس بھی جینے کا کوئی جواز نہیں، سوائے آپ کے مغرب کے بعد نکاح پڑھواؤں مجھ سے ورنہ میرے۔۔۔ میرے کفن و دفن کا انتظام کر لیں۔ آپ کو نہیں مگر جانے والے کو وہاں بھی میری ہی ضرورت ہے۔“

اس کے کہنے میں اس کے رویے میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ منصور ڈگمگا گیا۔ ارسل کی موت نے اسے اس قدر دہلایا تھا کہ وہ کسی نئی مصیبت کا تحمل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ شاہم کے کہے پر شک و شبہ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس نے بچوں کی خاطر منصور سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اور اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا اور اب اگر وہ بھی۔۔۔

شام کے ملگجے سے اندھیرے میں وہ کمرے میں دونوں ہاتھ گود میں دھرے بے حس، ساکت و صامت سی بیٹھی تھی۔ مغرب کی اذان ابھی ہوئی تھی۔ نماز کی ادائیگی کا فریضہ مساجد میں بڑے خشوع و خضوع سے ادا کیا جا رہا ہے۔

نماز کے بعد دو مولویوں نے دو مختلف جگہوں پر دو مختلف کام سرانجام دینے تھے۔ ایک نے دو اجنبیوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ کر شاید نئی زندگی کی نوید دینا تھی اور دوسرے نے کسی کی لحد سے سپردگی سے پہلے نماز جنازہ پڑھانا تھی۔

وہ نکاح کے لیے مولوی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے جذبات اتنے سرد ہو چکے تھے جیسے مردہ۔ اس کے کپڑے ملگجے ملگجے تھے، بالوں کو یونہی سمیٹا گیا تھا، لٹیس ٹکلی ہوئی تھیں، ہونٹ ایک دوسرے میں سختی سے پیوست چہرے پر درد اور خوف کی وحشت تھی۔

اس کے اندر کی ٹھٹھن آنسوؤں کے رستے نکاس کا رستہ پاسکتی تھی مگر اپنی زندگی کا اتنا مکمل حصہ کھو کر وہ رو بھی نہیں پار رہی تھی۔

منصور شیفت ڈرائیور، سیکورٹی گارڈ اور مولوی کے ساتھ اندر داخل ہوا، وہ کمال ضبط سے خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔

نماز جنازہ کے لیے امام آگے کھڑا ہو گیا۔ پیچھے لوگ صفیں درست کر رہے تھے۔

”منصور رضا ولد خطیب رضابہ عوض۔“

امام نے نیت باندھ کر پہلی تکبیر بلند کی۔

”منصور رضا ولد خطیب رضابہ عوض۔“

امام نے بڑی رقت سے ثناء پڑھ کر دوسری تکبیر لگائی۔

تیسرے اقرار اور تیسری تکبیر کے ساتھ ہی کتنا کچھ الگ ہو گیا تھا۔

وہاں ادھر ایک نئے بندھن کے اٹوٹ ہونے کے لیے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے گئے۔ ادھر کسی کی دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھائے گئے۔

ادھر ارسل کو اپنی منزل تک رسائی مل گئی تھی اور ادھر شاہم نے ناموار کھن رستوں کے سفر کا آغاز کر دیا تھا۔

وہ رات کو دس بجے ضروری میٹنگ بننا کر لوٹا تھا کہ پورچ میں کاشا کی لکڑی مرستہ پڑ گئی تھی۔ اس کی گاڑی ہمیشہ کی طرح پورچ کے وسط میں کافی سے زیادہ جگہ گھیرے ہوئے تھی۔ کاشا کے آنے کی خوشی میں وہ اپنی گاڑی پچھلی سائیڈ پہ لگا کے بغیر جھنجھلائے بڑے خوشنوار موڈ میں اندر آیا۔ اس نے رات کاشا کو ہمیں ٹھہرانے کا ارادہ کیا۔

چار سو خاموشی کا راج تھا۔ کاشا کی موجودگی میں دروازہ دوار خاموشی کو ترستے تھے۔ صوفے پہ بریف کیس رکھ کر وہ ڈانٹنگ ہال میں آگیا۔ ڈانٹنگ ٹیبل پہ دھرے جگ میں سے پانی کا گلاس پیا۔ چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے وہ کاشا کے کمرے کی طرف آگیا کہ شاید وہ شاور لے رہا ہو۔ کاشا کا کمرہ استعمال کی سب چیزیں حتیٰ کہ کپڑے بھی یہاں موجود تھے۔ اس کی ضرورت کا سارا سامان ویسے ہی دھرا تھا جیسے اس کی رہائش سے قبل تھا۔

ہینڈل گھمانے پہ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کاشا نے پیچھے مڑ کر دیکھا صرف تھو بھر کے لیے اس کی اور غنی کی نظریں ملی تھیں۔ اگلے پل غنی نے زوردار آواز سے دروازہ بند کر دیا۔ اس سے ٹیک لگا کر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا جو منظر وہ دیکھ چکا تھا اسے پاگل کرنے کو کافی تھا۔ اسے سانس لینے میں دشواری سی ہونے لگی۔

کوٹ کا بٹن کھول کے اس نے انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کی۔ تنفس کے بحال ہوتے ہی غصہ اس کے دماغ کو چڑھنے لگا۔ اس نے خود ہی باہر آ جانا تھا۔ دس منٹ اس نے کھولتے ہوئے وال کلاک کی گھڑیاں گنتے گزارے۔

”تو ہمیشہ ہی غلط وقت پہ انٹری مارتا ہے۔“ وہ بدلتا ہوا بغیان چڑھاتے ہوئے نکلا تھا۔

”جسٹ شٹ اپ کاشا، ہاؤ ڈیئر تو؟ اس گناہ کی پوٹلی کو گھر کی حدود میں لے آیا؟“ دھیمی آواز میں وہ چیخ پڑا۔ اس کی ہر بری حرکت باہر تک ہی محدود رہی تھی۔

”تیرا میٹر کیوں گھوم رہا ہے۔“ وہ رتی بھر بھی خفیف نہیں ہوا تھا۔

دروازے کو اچھی طرح بند کر کے وہ سابقہ مطہر انداز میں الٹا اسی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

”کون ہے یہ عورت؟“ اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیوں لایا ہے اسے یہاں اور کیا کر رہا تھا؟“ غنی نے اپنے دماغ کو کھولتے سارے سوال ایک ہی سانس میں کر ڈالے۔

”فرسٹ۔“ اس نے ایک انگلی اٹھائی۔ ”شی از مائی سیکنڈ وائف لیلی اینڈ سیکنڈ۔“ اس نے دوسری انگلی اٹھائی۔ اس کا کہیں اور ٹھکانہ نہیں تھا اینڈ لاسٹ از ناٹ فیئر اب تم اتنے بچے چوچے نہیں ہو۔“

کاشا نے آخری جواب دیتے خباثت سے مسکرا کر اس کے گال کو چھیڑا۔

وہ ہواس کی اس بم بلاسٹ سچائی کو اپنی سماعتوں میں اتار رہا تھا زور سے ہاتھ جھٹک دیا۔

”ڈونٹ ٹچ می، ڈونٹ ٹچ می اگین کاشا! تم نے دوسری شادی۔“ نفی میں سر ہلاتے اس نے جملہ ادھر ادھر اچھوڑ دیا۔

”میں نے بس شادی کی ہے، پہلی اور دوسری کی گھمن گھیری میں نہیں پڑتا تو اتنا ہاتھ نہ ہوا کر۔“ کاشا کو اس کا یوں ہاتھ جھٹکنا سخت برا لگا تھا۔

”تو اس قدر کول ڈاؤن کیسے ہے؟ ایک عورت تیری بیوی، تیری واپسی کا انتظار کر رہی ہو گی اور تو دوسری کو پھنسا کر اس کے ساتھ جڑا ہے۔ وہ۔۔۔ وہ جو تیری خاطر اپنی اولاد شوہر بسا بسایا گھر چھوڑ کر آئی ہے، اس کی۔۔۔ قربانی کا یہ صلہ دے رہا ہے تو۔۔۔“

غنی تیز تیز بولتے مابہم کی حمایت کرنا اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اپنا دایوم کم کر۔ وہ سن لے گی۔“ اس نے پھرے ہوئے غنی کا بازو کھینچ کر وائٹ کچن کی طرف اشارہ کیا۔

”آئی ڈونٹ کیئر، بھلے سن لے، تو نے اپنے اس اقدام کا مجھ سے تذکرہ تک نہیں کیا۔“

”ایئر جی میں نکاح کرنا پڑ گیا یا رامو بال آف مل رہا تھا، آفس کال کی تو میٹنگ کے لیے نکل چکا تھا پھر میں نے تجھے بتایا نہیں۔“

اس نے اپنی جلد بازی کی وضاحت دی تاکہ وہ نرم پڑ جائے۔

”اپنی دے، جو بھی ہوا، اب اس عورت کو فوراً“ یہاں سے نو دو گیارہ کر۔“ اس نے نہایت غصہ میں کہا۔

”صرف۔۔۔ ایک رات برواٹ کر لے۔“ اس نے بڑے رمان سے کہا۔

”ٹھیک ہے تو اسے رکھ اور خود بھی رہ میں جا رہا ہوں۔ جب یہ دفع ہو جائے گی تب واپس لوٹ آؤں گا۔“

قطعیت سے کہتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ بیرونی دروازے کی طرف چلا گیا۔

”غنی۔۔۔ غنی، سن غنی۔۔۔ ایلیز رک تو سی۔“ وہ ڈیو لاؤنچ تک سست روی سے چلتا اسے آوازیں دیتا آیا

تھا۔

اس کے گاڑی اشارت کر لینے پہ کافی دیر تک یونہی ٹکا کھڑا رہا۔ پھر نجانے اسے کیا ہوا کہ لیلی کو جلد سے جلد یہاں سے جانے کو کہہ دیا۔ کاشا کے اتنی جلدی بدلتے روپ پہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کا احتجاج کاشا کے مضطرب چہرے میں دب سا گیا۔ لیلی کو ڈراپ کر کے اس نے مابہم کو بھی اطلاع کر دی کہ غنی کی طرف ہے۔ لیٹ آئے گا۔

غنی اور اس کا اتنے سالوں کا ساتھ تھا۔ ان کے بیچ کبھی خفگی بھی نہیں ہوئی تھی پھر غنی کب اس کی کسی بات کا برا ماننا تھا۔ کاشا جس نے کبھی کسی کی نصیحت نہ سنی، مشورہ نہ مانگا، غنی کو وہ ہر طرح کا اختیار دیتا تھا۔ چاہے وہ عمل کرے نہ کرے، خاموشی سے سن ضرور لیتا تھا۔ غنی اس کی سرگرمیوں میں مداخلت کرتا، وہ ہنستے ہوئے نظر انداز کرتا جاتا۔ وہ تقریباً ہر رات ہی اس سے تفتیشی پوچھ گچھ کرتا اور وہ بڑے محل سے وضاحت دیتا جاتا، حالانکہ جواب میں رد بدل بھی نہیں ہوتا تھا۔ اسے غنی کی روک ٹوک کبھی بری نہ لگی۔ بس اسے کاشا کی ایسی ناز بیا حرکات گھر کی حدود میں کرنا سخت ناپسند تھا۔

کاشا نے کبھی اختلاف نہ کیا حالانکہ یہ گھر بھی اس کے سوتیلے باپ کی ملکیت تھا۔ غنی اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے یہاں سب کچھ کر سکتا تھا۔ کوئی پوچھنے والا یا انگلی اٹھانے والا بھی نہیں تھا مگر وہ غنی کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں خود سے وابستہ لوگوں اور رشتوں حتیٰ کہ اپنی ماں تک کی پرواہ نہیں کی تھی مگر وہ غنی کے لیے ریشان تھا۔

رات کے ڈھائی بجے لان میں چکر اٹا پھر رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بہت اہم تھے۔ محبت بھی بہت تھی یہ بھی وہ جانتا تھا مگر وہ اس قدر اندر سے اس سے جڑا تھا، اس کا احساس اسے اس کا انتظار کرتے ہوا۔ سحر طلوع ہوئی جارہی تھی مگر وہ نہ آیا۔ کاشا آٹھ بجے تک اس کی راہ دیکھتے لوٹ آیا۔ سارا دن وہ وقفے وقفے سے اسے کال ملتا رہا، نیل جاتی رہی مگر اس نے

کال ریسیونہ کی۔ کاشانے بھی دوبارہ اس سے رابطہ نہ کیا، نہ وہ گھر گیا۔ ان دونوں کے مابین ان دیکھی سروسی خاموشی چھا گئی۔

حالات میں کتنا اتار چڑھاؤ آگیا تھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ سردیوں کی شامیں طویل ہونے لگی تھیں۔ سردیوں کی شام کی خنکی اب مست ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لبریز ہوئی۔ خزاں رسیدہ درختوں کی اجڑی ہوئی شاخوں پہ ننھی ننھی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ سورج کی حدت حرارت بخش تھی۔ اس بدلتی رت میں کتنے چہرے، کتنے لوگ رشتے بدل گئے۔ کون کہاں چپکے سے پھڑ گیا، کہیں کوئی مجبوراً، بے بسی کی حالت میں کسی کا ہم سفر بن گیا۔ زندگی کبھی کبھی کسی من چلے کی طرح کتنی غیر مستقل مزاج ہو جاتی ہے، کسی نقطہ پہ رکتی ہی نہیں۔ آوارہ گرد بے پروا، من موجی سی، اپنی ہی مستی میں گنگناتی ہوئی، بونہی چلتے چلتے کبھی کسی کا سب کچھ چرا لیا، کبھی کسی کی جھوٹی بن مانے بھردی۔

زندگی سے موت تک کا سفر کوئی کس طرح طے کرتا ہے۔ ارسل مرکر پل پل کے عذاب سے چھٹکارا لیا گیا۔ اس سے وابستہ محبت کی لڑیوں میں پروئے رشتے، والدین، دوست عزیز و اقارب روئے دھوئے، صف ماتم پچھی، دکھ، تسلی، تاسف کے لفظوں سے دلاسا دیا گیا۔ مگر اس کے پیچھے رہ جانے والوں میں سے کوئی خاموشی سے مر گیا، خبر بھی نہ ہوئی۔ نہ کسی نے سینے سے لگایا۔ نہ ہی اپنے کندھوں پہ پار اٹھایا۔

ان دونوں اموات میں بظاہر بہت فرق ہے مگر منصور جیسا سمجھ دار، زیرک بندہ بھی خود اپنے آپ کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ جانے کیوں اس کے اندر سے آواز سی اٹھتی۔ شاہم روتی کیوں نہیں؟ شاہم اتنی مضبوط کس طرح لگتی ہے؟ اس نے نکاح والی رات شاہم کو آخری بار روتے پایا تھا، پھر کبھی نہیں۔ اس کے چہرے پہ آنکھوں میں اگ ٹھہراؤ سا تو تھا۔ جیسے کچھ

بھی بڑا اور برا نہیں ہوا۔ وہ ان دونوں کے چہروں سے چھلکتی محبت کا آنکھوں دیکھا گواہ تھا۔ شاہم کا نارمل رہنا اسے اب نارمل کر دیتا تھا۔ نہ تھکن کی کوئی جھلک نہ ہی مایوسی کی کوئی رمت۔

اپنے ہی طور پہ اس کے اندر شاہم کے لیے ایک کھنچاؤ سا پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ شاہم نے اس کے ساتھ زبردستی کی تھی۔ اب یہی زبردستی اسے کھلنے لگی تھی۔ یہ تو صرف شاہم ہی جانتی تھی کہ اس کی روح تک میں کتنا گہبیر، جامد اور خوف ناک سناٹا اتر گیا ہے۔ قربانی کے حقیقی معنوں سے آشنائی تو ارسل کی موت کے بعد ہوئی تھی۔ جن بچوں کی خاطر اپنا سب سے قیمتی اثاثہ موت کی آغوش میں سلا دیا، اب اس جانے والے پہ ہلکان ہو کر وہ اس قربانی کو رائیگاں نہیں کر سکتی تھی۔

ارسل اور اس کی جدائی کا بہانہ یہ بچے بنے تھے تو اب ان سے محبت اور پرورش کے عہد کی پاس داری اسے کرنا تھی تاکہ روز قیامت اسے اس وفا پر قربان ہونے والے کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ وہ اس کی روح اور اپنے ضمیر کے آگے جھوٹی نہ پڑے۔ وہ خشک آنکھوں، بے تاثر چہرے اور نیم مسکراہٹ کے ساتھ اپنی ذمہ داری نبھا رہی تھی، حالانکہ جن کڑے لمحوں سے وہ گزری تھی اسے بہت وقت چاہیے تھا خود کو سنبھالنے کے لیے، سمجھنے کے لیے، مگر اس نے خود کو ذرا سی بھی رعایت نہ دی۔ وہ منصور کے سامنے اس لیے نہیں روتی تھی کہ کہیں وہ اس کے کردار کا موازنہ ماہم سے نہ کرنے لگے، اس زبردستی کے رشتے میں شک کی دراڑ نہ پڑ جائے، وہ اس کی طرف شکوک بھری نگاہ نہ ڈالے۔ وہ ڈرتی تھی اور۔

اور پھر شاید اس نے جہاں اور بہت کچھ سیکھا تھا وہیں اپنے آنسوؤں کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کا ہنر بھی سیکھ لیا تھا۔ پھر وہ کندھا تھا، نہ نرم پوریں اور نہ ہی نشوونما۔

اب اس کی ذمہ داریوں میں منصور کا بھی اضافہ ہوا، گیا تھا، جبکہ منصور نے اپنی ”ذمہ داری“ ابھی تک



فیس فریش کلینزر کریم

پانچ اضافی خوبیوں کے ساتھ

- 1 چھانہوں، جھریوں، دواغ، دھبوں اور کالے نشانات کو مکمل طور پر صاف کرے۔
- 2 آئلی سکن، نارمل سکن، اور ڈرائی سکن کیلئے یکساں مفید ہے۔
- 3 یہ ہر قسم کے مضر اثرات سے پاک کریم ہے۔
- 4 مرد و خواتین کیلئے یکساں مفید ہے۔

بہترین نتائج کے لئے کم از کم 15 دن استعمال کریں

www.facefreshproducts.com

قبول نہیں کی تھی۔

صبح بہت بھاگم بھاگ ہوئی تھی۔ عمیر کی ٹالی نہیں مل رہی، حمزہ بیڈ کے نیچے گھسا پسل باکس ڈھونڈ رہا ہے، افراتفری میں چپرس پوری ہوئیں تو کھانے میں شور بنگامہ، دعا کی اپنی الگ سے چیخ و پکار، ان سب سے بمشکل فراغت پاتے ہی منصور کی تیاری۔

منصور کے کھنچاؤ کو بہت تسلی سے برداشت کرتی وہ اس کے ہر کام، ہر فرض کو اولین فرض میں شمار کرتی۔ پہلے وہ صرف بچوں تک محدود تھی، منصور کے کسی کام میں مداخلت نہ کرتی تھی، مگر اب وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ منصور، اپنے شوہر سے بے اعتنائی کیوں پریتی۔ بچوں سے فارغ ہو کر وہ منصور کی طرف آگئی تھی۔

وہ شاور لے رہا تھا۔ ہر روز کی طرح منصور نے شاہم کے نکالے ہوئے کپڑے وارڈروب میں رکھ کر اپنی مرضی سے نکال لیے تھے۔ بیڈ پر پڑے لباس کو پھینکی مسکراہٹ سے اٹھاتے ہوئے اس نے دیکھا تیسرا بٹن غائب تھا۔ ماجدہ پہ جھنجھلا نے کافی اندھ نہیں تھا۔ وہ سوئی دھاگے والا ڈبہ لے کر بٹن ٹانگنے بیٹھ گئی۔ اتنے میں وہ بھی واش روم سے باہر آگیا۔

”چلے گئے بچے؟“ بالوں میں تولیہ رگڑتے وہ باہر نکلا۔

”جی، تھوڑا لیٹ ہو گئے، کمرے میں آئے تھے۔ آپ شاید ہاتھ روم میں تھے۔“ دانت سے دھاگہ توڑ کر اس نے بتایا۔

”یہ کام ماجدہ کے کرنے کے ہیں۔ تم خواہ مخواہ تکلیف کرتی ہو۔“ اس کے ہاتھ سے شرٹ پکڑتے وہ کہہ رہا تھا۔

”آپ کے کام کرنے میں تکلیف کیسی۔“ وہ ہولے سے مسکرا دی۔

”بہتر ہے خود کو بچوں تک محدود رکھو، ملازم ٹہلنے کے لیے نہیں ہیں۔“ کپڑے اٹھاتے وہ ڈریسنگ روم

میں چلا گیا۔

اس نے تکیے درست کر کے، بیڈ شیٹ کی شکلیں نکالیں، چارج برلگا ہوا موبائل اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا، گھڑی، والٹ، گلاسز اور کی چین سب ڈریسنگ ٹیبل پر منتقل کر دیا تاکہ کوئی چیز بھول نہ جائے یا ڈھونڈا نہ پڑے۔

گفلنکس بند کرنا وہ مکمل تیار ہو چکا تھا۔

”آپ بتائیں، ناشتے میں کیا بناؤں؟“ اس روٹین کے ناشتے سے تو میرادل اوب گیا ہے۔ ”میر پرش اس کی طرف بڑھاتے وہ پوچھ رہی تھی۔ منصور کی اب اسے کچھ دیر پہلے کی گئی تہنید کا اس پر قطعاً اثر نہیں ہوا تھا۔

”جو کھانے۔۔۔ کو جی چاہے۔۔۔ بناؤ، مرضی ہے تمہاری۔“ اس کی ساری توجہ بال سنوارنے پر تھی۔

آپ کے دل کی بھی تو کوئی مرضی ہوگی۔“ اسے بغور دیکھتے اس نے کہا۔

منصور کے ہاتھ رک گئے۔ برش رکھ کر وہ اپنا ضروری سامان سمیٹنے لگا۔

”میرے دل تک رسائی ممکن نہیں۔“ گھڑی کلاں میں ڈالتے اس نے اس کا پھر بریف کیس اٹھایا تو شاہم چونک کر بولی۔

”بریک فاسٹ۔“ شاہم خفیف سی ہو گئی تھی۔

”آئی ایم گیٹ انگ لیٹ۔“ (مجھے دیر ہو رہی ہے) جاتے ہوئے اس نے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔

ایسے میں ماضی کے بہت سے درتچے کھلنے لگتے تھے اس نے بھی ماضی کے سارے کواڑ اپنے ہاتھوں سے بند کیے تھے۔ وہ ہر ہمنے والی یاد کو کسی ایسے مستقبل کی امید پہ، خود کو ڈانٹ کر یا کسی کام میں مصروفیت ڈھونڈ کر جھٹک دیتی۔ مگر بہت سی یادیں پوری ڈھٹائی سے وارد ہوتیں، ان ہی سے جان چھڑانے کی کوشش اس نے اپنے طور پر کی تھی۔ شام کو اپنے کمرے سے منصور کے بیڈ روم میں شفٹ ہوا ہی تھا، حالانکہ اس کا دل ہرگز نہیں مانتا تھا کہ وہ اس کمرے میں اس قدر استحقاق سے جائے۔

منصور نے اس سے کہا بھی نہیں تھا وہ اپنی زندگی سے وابستہ رہنے والی کی چھوڑی ہوئی جگہ آج بھی کسی کو دینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ شاہم کے کمرے میں سیٹنگ کا سوچتا تھا۔ پھر شاہم کے پاس بھی اپنے کمرے میں لٹش چند قیمتی لمحات تھے جو اس کا زندگی بھر کا اثاثہ تھے وہ بھی اپنا روم کسی سے شیر نہیں کر سکتی تھی۔

بالاخر وہ دونوں نچلے پورشن کے ماسٹر روم میں سیٹ ہو گئے کیونکہ بچوں کا کمرہ بھی نیچے ہی تھا اور اب انہیں شاہم کے ساتھ سونے کی عادت بھی پڑ چکی تھی۔ دعا اس کے ساتھ ہی سوتی تھی۔ اس بڑے سے کمرے میں حمزہ اور عمیر کے لیے سنگل بیڈ لگا دیا گیا تھا۔

دوہر میں اس نے چاکلیٹ کیک بنایا۔ اس نے لیوی چینل سے متعدد بار کیک کی ترکیب نوٹ کی تھی۔ شیٹ کی مدد سے اس نے کیک تیار کر ہی لیا۔ اسے فریج میں رکھ کے کچن کا بھیڑا سمیٹا۔

شام کو جب منصور آفس سے لوٹا۔ اس نے چائے کے لوازمات کی ساتھ اپنی محنت کا بھی اضافہ کر دیا۔

”یو نیویا! اما نے بنایا ہے یہ چاکلیٹ کیک۔“

حمزہ نے جب سے سنا تھا شاہم نے کیک بنایا ہے تب سے اس کی رال ٹپک رہی تھی۔ وہ ماں کے ہاتھ کا بنا چکنا چاہتا تھا۔ شاہم نے ہی منع کر دیا کہ پاپا آج امیں تو اکٹھے کھا میں گے۔

”ہوں۔“ حمزہ کی بات پہ ہنکارا بھرنا وہ دعا کو چھوڑ کر سیدھا ہو گیا۔

اس نے پہلا پیس کاٹ کر پلیٹ میں رکھ کے منصور کے آگے رکھا اور پھر عمیر، حمزہ کو دیا۔ منصور کے لیے چائے کا کپ بنا کر وہ دعا کے لیے پلیٹ لے کر دوسرے صوفے پر آ بیٹھی۔

”مام! بریلی دیری ٹیسٹی“ اسی لیے چھپا کر رکھا گیا تھا۔

حمزہ مزے سے کھاتے ہوئے بولا۔

”ماما میرا برتھ ڈے کیک آپ کو بنانا ہے، ابھی سے آرڈر ہے۔۔۔“

”اور میرا بھی۔۔۔“ حمزہ نے فوراً ”عمیر کی بات اچکی۔“

”او کے بابا او کے! آپ دونوں کے لیے بناؤں گی ماں کی جان، آپ کی ماں چوبیس گھنٹے آپ کے لیے حاضر ہے، سب گردوں کی۔“ اس نے فوراً ”حامی بھر لی۔“

مبادا ابھی مار کٹائی نہ شروع ہو جائے۔

”آپ نہیں لے رہے پاپا!“ عمیر کا دھیان منصور کی پلیٹ پہ چلا گیا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں، میں لے رہا ہوں، آپ کھاؤ۔“ عمیر کے گال پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے بولا، ”مگر وہ چائے کے سب لیتا رہا۔ وہ دونوں بھائی کیک کھا کر باہر لان میں کھینچے چلے گئے۔“

شاہم نے بے دلی سے برتن سمیٹ لیے۔

غنی بڑے مست موڈ میں ست رفتار میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ سگنل پہ گاڑی روک کر اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو دوسری سڑک پر ہسپتال کی پارکنگ میں اسے کاشا نظر آیا۔ اس نے ذرا غور سے دیکھا وہ پچھلی سیٹ پہ کچھ پھینک کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گرین سگنل پہ غنی نے اپنی گاڑی آگے بڑھادی۔ کاشا کو پانچ ہفتوں بعد یوں دیکھ کر اس کا دل بہت برا ہوا تھا۔ تین گھنٹے بعد گھر واپسی پہ اس کا کھنکھنے سے برا حال تھا۔ گھر کے اندرونی حصے میں آتے ہی اسے عجیب سے احساس نے یکدم گھیرا اس نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا۔

”رحیم۔۔۔ رحیم خان۔“ اس نے ملازم کو پکارا۔

”جی صاب!“ وہ موڈب حاضر تھا۔

”کاشا کہاں ہے؟“

اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کاشا آیا ہے؟ بلکہ یہ کہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس کی چھٹی حس نے آگاہ کر دیا تھا۔

”وہ جی تھوڑی دیر ہوئی چلے گئے۔“

”آیا کب تھا؟“ اس کی بے قراری قابل دید تھی۔
 ”وہ تقریباً ڈھائی گھنٹے پہلے آئے تھے۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے کھانے کا پوچھا انکار کر دیا، بولے ”کیلا چھوڑ دو۔ ڈیڑھ گھنٹہ اندر بند رہے اور پھر اٹھ کے چلے گئے۔“ رحیم خان نے ساری تفصیل بتادی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کمرے کی طرف مڑ گیا۔
 ”آپ کے لیے کچھ لاؤں صاب؟“
 اس نے اثبات میں سر ہلا کے جاتے ہوئے غنی کو پکارا۔

”نہیں، تم جاؤ بس۔“
 وہ انکار کرنا اپنے کمرے کے بجائے کاشا کے کمرے میں آ گیا۔ جب سے وہ گیا تھا وہ یہاں نہیں آیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے اپنائیت کا شدت سے احساس ہوا، جیسے وہ کاشا کے گلے لگ گیا ہو۔ شاید یہ اس کی یہاں موجودگی کی وجہ سے تھا۔ کاشا اور اس کی تصویریں اور اس کی اکیلے کی تصویریں اس کے ہونے کا احساس دلا رہی تھیں۔ وہ اس کی قد آور تصویر کے پاس آ رکا۔

”سنتا تو ہے میری پرمانتا کیوں نہیں آئے گا نہیں میرے پاس۔۔۔ میرے گلے سے لگنے۔۔۔ اپنا فلسفہ سنانے۔۔۔ پلیر کم بیک کاشا۔۔۔ پلیر۔“
 اس کا گلہ رندہ گیا تھا۔ آنکھوں میں ٹھہری نمی کو انگلیوں سے مسل کر اس نے بغور ہر طرف کا جائزہ لیا۔ مرکزی ٹیبل پہ جام کے خالی گلاس نہیں تھے، نہ ہی ایش ٹرے میں سگریٹ کا کوئی ٹوٹا، کیلا تولیہ بھی دوہرا تھرا کر کے بیڈ پہ نہیں اچھالا گیا تھا۔ کارپٹ بھی جوتے کی مٹی سے نہیں اٹا تھا۔ کاشا کب سے اتنا مہذب ہو گیا تھا۔

”کاشا اور اس کی فوٹو تھی جس میں کاشا نے وکٹری کا نشان بنایا تھا۔ اس فوٹو کے نیچے غنی نے کاشا کے لیے ایک عبارت لکھ دی تھی۔

”You are always winner“
 کاشا اس عبارت کو پڑھ کر نچلا ہونٹ دانتوں تلے

دبا دھیمادھیماسکراتا رہا تھا۔ اس کا ابھی یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ صوفے پہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھ گیا۔ کارپٹ پہ نظریں جمائے اسے کچھ یاد آ رہا تھا۔

”اسی لیے خبیث! میں تیرے کمرے میں نہیں آتا“ ہر چیز پہ تیرا حق۔“
 غنی کا موڈ خراب ہونے لگا تھا۔ وہ دونوں فلور کشن پہ لیٹنے لی وی دیکھ رہے تھے۔ غنی اس سے ریموٹ کا مطالبہ کر رہا تھا۔

”چل جھوٹے، بکواسی! پھر پوری ڈھٹائی سے یہیں آجاتا ہے، تیرا ہر چیز پہ حق ہے، سوائے اس کے۔“ اس نے ریموٹ کی طرف اشارہ کر کے غنی کو چڑایا۔

”ذیل نہ بن یا رہا، پس پانچ منٹ دیکھ لینے دے، اتنی کیسی اچھی نہیں ہوتی۔“ غنی ریسنگ دیکھنے کی فرمائش کر رہا تھا۔

”اسے چھوڑ دے دیکھ۔“ اس نے ایک بے ہودہ سی انگلش فلم کی طرف اس کی توجہ دلائی۔ ”دیکھ کیا لگتا ہے اس کے جسم میں؟“ غنی کی بات پہ اس نے ذرا اچھی توجہ نہ دی۔

”تو کرا اپنی مرضی میں جا رہا ہوں۔“ وہ ناراض ہو کے اٹھ ہی گیا۔

”اچھا ناں! بیٹھ جا۔“
 کاشا نے اس کے ٹراؤزر کا پانچ اپنی مٹھی میں جکڑ کر اسے روکا مگر وہ ریموٹ نہیں چھوڑا۔

”ایسا کر بیٹھ مت لیٹ جا“ میں نے تیرے ایموشنز چیک کرنے ہیں۔“ اس نے بیٹھے ہوئے غنی کی پیچھے سے شرٹ کھینچی۔

”کیوں؟ کون سے ایموشنز چیک کرنے ہیں۔“ غنی نے جنبہ کر اپنی شرٹ اس سے چھڑائی۔ کاشا اسے گھڑی سون سے دیکھتے نہیں دے رہا تھا۔

”جیسے عورت ذات سے اس قدر الرجی ہے کہ۔۔۔“
 اب مجھے شک ہوتا ہے کہ تیرے emotions Sexual (جنسی جذبات) میں کوئی گڑبڑ۔“

”آج میں تجھے ضائع کر کے رہوں گا۔۔۔ بچے گا نہیں۔۔۔“ غنی اس کی ہچکچاہٹ کے بیچ ہی اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے کاشا پہ فوراً ”مکوں سے حملہ کر دیا۔“

”اشاپاٹ غنی۔۔۔ لگ جائے گی۔“
 کاشا یونٹی شور مچا رہا تھا۔ نہ اسے لگتی تھی نہ ہی غنی نے اسے لگنا تھی۔ ان دونوں کے قہقہے بلند ہوتے گئے۔

انہی قہقہوں نے غنی کو حقیقی دنیا میں واپس کھینچا۔
 عید اور حنزہ شام میں منصور کے ہمراہ ٹینس کورٹ جانے لگے تھے۔ منصور کی بہت خواہش تھی کہ اس کے بیٹے قومی کھلاڑی بنیں۔ خود اسے بھی اپنی اسٹوڈنٹ لائف میں ایسے بہت سے مواقع ملے جنہیں اس نے پڑھائی کے جنون میں گنوا دیا۔ جب وہ اپنے پیارے ان کی زبانی سنتا تھا کہ کیسے وہ محنت کر کے اس اسٹاکلرشپ تک اور اسٹاکلرشپ سے انگلینڈ تک پہنچے تو اس کا جنون اور بڑھ جاتا، مگر اب وہ سوچتا تھا کہ کاش میں اپنی غیر معمولی ذہانت کو کسی غیر نصیبی سرگرمی میں بھی بروئے کار لایا ہوتا۔ اس کا وقت تو اب نہیں رہا تھا مگر وہ اپنے بیٹوں کے ذریعے اپنی خواہش کی تکمیل کر سکتا تھا۔ وہ انہیں روزانہ ایک گھنٹہ کورٹ لے جاتا تھا حالانکہ ابھی وہ ریکٹ سنبھالنے کے لائق بھی نہیں ہوئے تھے۔

”ہری اپ حنزہ! عمیر کٹ لیے گاڑی میں بیٹھ بھی گیا ہے۔“

شاہم شام کے کھانے کی تیاری کے ساتھ حنزہ کو بھی ڈانٹ رہی تھی جو فریج میں سے ساتھ لے جانے کے لیے فروٹس وغیرہ اپنے بیگ میں ڈال رہا تھا۔

”بس دو منٹ مام۔“ وہ کب سے یہی راگ الاپ رہا تھا۔

شاہم نفی میں سر ہلاتے اس کی مدد کرنے کو مڑی۔ شاہم سے چھپا کے تیسرا کین بیگ میں ڈالتا حنزہ پکڑے جانے پہ بہت گھبرا گیا تھا۔

اس نے کمر پہ ہاتھ رکھ کے بھنویں اچکانے پہ اکتفا

کیا۔
 ”سوری ماما، وہ۔۔۔ میرا فریڈ ہے عادل۔۔۔ یہ اس کے لیے۔“ اس نے کین یا ہرنکال لیا۔

یادیں اچھی ہوں یا بری، ہم لاکھ مصروفیت میں مشغول رہیں یہ اپنی جگہ بنا ہی لیتی ہیں۔ یونٹی یادوں کا ایک درجہ شاہم کی طرف بھی کھل گیا تھا۔
 ”اوکے، میں جا رہی ہوں۔“ شاہم نے فریج میں سے دو سیب اور تین کیلے نکال کر بیگ میں ڈالے تھے۔

”ایویں فضول میں، کہیں نہیں جانا، ابھی تو آئی ہو۔“ وہ چاہے پانچ گھنٹے ہی کیوں نہ ارسل کے پاس بیٹھی رہتی، وہ ہمیشہ اس کی واپسی پہ رکنے کی تکرار ضرور کرتا۔ شاہم کے معاملے میں اسے وقت سے گلہ ہی رہتا۔

”ابھی نہیں، تین گھنٹے قبل آئی تھی، مائینڈاٹ۔“
 ”جو بھی ہے تم۔“

”آئی کے ساتھ ڈنر پر جانا ہے لازمی، اگر میں وقت پر نہ پہنچی تو وہ پروگرام (ملتی) کر دیں گی اور پھر منصور بھائی سے ہو جائے گی میری پٹائی۔“ شاہم نے محبت سے اسے سمجھایا۔

اس کو ارسل کا یوں روکنا بہت اچھا لگا کرتا تھا۔
 ”اچھا۔۔۔ چلو تھیک ہے۔“ تل بند کر کے وہ اس کے مقابل اکھڑا ہوا تھا۔

”کل۔۔۔“ ہونٹ کا کونا دانت میں دبا کر وہ سر ہلاتی بننے لگی تھی۔ وہ روز ہی ملتے تھے پھر بھی وہ اس سے یہ سوال ضرور کرتا تھا۔

”گڈ بائے اینڈ ٹیک کیئر۔“ اس نے جاتے جاتے ٹیبل پر رکھی پلیٹ سے چکن پیسٹ اچک لیا۔

”رکو۔ رکو شامی۔“ اس نے تین قدم دور کھڑی شاہم کے شولڈر بیگ کو دبوچا۔

”کیا ڈھونڈ رہے ہو، کچھ نہیں ہے۔“ وہ اس کے بیگ کی زپ کھول رہا تھا۔

اسے کوفت ہو رہی تھی۔ اس کے کندھوں کا سارا وزن ارسل پہ تھا۔

”ہاں! تم کہہ سکتی ہو یہ کچھ نہیں ہے۔ یہ کچھ بھی نہیں ہے، بھوکی، ندیدی، یہ چوری کرنا تمہاری ایکسٹرا کوالٹی ہے، میں اتنی دور سے بازہ اور منگافروٹ لاتا ہوں اور تم اپنے اس بکسے میں ٹھونس کر چلتی بنتی ہو۔ جم سے واپسی پہ مجھے خالی فریق منہ چڑاتا ہے۔“

ارسل نے سارے پھل واپس نکال لیے۔

”تمہاری زبان بہت چالو ہو گئی ہے ارسل! اتنے بلیم۔ صرف اس چونکے کے پھل کے لیے۔ کتنے کیسے ہو تم۔ میں نے تمہیں اپنا اتنا قیمتی دل دیا اور تم۔۔۔ وہ رونے کی مصنوعی ایکٹنگ کر رہی تھی۔“

”نومانی ڈیر لیدی۔۔۔ میں جھوٹا، بکواسی، گھونچو، چوروں کا چور کمنل اور تم۔۔۔ تم۔“

اس نے بھی مصنوعی گھبراہٹ سے جواب دیا۔

”بہت برے ہو۔“ وہ اسے دھکا دے کر آگے بڑھی۔

”مگر صرف تمہارا ہوں۔“ اس نے بچن کے دروازے سے ٹیک۔ لگا کر بازو سینے پہ لپیٹتے ہوئے جاتی ہوئی شاہم کو دیکھ کر زور سے آواز لگائی۔

”جھوٹے۔۔۔“ ناک چڑھا کر بڑی دلکشی سے مسکراتی وہ بولی۔ سیب اس نے پھر بھی چھین کر لے لیا تھا۔

”ماما!۔“ حمزہ نے اس کا ہاتھ ہلا کر اسے ہوش دلایا۔

”آں۔۔۔ ہاں ہاں۔“ وہ بری طرح چونکی۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی بھر آئی۔ حمزہ کے قریب ہی منصور کھڑا تھا۔

”نکلو حمزہ!“ اس نے حمزہ کو کندھوں سے پکڑ کر کہا جو بہت حیرت سے ماں کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ شاہم نے کین دوبارہ اس کے بیگ میں ڈالا اور زبردستی مسکرا کر بیگ اس کے کندھوں میں چڑھا دیا۔ وہ باہر بھاگ گیا۔

منصور کے دو قدم اور قریب ہونے پہ اس نے سر جھکا لیا۔

”جانے والے بھولتے نہیں ہیں، خود پہ اتنا سخت پہرہ مت بٹھاؤ کہ انہیں بھلاتے بھلاتے خود کو ہی

فراموش کر دو۔“

”اس کے قدم نصیحت کر کے مڑ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں انکے آنسو گالوں پہ لڑھک گئے۔“

ماہم اندر آ کے ٹھنک گئی تھی۔ کاؤچ پہ بڑے ہی ڈھیلے ڈھالے انداز میں کاشا پیچھے سر نکاتے آنکھیں موندے نیم دراز تھا۔ سر شام وہ کیسے آگیا تھا؟ وہ بھی خاموشی سے۔ بیرونی گیٹ پار کرتے وہ چوکیدار یا سکیورٹی گارڈ میں سے کسی کی ماں بہن ایک ضرور کرتا تھا۔ اس کی گاڑی کامیوزک والیوم اتنا ہوتا تھا کہ ساتھ میں چار چھ گھروں کے سوئے ہوئے بیدار ہو جاتے تھے، پھر ماہم کی شامت آتی تھی۔ ابھی وہ کب آیا اسے بتائی نہیں چلا۔

”کاشف آریو فائن؟“ اس نے اس کے کندھوں پہ ہاتھ دھر دیے۔

”ہوں۔۔۔ یا آف کورس۔“ اس نے یکدم آنکھیں کھول کر جواب دیا اور پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔

”باہر دل نہیں لگا۔“ وہ آہستہ آہستہ اس کے کندھوں پر ہاتھ پھیرنے لگی جیسے پالتو بلی کی بڑی نرمی سے پشت سہلائی جاتی ہے۔

”دل کو کبھی اتنی چھوٹ نہیں دی کہ اپنی مرضی سے لگتا پھرے۔“

”تھک گئے ہو، دباؤں۔“ وہ اپنے ہاتھوں سے ہلکا ہلکا دباؤ ڈالنے لگی۔

”رہنے دو، آخری فل ہو گئی تو تمہیں تھکاؤں گا۔“ وہ پچھکاسا مسکرایا۔

”تمہارا یہ عملیہ چہرہ کھل رہا ہے مجھے۔“ اس کے چہرے کی اداسی پر دھنا مشکل نہیں تھا کیونکہ وہ بناوٹی انسان نہیں تھا۔

”قریب بیٹھو۔“

اس نے تھوڑا سیدھا ہو کر اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔

”کیا ہے؟“ اس نے اشارتاً ”بوچھا۔“

کاشا کا یوں جم کے تکنائے پچھلپا ہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

”بہت براہوں میں؟“

خود پسندی تھی یا خود اذیتی۔

”نہیں۔۔۔ زیادہ نہیں۔ ابھی بہت اچھے لگ رہے ہو بہت عرصہ بعد پہلے والے کاشف۔“ ماہم نے اس کی ہندلی کو جھٹ پکڑ لیا۔

”پہلے اور اب میں کیا فرق ہے؟“

”میں صرف کاشف سے واقف تھی۔ شادی ہوئی تو معلوم ہوا کاشف کا نام و نشان نہیں، اس جسم میں صرف کاشا کا روپ ہے جس کی۔۔۔“

”جس کی۔۔۔“ اس نے بچ میں اسے اچک لیا۔

”جس کی برائیاں اس کے لیے صفات ہیں۔ وہ محبت کا نہیں نفرت کا پتلا ہے۔ آپ اس کے ساتھ نام تو پاس کر سکتے ہیں مگر لائف نہیں۔ اس کی ہر ابی

میں آپ کو اپنی خواہش، آرزو، آزادی حتیٰ کہ آواز تک کاٹنی گا گھونٹا پڑے گا۔ جس کے الفاظ حرف آخر ہیں۔“

اس کی حوصلہ افزائی سے فائدہ اٹھا کر ماہم نے اپنے اندر کی ساری بھڑاس نکال دی۔ وہ یونہی مسکراتا رہا پھر جب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال لیا۔

”اور تم محبت کی دیوی اس نفرت کے پتلے کی پکارن ہو۔۔۔ تمہارا وہ محبت کا سلوگن (نعرہ) زندہ باد ہے ابھی بھی یا مردہ باد ہو گیا؟“ سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر اس نے سلگایا۔

”میں بد بخت کیا جانوں، محبت کیا ہوتی ہے؟ میں سلوگن لگاتی ہوں اور تم۔“ ماہم کو بہت دکھ ہوا تھا۔

”میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور یہ ذہن میں رکھو تم نہ کوئی اور۔“ وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔

”تم یہ نہ بھی بتاؤ۔ میں تب بھی جان چکی ہوں، کاشف ہم شادی شدہ ہیں۔ میں تمہاری بیوی ہوں، تمہاری توجہ۔۔۔ تمہاری محبت پہ میرا حق ہے بالکل اسی

طرح جس طرح تم میری ذمہ داری ہو، ہمارا رشتہ ویسا نہیں ہے، جیسا ہونا چاہیے، ابھی تم نے خود ہی اعتراف کیا کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں، یہاں رک کر اس نے توقف کیا۔

کاشا کی نظریں بہت سنجیدگی سے اس پر جمی ہوئی تھیں۔

”میں یہ سوچنے اور کہنے سے بھی ڈرتی ہوں کاشف، کہ تم میرے لیے ایک پچھتاوا بنے جا رہے ہو۔ مجھے اس قدر مجبور مت کرو۔ عمر بھر کا رونا میرا نصیب نہ کرو۔ میں نے اپنا سب کچھ تم پر قربان کر دیا، اس کے عوض وفا کی نہیں، تھوڑی سے محبت کی التجا ہے۔ تم بہت دیا لو ہو۔۔۔ مجھے پجارن نہیں بھکارن کچھ کر اپنی محبت کی صرف تھوڑی سی بھیک دے دو پلیز۔“

ماہم نے ہاتھ جوڑ دیے۔ کاشا کش لینا بھول کر اس کی میلی آنکھوں کو بے خودی، حیرانی سے نکلے گیا۔

وہ سوالی سے محبت کرتا تھا مگر سوال سے نفرت۔ اس نے کبھی کوئی بھکاری خالی جھولی نہیں لوٹایا تھا مگر اس سوالی نے اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ اس کی تڑپ نے اس کی بے نیازی سے ہلکا سا پردہ سرکا دیا۔

”آئی، ہیو نو ٹائم، تم نے غلط جگہ سوال کیا ہے۔“

اس کے وجود کی ریٹیلٹی چٹان کے ذرے بکھرنے لگے تھے۔ پڑمروہ سنسان بدن، ساکت نگاہیں۔

بے جان ملتے ہوئے۔

”مطلب۔۔۔“ وہ رو رہی تھی۔

”مطلب۔۔۔“ اس نے غائب و غاشی سے لفظ دوہرایا۔

کیوں؟ کیا؟ کیسے اور مطلب؟ کا جواب اس نے غنی کے سوا کبھی کسی کو نہیں دیا تھا۔

”مطلب یہ کہ۔۔۔ میں دل دیتا ہوں مگر دل میں جگہ کسی کو نہیں۔“ تھوڑے توقف کے بعد وہ بلاوجہ ہی ہنسنے لگا۔ کھوکھلی بے جان ہنسی۔

”اٹس مائی اسٹائل نا۔“ راکھ جھاڑ کر اس نے لمبا سا کش کھینچا۔

”سچ کو ماہم! بچے یاد آتے ہیں؟“
اس نے کتنی غیر مناسب اور بے موقع بات کی تھی۔

موندلیں۔

اشاک مارکیٹ ایک ہفتے سے مندی کا شکار تھی۔ اس اتار چڑھاؤ کی زد میں منصور بھی آگیا تھا۔ اسے لاکھوں کا نقصان ہو رہا تھا۔ اس کا راجیکٹ بھی کینسل ہو گیا تھا۔ مارکیٹ میں روپے کی گرتی ہوئی ساکھ سب تاجروں کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ منصور جو بہت ٹھنڈے مزاج کا تھا۔ اب ماتحتوں پہ چلانے لگا تھا۔ گھر میں بھی اس نے ایک بار شاہم اور پھر بچوں کو اپنے غلطے کا نشانہ بنایا۔ شاہم چپ چاپ برداشت کر گئی۔ ابھی اس نے آئس سے آکر کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ دعا کو بخار تھا۔ شاہم نے منصور سے ڈاکٹر کے پاس چلنے کو کہا۔ بھی تھا مگر اس نے اسے اکیلے جانے کا مشورہ دے دیا۔ دو دن سے دعا کو سنبھال سنبھال کر وہ خود اتنی تندر حال ہو چکی تھی کہ شام سے اسے بھی بخار محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی بھی وہ مسلسل رو رہی تھی۔

”یہ کیوں روئے جا رہی ہے؟ پلیرز اسے چپ کر دو!“

منصور نے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر کوئی تیسری بار یہ الفاظ دہرائے تھے۔ اب کی بار لہجے میں واضح جھنجھلاہٹ تھی۔

”دعا بیٹا! کیا ہو گیا ہے؟ چپ کر جاؤ میری جان! ابھی دوائی دی ہے نا، درد ختم ہو جائے گا۔ شاباش۔“

منصور کی پشت پہ ایک غصیلی نگاہ ڈال کر اس نے بیڈ سے جو کر اٹھا کر اسے دیا۔ اس نے روتے ہوئے بڑھے ہوئے جو کر کو پرے کر دیا اور اپنا سر شاہم کے کندھے پہ ٹکا کے بچکیوں سے رونے لگی۔

”اس کا رونا بند کیوں نہیں ہو رہا؟ گاڈ سب کیسے کر دواؤ اسے۔“ وہ خاصی برہمی سے کرسی دھکیل کر اس کے سر پر آکھڑا ہوا۔ عمیر اور حمزہ جو کارٹون دیکھ رہے تھے انہوں نے دایوم کم کر دیا۔

”کل سے کہہ رہی ہوں کہ بخار ہے اسے مگر آپ کو کیا؟ آپ کو اپنی جمع، تفریق سے فرصت ملے؟“

ماہم نے جھکا سر اثبات میں ہلایا۔
”اور۔۔۔ منصور۔“

ماہم نے سر اٹھا کر تھوک نگلا۔ کاشا کی ہنسی اور سوالات۔ وہ اسے کوئی نفسیاتی مریض لگ رہا تھا۔ اس نے کبھی بھی پوں منہ پھاڑ کے کسی کی ذاتیات میں داخل اندازی نہیں کی تھی۔ دوسروں کی سن سن رکھنا اس کی فطرت نہیں تھی۔

”میں اپنی غلطیوں سے سیکھتی ہوں، انہیں سدھارتی ہوں مگر وہ ہراتی نہیں۔“ اس کا لہجہ مستحکم تھا۔

”منصور تمہاری غلطی تھی۔“ اس نے اندازاً کہا۔

ماہم چند لمحے اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔

”غلطی وہ نہیں مہم ہو۔۔۔ مگر اسے یاد کر کے میں دوسری غلطی نہیں کرنا چاہتی، پہلے بھی ماضی کو یاد رکھ کے حال تباہ کر لیا۔۔۔ سٹ ناٹ الین۔“

آخر میں اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ کاشا چپ بول سکتا تھا، یقیناً سچ سننے کی ہمت بھی تھی

”اسٹر انک سی چائے لاؤ۔“

وہ پھر غیر متوقع بولا تھا۔ ماہم کی اتنی تلخی پہ اس کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں ابھرے تھے۔ مانتھے پہ ایک شکن بھی نہیں تھی، جیسے وہ ماہم کی اس اندرونی خلش سے آگاہ ہو۔

”ہاں۔“ وہ پریشانی سے اسے مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی، جو موبائل پہ نمبر ڈائل کرنے لگا تھا۔

”ہاں لیلی! کتنی بھاگ دوڑ باقی ہے۔۔۔ کل میڈیکل کے لیے جانا ہے۔ پھر دو گھنٹے بعد ملتا ہوں۔ اوکے سی یو۔“

فون بند کر کے اس نے پھر سے سر ٹیک کر آنکھیں

دھیان دیں۔ آپ کے اس رویے اور روز کی چی چی سے گھر کا سکون تباہ ہو رہا ہے بہتر ہے کہ آپ اپنا غصہ اپنے اسٹاف اور ورکرز پہ نکل کر آیا کریں۔ میں ملازمہ نہیں ہوں جو جلی کٹی برداشت کروں۔ اینڈ کانڈلی آئندہ مجھ پر چیخے گامت۔“ رندھے ہوئے لہجے میں بولتے اس کی آواز خاصی تیز ہو گئی تھی۔

بچوں نے سسم کر چپ ہو گئے۔ وہ دیوان سے دعا کو بھلا بھلا کر اس کی خوشامدیں کر رہی تھی۔ وہ دونوں بھائی واپس روم تک اس کے بغیر نہیں جاتے تھے۔ منصور کا آف موڈ اسے الگ بھگتنا پڑتا تھا۔

”لی پو پو سیلف شاہم۔“
شاہم کو اس روپ میں دیکھ کے اس کی حیرت سوا تھی۔ وہ ساکن ہی ہو گیا تھا۔

”اپنے لی پو پو کے بارے میں کیا رائے ہے آپ کی؟“ اگر اتنی ہی نفرت ہے مجھ سے تو گھر سے باہر نکال دیں نا۔“ آنسوؤں کا پھندا گلے میں اشک گیا تھا بات کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

”کریں اپنا کام، میں باہر چلی جاتی ہوں بہت بری لگتی ہوں۔“ وہ آگے بڑھنے لگی منصور نے سختی سے بازو پکڑ لیا۔

”چھوڑیے میرا بازو۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔
”چھڑو الو۔“ اس کے آنکھوں اور چہرے پہ بھی خلش تھی۔

”جب بھی چھوڑنا ہے آپ ہی چھوڑیں گے میں اپنا آپ نہیں چھڑواؤں گی۔“ منصور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھی۔

”اتنی مضبوطی سے پیر مت جماؤ کہ جب گروتو سنبھل نہ سکوں۔“ وہ کہہ کر کانٹا نہیں تھا۔

دعا کئی رو دھو کر اس کی گود میں ہی سو گئی تھی۔ عمیر اور حمزہ بھی سو گئے۔ منصور واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی باہر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ہوش و حواس قائم ہوتے ہی اسے اپنی بد تمیزی کا احساس ہوا۔

وہ منصور سے ناراض ہو کر کیسے چین کی نیند سو سکتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ باہر آئی۔ وہ لاؤنچ

میں صوفے پہ نیم دراز تھا۔

”منصور۔۔۔“ اس نے بہت آہستگی سے پکارا۔

”ہوں۔“ اس نے یکدم آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس کے کافی قریب کھڑی تھی۔

”بہت رات ہو گئی ہے، انھیں۔“ اس نے پونے دو بجاتی وال کلاک کی طرف دیکھا۔

اس کے جسم میں ذرا سی بھی حرکت نہ ہوئی۔ وہ نیچے قایلین پہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

”ایم سوری منصور! بہت زیادہ فضول بول گئی ہیں۔ بہت اسٹوپڈ ہوں۔ جانتی بھی ہوں کہ آپ کی آفیشل

پراہلمز ہیں، آل ریڈی بہت ڈسٹرب ہیں، میں دعا کو لے کے بہت تھک چکی تھی۔ مینٹلی ایکزاسٹ ہو گئی ہوں، میں آپ سے اونچا بولنے کا تصور بھی نہیں

کر سکتی، پتا نہیں میں نے کیا کیا کہہ دیا۔“ وہ رونے لگی تھی۔ وہ بے چینی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”پلیز پسی اور آخری بار معاف کر دیں۔ میں۔۔۔ پلیرز۔“

”اٹھو اور رونا بند کرو۔“ اس نے اسے اپنے برابر بٹھالیا۔

”سارا قصور تمہارا نہیں، میرا بھی ہے۔ میں بھی بہت ہانپ رہی ہوں لگا ہوں۔ گھر کا سکون بہت بڑی نعمت

ہوتا ہے جس میں، میں خلل ڈالتا جا رہا ہوں۔ میری آفیشل پراہلمز کا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ تم نے جو کیا وہ صرف ری ایکشن تھا۔ دعا بیمار تھی، مجھے تمہارے

ساتھ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے تھا۔ خیر میاں بیوی میں ایسی چھوٹی موٹی لڑائی ہو جاتی ہے اتنا سیریس مت لو، معافی تو مجھے بھی تم سے مانگنا

چاہیے۔“ منصور کے چہرے پہ الجھن کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے پوری سچائی سے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اسے بری الذمہ کر دیا تھا۔

منصور کو اس کا یوں معافی مانگنا بہت اچھا لگا تھا۔ اس سے بھلا کب کسی نے معافی مانگی تھی۔ اپنی غلطی کے باوجود۔

”تو پھر آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟“ شاہم نے اس سے شکوہ کیا۔

”چلو۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”ادھر نہیں ادھر۔“ اس نے بیڈ روم کی طرف جاتے منصور کا بازو پکڑ کر پکچن کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ نے کھانا نہیں کھایا، میں نے بھی نہیں کھایا“ صرف رات کا کھانا ہی تو ہم ساتھ کھاتے ہیں۔ آپ ٹیبل پہ نہیں تھے میرا بھی دل نہیں چاہا۔“

وہ مڑتے پن سے اسے بتاتی، پکچن میں لے آئی۔

منصور کو ایک عجیب سی انہونی خوشی ہو رہی تھی۔ اس کے اندر کئی دنوں کا پلٹا غبار آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے منصور سے معافی مانگی تھی اس کے ناراض ہونے پہ روتی تھی اس کی غیر موجودگی میں کھانا نہیں کھایا تھا۔

کسی بھی انسان کو جب تک یہ احساس ہے کہ کوئی ہے جو میری پروا کرتا ہے تو وہ کبھی بھی کمزور نہیں پڑتا۔

دستی گھڑی پہ سوا دس بجاتی سوئیوں کو ذرا غور سے دیکھ کر اپنے استقبال کے لیے کھڑے اسٹاف کو سر کے مبہم اشارے سے گڈ مارنگ کہتے وہ اپنے آفس میں داخل ہو گیا۔ آج اس کا کام معمول سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ دو اہم میٹنگز تھیں۔ اسے ٹیکس کے سلسلے میں انکم ٹیکس آفیسر سے ملنا تھا۔ گودام کا چکر بھی لگانا تھا۔ اس حساب سے وہ کافی لیٹ ہو چکا تھا۔ بریف کیس ٹیبل پہ دھر کے، کوٹ کا اوپرنا بن کھولتے لمبا سانس خارج کر کے وہ کرسی پہ بیٹھا تھا جیسے شکر ادا کر رہا ہو، چلو یہاں تک تو پہنچا۔ انٹر کام پہ سیکریٹری سے آج کے دن کی تفصیلات پوچھیں۔

”ایکسکیوز می سر! صبح سے آپ کے لیے تین بار کسی شخص کی کال آچکی ہے۔“ وہ اپنی مطلوبہ معلومات لے کر ریپورر رکھنے ہی والا تھا کہ دوسری طرف سے اس سے بھی تیزی دکھائی گئی۔

”کون تھا؟“ اس نے سرسری سا پوچھا۔

”نام نہیں بتایا، کافی Insist (اصرار) کیا ہے۔ بہت رعب دار بلکہ غصیلی آواز تھی۔ شاید وہ۔“

”ٹھیک ہے اب کال آئے تو مجھے ٹرانسفر کر دیں۔“ غنی نے فضول نقش بیانی سے جان چھڑائی۔

لحہ بھر کو اس نے سوچا ”کون ہو سکتا ہے۔“ کاشا کے علاوہ اور کسی کا نام ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ کاشا کو یہاں کا چپڑا سی تک جانتا تھا، پھر وہ نام نہ بتانے والی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی وہ اندازہ لگا ہی رہا تھا کہ اسی گناہم شخص کی کال موصول ہو گئی۔

”بس غنی اسپیکنگ۔“

”کاشا کہاں ہے آج کل؟“ اسی مخصوص جگہوں پر برا کم کم نظر آتا ہے۔ اس شخص نے غنی کو اپنا نام پوچھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

”تم نے کاشا کا پوچھنے کے لیے مجھے فون کیا ہے؟“ کوئی گیدڑ یا چوہا ہے جو چھپ کر گیس بیٹھ جائے گا۔“

کاشا کا ذکر سن کر وہ تیار ضرور تھا مگر اسے زیادہ غصہ اس شخص کے لہجے پہ آ رہا تھا جو کسی گریز کی طرف اشارہ کرتا تھا۔

”شیر کو چوبائیسے بنایا جاتا ہے، اس کا نسخہ جانی باؤ کو اپنے پرکھوں سے ملا ہے۔“ کہنے والے کی مکروہ ہنسی میں صاف دھمکی تھی۔

”واٹ ریش سیدھی طرح بکو۔“

جانی باؤ کے نام سے اسے تھوڑی بہت واقفیت تھی مگر وہ ذرا نہیں ڈرا تھا۔

”دیکھ شہزادے! ہم صرف نرمی سے بات کرتے اور سمجھاتے ہیں، بکنے والی کیشنگوی سے نہیں ہیں ہمیں گلا پھاڑنے سے زیادہ آسان، انگلی دبانا لگتا ہے۔“ بہت نڈر اور لا پرواہ لہجہ تھا۔

”کام کی بات کر رہے ہو یا فون رکھ دوں۔“ اس نے سختی سے کہا۔

”آج رات ساڑھے دس آجانا تجھ سے کہہ ضروری باتیں کرنا ہیں، پھر تو اپنی زبان میں کاشا کو سمجھا دینا، سنا ہے تیری وہانتا ہے۔“

”مجھے کاشا کی کسی ایکٹیویٹی میں کوئی انٹریسٹ نہیں

اور تم۔۔۔“

”مانا کہ تیری ناراضی ہے مگر ہے تو تیرا جگرتاں کل کلاں کچھ ہو جاتا ہے تو ساری زندگی کا پچھتاوا ہے میرے لیے۔“ غنی ساکت سا ہو گیا۔ وہ شخص ان دونوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔

”کہاں آتا ہے؟“ اس کی آواز کالی دھیمی تھی۔

غنی نے مطلوبہ جگہ کا ایڈریس سن کر اس کی مزید بکواس سے بغیر فون بند کر دیا۔ ٹھیک دس بج کر پچیس منٹ پہ اس کی کار پارکنگ ایریا میں جا رہی تھی۔ وہ وقت کا پابند تھا مگر یہاں وہ جان بوجھ کر صرف پانچ منٹ بل آیا تھا۔ وجہ کوئی خاص نہیں تھی۔ صبح اس فون کال کو سوچ سوچ کر اچھے برے اندازے لگا لگا کے اس کا ذہن اتنا الجھ گیا تھا کہ اس کی طبیعت بوجھل اور بدن دکھنے لگا تھا۔ اپنی تمام مصروفیت ملتوی کر کے وہ آفس سے اٹھ گیا۔ کئی بار اس نے سوچا کاشا سے لاکھ ناراضی سہی مگر اسے یہ معاملہ اسی سے معلوم کرنا چاہیے۔ اس شخص کی دھمکی بھری آواز نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

وہ ابھی وسیع ہال کے بیچوں بیچ کھڑا ادھر ادھر متلاشی نظریں دوڑا رہا تھا کہ ویٹراس کی طرف بڑھا۔

”سر! ٹیبل آپ کے لیے ریزرو ہے۔“ ویٹراس مخصوص میز تک لے آیا۔ جہاں کرسی پر اس کی طرف پشت کیے کوئی موجود تھا۔ وہ اس کے بالکل سامنے والی کرسی پر براجمان ہوا۔

”مجھے بتا تھا تم ضرور آؤ گے کیونکہ۔۔۔“

”پلیز کم ٹودی پوائنٹ“ آئی ہو تو ناٹم۔“ وہ اس کا چھوڑا این سننے کے لیے نہیں آیا تھا۔

سفید کلف لگے سوٹ میں ملبوس گردن اکڑائے، چپڑے پہ خباثت کرختگی، سیاہ گھنی واڑھی مونچھیں، سوا چھ فٹ قد، بھرے ہوئے جسم والے اس بد معاش صفت کو یہ بالشت بھر کا چھو کر برا کھلا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اس کا تپا پانچا کر دیتا۔

”جانی باؤ کا آدمی ہوں کاشا نے ان سے گلبرگ کی ایک کو بھی کا سودا کیا تھا۔ کاغذات اس کے نام نہیں

ہیں۔ بلیک میں قبضہ دے گا، تم جانتے ہو گے اس طرح کی دو نمبری میں دام کا کوئی مول نہیں ہوتا، طاقت کا ہوتا ہے۔ بس سودے میں تھوڑی سی اونچ نیچ ہو گئی ہے۔ کاشا اپنی بولی سے ایک روپیہ کم وصول کرنے پر تیار نہیں جبکہ جانی باؤ کی نظر اس کو بھی یہ ایسی لگی ہے کہ وہ چھوڑنے کو تیار نہیں، تم کاشا کو سمجھاؤ۔۔۔“ میں ملا تھا اس سے۔ بڑی ہی الٹی کھوپڑی کا ہے، کیوں بھری جوانی کو کندھوں پر اٹھوانا۔۔۔“

”بس۔۔۔“ غنی نے ہاتھ اٹھا کر اسے منحوس بولنے سے روکا۔

غنی کے لیے یہ نئی خبر دھماکا تھی۔ وہ اپنے تاثرات پہ قابو پا کے خاموشی سے اٹھ گیا۔

اس کا اگلا کام کاشا کو سارے شہر میں ڈھونڈنا تھا۔ اس کے تھکے ماندے اعصاب کو لمبی نیند اور آرام کی اشد ضرورت تھی۔ کاشا کا یہ کارنامہ جان کر اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ پہلا نمبر اس نے جم کا ڈاکٹر کیا، وہ وہاں نہیں تھا، الماس بائی نے کاشا کا نام سنتے ہی وہ گوہر افشائیاں شروع کیں کہ غنی نے فون بند کر دیا۔ یقیناً ”کاشا نے اس کا ناطقہ بند کر رکھا ہو گا۔ کاشا سے واسطہ پڑنے والوں کی اس کی پیٹھ پیچھے زبان یوں ہی فرارے بھرتی تھی۔ آخری تلاش ریس کورس کی تھی وہاں بھی لا علمی کا اظہار ہوا۔ جوں جوں وہ انکار سنتا جا رہا تھا، اس کا خون مزید کھولتا جا رہا تھا۔

آخر کار وہ مڈ نائٹ کلب آیا تھا۔ یہاں کاشا کی عیاشی کا سب سامان موجود تھا۔ اس کلب کی ممبر شپ غنی کے پاس بھی تھی۔ یہ بھی کاشا کی مہربانی تھی۔ جو وہ اپنے لیے پسند کرتا تھا وہی غنی کے لیے بھی ماسوائے عورت کے۔

غنی اس کی ہر برائی میں برابر چلتا مگر جہاں عورت کا معاملہ آتا وہ بدک جاتا۔ گاڑی پارک کرنے میں اسے کافی دقت ہوتی تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ کلب کی روخنیاں اپنے جوبن پر تھیں۔ تیز انگلش میوزک کے ساتھ تالیوں اور چیخنے چلانے کا شور بھی عروج پر تھا۔ فینسی لائٹس کی مدد ہم روشنی جل بجھ رہی تھی۔

اس نے مجمع کے اندر گھس کے چہروں کو جانچا۔ کتنے ہی نازک بدن اس کے ساتھ مس ہوئے تھے۔ جھومتے ہوئے کسی کے سلکی بال اس کے خدوخال سے ٹکرائے۔ کاشا یہاں بھی نہیں تھا۔ وہ رستہ بنانا اسی کلب کے فرسٹ فلور پر آگیا جہاں گندی گالیاں بکتے جواری اور عادی شرابی حال سے بے چال تھے۔ شراب پینے والوں میں عورتیں بھی شامل تھیں جو اور کسی میدان میں تو نہیں البتہ یہاں مرد کے کندھے سے کندھا ملانے کی کوشش کرتی تھیں۔ کاؤنٹر پر کھڑے وکی نے اس کی طرف دیکھتے آشنا سی مسکراہٹ اچھالی۔ اس کلب کا ایک فلور باقی تھا۔ جہاں کوئی یوں منہ اٹھا کر نہیں جاسکتا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر آگیا۔

اسے لگ رہا تھا وہ کاشا کو مار دے گا یا خود کو کچھ کر لے گا۔ گارڈ اپنا فرض نبھانے کے چکر میں اب کی بار بھاگتا ہوا اس کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔

”بولا نہیں بنگل فل ہے“ کارڈ دکھاؤ۔“ پھولتی سانسیں ہموار کرتے اس نے کندھے پر ڈھلکتی بندوق سیدھی کی۔ غنی نے اپنا سارا غصہ اس پر نکالنے کا سوچا۔ ڈھلکتی بندوق کو جھٹکے سے کھینچ کر اس کو سیدھا کیا۔ اس اچانک افتاد پر وہ گارڈ سنبھل نہ سکا۔ پارک بھر پور داریوں نے اسے زمین پر لٹا دیا۔ غنی نے اسے دفاع کا موقع ہی نہیں دیا۔ بندوق اسی پر پھینک کر وہ لمبی راہداری میں آگیا۔

روم نمبر زیرو زیرو تان کو دھڑو دھڑاتے اسے پیسہ آچکا تھا۔

وہ جواب دینے کے بجائے آخری فلور کی طرف سر اٹھا کر ریٹنگ کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔

”بہت پیسے ہوئے تھے وہاں ریٹنگ پہ کسی حسینہ۔“

کاشا کے کمرے کی اندرونی صورت حال سے آگاہ ہونے کے باوجود وہ تنگ دینے کی جرات بھلا غنی کے سوا اور کون کر سکتا تھا۔ یہ دوسرا موقع تھا۔ پہلی بار بھی کاشا جان گیا تھا کہ باہر کون ہے؟ اب بھی اس نے کافی تسلی و اطمینان کا مظاہرہ کیا۔ باہر کھڑے اپنا خون کھولتے غنی نے ساتویں منٹ میں چوتھی بار دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔ کاشا بدن پر بنیان چڑھتا نکلا تھا۔ غنی کے اتنے سخت تاثرات نے اسے ٹھنکا دیا۔

”جسٹ شٹ اپ وکی“ اس کی بنگل چیک کرو۔“ وہ بھٹا گیا۔ وہ مسکراہٹ کو بریک لگا کے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگا۔

کسی کی بنگل کا پول کھولنا یہاں کے قاعدے قانون کے خلاف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ شہر کا سب سے مہنگا اور محفوظ ترین کلب سمجھا جاتا تھا جہاں پر آپ کو نقاب پوشی کی ضرورت نہیں۔

”جانی باؤ سے کیا جھگڑا ہے تیرا؟“ غصے کو ضبط کرنا وہ آخری حد پہ کھڑا تھا۔ وہ اتنے عرصہ بعد ملے تھے وہ بھی اس انداز میں۔ وہ دونوں کی دوری پہ ایک دوسرے کو کتنی دیر بانہوں میں لپٹانے رکھتے تھے۔

”روم نمبر زیرو زیرو تان میں کاشا موجود ہے۔“ غنی کو اپنی کنپٹیاں تپتی محسوس ہوئیں۔ اس کا سارا جسم دھک رہا تھا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا میڑھیاں چڑھ گیا۔ وکی نے بے بسی سے اسے جاتے دیکھا۔ وہ اسے روک نہیں سکتا تھا مگر سیکورٹی گارڈ اس کے رستے میں آگیا تھا۔

”تو شہر بھر میں جھل خوار صرف یہ پوچھنے کے لیے رہا تھا گھر آ جاتا یا۔۔۔“

”میری بات گول مت کر۔“ وہ چبا چبا کر بولا۔

”میں گلبرگ والی کو تھی“ جس میں رہتا ہوں وہ سیل کر رہا ہوں۔“ کاشا نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بتایا۔ وہ بھلا کیوں خائف ہوتا۔

”کیوں؟ وہ ماہم کی ملکیت ہے تمہارے نام نہان ہو گئی ہے؟“

”روکو کدھر جاتے ہو سارے کمرے تک ہیں۔“ اس کے تاثرات گارڈ کو ٹھیک نہیں لگے تھے۔ وہ تیز تیز چلتا اس کے سامنے تن گیا۔ غنی نے اسے دائیں بازو سے پرے دھکا دیا۔

”جانی باؤ اندر ورلڈ کا بندہ ہے قبضہ گروپ۔“

”ایک سیکورٹی سربراہ کیا بد تمیزی ہے“ آپ نے ہمارے گارڈ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے“ اسے زخمی کر دیا ہے۔“ کلب کا منیجر دو تین لوگوں کے ساتھ پہنچ گیا تھا۔ غنی یوں بیگانہ بنا کہ جیسے یہ سب کسی اور سے کہا جا رہا ہو۔

کاشا نے باری باری دونوں کو دیکھا اور معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔

”ایسا کرو۔“ وہ سپر پاکیٹ سے والٹ نکالنے لگا۔

”یہ رکھو۔“ اس نے ہزار ہزار کے نوٹ نکال کر اس منیجر کی طرف بڑھائے۔

”اسے ہسپتال لے جاؤ۔ پٹیاں وغیرہ کسواؤ، گلو کوڑ چڑھاؤ جو باقی پیسے بچیں اس کی عیادت کے لیے جاتے ہوئے بکے خرید لینا کیونکہ مرا نہیں نبھ چل رہی ہے۔“

”مگر سربہ سراسر زیادتی۔۔۔“

”اے منیجر! زیادہ بڑھ بڑھ کے طرف داری نہ کر“ جس طرح غنی نے اس گارڈ کو اوقات یاد دلائی یہ نہ ہو میں تجھے تیری اوقات یاد دلا دوں“ اس پہ تو ترس کھا کے میں نے رقم دے دی ہے“ تجھے کون دے گا؟ چل جا یہاں سے“ کہیں میرا بھیجہ نہ الٹ جائے۔“

اس نے سر فنی میں ہلا کے اسے ہاتھ سے بھی دفع ہونے کا اشارہ دیا۔ منیجر ضبط کے کڑوے گھونٹ پی کے مڑ گیا۔

”یو آر گونگ گڈ کاشا!“ غنی نے اس کے ہاتھ سے والٹ چھین لیا۔ ”اسی پیسے کی دھن پہ تو اپنی عاقبت کو آگ میں جھونک رہا ہے۔ تو کتنا ذلیل انسان ہے“ کسی نے تیری محبت میں اپنا بسا بسایا گھر اجاڑ دیا اور تو بدلے میں اسے اور برباد کرے گا۔ جس پیسے پہ تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہے، کبھی اس عورت سے بھی پوچھ جو تیری ماں ہے، کہاں سے بھیجتی ہے تجھے ایک جوان بیٹے کا بوڑھی بے بس ماں خرچہ پورا کرنے کے لیے کتنے پارہ بیلتی ہے۔ اس کا جرم صرف تجھ جیسے سپیولے کو جنم دینے کا ہے۔ کبھی کبھار مجھے لگتا ہے تو

لاچی نہیں صرف بدلہ لے رہا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے تیرے اندر سکون اترتا ہے“ لا شعوری طور پر ہر عورت کو اپنی فرسٹیشن کا شکار بننا چکا ہے۔ تیری ماں نے تیرے ساتھ اچھا کیا یا برا؟ اس کی سزا تو ہر عورت کو دیتا ہے۔ اگر ماں سے نفرت ہے تو اس کا دیا کیوں کھاتا ہے؟ دوسروں کو خالی کرتے کرتے تو خود کھوکھلا ہو چکا ہے۔ جو کچھ تو کرنا پھر رہا ہے، جس دن مرا تیرے جنازے کو کندھا بنے چار لوگ بھی نہیں آئیں گے“ پھر تم۔۔۔


”تم تو آؤ گے ناں“ مجھ جیسے گنہگار کو چار کی نہیں صرف تیرے کندھے کی ضرورت ہو گی۔“ وہ جذباتیت میں تباہ ہوتے غنی کو ٹوک کر استفسار کر رہا تھا۔

”جسٹ شٹ اپ۔“

غنی بکتا بکتا سلگتے جذبات لیے واپس مڑ گیا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ)

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



میں عبدالقادر بہنوں
شروت ندیر
قیمت - 225 روپے

مکھوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

میری سچائی کا سکارہ

غریب گھرانے میں پیدا ہونے والی سارا کو اپنی خوب صورتی پر بہت غور ہے۔ بچپن کا مگیترا وجود خوب صورت ہونے کے محض غریب ہونے کی بنا پر ٹھکرا دیا۔ اگرچہ نواز اکرم کا پورا خاندان اور وہ خود معمولی شکل کے تھے۔ لیکن سارا نے پورے خاندان سے ٹکڑے کران سے شادی کر لی۔ لیکن کبھی نواز اکرم کو وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ انہیں اپنی بڑی بیٹی ماہین سے صرف اس لیے نفرت ہے کہ وہ شکل و صورت میں دوھیال پر بڑی ہے، جبکہ چھوٹی بیٹی میرب بالکل ان کا پرتو ہے۔ سارا علوی اور میرب ہر وقت ماہین کو اس کی کم صورتی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ جس سے ماہین اپنے رنگ کے معاملے میں حساس ہو گئی ہے۔ دونوں بہنوں میں بالکل نہیں بنتی۔ اس کی واحد دوست رفعت اسے نت نئی رنگ گورا کرنے والی کریمیں لاکر دیتی ہے اور پیسہ بھرتی ہے۔ گھر میں وہ نواز اکرم کے قریب ہے، لیکن ہر وقت کی تنقید اور رشتوں سے انکار نے اسے نفسیاتی طور پر تباہ کر ڈالا ہے۔ نواز اکرم کی بہن ثروت بھی اس سے محبت کرتی ہے، لیکن سارا علوی کے ناروا سلوک کے باعث بھائی کے گھر آنے سے کتراتے ہیں۔

میرب کے لیے نواز اکرم کے دوست رضا اپنے بیٹے کا رشتہ دیتے ہیں تو میرب اسے ٹھکرا دیتی ہے۔ سارا۔ کا ایک ذہنی طور پر کمزور بھائی شہزاد ہے جس کی ذمہ داری ماں نے مرتے وقت سارا کے سپرد کی تھی۔ اسے آوارہ گردی کا اور مشورہ دینے کا شوق ہے۔ ماموں شہزاد کو ماہین سے خاصی انیسیت ہے جو دیگر لوگوں کی طرح انہیں ڈانٹنے کے بجائے ان کا خیال رکھتی ہے۔

Scan & PDF
FIAZ AHMED
Friends Korner.com



فاخرہ کی اپنے شوہر ریاض کے انتقال کے بعد دنیا اندھیر ہو گئی۔ اسے چند ماہ تک اپنے بیٹے کاشف کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ میکے والے اس موقع پر اسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاض کے بچپن کا دوست اقبال کاشف کو اپنی چکنی چڑی باتوں سے متاثر کر لیتا ہے۔ حالات کی سنگینی کا احساس فاخرہ کو اس وقت ہوتا ہے جب کاشف ماں کو اقبال سے شادی کا مشورہ دیتا ہے۔ فاخرہ اسے احساس دلاتی ہے کہ وہ اقبال سے دور رہے، لیکن کاشف اقبال انکل کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں۔ بیٹے کو مجبور کرنے پر وہ اقبال سے عقد ثانی کر لیتی ہے۔

شادی کے فوراً بعد اقبال اچھائی کا لبادہ اتار پھینکتا ہے اور ماں بیٹے کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ گھر کا پیسہ فاخرہ کی اسکول کی نوکری پر ہی چلتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ کاشف کو اپنا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ وہ نواز اکرم کے یہاں بطور اکاؤنٹ کلرک کام کرتا ہے اور کبھی کبھار ہی ماں سے ملتا ہے اور ہر وقت فاخرہ کو علیحدگی کا مشورہ دیتا ہے۔ اس عمر میں بدنامی کا خوف انہیں ایسے فیصلے سے روکے ہوئے ہے۔ فاخرہ کے لیے اقبال کی غیر اخلاقی سرگرمیاں ناقابل برداشت ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

۵ پانچویں قسط

میں بیٹھے ہیں آپ کو بلایا جا رہا ہے۔ پیون دانت نکالتا باہر نکل گیا تھا۔

”تو وہ یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔“ اس نے دانت پیسے ”اب کیا ہو گا کیا کروں۔“

اس کا ذہن تیزی سے آنے والی صورت حال کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ نواز اکرم کے سامنے اقبال کو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور اس کی اسی بے بسی کا فائدہ اٹھا کر وہ کچھ بھی بول سکتا تھا۔

”اگر اس نے رانی کا قصہ نواز اکرم کو بتا دیا تو؟“ پل بھر میں اس کا دل سکڑ کر پھیلا۔

”مجھے فوراً اس کے پاس جانا چاہیے دیکھوں تو کیا کہہ رہا ہے۔“ کاشف جلدی سے اپنے کہن سے نکل کر نواز اکرم کے آفس کی جانب بڑھا۔

”ارے اقبال صاحب! آپ کاشف کے باپ ہیں آپ سے بات۔“ اسی بل کاشف نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ نواز نے چونک کر اسے دیکھا۔

”سورہ! اس نے اجازت طلب نظروں سے نواز اکرم کو دیکھا۔

”او آؤ کاشف! آؤ بیٹھو۔“ اس نے اندر آکر ایک

فاخرہ کا اندیشہ اگلے ہی روز سچ ثابت ہوا تھا۔ جب اقبال گجر نواز اکرم کے آفس جا پہنچا تھا۔ کاشف اپنے آفس میں بیٹھا کام کر رہا تھا جب چپراسی نے آکر بتایا۔

”سر جی! آپ کو بڑے صاحب اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔“

”خیریت!“ وہ بے ساختہ چونکا ابھی گھنٹہ پہلے تو وہ ان سے ایک فائل پر سائن کروانے گیا تھا تو تمام تفصیلات طے کر لی تھیں۔ پھر اب کیا بات ہوئی تھی۔

”ہاں جی۔ خیریت ہی ہے آپ کے والد صاحب آئے ہیں۔“

”کون والد صاحب؟“ اس نے نا سمجھی سے پوچھا تو پیون بے ساختہ چونکا۔

”والد صاحب! اباحضور۔ ابوجی! کیا کہتے ہیں آپ اپنے والد کو باپ کو کاشف صاحب۔“ پیون کے مذاق پر اس نے سہم کر ٹھٹھک کر اسے دیکھا تھا دل میں ایک دم ایک جھماکہ سا ہوا تھا۔

”اقبال!“ اس کے منہ سے سرسراہٹ آواز نکلی۔

”ہاں جی! اقبال صاحب! بڑے صاحب کے آفس

کڑی نگاہ اقبال پر ڈالی جو اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بڑی کھنٹی سی ہنسی ہنس رہا تھا۔ نواز اکرم اپنے موبائل پر مصروف ہوا تو اس نے گھور کر اسے دیکھا۔

”کیوں آئے ہو تم یہاں؟“ اس کا لہجہ بے حد سنگین اور سرد تھا۔ مگر آواز بہت دلی ہوئی۔ اس وقت اس کی بے بسی اور اقبال کی کمینگی غریب پر تھی۔ اقبال کو بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کس بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ بے بس برندے کی طرح محض پھر پھرتا تو سکتا ہے، مگر آواز نہیں نکال سکتا۔

”نواز صاحب نے مجھے خود بلایا ہے، کچھ ضروری معاملات طے کرنے کو جو صرف اور صرف بیوں کے درمیان ہی طے ہو سکتے ہیں۔ کیوں نواز صاحب؟“

اقبال نے اس کی کیفیت سے حظ اٹھاتے ہوئے بڑے ہی مدبرانہ اور بزرگانہ انداز میں اسے جتلیا تھا۔ کاشف کے تن بدن میں آگ سی بھڑک گئی تھی۔

”بالکل بھئی۔ یہ شادی بیاہ کے معاملات تو بزرگوں کے درمیان ہی طے ہوتے ہیں نا۔“ نواز اکرم کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”الو کا پٹھا کالا بھینسا! اب اسے کیسے بتاؤں۔“ اس کے اندر گالیاں ابل رہی تھیں۔ مگر وہ بہت تابعداری سے سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔

”آپ بڑے ہیں کاروبار کا تجربہ بھی ہے میں چاہتا ہوں آپ کاشی کو اس کے کاروبار میں مدد دیں۔ کیونکہ بچے تو بہر حال بچے ہوتے ہیں نا۔“

”بالکل جی بالکل! آپ کی بات سونے جیسی ہے، آپ بالکل فکر مت کرو، میں سب سنبھال لوں گا جی!“

اقبال اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بہت ہی خوش خوش کہہ رہا تھا۔ کاشف نے بمشکل خود کو کنٹرول کر رکھا تھا۔

”لیں اقبال صاحب! آپ کی لسی آگنی ہے۔ بھی تمہارے فادر چائے نہیں پیتے تو میں نے ان کے لیے ان کا پسندیدہ ڈرنک منگوا لیا ہے۔“ چپراسی نے سلور کے بڑے بڑے لمبے گلاس سامنے گلاس ٹاپ پر رکھے

تو اقبال کی میلی گدلی ہوس زدہ آنکھوں کی چمک و گئی ہو گئی تھی۔ اس نے غٹ غٹ کر کے پورا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھایا تھا۔ کاشف نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر نواز اکرم کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جہاں زبردستی اور مجبوری کی مسکراہٹ پھیلی تھی۔ کاشف کے پیٹ میں ایک دم گول سا گھوما تھا۔

”واہ جناب! واہ! سواد آگیا یہ اپنے۔“ فینچے کی لسی تھی نا، بڑی مشہور دکان ہے جی۔ بڑی دنیا وہاں لسی بیٹے آتی ہے اور۔۔۔ آ۔۔۔ بات کرتے کرتے اس نے منہ کھول کر بھینسے کی طرح ڈکراتے ہوئے ڈکاری۔ نواز اکرم بے ساختہ منہ بنا کر ہنسنے لگا تھا۔

”اباجی! آپ میرے کمرے میں آئیں۔“ باقی باتیں وہاں کر لیتا، سر بہت مصروف بندے ہیں۔“ اگلے ہی بل وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ ہی اقبال کو بھی بازو سے تھام کر کھڑا کر لیا تھا۔

”اوئے جبر کر! مجھے نواز صاحب سے بات تو کرنے دے۔“ یار میں نے ان سے کاروبار کے متعلق۔۔۔ تیرے کاروبار کے متعلق پیسے کی کل بات کرنی تھی اور۔۔۔“

اقبال نے اپنا بازو اس کے سخت شکنجے سے چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے نواز اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”سورہ! سورہ! ہم نے آپ کا بہت ٹائم لے لیا۔ میرے اباجی بالکل فارغ بندے ہیں اور ہر کسی کو اپنے جیسا سمجھتے ہیں۔ سورہ! سر! آئیں اباجی۔“

کاشف نے دونوں کو بولنے کا موقع دیے بغیر جلدی سے کہا۔

”اقبال! ارے یار! اوئے نن! اوئے بات تو۔۔۔ میں نے نواز صاحب سے۔“ اس کی ساری ادھوری باتیں نظر انداز کیے کاشف اسے سختی سے کھینچتے ہوئے اپنے کہن میں لے آئے۔

”بس! بہت ہو گیا یہ تماشا! بند کریں ڈرامہ بازی! جانتا ہوں تو پیسے کے لالچ میں یہاں آیا ہے، مگر۔“

ماہنامہ شعاع 227 اگست 2011

ماہنامہ شعاع 226 اگست 2011

دکن

اگست 2011 کے شمارے کی ایک جھلک

”اوار کسی دنیا سے“ لکھنا FM-107 کے پروجیکٹر ”عبدل اظہار“ کا ہیں۔

”انوشے عباسی“ سے شاپن رشیدی ملاقات۔

”شہود علوی“ کے پازے کے ساتھ۔

”مہر سے ملنے“ کے ساتھ ”درجن بال“ کے بارے میں دلچسپ باتیں۔

”اوار کے حوالے سے قارئین سے برے۔

”گارانہ کی عدالت میں“ ”اوار کا“ ”ماہیہ واسطی“ سے سوالات۔

زیب تارو کی نازی۔

”بول کہ لب آزاد ہیں قہر“ قارئین کے لیے دلچسپ سلسلہ۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

”نور الدین“ ”نور الدین“ کا سلسلہ ”اوار“۔

میری نقل میں وہ پریل سوٹ سلوایا تھا جو تمہیں بالکل سوٹ نہیں کیا تھا اور تم نے وہ یقیناً ”ارم کو دے دیا ہوگا۔“ ماہین نے محل سے اس کی بات سنی۔ پھر ایک دم ہنس دی۔

”وہ میں نے ارم کو نہیں دیا تھا، بلکہ اس کے کٹڑے کٹڑے کر کے کوڑے دان میں پھینک دیا تھا۔“ اس نے بڑے ہی سرد لہجے میں اسے اطلاع دی اور پھر وہاں سے اٹھ کر چل دی جبکہ میرب کا منہ حیرانی سے کھلا رہ گیا تھا۔

”واٹ کیا ماہین!“ اور وہ اس کا چنچا چلا کر قطعی نظر انداز کر کے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

”ہا، اب چنچنی رہے،“ مجھتی کیا ہے خود کو، یہ تم پر سوٹ کرے گا اور یہ نہیں کرے گا، ہر رنگ ہر شے پر اسی کا حکم چلتا ہے، جیسے ہر چیز اسی کے لیے بنی ہے، بڑی خوش فہم ہے۔“ وہ اس کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے آئینے کے سامنے آگئی تھی۔

”کیا واقعی سفید رنگ اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ اس پر سب چل جاتا ہے اور سب اچھا لگتا ہے، اور میرا رنگ مجھے گھرے رنگ پسند ہیں، مگر میں اپنے پسندیدہ رنگ نہیں پہن سکتی کیونکہ سب ہی مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ ماما ہر وقت کہتی ہیں۔ بلکہ ہلکے رنگوں کے کپڑے پہنا کرو، تو پھر میری خواہش کب پوری ہوگی۔“ اس نے حسرت سے آئینے میں اپنا سر لپا دیکھا۔ سفید شلوار، ہلکی پنک قمیض، سفید دوشہ۔

”کتنی کمی ہے میری زندگی میں رنگوں کی۔“ مجھے گھرے رنگوں کی لب اسٹک پسند ہے۔ مگر

”تم اپنی مرضی کیا کرو، میرب تمہاری مرضی پر چلتی ہے کیا، جو تم اس کی مرضی پر چلتی ہو۔“ ارم نے نئی بار اسے سمجھایا تھا، مگر وہ اتنی بہادر نہیں تھی کہ اس کی باتوں پر عمل کرنے کا سوچ بھی لیتی۔

”شادی کے بعد جو مرضی پہننا، جیسا مرضی پہننا، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ ایک بار ممانے کہا تھا۔

”تو کیا کاشف۔“ ایک خوب صورت سی

جلد ملاقات ہوگی، رب راکھا۔“ وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گیا کاشف نے غصے سے میرب کا مارا۔

”کمینہ، گھٹیا، امی نے اسے بتا کر اچھا نہیں کیا، میں پوچھوں گا، یہ کمینہ مجھ سے زیادہ پیارا ہو گیا ہے، انہیں۔“ اس کا تمام غصہ فاخرہ پر نکلتا تھا اور اسی بات کا خدشہ کئی کلو میٹر دور بیٹھی فاخرہ کو بھی تھا۔ اسی لیے وہ بے حد پریشان اور متشکر بیٹھی آتے والے وقت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

ماما اور میرب شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں اور وہ خاموش تماشاخی تین میں نہ تیرہ میں۔ روزانہ ہی بازاروں کے چکر لگ رہے تھے اور روزانہ ہی ہزاروں لاکھوں کی شاپنگ ہو رہی تھی۔ مگر وہ اس ساری شاپنگ سے محروم، بے بسی سے بس ماں اور بہن کی آنیاں جانیاں ہی دیکھ رہی تھی، کبھی کبھار وہ لاؤنج میں ہی بیٹھی ہوتی تھی تو میرب اپنے کپڑوں اور جوتوں کو کھول کھول کر دیکھتی اسے بھی دیدار کروا دیتی تھی۔

”پیارا ہے نا، بہت قیمتی ہے یہ سوٹ، شاپ والے نے کہا کہ آپ یہ ضرور لیں، آپ پر یہ بہت سوٹ کرے گا، لگتا ہے یہ آپ کے لیے ہی بنا ہے۔ کیسا ہے؟“

وہ سی گرین بے حد نازک اور خوب صورت کام والا دوشہ اپنے سر پر اوڑھ کر اسے دکھاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ماہین کا سر اثبات میں ہل گیا۔

”بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ اس نے دل سے اعتراف کیا۔ واقعی وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

”ہاں، مگر یہ کمر تم پر سوٹ نہیں کرے گا، یہ بہت فیٹر (گورے) رنگ پر چلتا ہے۔ تم اس کمر کا سوٹ مت بنو لینا۔ ورنہ۔“

”ورنہ!“ اس کا ہاتھ بے اختیار دوشے سے پھسل گیا تھا۔ اس نے غصے سے میرب کو گھورا۔

”ورنہ بہت عجیب لگوگی، تمہیں پتا ہے نا، تم نے

اسے کرسی پر دھکا دے کر اس نے زہر خند لہجے میں دانت پیٹتے ہوئے اسے ٹوکا۔

”آہستہ، ہولی ہولی بول کا کے، ورنہ یہاں سے نواز سیٹھ کا کمرہ زیادہ دور نہیں ہے۔“ اقبال گجبر نے خباثت سے مسکراتے ہوئے اسے گویا تنبیہ کی تھی۔

”تو کیا سمجھتا ہے، میں تیری دھمکیوں سے ڈر جاؤں گا۔ اگر تو یہاں۔۔۔ اس بلڈنگ میں بیٹھا ہے تو شخص میری وجہ سے ورنہ تیرے جیسے کو تو اس کے گیٹ پر کوئی بھیک بھی نہ مانگنے دے اور جو تو سوچ رہا ہے نا، وہ بھی ممکن نہیں ہوگا۔ میں نے نواز اکرم کو تیری اصلیت بتا دی تو۔“ اس نے غصے سے اس کی جانب انگلی اٹھا کر کہا تو اقبال نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا تھا۔

”لوئے کا کے! بچہ ہے نا، جوان خون سوچنے نہیں دیتا، تو میری اصلیت بتائے گا تو کیا میں چپ رہوں گا، رانی کے بارے میں تو نے یقیناً سیٹھ صاحب کو کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ ہے نا؟“ وہ کان کھاتے ہوئے خباثت سے مسکرا کر اسے دیکھتا اپنی کرسی سے اٹھا تھا۔ کاشف کا منہ سرخ ہو گیا۔

”تو مجھے بلیک میل کرے گا کمینہ، میں تیری۔۔۔ وہ غصے سے بے قابو اس کی جانب جھپٹا تھا۔ اسی پل دروازہ کھول کر گل خان اندر آ گیا۔

”کاشف صاحب! آپ کے لیے چائے لاؤں۔“ اس نے حیرانی سے کاشف کو دیکھا جو اقبال کے بے حد قریب کھڑا تھا۔ اور اس کا گریبان تھامے ہوئے تھا۔

”ہاں، آں ہاں، لے لے آؤ۔“ وہ گڑبڑا کر پیچھے ہٹا۔

”ایک یادو؟“ گل خان نے بغور سر تپا اقبال کا جائزہ لیا تھا۔

”ایک۔۔۔ اباجی تو جا رہے ہیں واپس۔“ اس نے ابا جی کو دانتوں تلے پیسا تھا، اقبال۔ بے ساختہ مسکرایا تھا۔

”ہاں، ہاں، میں تو جا رہا ہوں، بہت شکریہ، ان شاء اللہ

مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی تھی۔
 ”ہاں! وہ مجھے نہیں روکے گا وہ کتنا ہے تم پر سب رنگ سجتے ہیں۔ تم ہر روپ میں مجھے اچھی لگتی ہو۔ وہ میرے ظاہری حسن کو نہیں دیکھتا وہ تو میرے باطنی حسن کا دیوانہ ہے مجھے سنہری پری کہتا ہے۔“
 جوں جوں وہ کاشف کے بارے میں سوچ رہی تھی اس کے گہرے سانولے رنگ میں عجیب سی روشنی پھیل رہی تھی۔

”شادی کے بعد میں اپنے سارے پسندیدہ رنگ پہنوں گی گہرے رنگ جو کبھی نہیں پہنے ہیں اور گہرا ڈارک میک اپ بھی کروں گی، سرخ، مہون، اور بج لپ اسٹک بھی لگاؤں گی تب مجھے ماما میرب دونوں میں سے کسی کا خوف نہیں ہوگا نہ کوئی روک ٹوک نہ طنز نہ کوئی طعن دینے والا۔“ وہ بے حد خوش اور مطمئن سی سب سوچے جا رہی تھی۔ موبائل بیل بریک دم چوٹی۔ بے ساختہ مسکراہٹ چہرے پر پھیلی تھی۔
 دوسری جانب کاشف کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

”بڑے لمبی عمر ہے تمہاری میں تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔“
 ”واقعی یعنی شیطان کو یاد کیا تو شیطان حاضر۔“ وہ زور سے ہنسا۔

”تم شیطان نہیں ہو، تم تو فرشتہ ہو کاشف! میری صبح کا ستارہ، میری امید اور خوشی کی سحر۔“ وہ جذب سے کہہ کر جیسے اپنے لفظوں کے سحر میں خود ہی کھو گئی تھی۔

”بہت شکریہ میری جان یہ تو تمہاری زرہ نوازی ہے جو مجھے اتنا بلند رتبہ دیتی ہو ورنہ میں کیا میری اوقات کیا۔“

”ایسی باتیں کیوں کرتے ہو کاشف! تم خود کو میری نظر سے دیکھو میرے دل میں تمہاری محبت کتنی زیادہ ہے تم اندازہ نہیں لگا سکتے ہو۔“

”لگا سکتا ہوں یہ تمہاری محبت ہی تو ہے جو مجھے نواز اکرم نے اپنا بیٹا بنالیا ہے۔ ہاں بس ایک بات مجھے تکلیف دیتی ہے کہ۔“ وہ یک دم سنجیدگی سے کہتے کہتے

خاموش ہو گیا۔ مابین بری طرح بے چین ہوئی۔
 ”کیا کیا ہوا ہے کیا بات تمہیں تکلیف دیتی ہے کاشف مجھے بتاؤ۔“
 ”میری غیبت میں تمہیں اپنے دل کی ملکہ تو بنا چکا ہوں مگر سچ مجھ تمہیں کسی ملکہ کی طرح اپنے گھر میں نہیں رکھ سکوں گا۔ کیونکہ میں اتنا دولت مند نہیں ہوں ایک غریب معمولی۔“
 ”کاشف۔۔۔“ اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی مابین نے سچ کر اس کی بات کالی نہیں۔

”تمہاری اس بات سے مجھے بہت دکھ ہوا ہے کاشف! میں دولت کی بھوکی کوئی سطحی سوچ رکھنے والی لڑکی نہیں ہوں مجھے وہیہ پیسہ دولت کی کوئی خواہش نہیں ہے میرے لیے سب سے اہم تمہاری محبت اور عزت ہے تم اپنے اندر سے یہ امیری غریبی کا کیلیکس نکال دو۔“

”اوکے اوکے ڈیر توبہ میری توبہ اب کوئی بات نہیں کروں گا بس۔“
 ”پیسے کے علاوہ محبت اور اعتماد کی باتیں جتنی چاہے کرو کوئی رکاوٹ پابندی نہیں ہے۔“ وہ ہنس کر بولی تھی۔

”سوچ لو بہت بڑی اجازت دے رہی ہو پھر نہ کہنا مجھے تنگ کرتے ہو۔“ کاشف نے معنی خیزی سے اسے بتایا تو وہ سرخ ہو کر زبان دانتوں تلے دبا لی۔
 ”کیا ہوا؟ اب چپ کیوں ہو۔“ کچھ ہی دیر بعد وہ شرارت سے ہنسنے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”کچھ نہیں اچھا اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ پھر بات کروں گی شام کو اوکے بائے۔“ اس نے کاشف کی ”سنو سنو“ کو نظر انداز کرتے ہوئے جلدی سے فون بند کر دیا تھا۔ ورنہ وہ مزید رونا بنک ہو جاتا۔
 ”کاشف!“ بے حد سکون سے لیٹ کر بند آنکھوں میں اس کا سراپا سمونے اس نے آہستہ سے پکارا تھا۔



”آیاں! شادی میں محض ہفتہ باقی ہے اور تم ابھی

تک اپنی منی، شیلانا پ گرل فرینڈز کے چکروں سے نہیں نکل سکے ہو۔ ابھی تک فون بھی آتے ہیں اور۔۔۔ تمہارے بابا بہت ناراض ہو رہے تھے بیٹا! یہ تمہاری پسند سے شادی ہو رہی ہے اور تم میرب سے محبت کے دعوے دار ہو تو اس کے لیے اپنی زندگی میں موجود سب لڑکیوں کو نکال دو کیونکہ ان سب کے ساتھ تم میرب کو خوش نہیں رکھ سکو گے۔ عورت مرد کی شیرنگ کسی بھی صورت میں پسند نہیں کرتی۔ گھروں میں لڑائی جھگڑے شروع ہو جائیں تو سب ہی کا آرام سکون برباد ہو جاتا ہے اور میں اپنے گھر کا آرام سکون کبھی برباد کرنا نہیں چاہوں گی اسی لیے تمہیں کبھاری ہوں کہ تم سیریس ہو جاؤ۔“

عالیہ واسطی نے بڑے سنجیدہ انداز میں اسے سمجھایا تھا۔ آیاں سر جھکائے خاموشی سے بیٹھا ان کی بات سن رہا تھا۔

”ماما ڈونٹ وری آپ کو میری جانب سے کوئی شکایت نہیں ہوگی اور وہ میری منی، شیلانا پ گرل فرینڈز محض نامم پاس ہیں۔ میرب کے آنے کے بعد ان کی میری زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔“
 ”پر امس۔“ عالیہ واسطی ابھی بھی بے یقین تھیں۔

”پس ماما شیدور“ آئی نو میرب بہت پوزیٹو ہے میرے معاملے میں۔ وہ یہ سب برواشت نہیں کرے گی۔ سو میں بھی مزید پکا مسلمان بن جاؤں گا۔ نیک شریف شوہر جیسا ڈیڈی شادی کے بعد بن گئے ہیں۔“
 وہ ہونٹ دبا کر شرارت سے کہتے ہوئے ماما کو دلچسپ معنی خیزی سے ہنسا۔ عالیہ واسطی نے گھور کر اسے دیکھا۔

”تم اپنے ڈیڈی سے خود کو مت ملاؤ انہوں نے کبھی تم جیسی حرکتیں نہیں کی ہیں۔ وہ بہت شریف اور اچھے انسان تھے۔“ عالیہ واسطی نے خفگی سے اسے بتایا تو اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”اللہ ہر کسی کو آپ جیسی بیوی دے جو شوہر کی ساری خامیوں پر پردہ ڈال کر اسے سنی ساو تری بن کر دکھائے۔“

”بکو مت۔ اتور کو میں یونیورسٹی کے زمانے سے جانتی ہوں مجھ سے ملنے سے پہلے جو بھی کرتے تھے الگ بات ہے مگر مجھ سے ملنے کے بعد انہوں نے کبھی کسی لڑکی کو نہیں دیکھا۔“
 ”کیوں نہیں دیکھا ماما کل بھی بازار میں ایک بڑی اسمارٹ سی فیشن ایبل آئی کو گھر رہے تھے۔“ عالیہ واسطی کے دعوے پر اس نے ہل کر کہا تو انہوں نے غصے سے اسے گھورا۔

”اپنے کر تو تیر پردہ ڈالنے کو تم اپنے باپ کو بدنام کر رہے ہو شرم کرو آیاں اور ہاں اب مزید کوئی ایڈ ونس مجھے برواشت نہیں ہوگا۔ لڈرا سنڈیڈ۔“
 وہ اسے تنبیہ کرتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں۔
 آیاں واسطی نے متہ بنا کر سر جھکا۔ پھر گہرا سانس لے کر زیر لب بڑبڑایا۔ ”لوگ صحیح کہتے ہیں شادی نہ کرنا یا رو پچھتاؤ گے ساری لائف۔ ابھی تو میرب گھر میں آئی بھی نہیں اور مجھ پر پابندیاں لگ رہی ہیں بعد میں تو۔“

”ہائے میری منی، شیلانا پلو“ کی۔ کیا ہو گا ان بے چاریوں کا اور خود میرا میں کیا ان سب کے بغیر صرف اور صرف ایک عورت کے لیے زندگی وقف کر سکتا ہوں۔“ عجیب سی الجھن میں بلا سوچ رہا تھا۔ اس جیسے کلی کلی منڈلانے والے ہنارے کے لیے ایک ہی ڈال پر بسیرا بہت مشکل تھا۔

”اف“ کیا ہو گیا ہے مجھے کتنا عجیب سوچ رہا ہوں میں توبہ۔“ اس نے گھبرا کر سر ہٹکا اور جلدی سے میرب کا نمبر ملایا۔ اسے میرب سے بات کرنے کی شدید خواہش ہو رہی تھی یا پھر خوف زدہ تھا اپنے اندر اٹھتے جذبات سے اپنی توجہ ہٹانے کو فوراً کسی ساتھی کی ضرورت تھی اور میرب سے بڑھ کر قریبی اور بہت خاص ساتھی کون ہو سکتا تھا۔

”ہیلو چارمننگ! کیا کر رہے ہو۔“ دوسری جانب سے میرب کی کھنکھاتی خوبصورت آواز نے بل میں طبیعت کو ہشاش بشاش کر دیا تھا وہ بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بید پر ہنس مہم دراز ہو گیا۔

”نور ہو رہا ہوں اور تمہیں مس کر رہا ہوں۔“
”سہلی! آئی مس یو تو تم ایسا کرو میرے گھر آ جاؤ“
دونوں مل کر کہیں ڈرائیو پر چلتے ہیں۔ موسم بھی بہت
اچھا ہو رہا ہے۔
”اوجو میری جان یہ ہوئی ثابت میں ابھی آیا تم
نے تو میرے دل کی بات کر دی ہے گرے۔“ وہ خوشی
سے اچھلتے ہوئے فون بند کر کے باہر بھاگا تھا۔

”ماما سے تو پوچھ لوں۔“ میرب نے کہہ تو دیا تھا۔ مگر
سارا سے بہر حال اجازت لینا بھی اسی کیسے ہو سکتا تھا
کہ سارا سے اجازت نہ دیتیں۔
”شادی میں بہت کم دن رہ گئے ہیں۔ اب تم آیان
سے ملنا جلنا کم کرو۔“
”واٹ! آپ کا مطلب پرہ شروع کروں؟“ سارا
کی بات پر اس نے ہنستے ہوئے طنز لہجے میں کہا۔
”پرہ کرنے سے دلہن پر روپ آتا ہے میرب!“
میرب نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

”کم آن ماما یہ پرانے زمانے کی دقیاوسی باتیں ہیں
آج کل تو یہ رنگ روپ صرف اور صرف ایک اچھے
پارلر کی وجہ سے ہی آتا ہے اور میں اس شر کے سب
سے اچھے پارلر میں بنگ کرنا چکی ہوں۔ ہاں مابین کو یہ
ترکیب ضرور آزمانا چاہیے ہو سکتا ہے اسی بہانے
سے۔ میرا مطلب آپ سمجھ گئی ہوں گی ماما۔“
سامنے سے آئی مابین کو دیکھ کر اس نے فوراً بات
بدل دی تھی۔ مابین تھک کر رہی۔ وہ مزے سے اپنا
بیک کندھے پر ڈال کر چلتی بنی تھی۔ اور مابین وہاں سے
مل بھی نہیں سکی تھی۔

”تم کہیں جا رہی ہو؟“ اسے یوں گم مُم دیکھ کر سارا
نے پوچھا تو وہ چونکی۔

”جی ماما۔ بازار جا رہی ہوں۔“
”کس کے ساتھ؟“

”ارم کو بلایا ہے اسی کے ساتھ جاؤں گی۔“
”کتنا کام باقی رہ گیا ہے اور ختم کرو اب یہ بازاروں

کے چکر لگانا۔ ایک ہفتہ تو رہ گیا ہے شادی میں۔“
”جی ماما۔“ جی تو چاہا پوچھے ابھی میرب جو باہر گئی
ہے۔ کس لیے۔ کس کے ساتھ اور کیوں والے سوال
اس سے تو نہیں پوچھے تھے آپ نے۔ پھر ساری
پابندیاں میرے لیے۔ بس میرے لیے ہی کیوں؟ مگر
ہمیشہ کی طرح خاموشی سے بیرونی دروازے کی جانب
چل دی تھی۔

”سنو گاڑی ہے۔“ اس نے بیرونی دروازے
کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو ایک دم ماما کی آواز آئی تھی۔
”جی ماما۔“

”کاشف لایا ہے گاڑی؟“ ماما کے استفسار پر وہ پل
بھر میں ان کا مدعا سمجھ گئی۔ بے ساختہ اس نے اپنے
ہونٹ پیچ لیے ماما کاشف کی بے عزتی کا کوئی موقع
بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔ اسے کم تر ثابت
کرنا اور اسے اس کی اوقات یاد دلانا انہیں کبھی نہیں
بھولتا تھا۔

”ماما! کاشف ڈرائیور نہیں ہے۔ اس گھر کا ہونے
والا داماد ہے۔ گاڑی ڈرائیور ہی لایا ہے۔“ اس نے
”ڈرائیور“ پر خاص زور دیتے ہوئے ماما کو دونوں کافرق
سمجھایا تھا۔ اور باہر نکل گئی تھی۔

”کیا بات ہے تمہارا موڈ کیوں آف ہے۔“ ارم
نے گاڑی میں بیٹھتے ہی پوچھا۔ اس نے بمشکل خود
قابو پایا۔ جی چاہا صاف صاف بتا دے۔ مگر اس سچ سے
خود اپنی بھی تو ہنسی ہوتی تھی۔ اس لیے بات پلٹ گئی۔
”یار! مجھے اس ٹیلر نے خوار کر دیا ہے۔ ایک ہفتہ
سے مسلسل چکر لگا رہی ہوں۔ اور اب تک کپڑے
نہیں سلے۔ آج میں نے اسے خوب سنائی ہیں۔ اگر
آج بھی ماسٹر جی نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔“ اس نے اپنا
سارا غصہ ٹیلر پر نکال دیا تھا۔

”تنتا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی
ہفتہ باقی ہے۔ مل جائیں گے کپڑے اور اگر کوئی رہ گیا
میں پک کر لوں گی تم کیوں پریشان ہوتی ہو۔“ ارم نے
بڑے پیار سے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ وہ یکدم خاموش
ہو گئی تھی۔ ارم نے بغور اسے دیکھا۔ بچپن سے وہ اس

کا ہر رنگ، ہر روپ، ہر انداز، حتیٰ کہ لب و لہجے کا اتار
چڑھاؤ بھی دیکھتی اور پرکھتی آتی تھی۔ پھر یہ کیسے ممکن
تھا کہ وہ اب اس کے موڈ کو پہچان نہ پاتی یقیناً اسے گھر
سے ڈانٹ پڑی تھی۔ سارا یا میرب۔ اس نے مابین
کے منہ سے ہمیشہ ان ہی دونوں کے نام سنے تھے۔ اور
اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی میں بھی ہمیشہ یہی دو نام
سرفہرست ہوتے تھے۔

”تم کسی اور کا غصہ ماسٹر صاحب پر اتار رہی ہو
مابین۔ سچ بتاؤ۔ کیا بات ہوئی ہے؟“

ارم کی بات پر یکدم اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا
تھا۔ دل تو پہلے ہی بھرے جام کی طرح پھلنے کو بے
تاب تھا۔ ارم کی ذرا سی ہمدردی پر فوراً اس کے اندر
جیسے گولے تھے۔

”ماما کہتی ہیں۔“ حلق تک نمکین پانی بھر گیا تھا۔
”پلیز روکو نہیں۔ ارم نے ہمدردی سے اس کے
کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”میں ایسی نہیں ہوں۔ پھر ماما مجھے الٹی سیدھی
باتیں کیوں کہہ جاتی ہیں۔ کیوں کیا ان کی نفرت۔“
اس کے اندر کاٹا چبھا تھا۔ اذیت لہجے سے جھلک
رہی تھی۔

”میرب کو تو کبھی انہوں نے ایسے نہیں کہا۔
حالانکہ وہ ہمیشہ ان کی مرضی کے خلاف کام کرتی
ہے۔“

اس کے انداز میں عجیب سی بے بسی اور محرومی
تھی۔ جس نے چہرے کو مزید سیاہی مائل بنا کر دیا تھا۔
ارم نے اس کے کندھے پر ہمدردی سے ہاتھ رکھا۔
اسے بہت ترس آتا تھا اس پر۔ وہ جب بھی اپنی بہن
اور ماں کی زیادتی کا شکار ہوتی تھی تو ایسے ہی خود ترسی
اور بے بسی سے بولتی تھی۔ اور وہ ہمیشہ اپنا کندھا پیش
کر دیتی تھی۔ تاکہ وہ کھل کر رو لے۔ اگرچہ وہ اپنا
کندھا پیش کرنے کی پوری قیمت وصول کرتی تھی۔
اس کے ساتھ دوستی کا رشتہ محض بے غرض اور بے
لوٹ نہ تھا۔ کپڑے، جوتے، تحائف، ہر ضرورت میں
پیسوں سے مدد، بغیر ضرورت، بخوشی دیے جانے والے

تحائف۔

دونوں اپنی اپنی ضرورت کے لیے ایک دوسرے کی
محتاج تھیں۔ اور یہی محتاجی دوستی کے پل صراط کا کام
دے رہی تھی۔ دوستی بے غرض اور بے لوٹ ہوتی
ہے۔ مگر کبھی کبھی غرض کے ساتھ جڑی دوستی بھی دیرپا
اور گہری ثابت ہوتی ہے۔ کچھ لو اور کچھ دو کا اصول دو
انسانوں کے درمیان کا بنیادی اصول دوستی، تعلق اور
رشتے داری استوار کرتا ہے۔

”چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ دل برا مت کرو۔ آؤ!
ماسٹر صاحب کی دوکان آگئی ہے۔“ ارم نے اس کے
کندھے کو تھکتے ہوئے اسے تسلی دی۔ وہ ابھی بھی غم
آنکھیں لیے خود کو سنبھال رہی تھی۔

”تم چند دن کی مہمان ہو اپنے گھر میں۔ سب کی
باتوں کو ایک کان سے سنو اور دوسرے سے اڑاؤ۔“

دیکھنا شادی کے بعد تم سب باتیں بھول جاؤ گی۔
کاشف کی محبت، پیار اور اعتماد تمہیں سب کچھ بھلا
دے گا۔ تم بہت خوش رہو گی اور یہ سارا گزر اوقت۔
جو نہیں تکلیف دیتا ہے۔ یاد بھی نہیں رہے گا۔“
ارم کی حسین باتوں نے ٹانگ کا کام دیا تھا۔ وہ فوراً
سب کچھ بھلا کر مسکرا دی تھی۔ کاشف کا خیال۔ اس
کے ساتھ گزارے جانے والے دن، نئے گھر کا تصور
اور نئے گھر کی خواہش۔ اسے سب کچھ بھلا دیتا تھا۔ اور
پھر نہ تو اسے سارا کی زیادتیاں یاد رہتی تھیں۔ اور نہ ہی
میرب کے طنز اور مذاق۔ وہ ساری نئی کاشف کے لہجے
کی محاسن سے ختم ہو جاتی تھی۔

اسے بھی آنے والے دنوں کا شدت سے انتظار
تھا۔ جب سارا وقت اسی کا ہو گا اور کاشف کا۔ اور ان
دونوں کے حسین خواب ناک محبت بھرے دن۔

ارم نے شاپ میں داخل ہونے سے قبل اطمینان
سے اسے دیکھا۔ اس کا موڈ بہت نارمل اور اچھا ہو گیا
تھا۔ کاشف کا ذکر اس کے موڈ کو ہمیشہ ہی بدل دیتا تھا۔
اور پھر وہ تمام وقت بڑے خوش خوش انداز میں اس کے
ساتھ شاپنگ کرتی رہی تھی۔ ماسٹر صاحب نے اگرچہ
ابھی تک اس کے دوستی سے بھی نہیں تھے۔ اس

کے باوجود اس نے ان پر غصہ نہیں کیا تھا۔ نہ چیخی چلائی نہ پریشان ہوئی۔ اسی طرح خلاف طبیعت دکان دار سے بغیر جھگڑا کیے اس نے اتنا میک اپ کا سامان بھی خرید لیا تھا۔ حالانکہ یہ ایک بہ پرماعرکہ تھا۔ جس کے لیے ارم خود کو خاصا تیار کر کے آتی تھی کہ ماہین کو پروہ پر ڈاکٹ چاہیے ہوئی تھی جو رنگ گورا کرتی تھی۔ خواہ وہ اس کے لیے مناسب ہوتی تھی یا نہیں۔ اور اگر دوکاندار شامت اعمال اسے کسی معاملے میں مشورہ دے دیتا تھا تو وہ بھڑک اٹھتی تھی۔ اسے اپنے رنگ کی مناسب سے میک اپ کا سامان خریدنا قطعی پسند نہ تھا۔

”مجھے یہ ہلکے براؤن۔ پیلے اور سفیدی مائل آف وائٹ کلرز بالکل پسند نہیں ہیں مت دکھائیں۔ برائٹ ڈارک کلرز دکھائیں۔“ اس کی ایک ہی ڈیمانڈ ہوتی تھی۔ اور اسی لیے نے تگے اور بے کار سامان سے بھری الماریاں بھی اسے مطمئن نہیں کر سکی تھیں۔ مگر آج تو کمال ہی ہو گیا تھا۔

”آج تم نے بہت اچھی شاپنگ کی ہے۔ ساری چیزیں ہی بہت شان دار ہیں۔“ گھر آکر ارم ڈبے کھول کھول کر اس کی لائی ہوئی چیزوں کی تعریف کر رہی تھی۔ وہ بے ساختہ ہنسی۔

”کیونکہ یہ سب تمہاری ہی پسند ہیں۔ تمہیں تو اچھی لگیں گی نا۔“ اس نے اس کے ہاتھ سے نیلا روپیہ لے کر اپنے کندھے پر پھیلا یا اور آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”خالی میرے اچھا لگنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم خود بھی تو پسند کر رہی تھیں۔ جب ہی تو خرید رہی تھیں۔“ وہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے ہی آگئی تھی۔

”ہوں۔ چوائس تمہاری اچھی ہے۔ مجھے کاشف نے بھی کہا تھا کہ تمہارے مشورے سے شاپنگ کروں۔“ ماہین کی بات پر ارم حیرت سے چونکی۔

”کاشف بھائی نے کہا تھا۔ کیا مطلب انہیں کس نے بتایا میری چوائس کے متعلق۔“

”میں نے۔ جتنا میں تمہارے بارے میں جانتی

ہوں۔ اتنا ہی وہ بھی جانتا ہے۔“ ماہین کے انکشاف پر وہ غصے اور خفگی سے اسے گھورنے لگی۔

”تم نے مانڈ کیا میری بات کو؟“ اس کی خاموشی پر ماہین نے اچنبھے سے پوچھا۔ ارم اس کی کسی بات کو مانڈ بھی کر سکتی ہے۔ وہ یہ توقع نہیں رکھتی تھی۔ اس کا مذاق اس کا غصہ اس کے طنز۔ سب ہی کچھ ارم نے ہمیشہ بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔ تو پھر اب۔ یہ معمولی سی بات۔!

”نہیں مانڈ تو نہیں کیا۔ مگر حیران ضرور ہوں۔ تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ تم میری باتیں کاشف بھائی کو بتاتی ہو۔“

”تمہاری باتیں بتاتی نہیں ہوں۔ کاشف کے ساتھ کرتی ہوں۔ میری واحد مخلص راز داں دوست کم بن اور اس کی سالی۔ آدھی گھر والی۔“ ماہین نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے قریب بٹھالیا تھا۔ ارم بے ساختہ ہنس دی۔

”خیر۔ میں کیا بنوں گی۔ آدھی گھر والی۔ وہ تو میری کامقام ہے اور اسی کارہے کا لیکن تمہارا شکریہ تم نے مجھے اتنا اعتماد دیا۔ مان دیا۔“

”تم مجھے میرے سے بڑھ کر عزیز ہو ارم۔“ اس نے بے ساختہ اسے گلے لگا گیا۔

”تھنیک یو۔ اس کے ساتھ ہی تو خلوص اور محبت کا رشتہ تھا اس کا۔ اسے ارم ثروت پھپھو کی طرح لگتی تھی۔ مہمان نرم دل اور درد آشنا۔ جیسے ثروت پھپھو اس کا ہر رنگ ہر انداز پہچانتی تھیں۔ اسی طرح ارم بھی اس کے لہجے سے اندازہ لگا لیا کرتی تھی کہ وہ خوش ہے یا دکھی۔

”میں نے کل ثروت پھپھو سے کہا تھا کہ آپ اب آجائیں۔ غیروں کی طرح شادی کا روڈ پر لکھی ڈیٹ پر آئیں گی تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔“

”پھر آ رہی ہیں وہ۔؟“ ارم نے سینڈوچ کا بڑا سا ٹکڑا منہ میں ڈالا۔

”کہہ تو رہی تھیں کہ کوشش کروں گی۔ ایک دو دن میں آنے کی۔ مگر مجھے پتا ہے، انہیں اپنے چڑیا گھر کو

چھوڑ کر آنا بہت مشکل لگتا ہے۔“

”مجبوری ہے نا ان کی بھی۔ تم ضد نہ کرو۔“ ارم کی بات پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ضد۔ میں بھی انسان ہوں۔ ارم دل چاہتا ہے ضد کرنے کو۔ اور خواہش ہوتی ہے کسی سے اپنا آپ اپنی بات منوانے کی۔ ماما اور میرب سے تو کبھی میں نے کچھ نہیں کہا۔ بابا کو بھی مجبور نہیں کرتی ہوں۔ مجھے ہا ہے وہ میرے لیے بہت حساس ہیں اور میری بات پر صورت پوری کرنے کے لیے پریشان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مان اور زور وہاں ہی آزمایا جاتا ہے۔ جہاں مان جانے کی آس ہو۔ میں نے کبھی بھی ماما کے ساتھ ضد نہیں کی کیونکہ مجھے معلوم ہے وہ ڈانٹ دیں گی اور صاف جواب پر میرا دل ٹوٹ جائے گا۔“ اس کے لیے

میں ٹوٹا ہوا کلچر سا کھڑا تھا۔ ارم کا دل بوجھل ہو گیا۔

”تم بہت حساس ہو گئی ہو ماہین! اتنا قلیل کیوں کرتا ہو ہر بات کو۔ بس نارمل بول کر دو۔“ ارم نے اس کے

کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

”ہمارے اپنوں کے رویے ہمیں ایسا ناراض بناتے ہیں ارم۔ خیر وہ یک دم سنبھل گئی تھی۔

”او کچھ اور کھاتے ہیں یہ سینڈوچ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ کوئی مزے کی چٹ پٹی چیز بنواتے ہیں خال سے۔“ وہ اسے لے کر کمرے سے نکل گئی اور کچن کا

جانب ان دونوں کو ہنستے کھلکھلاتے جاتے دیکھ کر لایونج میں بیٹھی سارا علوی کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔

”بے وقوف لڑکی کونہ جانے کب عقل آئے گی۔ ہر وقت اس لالچی لڑکی کو ساتھ چکائے رکھتی ہے۔ بھوکی“ اس نے دانت پیس کر ارم کی شان میں اضافہ کیا۔

”شکر کروں گی۔ شادی کے بعد کم از کم اس بلا سے جان چھوٹ جائے گی اس کی بے وقوفی، کم عقلی، میرب سے ہی عقل سیکھ لے۔ جو دوستی بھی اپنے اسٹینڈرڈ کے مطابق کرتی ہے۔“ وہ دونوں بیٹیوں کے موازنہ کا کوئی موقع جانے نہیں دیتی تھیں۔



”میرب! تم سے ایک بات پوچھوں۔“ وہ دونوں ساحل کی گیلی رست پر چلتے جا رہے تھے اور ان کے ننگے پاؤں آلی جانی لہروں سے عدم توازن کا شکار ہو کر لڑکھڑاتے تھے تو دونوں ایک دوسرے کا سہارا لے کر زور زور سے قہقہے لگانے لگتے تھے۔

”ہوں بولو۔۔۔“ میرب نے اس کا بالوں بھرا بازو تھامتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے۔۔۔ تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“ آیان کا سوال سن کر وہ بے ساختہ لڑکھڑائی تھی۔ پیروں تلے سے ریت جاتی لہروں کے گئی تھی۔ آیان نے فوراً اسے سنبھالا۔

”تھنیک یو۔ تم نے محبت کے بارے میں پوچھا ہے۔ نہیں کی ہے۔“ میرب کی بات پر اس نے کچھ دیر بغور اسے دیکھا تھا۔

”جھہ۔۔۔ پہلے کبھی کسی کو پسند کیا۔ کوئی اچھا لگا۔“ بہت کاٹیاں تھانہ ہی۔ اس کا جواب سن سنے ہی جان گیا تھا۔ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا اور لڑکیوں پر تو اس نے گویا پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔

ماضی وہ کیا شعر ہے۔

یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظ میرا
شعر بڑھ کر وہ زور سے ہنسی۔

”اگر یہی سوال تم سے کروں تو تمہارا جواب کیا ہو گا؟“ مقابل بھی تو میرب نواز تھی۔ اسی میدان کی شہسوار جس کا وہ شاطر کھلاڑی تھا۔

”تو؟“ آیان نے بغور اسے دیکھا۔ پھر گہری سانس لے کر سامنے سے آتی بڑی لہر کو دیکھنے لگا، جس کی اونچائی اس کے کندھوں کے برابر تھی اور جو بڑی تیزی اور تندگی کے ساتھ پھٹکارتے ہوئے اسے اپنی لپیٹ میں لینے کو اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ وہ پھرتی سے میرب کا بازو تھام کر پیچھے ہٹا۔ اس کے باوجود دونوں سر لپا بھیگ گئے تھے۔

”اف پانی بہت wild ہو رہا ہے۔ آویا ہر چلیں۔“ میرب کے منہ میں نمکین پانی چلا گیا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ اس کا حلق کڑوا ہو گیا تھا۔ وہ مسلسل گھانسی رہی تھی۔ کنارے کے بیچ پر آیان کی پانی والی بوتل پڑی تھی۔ اس نے بوتل کا ڈھکن اتار کر میرب کو دیا۔ صاف شفاف منل واٹر سے کلیاں کر کے منہ دھو کر اس نے چند گھونٹ حلق میں اندیلے اور گیلی شرٹ جھاڑتے ہوئے بیچ پر بیٹھ گئی۔ آیان بھی اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک بھر پور نظر اس کے بھیگے قیامت خیز سراپے پر ڈالی۔ دودھیا رنگت سیاہ شرٹ میں دمک رہی تھی۔ اس کا بازو بیچ کی پشت پر پھیلا اور ہاتھ میرب کے کندھے پر جا نکلتا تھا۔ میرب یکدم چونکی۔ بغور اس کے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر اسے دیکھا۔ آیان کی نگاہوں میں عجب سا تاثر تھا۔

”آئی تھنک۔ ہمیں کافی دیر ہو گئی ہے اب چلیں؟“ اس کے اندر ایک سنسنی سی دوڑی تھی۔ اور اگلے ہی لمبے وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

”کیا! کیوں بھی؟ تو ہمیں بہت باتیں کرنا ہیں۔ بیٹھو تیار! آیان نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھانا چاہا۔ مگر وہ اس وقت یہاں بیٹھ کر خود کو کسی مصیبت میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ مرد کے انداز و اطوار اور اس کی نظروں کے زاویے اس نے بھی بہت دیکھے تھے۔ آیان کی نظریں جھٹک جھٹک کر اس کی سیاہ شرٹ جو اس کے جسم سے چسکی ہوئی تھی، پر اٹھ رہی تھیں اور وہ جانتی تھی کہ یہ بھٹکانا صرف نظروں کا ہی نہیں تھا۔ قدموں کو بھٹکنے کے لیے محض چند فٹ سے بھی کم کا فاصلہ مشکل نہ تھا۔

”آیان! چلو نا مجھے، مجھے خارش ہو رہی ہے۔ میری سکن بہت حساس ہے۔ لگتا ہے ریش پڑ گئے ہیں۔ اوہ گاڈ! آنا پلینز۔“ اس کے سفید بازوؤں پر سرخ دھبے نمودار ہو گئے تھے۔ آیان نے کوفت سے اسے دیکھا۔

”لو کے آؤ چلیں۔ مجھے نہیں پتا تھا۔ تمہیں سی واٹر سے ایسی الرجی ہے۔“

”ہاں۔ مجھے یہ پانی سوٹ نہیں کرتا۔ گاڑی میں

بیٹھتے ہی اس نے اپنے بیگ سے لوشن نکال کر اپنے بازوؤں پر مالیں۔ ہاتھوں پر مل لیا تھا۔ جس سے سرخ دھبوں میں کچھ سکون ملا تھا۔

”مجھے گھر چھوڑ دو۔ میں شاور لے کر چینج کروں گی۔“

آیان نے سر ہلایا۔ مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میرب نے شدت سے اس کی خاموشی اور خفگی دونوں محسوس کی تھیں۔ مگر ابھی باز پرس کا وقت نہیں تھا۔ ناراضی کا اظہار وہ بھی کر سکتی تھی۔ مگر موقع مناسب نہیں تھا۔ اسی لیے مسکرا کر اسے خدا حافظ کہہ کر گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ اسی بل ماہین بھی روش پر اسے آتی دکھائی دی تھی۔

”تم کہاں سے آرہی ہو؟“ اس نے سر تپا اسے کڑی نظروں سے گھورا تھا۔ میرب کے منہ میں سمندر کا نمکین پانی کھلے لگا۔

”جہنم سے۔“ وہ چیخ کر بولی تھی۔ ماہین نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔

”جہنم میں کیا نہ لے گئی تھیں!“

”ہاں۔ تم بھی جاؤ۔ تمہیں عقل آجائے گی۔“ وہ اسے گھورتی نظریں سے جواب دے کر اندر چلی گئی۔ ماہین کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

”ہوں جہنم میں تو یہ ضرور جائے گی۔ جیسے اس کے کر تو ت ہیں۔“

اما کو اب کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ اس کی بھی تو شادی میں ایک ہفتہ بلکہ چھ دن باقی ہیں۔ بھٹکتے گی خود ہی سزا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے گیٹ کی سمت چل دی تھی۔

”گل خان! کاشف صاحب آرہے ہیں۔ آجائیں تو مجھے اطلاع کرنا۔“ اس نے چوکیدار کو اطلاع دی اور واپس مڑی۔ کاشف کے لیے اس نے کپڑے خریدے تھے اور وہ اسے دینے تھے۔ اسی لیے اسے بلایا تھا۔ اما اپنی کسی فرینڈ کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ میرب کمر نہیں تھی۔ موقع اچھا تھا۔ اس نے کاشف کو بلا لیا تھا۔ مگر اب میرب کی واپسی ہو گئی تھی۔

”اگر آج میرب نے کاشف کو کچھ کہا تو میں اسے معاف نہیں کروں گی۔ عمر اور رہتے ہیں بڑی ہوں۔ ڈانٹ دوں گی۔“ اس نے فیصلہ کیا اور مطمئن ہو کر لڑان کی کرسیوں کو ترتیب سے سیٹ کر کے ایک پر بیٹھ گئی۔ بیس منٹ کے انتظار کے بعد کاشف آگیا تھا۔

”ہاں جی اب بتائیں۔ کیا حکم ہے۔ جو اتنی ایمر جنسی میں بلایا ہے۔ میں تو تمہارا میسج پڑھتے ہی گھبرا گیا تھا۔ ایسا آرڈر تو تم نے کبھی پہلے نہیں دیا۔“ کاشف کی بات پر وہ بے ساختہ ہنسی گئی۔

”بات واقعی بہت ضروری ہے۔ ایک منٹ میں آئی۔“

”مگر بات کیا ہے جو۔!“ اسے جانتے دیکھ کر اس نے بے ساختہ پکارا۔

”صبر سے بیٹھ جاؤ۔ کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہو۔ میں آتی ہوں۔“ اس نے رک کر اسے محبت بھری ڈانٹ پلائی۔ تو وہ یکدم کسی نئے کی طرح سم کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش ساکت اور سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ ماہین ہنستی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔

”یہ لو۔“ ڈھیر سارے شاپر اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

”یہ کیا ہے بھی۔!“ وہ حیرت سے ٹھٹکا۔

”تمہارے سوٹ۔ ٹیلر کو دے دو۔ اسی لیے تمہیں بلایا ہے کہ تم اپنی مرضی کے سلواؤ۔“ وہ مسکرائی۔

”لستے زیادہ۔۔۔ یہ تو یہ تو بہت زیادہ ہیں۔“ کاشف حیرت اور استعجاب کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ شاپر کھول کھول کر دیکھ رہا تھا۔

”کیسے ہیں!“ اسے بھی اس کا خوش ہونا اچھا لگ رہا تھا۔

”زبردست بہت اچھے بہت ہی اچھے ہیں۔“ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ایسے قیمتی اور خوب صورت کپڑے خرید سکتا ہے۔

”یہ تو بہت زیادہ پیسوں کے ہیں۔“ اس کے لہجے میں اپنی کم مائیگی کا احساس جھلک رہا تھا۔

”تو میں کیا تم سے قیمت مانگ رہی ہوں۔“ ماہین

نے خفگی سے اسے گھورا۔

”نہیں۔ مگر تم نے بھی تو زیادہ پیسے خرچ کر ڈالے ہیں نا۔“ کاشف کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس دی۔

”مجھے اچھا لگتا ہے۔ تمہارے لیے شاپنگ کرنا۔ اچھی اچھی چیزیں خریدنا۔ میرب نے آیان کے لیے بہت قیمتی گفٹس لیے ہیں۔ میں کہیں نہ لیتی۔ بابا کی کمرہوں کی جائیداد میں میرا بھی تو برابر کا حصہ ہے۔“

ماہین کی بات پر کاشف کے دل میں ڈھیروں سکون اتر ا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ آئے والے وقت میں اس کے لیے بہت آسانیاں پیدا ہونے والی ہیں۔ اس کی تمام خواہشات اور تمنا میں یوں ماہین کے توسط سے پوری ہو جائیں گی۔ یہ تو اس کے لیے پراثر بانڈ سے بھی بڑھ کر حیران کن سرپر اثر تھا۔

ابھی کل ہی توراتی اس سے کہہ رہی تھی کہ جلدی سے سارا مال سمیٹ لو تاکہ ہماری شادی بھی جلد از جلد ہو جائے اور اس نے اس سے کہا تھا کہ ابھی صبر کرو۔ جب تک وہ تمام مال و دولت سمیٹ نہیں لیتا۔ تب تک رانی سے شادی نہیں کرے گا۔ اس جیسے شخص کے لیے محبت یا محبوب اہم نہیں فدا و ملت روپیہ پیسہ اہم تھا۔ اس کے لیے محبت یا محبوب دونوں کا مفہوم بالکل الگ تھا۔ رانی بچپن کی ساعی حکزن اور منگیتر تھی خوب صورت، جوان شوخ اور چیخل مگر ساری خوبیوں پر اس کا ایک ریڑھی والے کی بیٹی ہونا ناقابل معافی خافی تھی۔ وہ تمام عمر سک سک کر ایک ایک شے کو ترستا اور اپنی خواہشات کو دانا رہا تھا اس کے بعد تو اب جا کر اس کی دلی مراد پوری ہونے چلی تھی۔ وہ تمام محروم لمحے ننگے پاؤں سے ہوئے چہرے اور خشک آنکھیں لیے اس کے سامنے آکرے ہوئے تھے پھر اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنی تمام تشنہ آرزوؤں کی تکمیل نہ کرتا۔ رانی کا باپ اس کی شادی جلد از جلد کر کے اپنا فرض پورا کرتا چاہتا تھا۔ مگر وہ ابھی اس کا فرض اپنے گلے ڈالنے کو تیار نہ تھا۔

”کاشف۔۔۔ ہیلو کیا ہے۔“ وہ۔ کہاں گم ہو۔“

ماہین نے اس کا بازو ہلا کر اسے جگایا تو وہ چونکا۔

”ہاں۔۔۔ آں۔۔۔ وہ وہ میں میں سوچ رہا تھا کہ تم مجھے اتنے مٹکے مٹکے تحائف روزانہ دیتی ہو اور میں میں تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ حالانکہ تمہیں تحفہ دینے کو دل تو بہت کرتا ہے۔ مگر تمہارے معیار کے مطابق۔“

”کاشف! تمہارا یہ احساس کمتری مجھے بہت ہرٹ کرتا ہے۔ کتنی مرتبہ سمجھا چکی ہوں کہ خود کو کم تر مت سمجھا کرو۔ مجھے وہ پیسہ مٹکے تحائف کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری محبت کا تحفہ چاہتی ہوں کاشف! جو میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے اس کی چاہ ہے۔“

ماہین نے اس کا ہاتھ تھام کر بڑے پیار سے انداز میں کہا تھا کاشف نے بے ساختہ اس کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط، توانا اور گورے چنے ہاتھوں میں جکڑ لیے تھے۔ اس کے دودھیا، بے حد خوب صورت ہاتھوں میں ماہین کے سیاہ رنگ والے ہاتھ بہت عجیب لگ رہے تھے مگر وہ محبت کی بارش میں پور پور بھیجتی اس فرق کو بھول چکی تھی۔ جبکہ کاشف کی نظر اس کے ہاتھوں پر ہی تھی۔ اسے ان سیاہ ہاتھوں سے یکدم شدید کراہیت محسوس ہوئی تھی، سیاہ دھبوں کے درمیان اس کے دکتے سفید ہاتھ۔ اس کا دل چاہا جلدی سے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑوا لے۔ ورنہ اس کے ہاتھ بھی سیاہ ہو جائیں گے اور یکدم اس خیال نے کچھ اس طرح اسے اپنے شکنجے میں جکڑا تھا کہ اگلے ہی پل اس نے تیزی سے اپنے ہاتھ سیاہ ہاتھوں کے اوپر سے سمیٹ لیے تھے۔

”کاشف۔۔۔ ماہین اس کی قوت کی گرمی میں گم یک دم چونکی تھی۔ گھبرا کر اسے پکارا۔ وہ دونوں ہاتھ عجیب سے انداز میں مسل رہا تھا۔

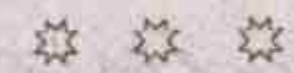
”کیا ہوا؟“ اس نے اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت دیکھی تھی۔ کراہیت آمیز یا نفرت بھری۔ ماہین کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا کرے۔ کیا کہے۔ ”میں میں سوری۔ میں بھٹکنے لگا تھا۔ میں۔“ اس

کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کسی طرح ماہین کو مطمئن کرے اور اسے مطمئن کرنے کو ابھی اس کا اپنا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ کیونکہ عجیب سی الجھ جانے والی کیفیت اس پر طاری ہو گئی تھی۔ جیسے طبیعت کسی ناپسندیدہ شے کو دیکھ کر بے زار ہو جائے یا اودھ جائے۔ حلق تک الٹی آجائے۔ مگر کی نہ جائے۔

اگلے ہی پل وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ”کیا ہوا کاشف؟“ ماہین نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کچھ نہیں۔ وہ میں پلینز مجھے ابھی جانے دو ورنہ۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ ماہین حیرت زدہ گم غم صدم سی بیٹھی تھی۔

”ابھی تو میں نے اسے اپنی چیزیں بھی دکھانا تھیں اور ارم کی باتیں بھی بتانا تھیں۔ مگر یہ کیا ہوا کاشف کو ایسا کیا کہہ دیا میں نے۔ میں تو کچھ بولی ہی نہیں بس۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ اس کا چہرہ مایوس اور پریشان لگ رہا تھا۔ بو جھل اداسی اور خاموشی کی چادر اس کے چاروں جانب تنی تھی۔ دل یکدم ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ کاشف تو اپنے کپڑے بھی یہاں ہی چھوڑ گیا تھا۔ اس نے شاہ پر نظر ڈالی۔

اتنی محنت کے بعد اتنی جدوجہد کر کے اس نے کئی گھنٹوں کے بعد مختلف دوکانوں پر چھان پھٹ کر اس کے لیے اتنے خوب صورت کپڑے خریدے تھے اور ان کا یہ حشر! اس نے بے حد دکھ سے سارے شاہرے سمیٹ کر دونوں ہاتھوں میں بھر لیے تھے۔ لاؤنج میں میرب کبھی بھی آسکتی تھی۔ اس کی تنقید اور جرح کے لیے اس کا ذہن ابھی بالکل تیار نہ تھا۔ سو بے زاری سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔



”تم نے کاشف کو بزنس کے لیے پیسے دیے ہیں؟“ رات کو سارا علوی نے اپنے کمرے میں آتے ہی نواز اکرم سے سوال کیا تھا۔ نواز بری طرح چونکا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ اس کے منہ سے نکلنے ہی والا تھا۔ اگر وہ اپنی زبان دانتوں تلے نہ دبالتا۔ اسے

سارا کی سی آئی ڈی کے ایکٹو ہونے کے بارے میں اگر کاشف کا شک و شبہ تھا بھی تو دور رہو گیا تھا کہ اس قدر راز داری برتنے کے باوجود اسے پیسیوں کا علم ہو گیا تھا۔ ”کیا کاشف نے خود۔۔۔ کیونکہ اس بات سے تو صاف کاشف اور میں۔“

”کیا ہوا نواز! کیا سوچ رہے ہو۔ بہانے بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جھوٹ بولنے سے تمہارا ہی قد چھوٹا ہو گا۔ میں جانتی ہوں۔ تم اس کلرک کو بہت کچھ دے چکے ہو۔ پھر اب مزید کیوں پیسہ دے کر اسے اس کا اوقات بھلا رہے ہو۔“

”مم۔۔۔ میں میں تو اسے کاروبار کروانا چاہتا ہوں۔“

”ماکہ وہ تمہارے رعب سے باہر اپنی من مانی کرتا پھرے۔ اتنا مت دو اسے کہ وہ کل تمہیں دھتکار دے۔ مانا اپنی بیٹی کے لیے تم اسے خرید رہے ہو۔ مگر اے غلام سے آقا بنانے کی غلطی مت کرو۔ ورنہ تم اور تمہاری لاڈلی جس کے کہتے پر تم اسے آیان واسطی کے ہم پلہ لانے کی کوشش کر رہے ہو۔ دونوں پچھتاؤ گے۔“

سارا علوی نے سفاکی اور بے رحمی سے آئینہ نواز اکرم کے چہرے کے سامنے لا رکھا تھا۔ بے چارے نواز میں اسے جھٹلانے کی ہمت تھی نہ ہی سراہنے کی۔ مناسب معمول بکھلا سا گیا تھا۔

”نہیں سارا! ایسا نہیں ہو گا میں تو۔۔۔ کاشف بہت اہلکار کا ہے۔ وہ ہمیں دھوکا نہیں دے گا۔“

”یقیناً“ اچھا ہو گا۔ مگر جس طرح تم اسے پیسہ دے رہے ہو۔ پھر وہ اچھا نہیں رہے گا۔ کم ظرف کو اتنا مت دو کہ ظرف ہی جھٹک جائے۔ آیان واسطی جدی بیٹی امیر رئیس زادہ ہے۔ اس کا اور کاشف کا کیا مقابلہ۔“

”کوئی مقابلہ نہیں اور میں کب دونوں کا مقابلہ کر رہا ہوں؟“ سارا کے کڑے استفسار پر نواز فوراً بولا۔

”تو پھر نا انصافی کیوں کر رہے ہو۔ میرب کا بھی تو

تمہاری جائیداد میں اتنا ہی حصہ ہے۔ تو صرف ماہین کو اتنا دینے کی کیا تک ہے۔ فلیٹ گاڑی تک تو ٹھیک ہے کہ ہماری ہی بیٹی کے کام کی چیزیں ہیں۔ مگر بینک بیلنس، بزنس کے نام پر پیسہ، اسے دینا عقل مندی نہیں ہے نواز! پتا نہیں تمہاری ساری کاروباری چالاکیاں اور تجربہ کہاں چلا گیا ہے تم بے سوچے سمجھے کاشف کو اتنا نواز رہے ہو۔“ سارا جب لٹاؤنے پر آئی تھی تو یو یو نمبی سانس لینے بنا اسے کھری کھری سناتی تھی۔ ”میں تو محض اپنی عزت کے لیے ہی یہ سب کر رہا تھا نا کہ لوگ مجھے یہ نہ کہیں کہ۔“

”کیوں لوگ اندھے ہیں یا خلا سے آئے ہیں۔ جو یہ بات کریں گے۔ اس شر کا چرندہ جانتا ہے کہ کاشف تمہارے آفس کا معمولی کلرک ہے۔ بھلے تم اسے ارب پتی بنا دو۔ مگر اس کا عہدہ اور اوقات نہیں بدلے گی۔“ سارا نے اس کی بات کٹ کر اسے سچائی بتائی تھی۔ نواز کا سر جھک گیا۔

”نواز اکرم! عقل کرو جب تک وہ لڑکا تمہارا محتاج ہے۔ تمہارے کام کا ہے۔ جس دن تم سے غرض کا یہ رشتہ ختم ہو گیا۔ اسی دن وہ اڑ جائے گا بھلے تم سونے کا بجر ہو۔ سو آ یا چاندی کا۔“ ”وہ اب اپنے ہاتھوں پر روشن مل رہی گی۔ نوازی کی نظر بے ساختہ اس کے سفید دکتے ہاتھوں پر گئی تھی۔

”کتنے خوب صورت ہاتھ ہیں سارا کے۔“ اس نے بے ساختہ سوچا تھا پل بھر کو وہ ماہین اور کاشف والا معاملہ بھی بھول گیا تھا۔

”مسز واسطی کا فون آیا تھا کہ وہی تمہیں۔ پہلے ماہین کی رخصتی ہوگی اگلے روز میرب کی۔“ ”کیا مطلب؟“ وہ چونکا ”اگ الگ۔۔۔ مگر دونوں کی ایک ساتھ۔“

”نا ممکن، کہاں آیان کہاں کاشف۔ بات تو ان کی ٹھیک ہے نا۔ انہوں نے بہت سے ایم این ایز اور میسرز، ممبرز اسمبلی انوائٹ کیے ہیں۔ بزنس کیونٹی کے ہیڈز، شہر کی کریم ہوگی اور ان کے ساتھ وہ اقبال گجر کے نشینی اور نکلے، ٹھوڑا کلاس گلی محلے کے آوارہ دوست

کیا جوڑ ہے نواز! میں نے تو عالیہ واسطی کو ہاں کہہ دی ہے۔

وہ اپنی پنک تائی کا کھلا گلا درست کر رہی تھی۔ سفید صراحی دار گردن اور اس سے نیچے دکتا جسم۔ ”کیوں ٹھیک کیا تا میں نے...؟“ اس نے بڑی ادا سے تائی کے گلانی ریشمی ربن کو اپنی کمر کے گرد لپیٹا اور نواز سے چند فٹ کے فاصلے پر آ بیٹھی۔

”ہاں... ہاں ٹھیک ہے۔ تم نے جو فیصلہ کیا ہے۔ ٹھیک ہے۔“ وہ تو سارا کے سامنے انکار کی جرات کر رہی نہیں سکتا تھا اور جو سارا حکم دے دے تو پتھر پر لیکر بن جاتا تھا۔ ابھی اس نے اطلاع نہیں دی تھی۔ اپنا فیصلہ سنایا تھا اور اس کے فیصلے کے سامنے انکار کی مجال نواز میں کہاں تھی۔ خاموشی سے سر جھکا لیا تھا اور سارا نے کسی ملکہ کی طرح اپنی لمبی حسین گردن اکڑا کر فاتحانہ نظروں سے نواز کو دیکھا۔ ایک مغرور اور فاتحانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔

”میں اس کینے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ آئندہ یہ میرے آس نہ آئے۔ اس نے مر نواز سے دس ہزار لے لیے ہیں۔ مزید ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا۔ لالچی انسان“ وہ عرصے سے لال پیلا زور زور سے بولتے ہوئے اسے بالکل اقبال کی طرح لگا تھا۔ وہ بھی تو غصے میں ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتا تھا۔ چکراتا تھا اور زور زور سے بولتا رہتا تھا۔

”میں نے اسے نہیں بھیجا تھا۔“ اس نے دکھ سے اسے ٹوکا۔

”اگر تم نہ بتاتیں تو کیا فرشتے اسے اطلاع دیتے؟“ میرے منع کرنے کے باوجود تم نے اسے یہ سب بتا دیا۔ پھر کہتی ہو میں بولوں بھی نہیں کس منہ سے بلاتی ہو مجھے زندگی میں پہلی بار میں دل سے خوش ہو رہا تھا۔ مگر اقبال نے میری ساری خوشی ملیا میٹ کر دی ہے۔ تمہاری وجہ سے اماں! صرف تمہاری وجہ سے۔“ وہ غصے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔ فاخرہ اسے

پکارتی رہ گئی تھی۔

”میں جانتی تھی یہ تو ہوتا ہی تھا۔ کیا کروں نہ اقبال میرے کہنے میں ہے اور نہ ہی یہ کاشف۔ فرق کیا ہے دونوں میں؟ دونوں مرد ہیں اور عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اپنا مطلب نکالنے کے چکروں میں ہیں۔ اقبال برا مرد تھا اور ہے۔ جبکہ میرا بیٹا بھی اب برے مردوں کی صف میں آکھڑا ہوا ہے۔ اس بے چاری لڑکی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر دولت کماتا چاہتا ہے اور رانی بھی اس جرم میں برابر کی شریک ہے۔ یا اللہ رحم کرنا۔ ان لوگوں کی آنکھوں پر دولت نے پی باندھ دی ہے۔ لالچ، ہوس اور حرص کے غلام۔ ہاں کو کہتا ہے میرا قصور کیا ہے۔ ایک عورت کو دھوکا دے رہا ہے محبت کے نام پر اور پھر بھی معصوم بننے کی کوشش کر رہا ہے۔“

فاخرہ جلتی کڑھتی کاشف کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جبکہ دوسری جانب کاشف یہاں سے نکل کر سیدھا رانی کے گھر پہنچا تھا۔ اس کا ابا گھر نہیں تھا۔

ورنہ وہ پھر کاشف کے پیچھے بڑھا تاکہ شادی کرو۔ کاشف نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اس کی خالہ رانی کی ماں صحن میں بیٹھی بھنڈیاں کٹ رہی تھی۔ کاشف کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اندر سے رانی بھی نکل آئی تھی۔ اسے دیکھ کر بڑی ادا سے مسکرائی۔ ”جارانی! اچھی سی چائے بنا کر لے آ۔ کتنے دن کے بعد تو کاشف باپو آیا ہے۔“

اس کی ماں کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ اب کاشف باپو بن گیا ہے۔ اسکوٹ پر نہیں گاڑی میں آتا ہے۔ اس کی بیٹی کو بھاری سونے کے زیورات، تحائف، پہرے لے کر دیتا ہے۔ یہی اس کی خالہ تھی اپنی بیٹی کی خوب صورتی پر اتراتی تھی اور اس کی آمد پر ٹاک بھوں چڑھاتی تھی۔

”تم چائے پیو۔ میں بھنڈیاں چڑھا دوں۔“ وہ اب انہیں تنہائی میں ملنے کا موقع بھی دینے لگی تھی اور اس موقع میں رانی اسے اپنی ادا میں دکھاتی تھی اور دونوں مل کر زیادہ سے زیادہ نواز اکرم سے دولت سمیٹنے کی

پلاننگ کرتے تھے۔

”اماں نے اقبال کو سیٹھ نواز کے متعلق بتا دیا ہے۔ وہ الو کا پٹھا وہاں آگیا تھا۔“ اس نے غصے سے اسے اطلاع دی۔

”کہاں؟“ رانی حیرت سے اچھلی۔ ”میرے دفتر؟ نواز اکرم کے پاس۔ دس ہزار لے آیا ہے۔“

”ہائے اللہ اس جیسے لالچی اور بلیک میلر نے پہلی قسط وصول بھی کر لی۔ خدا خیر کرے۔ وہ تو نواز کو سیٹھ نواز سے نواز فقیر بنادے گا۔ کاشی! اس کا علاج کرورنہ یہ ہمارے حصے پر بھی قبضہ جمالے گا۔“

”جانتا ہوں۔ بہت گھٹیا ہے۔ لالچی ہے۔ مگر اتنی آسانی سے اس کھیر میں سے اسے کچھ نہیں دوں گا۔ قتل کروں گا کینے کو۔“ کاشی نے نفرت سے مکاتنا۔ ”ہائے اللہ نہ کرے اس گنہگار کے قتل میں تم کیوں پھانسی لگو گے۔ ذرا ٹھنڈا رکھو دماغ۔ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“

”یہی تو فکر ہے۔ مجھے شادی میں چھ دن رہ گئے ہیں صرف چھ دن اور یہ دنیا تماشا شروع ہو گیا ہے۔“ ”تو فکر نہ کر۔ اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ ویسے ایک ترکیب میں نے سوچی ہے۔ اگر تو نواز اکرم کو اس کی اصلیت بتا دے تو وہ۔“

”ناممکن۔ تو اس کا لے بھنے سیٹھ کو نہیں جانتی ہے۔ وہ اس بات کو بنیاد بنا کر کوئی بھی فیصلہ کر سکتا ہے اور شادی تک۔“

”بڑا شوق ہے تجھے شادی کا۔ اس کالی بھینس سے۔“ رانی نے ترش کر اسے ٹوکا تھا۔

”اوہو، تم کیوں جلتی ہو اس سے میں نے کہا بھی ہے۔ وہ تو تیرے جوتی کے برابر۔“ اسی بل موبائل کی تیز دھن نے اس کی بات درمیان میں ہی کٹ دی تھی۔ اس نے نمبر دیکھا پھر رانی پر نظر ڈالی۔ وہ اسے ہی گھور رہی تھی۔

”کس کا ہے؟“ اس نے شکی نظروں سے سوال کیا۔

”ایک دوست کا۔ اس کے پاس مجھے جانا تھا۔ مگر

تیرے ساتھ باتوں میں لگ کر بھول گیا۔ اسی لیے وہ مں کال دے رہا ہے۔ میں چلتا ہوں۔“

”اچانک یہ چائے تو۔“ ”تو نی لے میری جگہ۔“ اس نے بائیں آنکھ دبا کر اسے مسکرا کر کہا اور باہر نکل گیا۔

”کمیٹہ۔۔۔“ وہ سسخت چہرے زیر لب اسے گالی دیتی چائے کے برتن سے لگی تھی۔

کاشف نے باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھتے ہی ماہین کو واپس کال کی۔ رانی کے سامنے تو وہ اس سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا اور وہ بار بار کال کیوں کر رہی تھی۔ یہ بھی کاشف کو معلوم تھا۔

”ہیلو۔۔۔“ اس کے ہیلو کہنے کی دیر تھی۔

”ہیلو کاشف! کہاں ہو بھی۔ کب سے کال کر رہی ہوں تمہیں۔“ اس نے گہرا سانس لیا۔

”ہاں میں۔۔۔ میں ایک دوست کے گھر آیا ہوا ہوں۔ خیریت۔۔۔“

”خیریت؟“ تم اچانک یوں ناراض ہو کر اٹھ کر کیوں چلے گئے تھے۔ اپنے کپڑے ہی لے کر نہیں گئے۔ میری شائینک بھی نہیں دیکھی۔ مجھے تو ابھی تم سے ڈھیروں باتیں کرنا تھیں۔ تمہیں ہوا کیا تھا میری کوئی بات تمہیں بری لگی تھی۔“

”بری؟“ یکدم اس کی نظریں اپنے ہاتھوں کی جانب اٹھی تھیں۔ سیاہ دھبوں کی صورت میں دو ہاتھوں نے اس کے ہاتھوں کو جکڑ رکھا تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنے ہاتھوں کو جھٹکا دیا۔

موبائل اس کے قدموں میں بریک کے قریب جا گرا تھا۔ اس میں سے ماہین کی آواز آرہی تھی۔ وہ متواتر ہیلو، ہیلو کر رہی تھی۔ مگر کاشف خوف زدہ نظروں سے موبائل کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے ابھی وہ سیاہ دھبے اس کے اندر سے نکل کر اسے چمٹ جائیں گے۔ موبائل ساکت ہو گیا تھا۔ اب ماہین کی آواز نہیں آ رہی تھی مگر وہ ہنوز کم صم پھریا ہوا اسے دیکھے جا رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سگاہِ حلال

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ، اولاد کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر میت سے ہے۔ دین محمد کا دواں دواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے عجم دُعا میں چکا ہے۔ اس کی دُعا میں مستعجاب ٹھہرتی ہیں اولاد اس کے یہاں ایک خوبصورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی جنت کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ بہتر مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم اس کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے جنت بی بی حراست میں ہے۔ جس کا دُعا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگ بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت بی بی تیز و فریضہ کی مریض ہے جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینیہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں تو قیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاشے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست تو قیر صاحب کے توسط سے دانیال کی اینکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت طینال ملنسار اور مجتبی خاتون ہیں۔ ولی، ولید اور انبیان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انہیں اسے دوستی ہو جاتی ہے۔

Scan & PDF
FIAZ AHMED
Friends Korner.com

شبیبہ العباس طبعاً سخت گیر اور غفہ ورنہ جو ان تھے۔ جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ پورا زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے نالاں ہے۔ شبیبہ، تنوی کو کاج چھوڑنے آتا ہے تو ہیلیاں عبیرہ اور غزہ، تنوی کے سر ہوجاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیبہ، تنوی کا سنگتر ہے۔ وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزراش کرتی ہے کہ عرفہ کو اس کی بات کا علم نہ ہو۔

شبیبہ بیگم، ثروت دانیال کی اولاد ہے جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بد مزاج اور غصیلانا بنا دیا۔ وہ انبیا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بحیثیت بہن بھائی قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انبیا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انبیا پر بری نظر ڈالنے پر وہ جیسے ڈی کے دوست سعدی کو بیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار پڑنے پر بیگم دانیال، شینہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہے تو شینہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ لگا کر دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرا اس کی جنت سے طرفائی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد، زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا بلکہ اس کے شوہر کو گھر واپس بلا لے گا۔ اتفاقاً ماوی کا ٹکڑا شبیبہ سے ہوتا ہے جس سے ماوی کا ہیر زخمی ہوجاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود بھلاہٹ میں شبیبہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ شینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔

شینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں، لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے جس پر شینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً "ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ شینہ اسے گھر بلائی ہیں۔ شینہ، ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے مل ہوا تھا۔ اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیبہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور شینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں، جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہ بھی کرتا ہے۔

انبیبہ دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب شینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ماوی، ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے شینہ ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔

عبیرہ، نمروہ اور تنوی کو عروس کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمروہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیرہ کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے۔ وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو حفص جنت کے کہنے پر دین محمد، بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو عبیرہ صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو یہ بات جنت بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پہنچنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

۱۲
چو کہوین قسط

یہ عالم استعجاب تھا یا مقام آگئی؟

وہ سمجھ نہ سکی بس چپ چاپ دیکھا کی۔

ہوتا یہ ہے کہ دل ایک ہوتا ہے، لیکن اس دل کے سوتھامے ہوتے ہیں۔ اول الذکر اپنا آپ تسلیم کیے جانے کی شدید ترین خواہش اور وقت سے پہلے سراٹھانے والی ہر خواہش آتش فشاں کا ایسا دہانہ جس میں سے کسی بھی وقت لاوا بہہ نکلنے کا خدشہ ہر وقت لاحق رہے۔

فاروق نے تو اس کو سرسری ہی دیکھا تھا۔

ایسے جیسے سر راہ کسی پر نظر پڑ جائے۔

لاشعور کے کسی کو نے میں پہچان کی کرن چمکے تو انسان دو سری نظر ڈال لیتا ہے تو فاروق نے بھی اس پر ایسی ہی نظر ڈالی تھی۔

لیکن یہ ایک نظروں کے لیے نئی کائنات کے انکشاف کا اور اک ثابت ہوئی۔

وہ کائنات جہاں طرز زندگی الگ ہوتا ہے۔

اس کائنات کے رسم و رواج، رکھ رکھاؤ، تہذیب و تمدن کا اس دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

لیکن جنت اس کائنات کے اسرار و رموز سے واقف نہیں تھی۔

وہ ابھی کئی اس پر اسراریت میں گم ہونے لگی کہ بہر حال اس کائنات کے اسرار میں کشش بہت تھی۔ نہ صرف کشش بلکہ ایک پر لطف سی مٹھاس بھی سو وہ گھنچتی چلی گئی، آنکھیں بند کر کے اس کائنات کی سحر انگیزی میں گم ہونے لگی۔

اس کے پاس ایک باپ تھا جس نے بے تحاشا محبت دی، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں، سوتیلی ماں تھی جس نے خود کو اور اپنی اولاد کو اس کے عتاب سے بچانے کے لیے چالو سی کی راہ اختیار کی تھی۔ اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور سکون سے رہتی۔ جنت کی غلطیوں پر اسے آنکھیں بند رکھنا سیکھ لیا تھا۔ باقی بچیں سہمہ لیاں۔ تو مطلبی، خود غرض سہمہ لیاں بھی آج تک کسی کے کام آئی ہیں؟

کون تھا اس کے پاس جو بتاتا کہ اس ایک نظر کے طلسم کے ہاتھوں خوار نہ ہونا، محتاط رہنا، یہ پر اسرار کائنات جسے تم جیسی نا سمجھ کم فہم لڑکیاں کسی نو دریافت شدہ سیارے کی طرح خود پر منکشف ہونے دیتی ہیں، صدیوں سے پنپ رہی دلدل بھی ہو سکتی ہے۔

”شکریہ جلال بیٹے! آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ آپ نے مجھے کتنی بڑی فکر سے آزاد کر دیا ہے۔ ماوی کی خوشی میرے لیے ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ آپ کے اس فیصلے سے میں بے حد خوش ہوں، سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔“ شینہ احساس تشکر سے بھر پور لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

جلال کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں جھجک آمیز مسرت، شینہ کی بات سن کر وہ فطری سی گھبراہٹ کا شکار ہو گیا۔

”پلیز شینہ! آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔“ اس نے جلدی سے کہا، پھر گلاس میز پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں آپ کو بتانے آیا تھا، آج حوصلی جا رہا ہوں، اپنے بزرگوں سے بات کر کے جلد ہی آپ کو انفارم کر دوں گا۔“

”میں انتظار کروں گی۔ تمہاری اوروں کی کتنی ہو جائے تو سکون سے ڈھلن واپس چلی جاؤں گی۔“

شینہ نے شہد پٹکاتے لہجے میں کہا۔ جلال جس طرح مسکراتا ہوا آیا تھا ویسے ہی رخصت ہوا یوں بھی آج کل

جس نے جذبے نے اس کے دل میں پچھل مچا رکھی تھی اس جذبے کے ساتھ لبوں پر بات بے بات مسکراہٹ کھیلنا کچھ ایسا حیران کن عمل نہیں ہے۔

جلال کے جانے کے بعد شمیمہ صوفے پر بیٹھ گئیں اور اس ساری صورت حال پر غور کرنے لگیں جو انہوں نے بڑی محنت سے ترتیب دی تھی۔ انہیں اپنی کامیابی کا پہلے بھی یقین تھا، جلال کی جانب سے مثبت جواب ملتے ہی یہ یقین کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ لیکن ابھی بھی کوئی سوچ تھی جو انہیں لاحق تھی، دراصل ہر امکان اپنے ساتھ ایک اندیشہ ضرور لاتا ہے۔

اور یہ ہی اندیشہ شمیمہ کی فکر مندی کا سبب تھا۔ وہ جانتی تھیں جلال کو اس راہ پر لانا ہرگز مشکل نہ ہوگا، اصل مسئلہ ماوی کا تھا جو ماضی کے حقائق سے لاعلم، بے فکری کی زندگی گزار رہی تھی۔

یہ ایک شمیمہ کے سامنے کئی ایک سوالیہ نشان منہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔

”کیا ماوی راضی ہو جائے گی۔“

”راضی ہونا تو بڑے دور کی بات ہے، کیا وہ میری بات کا اعتبار بھی کرے گی؟“

”ہاں ضرور، کیوں نہیں؟ ماں ہوں میں اس کی، میری بات پر اعتبار نہ کرے گی تو کس کی بات پر کرے گی؟“

وہ خود ہی سوچتی اور اپنے ہر سوال کا جواب دیتی رہیں یہاں تک کہ باہر آسمان پر تیزی سے بادل پھیل گئے اور پورا دن تاریکی میں ڈوب گیا۔



دین محمد ششدر سا اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو جنت کے ہاتھوں پٹا دیکھ رہا تھا، اس قدر حیران پریشان ہوا تھا کہ آگے بڑھ کر بیٹی کو بچا بھی نہیں پارہا تھا۔ کچھ دیر بعد بیٹی کو اچھی طرح دھتکے کے بعد جنت سے کچن میں پھینک کر اندر چلی گئی۔ بڑی دیر سے خاموشی سے ایک طرف کھڑی بشری نے آگے بڑھ کر بیٹی کو اٹھایا اور سہلائے ہوئے اسے کمرے میں لے آئی۔

”آپ کب آئے؟“ کمرے میں دین محمد کو دروازے کے قریب کھڑا دیکھ کر بشری بڑی طرح چونکی۔ دین محمد آج طبیعت خرابی کی وجہ سے اپنے مقررہ وقت سے پہلے گھر آگیا تھا، لیکن جنت اور بشری دونوں ہی اس بات سے ناواقف تھیں۔

دین محمد نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ہاتھ بڑھا کر بیٹی کو اپنی آغوش میں لے لیا، بیٹی کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اور پے در پے رونے والے تھپڑوں سے لال ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی اور دین محمد کے کندھے سے لگ کر گھٹ گھٹ کر رونے لگی تھی۔

”جنت اسے اتنی بری طرح کیوں مار رہی تھی؟“ دین محمد نے پوچھا، بشری خاموش رہی، لیکن اس کی آنکھوں میں وہ سب کچھ تھا جو دین محمد کو نظریں چرانے پر مجبور کر سکتا تھا۔

”اس نے جنت کی پلیٹ سے بولی اٹھالی تھی اور ہاتھ مار کر شور مچا دیا تھا۔“

بشری نے بالآخر زبان کھولی۔

”دین محمد اور حیران ہوا، کیا بویاں ختم ہو گئی تھیں؟“

”نہیں۔“

”پھر؟“

”سے اچھا نہیں لگتا، کوئی اس کی پلیٹ میں سے کھائے۔“

”یہ تو بہت چھوٹی بات ہے۔“

”شور مچانے سے اس کے کپڑے بھی خراب ہو گئے تھے۔“

”چھوٹی عقل کی عورت! یہ کوئی ایسی بات ہے کہ بچی کو اس بے دردی سے مارا پٹا جاتا۔“ دین محمد نے یک دم بھڑک کر کہا، لیکن اگلے ہی پل اسے احساس ہوا کہ اس کے اشتعال کی حق دار جنت ہے، بشری نہیں، لیکن جنت پہ وہ غصہ کیسے کر سکتا تھا۔ وہ تو اس کی لاڈلی نازوں بی اولاد تھی۔

”تو وہاں کھڑی اپنی اولاد کو پٹتا دیکھتی رہی۔ آگے ہو کر روک نہیں سکتی تھی اسے؟“

”میں کیسے روکتی۔“ بشری نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”جنت کا ہاتھ پکڑ لیتی۔“ دین محمد نے کہا۔

”جنت کا ہاتھ پکڑ لیتی تاکہ آپ کے گھر آنے پر وہ آپ سے شکایت لگاتی اور پھر آپ مجھے مارتے۔“

دین محمد چپ کا چپ رہ گیا، بشری نے جیسے اس کے سامنے آئینہ لا کر رکھ دیا تھا۔

”آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں جی، بلکہ میں نے جنت کو کیوں نہیں روکا۔ آپ بھی تو یہاں کھڑے دیکھتے رہے۔“

آپ نے اسے کیوں نہیں روکا؟ ”بشری نے بیٹی کو دین محمد سے لے لیا۔“

”آپ فکر مند نہ ہوں۔ آپ نے آج پہلی بار جنت کے ہاتھوں اسے پٹتے دیکھا ہے۔ اس لیے پریشان ہو گئے ہیں، میں تو ہر روز اسے دیکھتی ہوں۔ اپنی بیٹیوں کو ڈھونڈ نکروں سے بھی زیادہ بے دردی سے مار کھاتے دیکھنے کی مجھے عادت ہو گئی ہے، آپ کو بھی ہو جائے گی۔“

بشری نے جیسے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا تھا۔

دین محمد وہیں کھڑا عالمِ بشتیانی میں گھر گیا، بشری نے کئی مرتبہ اسے جنت کے نارا اسلوک کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی، لیکن ہر بار دین محمد نے جنت کی طرف داری کی تھی، کیونکہ اسے کبھی لگا ہی نہیں کہ جنت بھی کچھ غلط کر سکتی ہے۔

لیکن ہاں جنت کی پیدائش کے بعد پہلی مرتبہ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس سے جنت کی تربیت میں کچھ نہ کچھ کوتاہی ضرور سرزد ہو گئی ہے۔ دین محمد گاؤں کے معزین میں شمار ہوتا تھا، کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کی بیٹی کے متعلق اس کے منہ پر کچھ کہہ سکے، لیکن بہر حال اس نے بھی کچھ چہ میگوئیاں سن ہی لی تھیں۔ وہ ان چہ میگوئیوں پر ہرگز کان نہ دھرتا۔ بشرطیکہ فاروق اور جنت کو سراہا بات کرتے ہوئے نہ دیکھ چکا ہوتا۔ اس کا دل چاہا تھا فاروق کا منہ توڑ دے، لیکن اس سے بھی زیادہ صدمہ اسے جنت کی روش پر پہنچا تھا۔

وہ جنت کو بشری سے زبان چلاتے دیکھ چکا تھا، چھوٹی بہنوں کو مارتے پٹتے دیکھ چکا تھا اور اس کی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے غلطی کہاں ہوئی ہے۔ اس نے تو جنت کو اتنی محبت دی تھی کہ کوئی باپ اپنی بیٹی کو نہ ریتا ہو گا۔

کیا محبت بھی کسی کو بگاڑ سکتی ہے؟



”ثروت!“ میرپیس میں آواز ابھری تھی۔ آواز تھی کہ مسرت کا سندیدہ۔ ثروت کے رگ و پے میں ایک سرخوشی سی دوڑ گئی۔

”دانیال! آپ۔“ انہوں نے کہا تو فقط اتنا کہ بلیوں اچھلتے دل نے الفاظ ہی گم کر دیے تھے۔

وہ کم عمر لڑکیوں یا جذباتیت کے ہاتھوں بے حال عورتوں کی طرح خفا ہو کر نہیں نکلی تھیں۔ بڑی سوچ بچار کے

ترقی یافتہ ممالک میں ہر 3 میں سے 2 ڈسٹنٹ

کھانے کے سوڈے والا ٹوتھ پیسٹ تجویز کرتے ہیں جیسے ...

Soda White

BAKING SODA



دانتوں پر چپکے میل اور داغوں کو



بھر پاور فل فلورائیڈ دانتوں پر اثر دکھاتا ہے



دانتوں کو مضبوط اور کثیرا گلنے سے محفوظ بناتا ہے

Soda White

BAKING SODA TOOTHPASTE
TARTAR CONTROL With Fluoride Fights Plaque

0% Germs Free

بعد اس نتیجہ پر پہنچی تھیں کہ انہیں وہاں سے ہٹ جانا چاہیے، ممکن ہے ان کی غیر موجودگی دانیال کو ان کے رویے کی بد صورتی کا احساس دلاوے۔ اتنا عرصہ بے زبان بن کر گزار دیا، پہلی بار اپنے حق کے لیے آواز اٹھائی تھی تو بھی خدشات ساتھ ساتھ تھے گو کہ عقل ان کا شانہ بھینکتی تھی۔

جس مرد کے لیے عورت نے اپنی زندگی نثار کی ہو، اپنی وفا میں اپنا اخلاص جس کے نام لکھا ہو، جس کے بچوں کی پرورش کے لیے اپنے دن رات قربان کیے ہوں، وہ ہی مرد، عورت کو ساری زندگی شک کی مار مارتا رہے، کہاں کا انصاف ہے؟

وہ آتو گئی تھیں، لیکن دل و جان سے دانیال کی محض ایک پکار کی منتظر تھیں۔ فیصلہ تو کر ہی چکی تھیں کہ وہ ایک بار پکار لیں تو جھکنے میں لمحہ بھی نہیں لگائیں گی اور شکر ہے انہوں نے پہل کر بھی لی تھی۔ لیکن دانیال کے اگلے جملے نے جیسے سارے جوش و مسرت پر ٹھنڈا پانی اندیل دیا۔

”الماری کی چابیاں کہاں رکھی ہیں؟“ وہ بھی اپنا پرست تھے۔ ارادہ کچھ تھا بلوں سے کچھ ادا ہوا۔ جھکنا تو ان کی بھی فطرت میں نہیں تھا، کچھ ضد بھی زور پکڑ چکی تھی۔

”اوہ۔“ ثروت کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ گہری سانس بھر کر بولیں۔

”میرے پرس میں رکھی رہتی تھیں ہمیشہ سے۔ آتے ہوئے نکال کر آتا یا دہی نہیں رہا۔“

”انسان میں اتنی عقل ہونا چاہیے، لیکن خیر عقل کا جذباتیت سے کیا تعلق؟“ طنز یہ سلگا تا ہوا لمحہ۔

ثروت کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

”جذباتیت انسان کے پاس سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رہنے ہی کہاں دیتی ہے۔“ دانیال حسن نے مزید کہا۔

”غالبا“ آپ شک کہنا چاہ رہے ہیں۔“ ثروت نے بھی حساب برابر کرنے کی ٹھانی۔ لیکن اس بار دانیال حسن کا

دماغ بھٹک سے اڑ گیا، یوں بھی ان کے سرد مہری میں ڈوبے ہوئے طنز اس وقت تک کاری ثابت ہوتے تھے، جب تک ثروت زبان بندی کے فیصلے پر عمل درآمد کرتیں۔

”کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے تب ہی شک زور پکڑتا ہے۔“ انہوں نے سلگ کر کہا۔

”جی نہیں۔ کچھ لوگوں کو ہوا میں تیر چلانے کا بھی شوق ہوتا ہے۔ لیکن آپ نہیں سمجھ سکتے۔“

”چابیاں؟“

”میں کل ہی ڈاک کے ذریعے بھیجا دوں گی۔“ ثروت نے ان سے زیادہ سرعت سے کہا۔

”بہتر۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم نے احتیاط سے کام لیا ہو تا تو مجھے فون کرنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔“

”اف۔“ ثروت کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا۔

”بچے کیسے ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

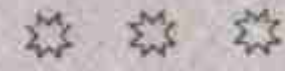
”خوش و خرم۔ انہیں اس گھر میں کس چیز کی کمی ہے کہ کسی اور کے در پر جا بیٹھیں۔“ ایک اور وار۔ ثروت نے تحمل سے سہا۔

”میرا دوست فرمان قریشی تو تمہیں یاد ہو گا؟ اس کا بیٹا میڈیکل میں ہے، میں کل اس کی تصویر تمہیں ای میل کروں گا اپنی رائے سے آگاہ کر دینا۔ میرا خیال ہے انبیاء کے لیے وہ بہترین شریک حیات ثابت ہو گا۔“ کھٹاک کی آواز کے ساتھ فون بند ہو گیا۔

ثروت ہکا بکا سی ریسور ہاتھ میں لیے کھڑی رہیں، ان کے کانوں میں اپنا ہی جملہ گونج رہا تھا۔

”علیحدگی کا فیصلہ ہو تو میری بیٹی کو اس گھر سے رخصت کر دیجئے گا۔“

”تو۔ تو کیا فیصلہ ہو چکا؟“ ایک ہر اس میں گہری ہوئی آواز ان کے دل سے ابھری تھی اور پھر دل کسی اتھاہ میں



بڑی سوچ بچار کے بعد دین محمد نے فاروق سے بات کرنے کا ارادہ کیا، بلکہ بات بھی کیا کرنا تھی سیدھے سادے طریقے سے اسے ڈرا دھمکا کر اس گاؤں سے رخصت کرنے کی ٹھانی۔

لیکن فاروق کوئی نو عمر لڑکا نہیں رہ گیا تھا جو ماموں سے چار پھیر کھا کر ہراساں ہو جاتا، وہ جوان بھرپور لڑکا تھا، جس کے بازوؤں میں دین محمد سے زیادہ طاقت تھی، پھر وہ محکمہ زراعت کا ملازم تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کوئی اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالتا تو فاروق اتنی استطاعت رکھتا تھا کہ نہ صرف اسے دھوبی پنکادے کر زمین پر گرادیتا، بلکہ اس کی گردن بھی توڑ دیتا۔

دین محمد کی بات سن کر وہ بری طرح بھڑک گیا۔

”جیسے کچھ کہنے سے بہتر ہے اپنی بیٹی کو سمجھاؤ۔ سو مرتبہ اس سے کہہ چکا ہوں، میرے پاس نہ آیا کرے، مگر اس کی ہڈی میں تو سکون ہی نہیں ہے۔“

”تو الو کے پٹھے، میری بیٹی۔“ دین محمد اس کی بات پر بری طرح بھڑک گیا۔

”گالی مت دینا ماموں۔“ فاروق نے اس سے زیادہ اشتعال انگیز لہجے میں کہا۔ ”غیرت مندی صرف تم میں نہیں ہے، میں بھی راجپوتوں کا خون ہوں۔ تمہاری عزت کی پروا نہ ہوتی تو آج تمہاری لاڈلی کے کروت سارے گاؤں کو پتا چل چکے ہوتے۔ جتنا تم نے مجھے اور میرے ماں باپ کو ذلیل کیا تھا، میں چاہتا تو بڑے آرام سے تمہاری عزت کا جنازہ نکال کر تمہارے ساتھ حساب برابر کر لیتا، لیکن مجھے صرف اپنی ماں کی پروا ہے، جس کو تم اور تمہاری بیٹی بڑی عزیز ہے اور میں نہیں چاہتا میرے کسی عمل سے میری ماں کو دکھ پہنچے۔“

میری مانو ماموں! اپنی اس فنی کے دو بول پڑھا کر رخصت کر دو، اب تمہارے قابو میں نہیں آنے والی ہیں یہاں تک ہوں، آج نہیں تو کل میرا تبادلہ کسی اور جگہ ہو جائے گا، لیکن میری جگہ یہاں جو بھی آئے گا وہ بھی مردہ ہی ہو گا اور اتفاق سے اسے تمہاری عزت کی پروا کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ ہر کوئی میری طرح نہیں ہو گا، تاکہ پلیٹ میں پیش کی جانے والی شراب کو انکار کر دے۔ اس لیے بہتر ہے سنبھال لو اپنی بیٹی کو۔“

فاروق کی زبان الفاظ نہیں زہرا گل رہی تھی۔

دین محمد اٹھے ہوئے سراور کندھوں کے ساتھ فاروق سے جواب طلبی کرتے گیا تھا، لیکن واپسی میں اس کا سراور کندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ فاروق کی بات میں سچ اور جھوٹ کا تناسب کتنا تھا، وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ دشمنی کے باوجود فاروق نے اس کی عزت کی پروا کی تھی۔

دین محمد بے حد فکر مند ہو گیا تھا۔ جنت کی جگہ اس کا بیٹا ہوتا تو وہ ماریٹ کراسے سمجھا سکتا تھا، لیکن جنت لڑکی تھی اور دین محمد کی بے حد لاڈلی۔ وہ اسے پھولوں کی چھڑی سے بھی چھونے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

چھوٹی چھوٹی غلطیاں تو ہم سب ہی کرتے ہیں، بعض اوقات ان چھوٹی چھوٹی غلطیوں کا کوئی مجموعہ ہمارے لیے مشکلات بھی کھڑی کر دیتا ہے، لیکن کچھ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں اور کوتاہیاں مل کر دلدل کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور خود پر ہلاقم پڑتے ہی انسان کو اپنے اندر پہنچ لیتی ہیں۔

دین محمد کی غلطیاں بھی ایسی ہی دلدل کی صورت اختیار کر چکی تھیں اور دین محمد سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس دلدل میں پھر رکھے بغیر وہ سری طرف کس طرف پہنچے۔

بیٹی کی محبت نے بالا خراسے ایک بند گلی میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔



شبیبہ کمرے میں داخل ہوا تو جلال چھوٹے سے لیدر بیگ میں روزمرہ ضرورت کا سامان رکھ رہا تھا اور کہیں روا نگ کی تیاری میں دکھائی دیتا تھا۔

”کندھری کی تیاری ہے جناب؟“ اس نے تھکے تھکے انداز میں ہنسنے کو اڑیت سے پوچھا۔ ابھی کیمپس سے لوٹا تھا اور تکان زدہ دکھائی دیتا تھا۔

”میں گاؤں جا رہا ہوں۔“ جلال نے مصروفیت بھرے انداز میں اسے جواب دیا۔

”اے! شبیبہ چونکا۔“ یہ اچانک گاؤں جانے کا پلان کیسے بن گیا؟ اس نے کہا، ”ابھی تو کہا تھا۔ اس نے بیڈ پر لیٹے ہوئے کہا۔“

”بس اچانک پلان بنا، سب لوگ بہت یاد آ رہے تھے، سوچا ہمارا دل ہی آؤں۔“ ہال نے اصل بات گول کرتے ہوئے بہانہ بنایا۔

”تم بھی چلو شبیبہ، اس وقت واپس آجائیں گے۔“ ساتھ ہی اسے اسی بل کی ش کی۔

”نہیں یار! مجھے تو کل تک ہر حال میں اپنا پرو جیکٹ سمٹ کر انا ہے۔“ شبیبہ نے معذوری ظاہر کی۔ ”متم یوں کرو، تم بھی رک جاؤ، کل اکٹھے گاؤں کے لیے نکلیں گے، ویسے بھی آج موسم بہت خراب ہے، میرا نہیں خیال ایسے موسم میں تمہیں ڈرا یونگ کا رنگ لینا چاہیے۔“

وہ شورہ مارتا کر تھکے ہوئے انداز میں بیڈ پر لیٹ گیا۔

”کیا بات ہے بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو؟“ جلال نے بات ٹالتے ہوئے پوچھا۔ شبیبہ نے جواب دینے کے بجائے اپنی آنکھوں کو انگلیوں سے مسلنا شروع کر دیا تھا۔

”شبیبہ! طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ جلال نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ہوں۔ ہاں۔“ شبیبہ نے سابقہ انداز میں کہا، پھر دل ہی دل میں کسی نتیجے پر پہنچنے لگی۔

”جیلڈ! طبع تمہارا کت گئے تھے؟“

”ہاں۔ میں تو روز جاتا ہوں۔“ جلال نے جلدی سے کہا، ساتھ اس کے چہرے پر ”کٹھن بھانپ کر بولا۔“

”بات کیا ہے شبیبہ؟“

”میں نے کئی روز سے انہیں نہیں دیکھا۔“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”کون؟ کس کی بات کر رہے ہو۔“

”تمہاری ثروت آئی۔“ اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ امی، می یا ماں ٹائپ الفاظ تو وہ ان کے لیے کبھی بولتا ہی نہیں تھا، اب ان کے لیے کوئی جذبہ دل میں ابھر رہا تھا، لیکن اس جذبے کو بھی کوئی واضح نام دینے سے وہ قاصر تھا۔

جلال نے بغور اسے دیکھا۔

”ہاں۔ میں نے بھی کئی روز سے انہیں نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے، وہ پارک آئی نہیں رہیں، ورنہ میری ملاقات ضرور ہوتی۔“

شبیبہ نے اس بار کوئی جواب نہ دیا، بلکہ اس کے چہرے پر الجھن یا فکر مندی برپا ہو گئی تھی۔

”ممکن ہے وہ بیمار ہوں یا یہاں موجود ہی نہ ہوں، ورنہ جب سے میں یہاں آیا ہوں ایک بھی دن میں نے انہیں غیر حاضر نہیں پایا۔“ جلال نے کہا۔

”مگر تم کو تو میں ان کے گھر جا کر ان کی خیریت معلوم کر لیتا ہوں۔“
 ”ارے نہیں اب اتنی بھی امپورٹنٹ نہیں ہیں وہ۔“ اس کی سخت مزاحی عود کر آئی۔ جلال کو آکٹا ہٹ سی محسوس ہوئی۔

”خیر امپورٹنٹ تو وہ ہیں نہ ہوتیں تو تم ان کے لیے فکر مند نہ ہوتے۔“
 ”آتے جاتے ہر دوسرے تیسرے نظر آ ہی جاتی تھیں۔ آنکھوں کو عادت ہو جاتی ہے بھی سڑک کنارے درخت لگا ہو تو اس سے بھی آنکھیں مانوس ہو جاتی ہیں۔ درنہ اور کوئی بات نہیں ہے۔“ شبیبہ نے جھنجھلا کر کہا تھا۔
 ”میں ابھی انہیں روز دیکھتا ہوں پارک میں ملاقات ہو جاتی ہے، لیکن میں نے تو ان کی کمی محسوس نہیں کی۔“ جلال جرح کرنے لگا۔

شبیبہ نے خاموشی سے منہ پر تکیہ رکھ لیا۔ جلال سمجھ گیا اب وہ اس موضوع پر کچھ نہ سنے گا۔ جلال خاموش رہ کر اپنے کام میں لگا رہا۔ وہ تو خود شبیبہ سے ماویٰ کا ذکر کرنا چاہ رہا تھا، لیکن وہ خود الجھا ہوا تھا۔ جلال کی بات میں کہاں دلچسپی لے لیا تا یہ ہی سوچ کر جلال نے اس ذکر کو کسی اور وقت پر ٹال دیا۔ لیکن وہ ماویٰ کے متعلق سوچنے لگا اسے ماویٰ کے متعلق سوچنا اچھا لگ رہا تھا پتا نہیں پھول ملنے پر اس نے کیا رقص عمل بنا کر کیا ہو گا؟ کاش! میں اپنے لیے ان تمام جذبوں کے رنگ اس کے چہرے پر دیکھ سکتا جو میرے لیے محسوس کرتی ہے۔

ابھی وہ یہ ہی سوچ رہا تھا کہ شبیبہ کی آواز سنائی دے۔
 ”اور ہاں۔۔۔ تم اس روز روڈ پر کس لڑکی کے ساتھ تھے؟ میں اسے پہچان گیا ہوں، یہ وہی لڑکی تھی نا جس نے بے وجہ مجھ سے جھگڑا کیا تھا؟ مجھے وہ بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔ تمہیں ذرا فریڈ زینا تے ہوئے محتاط رہنا چاہیے۔ ایسی بد تمیز لڑکیوں سے دوستی کرنے کی کیا ضرورت ہے پتا نہیں ایسی منہ پھٹ بد تمیز لڑکیاں کن احمقوں کو اچھی لگتی ہوں گی۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے واش روم میں گھس گیا۔ جلال سر پکڑ کر بیٹھ گیا وہ تو شبیبہ کو اپنے اور ماویٰ کے بارے میں بتا کر ماویٰ جان کو راضی کروانے کے سلسلے میں پہلا اور سب سے اہم ووٹ اپنے حق میں کروانا چاہ رہا تھا، کہاں یہ صورت حال کہ شبیبہ صاحب اپنی ناپسندیدگی جتا گئے تھے۔ جلال کو کسی بڑی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔

بہت تیز بارش تھی۔ بادل گرجتے تو لگتا اللہ کا قہر نازل ہو رہا ہے۔ بجلی کڑکتی تو تیز روشنی آنکھیں چندھیانے لگتی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا اور میان میں حائل شیشہ توڑ کر اندر گھس آئے گی۔

کیسا غضب کا طوفان تھا۔ ہوا درود پوار سے ٹکراتی پھرتی تھی۔
 شمینہ کب سے چپ چاپ کھڑی شیشے کے اس طرف تباہی مچاتے طوفان کو دیکھ رہی تھیں۔

باہر اگر اٹھانچ تھی تو اندر ایک سکوت کا عالم تھا جیسے سمندر پر رات پھیل رہی ہو ایسا سا نا جو وحشت میں مبتلا کروے۔

ماویٰ نے کئی بار دیکھا۔ شمینہ گم صم سی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھیں۔ وہ ہر بار مخاطب کرنے کا ارادہ کرتی پھر ٹال دیتی خدا معلوم۔ کس گہری سوچ میں مبتلا تھیں۔ وہ خود ہی وی کے سامنے ڈٹی بیٹھی تھی۔ ایک بڑا سا پالہ گود میں بوج رکھا تھا دوسرے ہاتھ میں لکڑی کا چمچ جس کے ساتھ باؤل میں چینی اور مکھن کا آمیزہ پھینٹا جا رہا تھا۔ دونوں کی کاموں میں انہماک قابل دید تھا۔

بالا خراس خاموشی کو شمینہ نے ہی توڑا۔
 ”کیا کر رہی ہو ماویٰ! کو باتیں کریں۔“

”اس۔۔۔“ ماویٰ نے چونک کر کہا۔ ”ہاں۔۔۔ باتیں تو مجھے بھی آپ سے کرنی ہیں لیکن پہلے ذرا یہ کو کیز بیک اونے رکھ دوں؟“

”کو کیز میری بات سے زیادہ اہم نہیں ہیں۔“ شمینہ نے آہستگی سے کہا۔
 ”جب میں کافی کے ساتھ کو کیز آپ کی خدمت میں پیش کروں گی تو آپ کو باتیں کرنے کا مزہ آجائے گا۔“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا پھر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔
 ”کیسے بھی میں آج آپ سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی ہوں۔“
 ”مجھے پتا ہے۔ تم کیا پوچھنا چاہ رہی ہو؟“ شمینہ نے کہا۔
 ”کیا؟“

”تم زین کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی ہو ناں؟“
 ”زین کون؟“
 ”تمہاری کچھ جی جان۔“

”ارے ہاں۔۔۔“ ماویٰ بڑی طرح چوکی اور آنکھیں متاثر کن انداز میں پھیلا کر پوچھنے لگی۔ ”لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں ان کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی ہوں۔“
 ”بائے گاؤ می! کیا آپ کے پاس موکل ہیں جو آپ کو ہر خبر دے دیتے ہیں۔“

”شینہ اس کی بات پر آہستگی سے ہنسیں۔“
 ”تمہیں موکل نہیں ہیں میرے پاس۔“

”پھر جو میں سوچ رہی ہوتی ہوں یا جو بات میرے دل میں ہوتی ہے اس کا آپ کو کیسے پتا چل جاتا ہے؟“ اس نے الجھن آمیز انداز میں پوچھا۔

”کیونکہ میں تمہاری ماں ہوں اور ماؤں کو سب پتا ہوتا ہے۔“ شمینہ نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔
 ”اچھا۔۔۔“ ماویٰ نے ابرو اچکا کر پل بھر کو سوچا۔
 ”پھر آپ مجھے پھپھو کے بارے میں بتائیں گی ناں؟“

”ہاں۔۔۔ بتاؤں گی“ آج تو سب کچھ بتاؤں گی۔“ شمینہ نے خود کلامی کے انداز میں کہتے ہوئے کھڑکی کی طرف رخ موڑا۔

”چلیں ٹھیک ہے میں بس بیس منٹ میں اپنا کام سمیٹ کر آتی ہوں۔“ وہ پھرتی سے کچن کی طرف چلی گئی۔
 شمینہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہیں جہاں یارش مزید تیز ہو گئی تھی اور موٹی موٹی بوندیں زور زور سے بند شیشے سے ٹکرا رہی تھیں۔ اللہ جانے کون سا طوفان زیادہ شدید تھا، وہ جو کھڑکی سے باہر تباہی مچا رہا تھا یا وہ جو شمینہ کی ذات کو اٹھل پھل کیے دے رہا تھا۔

”کیا بات ہے بھائی دین محمد! پریشان لگ رہے ہو۔“
 دین محمد نے چونک کر حسین احمد کو دیکھا۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے ہاتھ روک کر فکر مندی سے دین محمد کو دیکھ رہا تھا۔

Doctor

HAIR FALL SOLUTION

بال گرنا بند!
کیونکہ بال بنے مضبوط

Friends Ko



”نہیں۔ پریشان تو نہیں ہوں بس سوچ رہا تھا اس کا مول اچھا لگ جائے تو انگلی بیانی کے لیے سہولت رہے گی۔“ دین محمد نے مہارت سے بہانہ بناتے ہوئے کہا اور رغبت سے کھانا کھانے لگا۔

وہ اپنی کپاس کی ضرورت کے سلسلے میں قریبی قصبہ کی منڈی میں آیا ہوا تھا، یہیں اس کی ملاقات اپنے بے حد عزیز لیکن کئی سال پہلے پھڑپھڑے ہوئے دوست حسین احمد سے ہو گئی۔ حسین احمد اور اس کا خاندان کئی سال اسی گاؤں میں رہ چکے تھے جس گاؤں سے دین محمد کا تعلق تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت دین محمد ایک معمولی درجہ کا زمین دار تھا لیکن اب اس کی حیثیت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا جنت کی پیدائش کے چند مہینے بعد حسین احمد نے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں چھوڑ دیا تھا، حسین احمد شہر میں جا بسا تھا۔ ان دونوں نے اتنے طویل عرصہ بعد کی ملاقات میں خوب باتیں کی تھیں۔ از سر نو میل جول برہانے کی بات بھی ہوئی۔ حسین احمد نے زہرہ کے انتقال کی خبر سن کر دکھ کا اظہار بھی کیا تھا حسین احمد نے یہ بھی کہا۔

”دوسری شادی کر کے تو نے بڑا اچھا کیا“ آخر انسان کب تک اکیلے زندگی گزار سکتا ہے۔ مرد کو بیوی کی ضرورت پڑتی ہی ہے پھر بیٹیوں کی تربیت ماں سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔“

کوئی اور وقت ہو تا تو دین محمد ہرگز اس کی بات نہ مانتا لیکن اب اسے اس بات پر سو قیصر یقین آ چکا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ جنت کی طرف سے بہت پریشان ہوتا تو سوچتا شاید اس سے ہی جنت کی تربیت میں کوئی غلطی سرور ہو گئی ہے۔ اس نے بھی بشری کو اتنا اختیار دیا ہی نہیں کہ وہ ماں بن کر جنت کو ڈانٹ ڈپٹ لے یا کوئی بات سمجھانے کی کوشش ہی کرے۔

لیکن اب تو بانی سر سے گزر چکا تھا اور بعض اوقات فکر مندی سے اسے رات رات بھر نیند بھی نہ آتی تھی۔ اس کو یاد تھا وہ کئی بار زہرہ کے سامنے اس بات کا اظہار کر چکا تھا کہ وہ جنت کو رخصت نہیں کرے گا بلکہ اس کے لیے کوئی ایسا لڑکا تلاش کرے گا جو گھر و اماں بن کر ان کے ساتھ رہے لیکن وقت اور حالات بڑی تیزی سے انسان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ دین محمد بھی اب اسی کوشش میں تھا کہ جیسے ہی کوئی اچھا رشتہ ملے وہ جنت کو رخصت کر دے یوں بھی اس کے ساتھ کی بہت سی لڑکیاں بیاہی جا چکی تھیں، صرف دین محمد تھا جس نے جنت کو گھر میں بٹھا کر رکھا ہوا تھا۔

وہ کھانا کھاتے ہوئے ایک بار پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ حسین احمد نے اس بار تشویش کے عالم میں اس کا کندھا دیا۔

”مجھے ہوا کیا ہے دین محمد!“

”کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں حسین بھائی!“ دین محمد نے کہا۔ حسین احمد اس سے عمر میں کئی سال بڑا تھا لیکن دونوں کی دوستی خوب تھی۔

”اچھا اس سے ملو۔ اس کو پہچانتے ہو کہ نہیں؟“ حسین احمد نے براشتیاق لہجے میں کہا۔ دین محمد نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اونچے قد کا اور مضبوط ذیل و دل والا تیس بیس برس کا جوان مسکرا رہا تھا۔

”دلاور حسین۔“ دین محمد نے بے ساختہ کہا اور اس سے بغل گیر ہو گیا۔ ”تم بھی کمال کرتے ہو بھائی حسین! کیا اپنے بھتیجے کو بھی نہیں پہچانوں گا۔“

وہ دلاور سے حال احوال دریافت کرنے لگا۔ پتا چلا وہ فوج میں بھرتی ہو چکا تھا۔ چند سال پہلے شادی بھی کی، بیوی بیٹے کی پیدائش کے وقت فوت ہو چکی تھی۔

”میں تو کہتا ہوں شادی کر لے لیکن یہ سنتا ہی نہیں۔ تو ہی سمجھا اسے دین محمد! آخر بیوی کے بغیر گزارا کرا لیا آسان ہے۔“

دین محمد دلاور حسین کو کیا سمجھاتا۔ اس کے ذہن میں تو بجلی کی طرح کوند لپکا تھا۔ اس نے آنکھیں سکوڑ کر دلاور حسین کو دیکھا۔ شکل و صورت بہترین خاندان زمین جائیداد کا مالک پھر حکومت کا ملازم۔ جنت کے ساتھ خوب چٹا، لیکن اگلے ہی پل اس نے اپنے خیال کو رو کر دیا اور دل مسوس کر رہ گیا جنت اور دلاور کی عمروں کا فرق یاد آگیا تھا پھر دلاور کا بیٹا بھی تھا۔

کچھ چیزیں انسان کو اپنے لیے غلط اور اولاد کے لیے درست لگتی ہیں اور کچھ چیزیں انسان اپنے لیے درست اور اولاد کے لیے غلط قرار دے دیتا ہے یہ طرز عمل صحیح ہے یا نہیں لیکن انسان اکثر ایسا کرتا ہے۔

دین محمد نے دل ہی دل میں دلاور حسین کو جنت کے لیے غیر مناسب قرار دیتے ہوئے اپنی اور بشری کی عمروں کے فرق کو بھلا دیا تھا۔



لونگ والشکار لونگ والشکار
ما میں نی مائیں مینوں لونگ گھڑا دے
لونگ گھڑا دے نگ جڑا دے
نگ جڑا دے ایسا۔

ولید کی اونچی اونچی تائیں سارے گھر میں گونج رہی تھیں انبیاء کا بس نہ چلتا تھا اسے اٹھا کر گھر سے ہی باہر پھینک دے۔ سچ سے ایسے ہی شادی بیاہ کے گیت سناتا کر اس کے کان کھارہا تھا۔

”ولید کے بچے! اب تم خاموش نہ ہوئے تو گلہ ان اٹھا کر تمہارے سر پر مار دیوں گی۔“ اس نے کتاب بیچ کر دھمکایا۔ کل اتنا اہم ٹیسٹ تھا اور یہ لڑکا مستقل اس کے سر پر سوار۔

”اس میں اتنا غصہ کرنے کی کیا بات ہے؟“ ولید نے معصوم سی شکل بنا کر پوچھا۔ ”تمہیں یہ گناہ پسند نہیں تو کوئی اور سنا دیتا ہوں۔“ اچھا وہ گناہ کیا رہے گا۔

ابھی وہ بیس تک ہی پہنچا تھا کہ انبیاء جچ اٹھی۔

”خبردار خبردار اب ذرا سی بھی آواز نکالی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ غضب خدا کا صبح سے میرا پیوں والا دورہ تمہیں پڑا ہوا ہے۔ پتا نہیں یہ سارے زنانہ گیت تم نے کہاں سے یاد کیے ہیں اوپر سے تمہاری آواز۔ ایسا لگتا ہے درجن بھر کوئے۔ ایک ساتھ جچ رہے ہوں میرے تو کان ہی پک گئے۔ اب میں تمہاری آواز میں مزید کچھ نہیں سن سکتی۔ رحم کرو مجھ پر۔“ آخر میں وہ بالکل ہی روہا سی ہو کر بولی تھی

ولید نے خفگی سے اسے ٹھورا۔

”ایک تو صرف تمہاری خاطر میں نے اتنے گانے یاد کیے ہیں اس پر سے تم باتیں بھی تم مجھے ہی سنارہی ہو۔“

”میری خاطر کس خوشی میں؟“ انبیاء نے چڑ کر کہا۔ ”میں نے تم سے فرمائش کی تھی کیا؟“

”ابھی تک تو نہیں کی لیکن شادی پر تو کرو گی۔ اب تمہاری اونچی بوگی سپیلیاں تو گناہ نہیں سکتیں۔ کوئی تو ہونا چاہیے جو اچھی آواز میں گائے یہی سوچ کر میں نے آج سے پریکٹس شروع کر دی ہے لیکن تمہیں تو قدر رہی نہیں ہے۔“ انداز احسان جتنا والا تھا۔

”اس کی فکر تم نہ کرو۔“ انبیاء نے رخ اسٹڈی ٹیبل کی جانب موڑتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

”میری شادی میں ابھی بہت وقت ہے پھر اور ویسے بھی تم سے تو اتنی فیصد بہتر گالیں گی میری اونچی بوگی سپیلیاں۔“

”جی نہیں۔۔۔ یہ غلط فہمی اپنے دل سے فوراً نکال دو۔“ ولید نے کہا۔

”لگتا ہے میری سپیلیوں کی آوازیں سننے بغیر ہی تم حسد میں مبتلا ہو گئے ہو۔“ انبیاء نے چڑایا۔

”ارے ان سے حسد کرتی ہے میری جوتی۔۔۔ وعدہ رہا اپنی شادی پر اپنی ساری بے سری سپیلیوں کا مجھ اکیلے سے مقابلہ کروالیتا۔ ایک گھنٹہ بھی میرے آگے ٹھہر گئیں ناں تو اپنا نام بدل دوں گا۔“ ولید نے جوش سے کہا۔

”اچھا تو پھر؟“ انبیاء کو اس کی بات بڑھک سے زیادہ نہ لگی۔

”اپنے دل سے یہ غلط فہمی نکال دو کہ تمہاری شادی میں بہت وقت ہے۔ ڈیڈی تو عنقریب رخصت کرنے کے چکروں میں ہیں۔۔۔ لڑکا بھی پسند کر چکے وہ تو۔“

انبیاء دھک سے رہ گئی۔ اس کے اٹھ سے پین چھوٹ گیا۔

”کیا کہہ رہے ہو ولید!“ اس نے سراپسنگی سے ولید کو دیکھا۔

”تمہیں تمہاری شادی کی خوش خبری سنارہا ہوں۔“ ولید نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں نے خود ڈیڈی کو فون پر کہتے سنا ہے۔“

”یہ خوش خبری ہے؟“ انبیاء نے چڑ کر کہا۔

”تو پھر کیا ہے؟“

”میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی ولید!“ اسے سخت پریشانی لاحق ہو گئی تھی ”اور پھر ڈیڈی“ ممی کی غیر موجودگی میں اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں۔“

”میری مانو۔۔۔ چپ چاپ شادی کر کے اپنی لا کف سیٹ کرو۔ لڑکوں کی زندگی تو ماں باپ کی علیحدگی کے بعد بھی ٹھیک رہتی ہے۔ شہرہ العباس بھالی کو ہی دیکھ لو۔۔۔ کس بات کی کی فکر آتی ہے ان کی زندگی میں؟ میں اور وی بھی سیٹ ہو ہی جاؤں گے اصل مسئلہ تمہارے لیے ہو گا وہ ہے ہی لڑکیاں! میں ہوتی ہیں۔ پھولی پھولی باتوں پر ابنا رمل ری ایکشن دیتی ہیں۔“

”تم کیا کہہ رہے ہو ولید! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ انبیاء نے افسوسناک سہمی سے کہا۔

”بھئی ڈیڈی اور ممی میں ڈائیورس ہونے والی ہے اس سے پہلے ہی تمہاری شادی ہو جانا چاہیے۔“ بالآخر بلی تھیلے سے باہر آئی گئی۔

”شٹ اپ ولید! کبھی تو سوچ سمجھ کر بولا کرو۔“ انبیاء نے غصے سے کہا۔

”غصہ مت کرو الو!“ ولید نے گل سے کہا۔ ”جو بات چند روز بعد تمہیں ممی یا ڈیڈی سے پتا چلتا ہے وہ میں بتا رہا ہوں تو بھڑک کیوں رہی ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے“ ممی بونہی اتنے روز سے نانا جان کے گھر جا کر بیٹھی ہوئی ہیں؟“

انبیاء بے طرح فکر مند ہو گئی ہر امکان سوچ چکی تھی مگر اس سچ تک تو اس نے ہرگز نہ سوچا تھا۔

”ولید! یہ بھی تم نے ڈیڈی کو کہتے سنا ہے یا تمہارا اندازہ ہے؟“ یکایک اسے خیال آیا۔

”میری چھٹی جس بتا رہی ہے۔“ ولید نے سنجیدگی سے کہا۔

”خدا کرے تمہاری چھٹی جس اس بار غلط اشارہ دے رہی ہو۔“ انبیاء نے صدق دل سے کہا۔

”آمین۔“ ولید کی آواز دھیمی تھی۔

”میں ممی کو فون کروں؟“

ولید نے کندھے اچکا دیے۔ انبیاء کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا لیکن اگلے ہی پل وہ اٹھی اور اپنے سیل فون پر نمبر ڈائل کرنے لگی۔



دین محمد باجی زبیدہ کو دیکھ کر بے حد حیران ہوا۔

چھٹی بار باجی زبیدہ زہرہ کے انتقال پر حویلی آئی تھی اور دین محمد نے اسے بے حد بے عزت کر کے نکال دیا تھا۔

سیونگزر ہی مشکل وقت میں کام آتی ہیں

- 8% سالانہ منافع*
- ڈپازٹ کی حد 10,000 سے 1,000,000 روپے تک
- 3 ماہ کا اکٹھا منافع
- ہر ماہ 2 مرتبہ مفت رقم نکالنے کی سہولت

111-111-425 www.hbl.com

میری سہیلی

HBL ValueAccount



منظیر حیات

JWT

اس قدر تذلیل سننے کے بعد وہ ایک بار پھر اعلا ظریف کا مظاہرہ کرتے ہوئے حویلی آگئی تھی تو اس کی وجہ صرف اور صرف ماں جانے کی محبت اور جنت تھی۔

یہ بات صرف باجی زبیدہ ہی جانتی تھی کہ اس نے فاروق کو کن دقتوں سے جنت کے ساتھ شادی پر آمادہ کیا ہے۔ لیکن دین محمد اپنی تمام تر پریشانی کے باوجود اسے دیکھ کر پھر اکڑ گیا اور مصلحت آمیزی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے زبیدہ کو مزید بے عزت کرنے لگا۔

”پاگل پن نہ کرو دین محمد! تو نہیں جانتا گھر آئے ہو تو کسی بڑی حماقت کر رہا ہے۔“ باجی زبیدہ نے اس کی ساری جلی گئی سننے کے بعد بھی منت بھرے کچے میں کہا۔

”میں نے کیا کرنا ہے کیا نہیں... مجھے سکھانے کی ضرورت نہیں ہے باجی! دین محمد نے ترخ کر کہا۔“ تیرے بیٹے نے میرے منہ پر کالک ملانا بھی سول دی۔“

”ارے میرے بیٹے نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ تو اسے الزام دے۔ جنت خود اس سے ملنے جاتی رہی ہے۔“ بالآخر باجی زبیدہ کی برداشت بھی جواب دے گئی۔

”بس بس... میری بیٹی کے بارے میں ایک بھی اور لفظ نہ کہنا۔“

”دیکھا... اپنی اولاد کے بارے میں کوئی غلط لفظ سننا کتنا برا لگتا ہے پھر بھی میں جب سے آئی ہوں مسلسل فاروق کو کوس رہا ہے اور میں خاموشی سے سن رہی ہوں۔ ایک بار بھی تجھے نہیں ٹوکا... جانتا ہے کیوں؟ صرف اس لیے تاکہ خیاندان کو بدنامی سے بچایا جاسکے۔ فرشتہ تو کوئی بھی نہیں ہوتا کہ غلطی سے دور رہے۔ اب جنت نے جو حماقت کرنا بھی سو کر دی تو تو عقل مندی کا فیصلہ کر... میں نے فاروق کو راضی کر لیا ہے بس تو بھی مان جا تو میں اگلے سوموار کو جنت کو رخصت کروالوں۔“

لیکن دین محمد نے راضی تو کیا ہونا تھا۔ باجی زبیدہ کو اتنی باتیں سنائیں کہ بچاری سمجھ گھنے کے قابل ہی نہ رہی۔ صرف اسی پر دین محمد نے اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ الزام بھی جڑ دیا کہ وہ اور فاروق دین محمد کی زمینیں ہتھیلے کے لیے یہ سارا کھیل رہے ہیں۔

باجی زبیدہ اپنے بھائی کی عزت بچانے کے خیال سے بڑی آس لے کر اس کے پاس آئی تھی لیکن دین محمد نے اس کے خلوص کی رتی بھر بھی قدر نہ کی۔ جب زبیدہ رخصت ہونے لگی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”صرف تیرے اسی روئے کی وجہ سے میں اپنی مری ہوئی ماں کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکی۔ مجھے ڈر تھا کہ پھر حویلی آنے پر تو مجھے بے عزت کرے گا۔ لیکن اس بار تو میں تیری عزت کو سہارا دینے آئی تھی دین محمد! تو نے پھر بھی میری قدر نہ کی۔“

”اچھا ٹھیک ہے میں تیری بات مان لیتا ہوں لیکن ایک شرط ہے فاروق کو شادی کے بعد اسی حویلی میں آکر آباد ہونا پڑے گا۔ میں جنت کو خود سے دور جانے نہیں دوں گا۔“ دین محمد نے ٹالا۔

”تو سن لو اماں! جس بھائی کی محبت میں تم دیوانی ہوئی جا رہی ہو۔ وہ تمہارے بیٹے کو سسرال میں کتے کی سی زندگی گزارنے کی ترغیب دے رہا ہے۔“ فاروق نے استہزاء میں پکلی بار زبان کھولی۔

”چلو یہاں سے اماں! ماموں نے ساری زندگی بیٹی کو گھر بٹھانا ہے۔ اس کے کارناموں کا گند بھی اسے خود ہی سمیٹنے دو۔“

دین محمد کا دل چاہا فاروق کا منہ توڑ دے۔

”تو تو بیٹی کی محبت میں پاگل ہے دین محمد! تجھے ذرا بھی احساس نہیں تیری غیر معمولی محبت نے جنت کے ذہن کو کس قدر خراب کیا ہے۔ عورت کا ذہن ہی سیدھے راستے پر نہ چلے تو نسلیں کی نسلیں خراب ہو جاتی ہیں... لیکن تو نہیں سمجھے گا۔ کبھی نہیں سمجھ سکتا۔“ زبیدہ زیر لب برہناتی اور روتی ہوئی رخصت ہوئی۔

دین محمد نے نخت سے اسے جاتے دیکھا۔ تکبر سے سر جھٹکا اور فیصلہ کر ڈالا۔
 ”میری معصوم بچی کو غلط راہ پر ڈال دیا لیکن میں سب سنبھال سکتا ہوں۔ کل ہی نہیں آج ہی میں بھائی حسین احمد سے ملنے روانہ ہو جاتا ہوں۔ جنت میری لاڈلے کے لیے دلاور حسین سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“
 اس نے پکا تہیہ کر لیا اور یوں جنت فاروق کے بجائے دلاور حسین کا مقدر بن گئی۔

ثمینہ سارا دن مصروف رہی تھیں۔ ایک بھی بل ایسا نہیں گزر رہا جب وہ ماویٰ کو حقائق سے آگاہ کرنے کے لیے تانا پٹا نہ بنتی رہی ہوں انہیں ماویٰ کو کس حد تک آگاہ کرنا ہے کتنا بچہ پٹانا ہے کتنا جھوٹ؟ وہ تقریباً ”سب فیصلے کر چکی تھیں لیکن پھر بھی کوئی گھبراہٹ تھی جو ان کے اعصاب پر سوار تھی۔

پورا لاکھ عمل ترتیب دینے کے بعد بھی بعض اوقات حسب منشا نتیجے ملنے کی امید نہیں ہوتی۔ امید ہوتی ہے گھبراہٹ سر پر سوار رہتی ہے یہی کیفیت ثمینہ کی تھی وہ کبھی بیٹھ جاتیں، کبھی چل قدمی کرنے لگتیں۔ کھڑکی کے باہر لان کی روش دکھائی دے رہی تھی جو تیز بارش میں تواتر سے بھگ رہی تھی گوکہ طوفان کی شدت میں کمی آ گئی تھی لیکن کبھی کبھی بجلی بڑے زور سے کڑکتی اور بادل پوری قوت سے گرجتے تھے۔
 انہیں خبر نہ ہوتی کب بچن سے نکل کر ماویٰ لاؤنچ میں آ گئی۔
 وہ کافی کے ساتھ پاپ کارن اور کوکیز بیک کر کے لائی تھی۔

”اتنی تیاری تو میں تب کرتی ہوں جب کوئی اچھی سی مووی دیکھنا ہو۔ مجھے یقین ہے اب آج مجھے کوئی بہت اچھی سی اسٹوری سنائیں گی۔“ ماویٰ نے ہنس کر کہا تھا ثمینہ نے سرائٹا کر اسے دیکھا اسی بل بجلی زور سے کڑکی تھی۔
 ماویٰ کا چہرہ اس روشنی میں منور ہوا تھا۔

”ہاں ماویٰ! میں تمہیں اچھی سی اسٹوری ہی سناؤں گی لیکن اس سے بھی پہلے مجھے تمہیں ایک اور بات بتانا ہے جسے سن کر تم ضرور شاکد ہو جاؤ گی۔“ ثمینہ نے تمہید باندھی۔
 ”ایسی کیا بات ہے می! ماویٰ نے کچھ حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
 ”تمہیں بتا ہے تمہارے بابا جان کا انتقال کیسے ہوا تھا؟“ ثمینہ نے پوچھا۔
 ”ہارٹ ایک سے۔“

”کیونکہ تمہیں حقیقت کا علم نہیں ہے تمہارے بابا کو ہارٹ ایک نہیں ہوا تھا بلکہ انہیں قتل کیا گیا تھا۔“
 ثمینہ کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ ماویٰ کی سماعت تک بمشکل پہنچی۔ لیکن اس دھیمی آواز نے بھی ماویٰ کے سر پر گویا آسمان گرا دیا تھا۔

”آ۔۔۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں می!“ الفاظ اس کے لبوں سے بمشکل ادا ہوئے تھے۔
 ”اور آپ نے مجھے پہلے کبھی کیوں نہیں بتایا؟ کس نے قتل کیا تھا بابا جان کو اور آپ نے اتنا عرصہ یہ بات مجھ سے چھپا کر کیوں رکھی تھی۔“ ماویٰ نے تابلو توڑ سوال کر ڈالا۔
 ”پہلے اس لیے نہیں بتایا کہ بتانے کا صحیح وقت نہیں آیا تھا لیکن آج میں تم کو سب کچھ بتاؤں گی۔ تمہارے ہر اُس سوال کا جواب تمہیں ملے گا جو تمہارے دل میں سرائٹا تھا۔“ ثمینہ نے کافی کے گگ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”پھر بتائیں کس نے میرے بابا جان پر ظلم کیا تھا۔“ ماویٰ نے بے قراری سے کہا۔
 ”جنت بی بی نے۔“ ثمینہ نے زہر بھرے لہجے میں کہا۔
 ”تمہاری بابا پر ہوئے ہر ظلم کی ذمہ دار وہی عورت تھی حتیٰ کہ انہیں قتل بھی اسی نے کیا تھا۔“
 کافی کی سطح سے اٹھتی ہوئی بھاپ ان دونوں ماں بیٹی کے درمیان پردے کی طرح تن گئی تھی۔ ماویٰ کو ثمینہ کا ہاتھ دھندلا دکھائی دینے لگا تھا۔
 (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ایک مقدمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

زندگی کا ہے کوہِ خواب سے دیوانے کا

خلق کہتی ہے جسے دل تیرے دیوانے کا

ایک گوشہ ہے یہ دنیا، اسی دیرانے کا

غمر قصہ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں

راز کو نہیں، خلاصہ ہے اس افسانے کا

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلے ہوئے رنگ

آؤ دیکھو نا! تماشا میرے غم خانے کا

دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں

سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے یہاں کے

ہڈیاں ہیں کٹی لپٹی ہوئی زنجیروں میں

لیے جاتے ہیں جتنا زہ تیرے دیوانے کا

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی

زندگی نام ہے مَر کے جسے جانے کا

فانی بدلیونی

ان سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے

کبھی تم بھی سستو، یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے

یہ ٹھٹھرتی ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں

یہ خامشی آواز نہا کچھ کہتی ہے

سب اپنے گھروں میں لمبی تان کر سوتے ہیں

اور دُور کہیں کوئل کی صدا کچھ کہتی ہے

جب صبح کو چڑیاں بادی بادی بولتی ہیں

کوئی ناما فوسس اداس نوا کچھ کہتی ہے

جب رات کو تارے بادی بادی جاگتے ہیں

کئی ڈوبے ہوئے تاروں کی ندا کچھ کہتی ہے

کبھی بھورے بٹے، کبھی شام پڑے، کبھی رات گئے

ہر آن بدلتی رت کی ہوا کچھ کہتی ہے

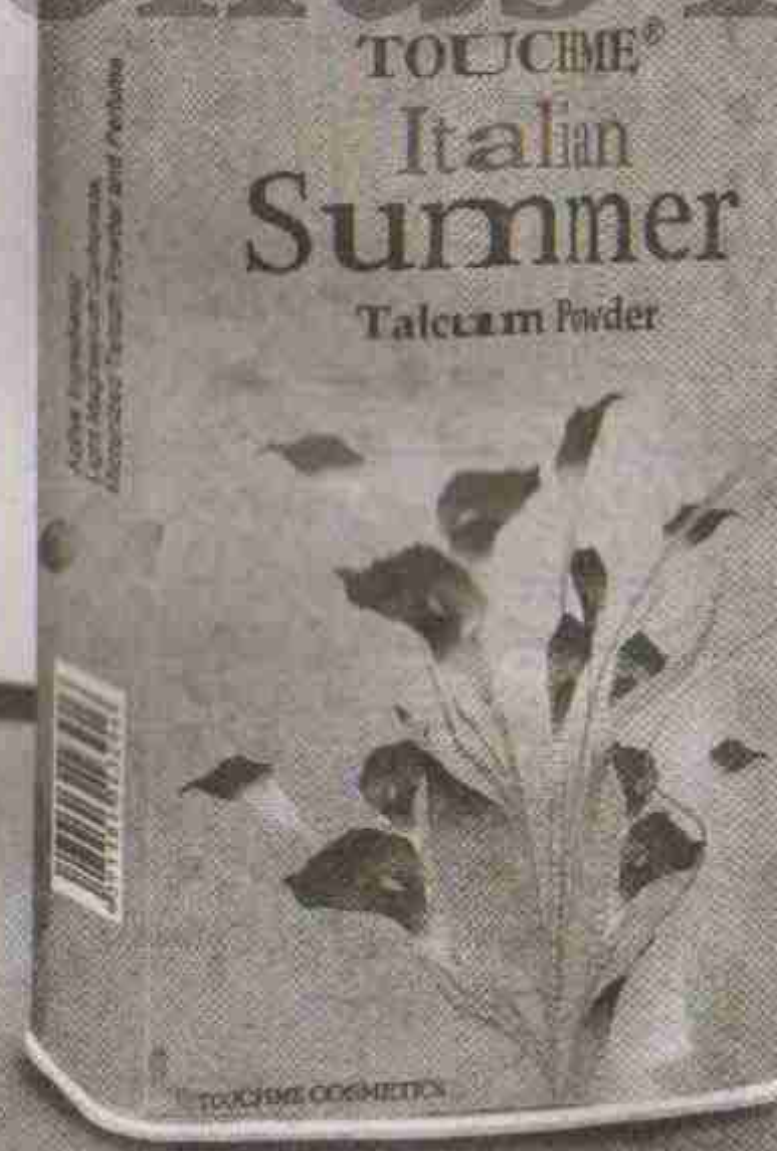
ناصر آشوب زمانہ سے غافل نہ رہو

کچھ ہوتا ہے، جب خلق خدا کچھ کہتی ہے

ناصر کاظمی



INTRODUCING
TOUCHME®
Italian
Summer
Talcum Powder



اٹالین خوشبو سے بھری زندگی

feel the freshness of Summer...

پاکستان میں پہلی بار۔۔۔

کھو کے اس کو جہاں کے میلے میں
ہم بہت روئے تھے اکیلے میں

اس کی خوشبو کی چاپ سنتے ہی
پھول کھلنے لگے تھے سیلے میں

مجھ سے وعدہ کیا ہے ملنے کا
اس نے امتدگان کے میلے میں

آؤ ڈھونڈیں کہاں گیا سورج
شام کے سرمئی جھیلے میں

اس سے کہنا کہ ٹوٹ آئے وہ
بات کرنا مگر اکیلے میں

اس کے چھوٹے ہی ہوش کی ناؤ
بہہ گئی خوشبوؤں کے ریلے میں

نعمان ناروق

سنو! اک بار پھر سے
پیار کا آغاز کرتے ہیں
نہ میں تم کو
تمہاری بے وفائی یاد دلاؤں گا
نہ تم مجھ کو
میری پچھلی خطاؤں پر سزا دوگی

کوئی وعدہ
کوئی پیمانہ جھوٹا
اب نہیں ہوگا

میں فوراً ٹوٹ آؤں گا
مجھے تم جب سزا دوگی
یہ تعلق ٹوٹ جانے سے

بہت تنہا رہا ہوں میں
تمہارا دل بھی روتا تھا
مجھے سب نے بتایا ہے

ہماری بے وفائی نے
ہمیں کتنا ستایا ہے
محبت یاد آئے تو

پلٹ کر ٹوٹنا سیکھو!
گرا کر بت اناؤں کے
آنا کو ٹوٹنا سیکھو!

تعلق ٹوٹ جائے تو
اُسے پھر جوڑنا سیکھو!
سنو!

اک بار پھر سے
پیار کا آغاز کرتے ہیں

ابن اس

اسی جگہ

جارج اور ہنری دونوں شکاری تھے۔ انہوں نے افریقہ جا کر گنڈے کے شکار کا فیصلہ کیا اور ایک چارٹرڈ طیارہ کروا کر افریقہ کے جنگل پہنچ گئے وہاں انہوں نے دو گنڈوں کا شکار کیا اور انہیں ریتوں سے باندھ کر گیسٹے ہوئے جہاز کے قریب پہنچ گئے اور پائلٹ سے مطالبہ کیا کہ انہیں جہاز پر سوار کرانے میں ان کی مدد کرے۔

پائلٹ نے ان سے کہا کہ میں دو گنڈوں کو جہاز پر سوار کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ کیونکہ اس میں حادثے کا خطرہ ہے۔

جارج اور ہنری نے کہا کہ ہم پچھلے سال بھی یہاں آئے تھے اور وہی گنڈے شکار کیے تھے۔ مگر پچھلے سال والے جہاز کے پائلٹ نے تو انہیں لے جانے میں کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

پائلٹ نے جواب دیا کہ شکار پائلٹ تیار ہو گیا اور دونوں گنڈوں کو جہاز میں سوار کروا کے جارج اور ہنری کے ساتھ جہاز کو اڑا دیا۔

جہاز صرف چند کلومیٹر اگے بڑھا اور پھر دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

ہنری نے سر اٹھا کر جارج کو دیکھا اور بولا۔
"جارج! پچھلی بار بھی ہم اسی جگہ پر گرے تھے ناں؟
شہناز شانزے سیال۔ خانیوال

ازدواجیات

بنو گھر بھونگڑے کے دوران شوہر نے شکوہ کیا۔
"گھر آئے پر مجھے کبھی تازہ کھانا نہیں ملتا۔"

"اتنے ناشکرے نہ بنو۔۔۔ بیوی تڑپ کر بولی۔
"ابھی کل ہی تو ہم نے رات کے کھانے کے ساتھ

اُبلایا ہوا انڈہ کھایا تھا۔ کیا وہ باسی تھا؟
بیوی نے اخبار پڑھتے ہوئے افسوس زدہ لہجے میں

کہا۔

"یہ خبر برمی تم نے؟ اخبار میں لکھا ہے کہ افریقہ میں ایک شہر ایسا ہے جہاں آپ صرف بیس ڈالر

میں اپنے لیے بیوی خرید سکتے ہیں۔
شوہر نے گنڈی ماس لے کر کہا۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے، ہم ناچار منافع خودی کی دیا

تو دنیا کے ہر کونے میں پہنچ چکی ہے۔
شوہر ناشتے کی میسر پر اخبار پڑھ رہا تھا۔ بیوی

گھبراہٹی ہوئی آئی اور بولی۔
"میں نے تم سے کتنی مرچہ کہا تھا کہ میری سوئے

کی انگوٹھی میری انگلی میں ڈرا ڈھیلی ہے۔ کسی سنا سے ٹھیک کر کے لا دو مگر تمہارے کان پر

جول تک نہیں رہی۔ آخر وہ کہیں گر گئی۔ میں تو اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی ہوں۔"

شوہر نے اخبار سے نظر اٹھا کر بغیر ہر سکون لہجے میں کہا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کل میں نے دفتر سے آ کر جو پتلون الماری میں لٹکانی تھی، اس کی جیب سے مجھے وہ انگوٹھی مل گئی ہے۔"

شوہر نے حیرت اور غصے سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔
"کیا کہا؟ ایک اور نیا سوٹ لا کر دوں؟"

آخر تم نے مجھے کیا سمجھا ہوا ہے؟ کیا پیسے درختوں پر اگتے ہیں؟ میں اتنے پیسے کس طرح کماؤں کہ

بنت نمونہ سوٹ لا کر دوں۔۔۔
"یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔ بیوی نے بے نیازی سے

کہا۔ "میں معذور ہے، میں نے کبھی تمہارے کاروباری معاملات میں دخل نہیں دیا۔"

گیلانی سسٹرز۔ کھرڈ پکا
افسوس

ایک صاحب اپنے دوست کے لیے حواہیر ایک

اشیج ڈراما دیکھنے چلے گئے۔ رات میں ایک سے ایک حسینہ آکر ایک کئی راتی گھر ہر جگہ کود دیکھنے کے بعد وہ صاحب بھی کہتے رہے۔

"لعنت ہے۔"

آخر دوست سے رہا گیا۔ اس نے کہا۔
"کمال ہے یا! یہاں حسین سے حسین لڑکیاں دیکھنے

کو مل رہی ہیں اور تم پھر بھی کہہ جا رہے ہو، لعنت ہے! وہ صاحب بولے۔
"میں ان حسیناؤں کے بارے میں

نہیں، اپنی بیوی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

افقی ناصر۔ کراچی

تاخیر

بیٹے نے باپ کے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا حال ہیں ڈیڈی! میں ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا کہ ڈیڈی کو سام کرنا چلوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں بیٹا، باپ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔
"تھوڑی دیر پہلے تمہاری مٹی بھی ادھر سے گزر

رہی تھی۔ انہوں نے بھی سوچا کہ مجھے سلام کرنی چاہیے۔ سارے پیسے وہ لے گئی ہیں۔"

بھلائے ظفر۔ لاہور

ہاں یا نہیں

دفتر 302 کے مقدمات کا شہرت یافتہ وکیل قتل کے مقدمہ میں مایوز ملزم پر بری سخت جرح کر رہا

تھا۔ پہلے تو خوب گونجی گئی اور پھر اس سے کوئی۔
اوٹ پٹانگ سوال کرتا اور جب ملزم جواب دینے

کے لیے منہ کھولتا تو وکیل کرائی ہوئی آواز میں اسے گونجتے ہوئے کہتا۔

"ہیں میں زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ میں ہاں یا نہیں میں مختصر جواب چاہتا ہوں۔"

ملزم بے چارے نے پہلے تو ضبط کرنے کی کوشش کی لیکن جب میری جوتی مرتبہ اسے ٹوکا گیا تو وہ جھنجھلا کر بولا۔

"جناب! یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر بات کا جواب ہاں یا نہیں میں دیا جائے۔ بہت سی باتیں ایسی بھی تو

ہو سکتی ہیں جن کا جواب ہاں یا نہیں میں دیا ہی نہیں جاسکتا۔"

یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ وکیل نے جواب دیا۔

"تم مجھ سے کوئی سوال کر کے دیکھو۔ میں تمہیں ہاں یا نہیں میں جواب دوں گا۔"

"بہت بہتر جناب! ملزم بولا۔ اور پھر ایک لمحہ سوچے بغیر اس نے کہا۔

"ہاں تو قبلہ افواہ بتائیے کہ کیا آپ بھی اپنی بیوی کو مارنے چاہتے ہیں؟"

اسیہ جاوید۔ علی پور چیتھ

دلیل

کسی ہوٹل میں ایک خرگوش اور شیر داخل ہوئے۔ کچھ دیر توقف کے بعد دونوں ایک خالی میسرے کے گرد

گرمیوں پر بیٹھ گئے۔ بیڑا آیا اور بڑے مؤدب انداز میں بولا۔

"فرمائے جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ خرگوش نے کان کھایا اور آٹکھ بچ کر کہا۔

"بھائی! میرے لیے تو ایک گھٹی سلاد لے آؤ اور دیکھو ساتھ انڈے زنڈے نہ ہوں۔"

بیسرے نے سوالیہ نظروں سے خرگوش کی طرف دیکھا پھر بولا۔
"اور آپ کے دوست کیا پسند فرمائیں گے؟"

"کوئی نہیں! خرگوش نے جواب دیا۔
"ہاں! میں جوتی نہیں ہے؟"۔ بيسرے نے پھر سوال

کیا۔
"خرگوش مسکرا کر بولا۔ "میں تو بے ضرر ہوں۔"

اگر یہ ہو کے ہوتے تو بھلا میں ان کے ساتھ کیسے یہاں پہنچ پاتا؟"

عطی غلام نبی۔ کراچی

درخواست

برما فٹ پر دلعل سے لبریز ایک علاقے میں رائیل انجنیئرز کوہ کے آفیسر اجازت سے اپنے ایک

لیفٹننٹ کوہرک تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ لیفٹننٹ نے جگہ کا معائنہ کرنے کے بعد کرنل کی خدمت میں رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"جناب! دلل قدام گہری ہے اور اس پر ہر طرح تعمیر نہیں کی جاسکتی۔"

"حکومت! کرنل نے گرج کر کہا۔ "جس چیز کی ضرورت ہو، لکھ کر دو۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ تمہاری تحریر رپورٹ

رپورٹ کرنے پر میں ضرورت کی چیزیں ہتیا کر کے دوں گا۔"

White Beauty

وائٹ بیوٹی

جڑی بوٹیوں کے حسین امتزاج سے
تیار کردہ ہرمل ایکشریکٹ میں بھی دستیاب ہے
صفائی کے ساتھ ساتھ جلد کو بنائے
بے بی سوفٹ



Free Hair Remover Cream & Lotion

For inquiry
Contact: 0300-1234567

”میری جلد پری! تم کتنی سوٹ ہو“
”ہوی بولی“ میں جاتی ہوں تم مجھے یہ خطاب کیوں
دے رہے ہو۔ کیونکہ میں دو گھنٹے سٹنگھا۔ مینو پر گزار
کر آئی ہوں“
”شوہر نے کہا“ نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں سبیل
افغانستان میں گزار کر آیا ہوں“
عابدہ منشا۔ کراچی

مشورہ

آج بھائی منکر و ادیب برنارڈ شا کے پاس ایک
افسانہ نویس اپنا افسانہ لے کر گیا اور کہا۔
”میرا یہ افسانہ پڑھ کر لٹے دیں۔ میں نے ایسے
کئی افسانے لکھ کر انسانی میں لکھے ہوئے ہیں“
برنارڈ شا نے افسانہ پڑھا اور مسودہ افسانہ نویس
کو فونے سے جڑا۔
”اسے بھی الماری میں دوسرے افسانوں کے ساتھ
لکھ دو“
برنارڈ شا۔ فیصل آباد

مہارت

انور صاحب اپنے دوست جمال صاحب کو اپنی
مورٹرائیکل پر مجھے جگا کر دوات ہوئے تو جمال صاحب کا کھرا نہیں تھے
کیونکہ وہ مورٹرائیکل پر سفر کرنے کے عادی نہیں تھے۔ انور صاحب
نے جتنی دقت اری ہے ایک شارع پر مورٹرائیکل کو
دوڑاتے ہوئے اونچی آواز میں جمال صاحب کو تسلی دی۔
”آپ کو گھبرانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔
میں دن میں کئی مرتبہ اس سڑک پر کہاں کہاں گزرا
ہے“
عین اسی وقت مورٹرائیکل ایک گڑھے سے گزری
اور بڑی طرح اٹھلی۔ جمال صاحب گرتے گرتے بچے۔
انور صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔
”اور یہ انہی گڑھوں میں سے ایک گڑھا تھا“
نمرہ، اقسرا۔ کراچی

لیفٹنٹ سیلوٹ کر کے اپنے خیمے میں چلا گیا۔
”توڑی دیر بعد کرنل کو ایک چٹ ٹی۔ جس پر لکھا تھا۔
”دلدار دالے علاقے میں سڑک تعمیر کرنے کے لیے
سولہ سولہ فٹ کے دس سپاہی مہیا کر دیجیے تاکہ تعمیرات
کا کام شروع کیا جاسکے“
غدا ناصر۔ کراچی

سوال

عید میلے پر ایک بچہ مرے ہوئے بچے نے پنڈال
کے باہر سپاہی کو روک کر کہا۔
”آپ نے میری امی کو میرے بغیر کہیں جاتے ہوئے
دیکھا ہے“
نمل، زینب کراچی

غریب

تین بچیاں اپنے وجود میں آنے کا واقعہ بیان کر
رہی تھیں۔
”پہلی نے کہا“ مجھے تو ڈاکٹر صاحب لے کر گئے تھے
دوسری نے کہا“ اتنی نے مجھے دیکھ کے ہاں سے
فریاد تھا“
تیسری نے کہا“ میری امی بے چاری عذاب میں
انہوں نے مجھے گھر پر ہی بنالیا تھا“
نادیرہ۔ گجرات

بے اعتبار

ایک لڑکی اپنی سہیلی کو بتا رہی تھی۔
”مردوں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ آج سے
میں نے قسم کھائی ہے کہ طارق کا منہ نہیں دیکھوں گی
اور مردوں پر کبھی اعتبار نہیں کروں گی“
”آخر ہوا کیا؟“ دوسری سہیلی نے پوچھا۔ کیا طارق
کو کسی دوسری لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا ہے؟“
”نہیں۔ بلکہ طارق نے مجھے دوسرے لڑکے کے ساتھ
دیکھ لیا ہے۔ جبکہ وہ مجھے کل بتا کر گیا تھا کہ وہ کراچی
جا رہا ہے“
عائشہ امین۔ کراچی

وجہ

ایک دوسری فوجی جی پر گھر گیا تو اپنی بد شکل
ہوی کو دیکھتے ہی کہنے لگا۔



شکفتہ جاہ

ماہنامہ شمع

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ اُمّ المؤمنین حضرت سودہ بنت زمعہ راست کے وقت باہر نکلیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں دیکھ لیا اور پہچان گئے۔ کہنے لگے۔
”اے سودہ! اللہ کی قسم! تم سے نہیں چھپ سکتیں۔“
جب حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا واپس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر کیا۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میرے چچے میں شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ میں گوشت کی ہڈی تھی۔ اسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونا شروع ہوئی اور جب قرآن وحی کا سلسلہ ختم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”تمہیں اجازت دی گئی ہے کہ اپنی ضروریات کے لیے باہر نکل سکتی ہو۔“
تقریباً۔

آج کے دور نازک میں ضروریات زندگی اور معاشی جدوجہد اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اکثر مواقع پر عورتوں کا گھر سے نکلنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے اس بارے میں تنگی نہیں رکھی۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ شرعی حدود میں پردہ کر کے عورتیں باہر نکلیں۔
(صحیح بخاری۔ جلد ششم۔ حدیث نمبر 5257)

مومن کی اہمیت،

حضرت ابوالحسن بہت عفتہ میں بھی شریک ہوئے تھے اور جنگ بدر میں بھی۔ وہ فرماتے ہیں۔
ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی کھڑا ہو کر کہیں چلا گیا اور اپنی جوتیاں وہیں بھول گیا۔ ایک آدمی نے وہ جوتیاں اٹھا کر اپنے نیچے رکھ لیں۔ وہ آدمی واپس آ کر کہنے لگا۔

”میری جوتیاں کہاں ہیں؟“

لوگوں نے کہا۔ ”تم نے تو نہیں دیکھیں۔“

پھر اس کے بعد جس آدمی نے وہ جوتیاں چھپائی تھیں، اس نے کہا۔

”میں جو تھیل“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”مومن کو پریشان کرنے کا کیا جواب دو گے؟“

اس آدمی نے کہا۔ ”میں نے تو مذاق میں چھپائی تھیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو تین بار یہی فرمایا۔

”مومن کو پریشان کرنے کا کیا جواب دو گے؟“

جو لوگ بے گناہ اور معصوم مسلمانوں کو شہید کرتے ہیں ان پر ہتھیار اٹھاتے ہیں، اپنا انجام سوچیں۔

ماں کی دعا،

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا۔

”جنت میں میرے ساتھ کون ہوگا؟“

ارشاد ہوا۔ ”فلاں قصاب بھی تیرے ساتھ ہوگا۔“

آپ کچھ حیران ہوئے اور اس قصاب کی تلاشی میں چل پڑے۔ وہاں دیکھا تو ایک قصاب (بڑی دکان میں گوشت بیچنے میں مصروف تھا۔ اپنا کام باختم کر کے اس نے ایک گوشت کا ٹکڑا کپڑے میں لپیٹا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قصابی کے بارے میں مزید کچھ جاننے کے لیے بطور مہمان گھر چلنے کی اجازت چاہی۔

گھر پہنچ کر قصابی نے گوشت کو دیکھا پھر روٹی پکا کر اس کے ٹکڑے شوربے میں نرم کیے اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں ایک انتہائی کمزور بڑھیا

بلنگ پریشی ہوئی تھی۔ قصاب نے بمشکل تمام اس بڑھیا کو سہارا دے کر اٹھایا۔ ایک ایک لقمہ اس کے منہ میں دیتا رہا۔ جب اس نے کھانا تمام کیا تو بڑھیا کا منہ صاف کر دیا۔ کھانا کھا کر بڑھیا نے قصاب کے کان میں کچھ کہا۔ جسے سن کر قصاب مسکرا دیا اور بڑھیا کو واپس لٹا کر باہر آ گیا۔

آپ نے قصاب سے پوچھا۔

”یہ عورت کون ہے اور اس نے تیرے کان میں کیا کہا؟“

قصاب بولا۔ ”اے اجنبی... یہ عورت میری ماں ہے، گھر پر آنے کے بعد میں سب سے پہلے اس کا کام کرتا ہوں تو خوش ہو کر روز مجھے یہ دعا دیتی ہے کہ

اللہ تعالیٰ تجھے جنت میں حضرت موسیٰ کے ساتھ رکھے جس پر میں مسکرا دیتا ہوں کہ بھلا میں کہاں اور موسیٰ کون اللہ کہاں؟“

حضرت الطاف احمد گرامی

جواہر پارے،

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

”یہ محبت دیکھو کہ کون بات کر رہا ہے بلکہ دیکھو کہ کیا بات کہہ رہا ہے۔“

آپ نے مزید فرمایا۔

”ہر بھائی چارہ ختم ہو جاتا ہے، صرف وہی بھائی چارہ باقی رہتا ہے، جو لالچ کے بغیر ہو۔“

غزوہ، اقرامہ، کراچی

ایمان کامل،

حضرت سعد بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ

حضرت زبیرؓ دومی باندی تھیں۔ وہ مسلمان ہوئیں تو ان کی بیٹائی باقی رہی۔ اس پر مشرکوں نے کہا۔

”ہمارے بتوں (لات و عزی) نے انہیں اندھا کر دیا ہے۔“

حضرت زبیرؓ نے کہا۔ ”انہوں نے (لات و عزی) نے نہیں کیا۔ میں لات و عزی (کے معبود ہونے) سے انکار کرتی ہوں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی واپس لوٹا دی۔“

نیت پر انحصار ہے،

حضرت عاصم بن عمر بن قتادہؓ فرماتے ہیں کہ ہم

لوگوں میں ایک پرولسی آدمی رہتا تھا۔ اسے کوئی جانتا نہ تھا۔ لوگوں سے ہرگز اسے قاتل کہتے تھے۔ جب بھی اس کا تذکرہ ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذمت لیتے تو دوزخ والوں میں سے ہے۔“

جنگ احد کے دن اس نے خوب زور و شور سے لڑائی لڑی اور اکیلے ہی سات آٹھ مشرکوں کو قتل کر ڈالا۔ وہ بڑا بہادر اور جنگ بونٹا تھا۔ آخر وہ زخموں سے نڈھال ہو گیا تو اسے بنو قریظہ کے محلے میں اٹھا کر لایا گیا تو بہت سے مسلمان اس سے کہنے لگے۔

”اے قریمان! آج تو تم بڑی بہادری سے لڑے ہو۔ تمہیں خوش خبری ہو۔“

اس نے کہا۔ ”مجھے کس چیز کی خوش خبری؟“

اللہ کی قسم! میں نے تو صرف اپنی قوم کی تادموری کے لیے لڑائی لڑی ہے۔ اگر میرا مقصد یہ ہوتا تو میں بھی نہیں لڑتا۔“

چنانچہ جب اس کے زخموں کی تکلیف بڑھ گئی تو اس نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور خود کشی کر لی۔

پردہ پوشی،

ایک شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی کے عیب بیان کر رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے منع فرمایا تو کہنے لگا۔

”میں اس کے عیب بارے میں خبر کو بتانا چاہتا ہوں تاکہ لوگوں کو بتا سکوں کہ اس کو آپ بہت معزز اور شریف سمجھتے ہیں، اس میں کس عیب ہیں؟“

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ ”بے عیب صرف اللہ تعالیٰ ذات اور ہمیں کسی بھی شخص کے ان عیبوں کی تشہیر نہیں کرنا چاہیے، جن پر خود اللہ تعالیٰ پردہ ڈال رہا ہو۔“

عائشہ، تحریم، گوجرہ

عظمت و سادگی،

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ ”میں نے ایک مرتبہ زمانہ خلافت میں حضرت عمر فاروقؓ کو دیکھا کہ انہوں نے اپنے دونوں کندھوں کے درمیان ادھر بیچے تین بیونڈ لگا رکھے تھے۔“

نہ، نقد، کراچی

اقوال زریں،

کسی کی حوصلہ شکنی نہیں کرنی چاہیے۔ کیا خبر کہ اپنی

لمبے لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔

MEDICAM SHAMPOO



وہی **Plum** کی خوبیوں کے ساتھ



آملہ، ریٹھا، سکا کائی اور کنڈیشنر سے لمبے گھنے اور چمکدار بال

فرماتے ہیں۔ میں قافلے کے ہمراہ ملک کشام جا رہا تھا۔ راستے میں ڈاکوؤں کی جماعت نے ہمیں لوٹ لیا اور سارا مال و اسباب اپنے سردار کے سامنے ڈھیر کر دیا۔ سلمان میں سے ایک شکر اور باطمینان کی بھٹی نکلی۔ سارے ڈاکوؤں نے نکال کر کھانا شروع کر دیا۔ مگر ان کے سردار نے ان میں سے کچھ نہ کھایا۔ میں نے پوچھا۔

”سب کھا رہے ہیں مگر آپ جو ان کے سردار ہیں، کیوں کچھ نہ کھایا؟“
اس نے کہا۔ ”میں روزے سے ہوں۔“
میں نے حیرت سے کہا۔ تم لوٹ مار بھی کرتے ہو اور روزہ بھی رکھتے ہو؟“
سردار بولا۔ ”اللہ سے صلے کے لیے بھی تو کوئی راہ باقی رکھنی چاہیے۔“

حضرت سیدنا اہلی فرماتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد میں نے اسی ڈاکو کو احرام کی حالت میں طواف خانہ کعبہ میں مشغول دیکھا۔ اس کے چہرے پر عبادت کا نور تھا اور عبادت نے اسے کمزور کر دیا تھا۔
میں نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔ ”کیا تم وہی شخص تہیں ہو؟“
وہ بولا۔ ”جی ہاں وہی ہوں اور سنئے۔ اسی روزے نے اللہ کے ساتھ میری صلح کرادی ہے۔“
تمرین شہزادی۔ مملتان

عظیم لوگوں کی عظیم باتیں

طبع کے تین حرف تینوں ہی خالی ہیں۔ کسی میں فقط نہیں۔ مطلب یہ کہ طبع سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔
(حضرت ابن یمن خراسانی د)

۱۔ دلی زبان کی کیفیت ہے، اس سے ابھی باتوں کی تخم ریزی کرو۔ دانے سب نہ اگیں گے تو کچھ نہ کچھ ضرور اگیں گے۔ (امام شافعی ر)

۲۔ لوگوں کے لیے غائبانہ دعا کرنا ان کی ملاقات سے بہتر ہے کیونکہ ملاقات میں کبھی غمناش اور ریا پیدا ہو جاتا ہے۔ (حضرت اویس قرنی)

۳۔ جو گناہ کا مرتکب ہو اسے آدمی سمجھو۔ جو گناہ کر کے نادم پشیمان ہو اسے دلی سمجھو اور جو گناہ کر کے اترائے اسے شیطان سمجھو۔ (گوردانک)

صائمہ جیمی۔ کراچی

آخری امید لے کر مل رہا ہوں۔
کسی چیز کو اتنا اہمیت تراشو کہ اس کا وجود ہی مٹ جائے۔
جو بات دانتوں میں دھکے لگا رہی ہو، اسے پھر دوستوں سے بھی چھپا کر رکھو۔ کیونکہ دنیا میں کل کا دشمن آج کا دوست اور آج کا دوست کل دشمن کی لائن میں بھی ہو سکتا ہے۔
کچھ لوگ ہماری زندگی میں نگاہ کی طرح ہوتے ہیں۔ اگر وہ ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیرے میں راستہ مل جاتا ہے۔
سونیا ربانی۔ قاضیاں محلہ بالا

موتی مالا

۱۔ اگر آپ تیس برس کی عمر میں طاقت و راوی چاہیں بریں میں عقل مند نہیں بنے تو آپ کبھی عقل مند اور طاقت ور بننے کی امید مت رکھیں۔

۲۔ لوگوں کو ہماری ضرورت نہیں بلکہ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ہم ان کے لیے کسی حد تک مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

۳۔ قوانین کی کثرت یہ ظاہر کرتی ہے کہ کیا تو بادشاہ بہت جاہل ہے یا مدعا ہی بے لگا ہے۔

۴۔ خاموش رہنا اور بے وقوف شمار ہونا۔ بول کر تمام شبہات کو دور کرنے سے بہتر ہے۔

۵۔ خاموش رہو اور بولنا سیکھو۔ آنکھیں بند کرادو دیکھنا سیکھو۔

۶۔ ان اسرار سے پردہ ہٹانے کی کوشش نہ کرو خدا کی ذات سے متعلق ہوں۔

۷۔ اللہ آسمان پر ہے اور اس کے نور کا عکس زمین پر۔ جو لوگ اس کا وظیفہ بجا لاتے ہیں وہ ان کے قریب تر ہے۔

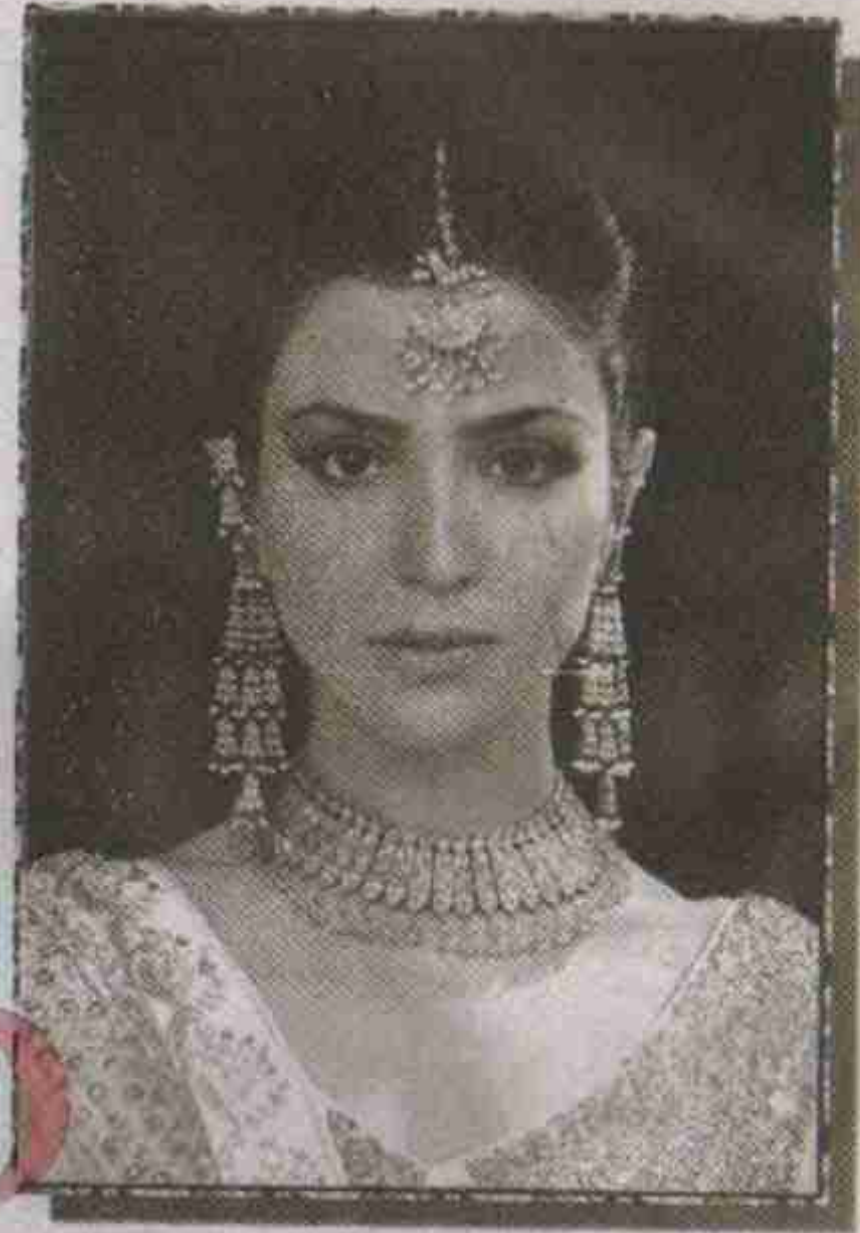
۸۔ اللہ تعالیٰ کا ناشکر گزار نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی ناراضی تجھے بڑی آفت میں مبتلا کر دے۔

۹۔ قناعت کی نسبت صاف گوئی زیادہ مؤثر ہے۔ یاد رکھو کہ نیک اعمال کے سوا دنیا و آخرت میں تمہارا کوئی مددگار نہیں۔

رضوانہ شکیل۔ لاہور۔ لودھراں

روزہ دار ڈاکو

روحی الریامین میں ہے حضرت سیدنا ابوبکر رضی



سکتا۔
”جب شعیب منصور نے تم سے رابطہ کیا اور مرکزی کردار کے لیے آفر دی تو کیا احساسات تھے؟“
”بہت زیادہ خوشی تھی پیرزمن پر نہیں لگ رہے تھے مگر میں نے پھر بھی سب سے مشورہ لینا ضروری سمجھا۔ سب سے مراد اپنے گھروالے اور جب میں نے گھروالوں کو بتایا کہ مجھے شعیب منصور صاحب نے آفر دی ہے تو سب کا ایک ہی جواب تھا کہ آنکھیں بند کر کے ہاں کرو۔ سوچو بھی مت۔“
”پھر یو سی تو نہیں ہوئی؟“
”ارے نہیں بلکہ میرے لیے تو یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ انہوں نے مجھے کال کی میرا انتخاب کیا۔ بس اب آپ لوگ بتائیں گے کہ میری پرفارمنس کیسی ہے۔“
”یہ پہلی آفر تھی یا اس سے پہلے بھی کوئی آفر آچکی

دستک دستک شاہین رشید

ہے؟“
”اس سے پہلے مجھے پاکستان میں ہی فلموں میں کام کرنے کی آفر ہوئی۔ لیکن آپ کو پتا ہی ہے کہ ہماری انڈسٹری کس قدر زوال پذیر ہے اسی وجہ سے فیملی کی طرف سے فلم میں کام کرنے کی اجازت نہیں ملی لیکن شعیب منصور جیسے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کو بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔“
”پروڈیوسر ڈائریکٹر اور رائٹر کیونکہ ”بول“ کے رائٹر بھی شعیب منصور ہی ہیں۔“
”جی جی بالکل قدرت نے انہیں بہت سی

”کیسی ہو۔؟ اور فلم ”بول“ اور ڈرامہ سیریل ”کبریٰ اصغری“ کی کامیابی پر مبارکباد قبول کرو۔“
”تھینک یو شاہین! میں بہت خوش ہوں اپنی فلم کی کامیابی پر۔ پہلی فلم اور وہ بھی اتنی کامیاب جہاں تک ڈراموں کی بات ہے تو ڈرامے تو اللہ کا شکر ہے سب ہی پسند کرتے ہیں۔“
”پہلی فلم اور اتنی کامیاب۔ امید تھی؟“
”بالکل تھی کیونکہ شعیب منصور جیسے باصلاحیت لوگوں کی ناکامی کے بارے میں تو کوئی سوچ بھی نہیں

صلاحیتوں سے نوازا ہے۔“
”تم جیسی اسٹارٹ اور خوب صورت لڑکی کو انڈیا والوں نے بلایا۔“
”دیکھیں اس بارے میں میں ابھی کچھ بھی نہیں کہہ سکتی جب تک کچھ فائنل نہ ہو جائے وقت اور حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس لیے بہتر ہے کہ انسان سوچ سمجھ کر ہی کوئی بات کرے۔“
”پھر بھی اگر موقع ملا تو؟“
”ظاہر ہے کہ اچھے مواقع کون ضائع کرتا ہے۔ لیکن اچھی آفر ہی قبول کروں گی چھوٹی موٹی آفر قبول نہیں کروں گی۔“
”میں نے جب تمہارا انٹرویو کیا تھا ”پیا کا گھر پیارا گے“ کے حوالے سے تو شمعون کو تم نے ایک اینڈیل انسان بتایا تھا پھر اچانک فاصلے کیوں بن گئے؟“
”بالکل کہا تھا مجھے یاد ہے اور میں نے شمعون کو بہت چاہا اور شمعون کے حوالے سے جتنے بھی ریلیشن تھے سب کو نبھایا مگر بس قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا اور یہ رشتہ ختم ہو گیا سب قسمت کے کھیل ہیں انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔“
”پھر آئندہ کے لیے کیا ارادے ہیں؟“
”ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی فی الحال تو اپنے کیریئر پر توجہ دے رہی ہوں۔ تمہاری اسٹارٹنس کو دیکھ کر بہت سی لڑکیوں کو رشک آتا ہے کیا کرتی ہو؟“
”یہ سب قدرتی ہے میں اسٹارٹ رہنے کے لیے کچھ نہیں کرتی۔ مجھے کھانے پینے کا شوق ہے اور میں اپنی پسند کی ہر چیز کھاتی ہوں۔ آپ کو پتا ہے کہ میں پنجابی ہوں اور پنجابی کھانے پینے کے شوقین ہوتے ہیں۔ تو بس۔ قدرت مہربان ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کھانے سے ہاتھ کھینچنے کی ہاں اگر کبھی موٹی ہو گئی تو کچھ نہ کچھ کر لوں گی۔“
”کھانے پینے میں کیا پسند ہے۔“
”سب کچھ پسند ہے پانی بہت پیتی ہوں چائے

بہت پسند ہے خاص طور پر ڈھابے کی چائے بھی اس کا تو مزایا کچھ اور ہے دھبہ پتی کی چائے بھی بہت پسند ہے۔“
”اپنی پسندیدہ عادت؟“
”سب کے لیے یونینوے میں سوچتی ہوں۔ کسی کی غیبت نہیں کرتی۔ کسی پر تنقید نہیں کرتی سب کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق ہے اس لیے کسی کی زندگی میں مداخلت بھی نہیں کرتی۔“
بلال مقصود
”کیسے ہیں بلال۔ آپ اور آپ کے دوست فیصل کیا ڈیا دونوں کو بہت شرت ملی ہے کیا محسوس کر رہے ہیں آپ؟“
”بہت اچھا بہت محبت دیتے ہیں لوگ اور لوگوں کی پذیرائی سے ہی ہم میں آگے بڑھنے کی ہمت آتی ہے۔“
بلال! آپ کو اپنے والد کی وجہ سے بھی اس فیلڈ میں آنے کی آسانی ہوئی ہوگی؟“
”بے شک والد صاحب کا بہت بڑا نام ہے لیکن آپ جانتی ہیں کہ اس فیلڈ میں ٹیلنٹ ہوتا ہے اگر ٹیلنٹ نہیں ہوگا تو آپ کتنے دن چل پائیں گے؟ ہم اپنے ٹیلنٹ اور جدوجہد کے ساتھ آگے بڑھے ہیں۔“
”کیا مطلب؟“
”مطلب یہ ہے کہ ہم سونے کا نوالہ لے کر پیدا نہیں ہوئے ہم نے بھی بہت مشکلات اٹھائی ہیں۔ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ میں ایک نامور فنکار کا بیٹا ہوں رکشوں اور بسوں میں اور پیدل بھی سفر کیا ہے۔“
”ملکی حالات کی خرابی نے لائیو شو پر اثر تو ڈالا ہوگا۔“
”بالکل ڈالا ہے۔ لوگ آتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی ہنگامہ نہ ہو جائے کوئی خدا خواستہ بم بلاسٹ نہ ہو جائے کتنی بھی سکیورٹی ہو لوگ آتے



ان کا تعلق سکھر سے جبکہ میری والدہ کا تعلق کوئٹہ سے ہے۔

”والدین کی اکلوتی اولاد ہو گا پیارے بگاڑا؟“
”والدین کی بہترین تربیت کی وجہ سے میں بگڑی تو نہیں۔ ہاں ضدی ضرور ہو گئی، مگر ایسی کوئی خواہش نہیں کی جو کہ باعث ندامت ہو، اگرچہ والدین راضی نہیں تھے کہ میں اس فیلڈ میں آؤں، لیکن جب انہوں نے میرے شوق اور لگن کو دیکھا تو مجھے اجازت دے دی۔“

”ضدی لوگوں میں غصہ بھی ہوتا ہے، ایسا ہے کیا؟“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔۔۔ ضدی لوگوں میں غصہ واقعی بہت تیز ہوتا ہے، مجھ میں بھی غصہ ہے اور کافی تیز ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ میں بلاوجہ غصہ کروں، کوئی بات ہوتی ہے تو غصہ آتا ہے، ورنہ تو میں خوش مزاج ہوں، کسی کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“

”اپنی غلطی پر شرمندہ ہوتی ہیں؟“
”بہت زیادہ۔ اور پھر اپنے آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی۔“

آپ نے مجھے کال کی اور دیگر لوگوں کی طرف سے بھی بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے۔“
”کتنے سال ہو گئے ہیں تمہیں اس فیلڈ میں؟“
”تقریباً گیارہ سال۔ 2000ء میں میں نے اس فیلڈ میں قدم رکھا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے کامیابیوں کے راستے کھول دیے۔“

”اچھا۔۔۔ کس نے متعارف کرایا اس فیلڈ میں؟“
”کسی نے نہیں۔ اپنی صلاحیتوں سے آئی ہوں۔ ایک دن اخبار میں اشتہار آیا کہ ہمیں خوش شکل اور اسمارٹ ماڈلز کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی قسمت آزمائوں اور اپنی اسادیم بیج دیں چند دنوں کے بعد ہی بلاوا آ گیا۔“

”پہلا کام کیا کیا؟ اوراکاری یا ماڈلنگ؟“
”پہلا کام میگزین ماڈلنگ کی دو سرائے کام کرنا تھا۔ ماڈلنگ جو کہ ایک صابن کی تھی، تیسرا کام اوراکاری کا تھا اور یہ تینوں کام جاری ہیں۔ جس وقت میں اس فیلڈ میں آئی۔ اس وقت میں میٹرک کی طالبہ تھی۔“

”رمضان المبارک کی آمد آگے ہے۔ رمضان المبارک اور پھر عید اہتمام سے منائی ہوگی؟“
”بالکل جی۔۔۔ بہت اہتمام سے منائی ہوں۔ نماز روزہ کرنا، پھر اہتمام کے ساتھ عید منانا۔ مجھے سب بہت اچھا لگتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ دنیا میں سب سے اچھا مذہب ہمارا ہے، مگر کوئی اس پر عمل نہیں کرتا، اس کا افسوس ہوتا ہے۔“

”کیا آرٹسٹ کا پرہیز لکھا ہونا ضروری ہے یا بس واجبی سی تعلیم سے بھی گزارا ہو سکتا ہے؟“
”تعلیم تو ہر فیلڈ کے لیے بہت ضروری ہے، خواہ شوہر ہو یا کوئی اور، تعلیم ہی تو انسان کو شعور دیتی ہے۔“
”کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔ کچھ اپنی فیملی کے بارے میں؟“

”جی۔۔۔! میں 20 ستمبر 1984ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئی۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں، میں نے گریجویشن کیا ہے۔ مصروفیات کی وجہ سے مزید تعلیم حاصل نہ کر سکی۔ میرے والد کا نام آصف علی بیگ ہے۔“

بہت متاثر ہو گیا تھا تو والد صاحب سے کہا کہ میں میوزک کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے ابتدا میں تو منع کیا۔ لیکن میرا شوق دیکھ کر انہوں نے اجازت دے دی۔ تب فیصل اور میں نے اپنا میوزک گروپ ”اسٹرنگز“ کے نام سے متعارف کرایا۔“

”ابتدا میں تو مشکل ہوئی ہوگی؟“
”بالکل۔۔۔ ہر نئے کام میں مشکل ہوتی ہے اور ہمیں بھی ہوئی۔ اس وقت جی چینلز کا اجرا بھی نہیں ہوا تھا اور چونکہ بی بی وی ہی تھا تو پہلے اسے بی بی وی پر متعارف کرایا اور بس پھر آہستہ آہستہ مقبولیت ملتی چلی گئی۔“

”والد صاحب نے کہا نہیں کہ لکھنے کی طرف آ جاؤ۔“

”نہیں۔۔۔ کیونکہ لکھنا تو قدرتی صلاحیت ہوتی ہے اور مجھ میں یہ صلاحیت نہیں تھی۔ ہمارے گروپ کے لیے گانے بھی والد صاحب ہی زیادہ تر لکھ کر دیتے ہیں۔“

”اس میں کوئی شک نہیں کہ انور مقصود صاحب بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں، اچھے مصور، بہترین شاعر، رائٹر۔“

”بالکل جی۔۔۔ ہمارے خاندان کے سب ہی لوگ ماشاء اللہ ذہانت اور صلاحیتوں میں خود کفیل ہیں۔“

زینبا علی

”زینبا! کیسی ہیں۔۔۔؟ کافی عرصے کے بعد آپ اسکرین پر اور وہ بھی کسی ڈرامے میں نظر آرہی ہیں۔“
”اللہ کا کرم ہے۔۔۔ اور ایسا نہیں ہے کہ میں کافی عرصے کے بعد اسکرین پر آرہی ہوں۔ مختلف چینلز سے میرے پروگرام ہوتے رہتے تھے اور ڈرامے بھی کر رہی ہوں۔ چونکہ چینلز کافی ہو گئے ہیں تو اس لیے لوگوں کو یاد نہیں رہتا۔“

”آج کل ڈرامہ سیریل ”تم ہو کہ چپ“ میں تمہیں دیکھ رہے ہیں گیارہ سانس مل رہا ہے؟“
”رسپانس کا اندازہ تو آپ اس بات سے لگائیں کہ

ہوئے گھبراتے ہیں، خاص طور پر کراچی میں۔“
”آپ اتنے مصروف رہتے ہیں ملک سے باہر بھی آنا جانا لگتا ہے، ٹیکم اور بچے ڈسٹرب تو ہوتے ہوں گے۔“

”بالکل ہوتے ہیں، لیکن قسمت میں جس انداز میں رزق لکھا ہے، ہمیں جدوجہد کر کے اسے حاصل کرنا ہے اور اب تو خیر گھر والوں کو عادت ہو گئی ہے اس لیے زیادہ محسوس نہیں کرتے، لیکن جب ہم اپنے ملک میں ہوتے ہیں تو ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ گزاریں۔“

”خیر سے شادی کو کتنے سال ہو گئے اور بچے کتنے ہیں؟“

”1995ء میں میری شادی ہوئی اور ماشاء اللہ سے تین بچے ہیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔“
”پسند سے ہوئی تھی؟ اور کیا کچھ زیادہ جلدی نہیں ہو گئی آپ کی شادی؟“

”جی! پسند سے ہوئی۔ میری بیگم میرے ساتھ ہی پڑھتی تھیں۔ پسند کو رائج کر دیا اور ماشاء اللہ بہت اچھی زندگی گزار رہی ہے۔ اور جہاں تک جلدی کی بات ہے تو ہماری فیلڈ ایسی ہے کہ یہاں فیملی جلدی بنالینا چاہیے، ویسے بھی فیملی بن جائے تو بندہ ذہنی طور پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں تو کام کرنے میں زیادہ دل لگتا ہے کہ کچھ کرنا ہے۔ ذمہ داریوں کو نبھانا ہے۔“

”بیگم آپ کی طرح میوزک کی دلدادہ ہیں؟“
”کوئی خاص نہیں۔ بس سننے کی حد تک پسند ہے انہیں میوزک۔“

”میں اتنے دور میں خیالات بدلتے رہتے ہیں، کبھی کچھ بننے کی امنگ جنم لیتی ہے تو کبھی کچھ اور۔ آپ کے خیالات اس وقت کیا تھے؟“

”میں کائرس کا طالب علم تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں ٹیٹر بنوں۔ پھر اچانک ایک دن خیال آیا کہ نہیں کوئی اور فیلڈ ہونی چاہیے اس وقت میوزک سے

دل کی تیرہ سیڑھیاں

مریم، سائرہ صغیر احمد شریکوثر شریف
مجیب طرح سے سوچا تھا زندگی کے لیے
جیتنا مرنا تھا صرف اسی کے لیے
وہ مجھے کو تنہا چھوڑ گیا تو یقین آیا
کہ کوئی بھی نہیں مرنا کسی کے لیے
سعدیہ نانلی رانا
مجھے ناز ہے کہ میں حسین ہوں میرے گلستان کو زوال کیا
مجھے غریب ہے کہ میں عشق ہوں جو بلا نہ دوں تو کمال کیا
مجھے زندگی کی دعا نہ دے مجھے زندگی کی طلب نہیں
میری موت کو جو مال دے اس زندگی کی مجال کیا
سعدیہ، مریم
نہ ہم رہے دل لگانے کے قابل
نہ دل رہا نظم اٹھانے کے قابل
لگا جو بے وفائی کا زخم دل پر
نہ چھوڑا ہمیں کبھی مسکراتے کے قابل
عزیز عتیق الرحمن لاہور
لمحہ لمحہ دس رہا ہے ایک ہی لمحے کا درد
زندگی کو کھا گیا ہے ایک دن مرنے کا درد
تسے تھوڑے وقت میں کیا کیا کئے کی بھی
اتنی لمبی عمر میں کچھ بھی نہ کر سکتے کا درد
بہوش دو کر گورجراؤلہ
کیا عشق ایک زندگی مستعار کا
کیا عشق پائیدار سے ناپا سیدار کا
کر پہلے مجھ کو زندگی جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دل بے قرار کا
عظمی غلام نبی کراچی
جو آسمان پر ہمیشہ رہا ہے آج اسے
ہمیں بتانا ہے کہ اک جگہ زمین بھی ہے
انا پرست ہے وہ چلتے ہیں ہم لیکن
وہ خود بلانے گا اس بات کا یقین بھی ہے

گیلائی سسٹرز کراچی
ساری حقیقتوں کو خواب کر کے
عمر بھر کی خوشیاں برابر کر کے
بدل گیا ہے وہ چاہتوں سے خداد
میری عادتوں کو خراب کر کے
طوبی، تادیب
اک حرف تلی کا، ایک لفظ عجت کا
خود اپنے لیے اس نے کھا تو بہت دوا
ادوں کے لیے چپ چاپ دھوپ کھینچیں
سیکھے کوئی آداب و فاساد و سیرے
ہائمہ سلیم سندھو کوجہ
یکے کہتے ہو کوئی یاد نہیں خاوند
شام ہوتے ہی بھی دیکھو ذرا صوف ارنی
کر، نیش کراچی
چاند بدلا ہے کبھی جھیل بدل جانے سے
آئینہ کوئی بھی ہو، عکس تمہارا ہوگا
غذا، انصاف کراچی
ہے آج بھی ہماری انا کا وہی مزاج
مشکل ہے اپنے درد کا اظہار آج بھی
سندھ و ذریعہ خوشاب
گئی رتوں کی طرح وہ بھی لوٹ کر آئے گا
مزاج اس کا بدلتا ہے موسموں کی طرح
عزیز و سیم گورجراؤلہ
ہم نوم کی میٹھی پر کھڑے سوچ رہے ہیں
سودج سے بغاوت کا صلہ کیسا ملے گا
اب دیکھنا یہ ہے کہ رخصت کئے کھڑے کو
درا سے محبت کا صلہ کیسا ملے گا
عبدالغنی مان
میں چپ رہوں کبھی بے وجہ نہیں بڑوں غصہ
اسے گنوا کے عجب حوصلے تلاقی کروں

نسیم سحر گلشن اقبال
یہ اور بات کہ منبر پر آکے کچھ نہ کہیں
خاموش لوگ بلا کے خطیب ہوتے ہیں
نمرود مذاق ڈیفنس کراچی
تمہاری یاد بھی محنت کسی مفلس کی پونجی ہے
جسے ہم ساتھ رکھتے ہیں جسے ہم روز لگتے ہیں
یاسمین کنول پسرورد
اب آئیں یا آئیں ادھر لو جیتے چلو
کیا چاہتی ہے ان کی نظر پلو جیتے چلو
نمرود، اقرا کراچی
بلا جواز کسی اجنبی کے گھر جانا
عجب لگتا ہے انسان کا چاند پر جانا
میدان محقق قرائن پر کشمکشوں کا رہا
کبھی ہوا، کبھی تاروں کو رہا سہرا مانا
کونل عدنان کراچی
ایک اک لمحے پر خود کر کے
ہم جہاں بھی گئے ڈرتے ڈرتے گئے
عائشہ، تحویم کوجہ
باوقار لوگوں کو بے وجہ تارنے کا
انگلیاں اٹھانا تو کام ہے زمانے کا
سیدہ نسبت زہرا کوجہ
جو چاہتے ہو دیوں میں کوئی جگہ رکھنا
محبتوں میں بھی محو فاصلہ رکھنا
بس اس کی یاد میں مت زندگی رکھنا
دلوں کا راستہ سب کے لیے کشادہ رکھنا
گردیا شاہ کوجہ
ہمارے پاس بھی بیٹھیں اتنا چاہتے ہیں
ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمہاری لگے
خراذ تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ
یہ کیا ضرور وہ صورت بھی کو پیاری لگے
مایا انعام، حفصہ انعام کراچی
جس شہر میں جگہ جگہ کئی سائیاں رہے
دلکے ہیں وہاں بھی تو ہم بے امل رہے
ایسے انا پرست تھے کہ مل نہیں سکے
میں دھڑکی ہو کے رہ گیا، وہ آسمان رہے

صغیر فاطمہ ملیر کراچی
حسین آنکھوں کو بڑھنے کا ایسی تک شوق ہے مجھ کو
محبت میں اجڑ کر بھی میری عادت نہیں بدلی

آمنہ اقبال ڈھری
نہ خط آب کا ڈر تھا نہ سیل ایک خوف
زین ہی ایسی تھیں، بادل ہی یوں برسے تھے
بس اتنا یاد ہے کچھ لوگ بک رہے تھے ظفر
خسبر نہیں کہ وہ چٹکتے تھے یا کہ سستے تھے
سیدہ رقیہ اسماعیل بزمان
تیسرا بارش میں کبھی سرد ہواؤں میں رہا
اک تیسرا ذکر تھا جو میری مدافوں میں رہا
کیتے لوگوں سے میرے گھرے مراسم تھے مگر
تیسرا چہرہ ہی فقط میری دعاؤں میں رہا
عابدہ بشیر مروت کراچی
سونا آنکھیں، تنہا عورت، لمبی عمر
غالی آنکھیں، ہلکا آنکھیں، کیلے ہونٹ
اتنا بول بولی تو کیا سوچیں گے لوگ
رسم یہاں کی ہے الٹی لے ہوٹ
مہرست الطاف احمد کراچی

وہ جانتا تھا اس کی ہنسی مجھے پسند ہے خداد
زخم اس نے جب بھی دیا منکرا کر دیا
سندھ سیدی منکیرہ قتلہ بکڑ
گتا میں عشق کی پڑھ کے نہ بھو خود کو عالم تم
یہ دل کے کام دل والوں کو کرنے دو تو اچھا ہے
ثمینہ کوثر فیصل آباد
تم نے انداز محبت تو دکھا ہے انداز وفا نہیں
ہنجرہ گلنے کے باد جو بھی تیرے بھی آڑا نہیں کرتے
اسیہ ماوید علی پورچہ
وہی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا
اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہوتا ہے
روز میں رحیم کراچی
ہم نے یہ سوچ کر جال دی ہے محبت میں خراذ
بلا ہوس کرتے ہیں کس رنگ میں تقلید کے



حضرت صالح علیہ السلام

ثمود ایک مشہور قبیلہ کا نام ہے۔ یہ جدید کے بھائی ثمود کی نسل ہیں۔ یہ دونوں عاشر کے بیٹے تھے جو ارم کا بیٹا تھا اور ارم نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کا بیٹا تھا۔

یہ دور قدیم کی خالص عربی قوم سے تھے۔ ان کی رہائش تبوک اور حجاز کے درمیان حجر کے مقام پر تھی جسے مدائن صالح بھی کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ خلیج عقبہ کے مشرق میں واقع شہر مدین کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ قوم ثمود کے مکانات اس علاقے میں پہاڑوں میں کھدے ہوئے صاف نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہمراہ تبوک جاتے وقت اس مقام سے گزرے تھے۔

جیسا کہ حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہمراہ تبوک تشریف لے گئے تو مقام حجر میں ثمود کے (دیران) گھروں کے قریب فروکش ہوئے۔ لوگوں نے ان کنوؤں سے پانی لے لیا جو ثمود کے زیر استعمال رہے تھے۔ انہوں نے (اس پانی سے) آٹا گوندھ لیا اور (گوشت پکانے کے لیے آگ پر) دیکیں چڑھا دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اسے استعمال نہ کیا جائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر دیکیں الٹ دی گئیں اور آٹا اونٹوں کو کھلا دیا گیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہمراہ وہاں سے روانہ ہو کر اس کنوئیں کے پاس جا ٹھہرے جہاں سے اونٹنی پانی پیا کرتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے (دیران) گھروں میں

داخل ہونے سے منع فرمایا جن پر اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا اور فرمایا۔

”میں ڈرتا ہوں کہ تم پر بھی ویسا عذاب نہ آجائے جیسا ان پر آیا تھا اس لیے ان کے علاقے میں داخل نہ ہو کرو۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام حجر میں ارشاد فرمایا: ”ان عذاب یافتہ لوگوں کے علاقے میں (داخل ہونا پڑے تو) صرف روتے ہوئے داخل ہوا کرو اگر روانہ آئے تو ان کے علاقے میں داخل نہ ہو۔“ کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آجائے جو ان پر نازل ہوا تھا۔“

ثمود عربی قوم تھے اور ان کا زمانہ عادی کے بعد کا ہے۔ لیکن انہوں نے عادی کے واقعات سے عبرت حاصل نہ کی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس قوم کے لوگوں کی عمریں بہت طویل تھیں۔ آدمی مٹی سے گھربنا تا تو اس کی موت سے پہلے وہ گھر گر پڑتا۔ چنانچہ انہوں نے پہاڑ کھود کر گھربنا شروع کر دیے۔

اللہ تعالیٰ نے ان ہی میں سے اپنے ایک بندے کو نبوت کے منصب پر فائز کر کے ان کی طرف بھیجا۔ اس نبی کا نام صالح بن عبید بن ماسع بن عبید بن حادر بن ثمود بن عاشر بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام تھا۔

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کو دعوت حق دی لیکن وہ انکار پر ہی متصر رہے بلکہ آپ کو جادو زدہ کہا اور یہ بھی کہا کہ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں تو کوئی معجزہ یا نشانی پیش کریں۔

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اگر میں

مطالبہ اسی انداز سے پورا کروں جیسے تم نے کہا ہے تو کیا تم واقعی اس دین پر ایمان لے آؤ گے جو میں لایا ہوں اور ان امور میں میری تصدیق کرو گے جنہیں دے کر مجھے مبعوث کیا گیا ہے؟“ انہوں نے کہا ”ہاں! (ہم تجھ پر ایمان لائیں گے اور تیری باتوں کی تصدیق کریں گے۔“)

آپ نے ان سے پختہ عہد و پیمان لے لیا۔ تب آپ نے کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔ پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ان لوگوں کا مطالبہ پورا فرمائے۔ اللہ کے حکم سے وہ چٹان پھٹ گئی اور اس میں سے ایک بہت بڑی حاملہ اونٹنی نکلی جس میں وہ تمام حیوانات موجود تھیں جو مطالبہ کرنے والوں نے بیان کی تھیں۔ جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے معجزہ ظاہر ہوتے دیکھ لیا تو انہیں اس کی عظمت کا احساس ہوا اور وہ مرکوب ہو گئے۔ یہ اللہ کی قدرت کی ایک واضح نشانی اور حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کا ناقابل تردید ثبوت تھا۔ چنانچہ قوم کے کچھ لوگ ایمان لے آئے۔ لیکن اکثر لوگ کفر و ضلالت اور ہٹ دھرمی پر اڑے رہے۔

وہ اونٹنی ان میں موجود رہی۔ ان کے علاقے میں جہاں سے چاہتی چرتی اور جب کنوئیں پر پانی پینے جاتی تو کنوئیں کا سارا پانی پی لیتی۔ چنانچہ لوگ اپنی باری والے دن اگلے دن کے لیے بھی پانی بھر لیتے تھے۔ وہ لوگ اس کا دودھ پیتے اور وہ سب کے لیے کافی ہو جاتا۔ اس لیے آپ نے ان سے فرمایا۔

”(ایک دن) اس کی پینے کی باری ہے اور ایک معین روز تمہاری باری۔“

ارشاد باری تعالیٰ ہے ”ہم اونٹنی ان کے لیے آزمائش بنا کر بھیجے والے ہیں۔“ آزمائش اس لحاظ سے تھی کہ کیا وہ اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر بھی ایمان لاتے ہیں یا نہیں؟

صالح علیہ السلام نے فرمایا۔ ”تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک معجزہ آچکا ہے یعنی یہ ہی اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے معجزہ ہے سو

اسے (آزاد) چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے اور تم اسے بری نیت سے ہاتھ بھی نہ لگانا ورنہ دروناک عذاب تمہیں پکڑ لے گا۔“

ایک عرصہ تک یہ معاملہ یوں ہی چلتا رہا۔ آخر ان کے سردار جمع ہوئے اور مشورہ کے بعد متفقہ فیصلہ کیا کہ اونٹنی کو قتل کر دیں، مگر اس سے جان چھوٹے اور انہیں سارا پانی مل جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ”آخر انہوں نے اونٹنی (کی کنوئیں) کو کاٹ ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے کہ صالح! جس چیز سے تم ہمیں ڈراتے تھے اگر تم (اللہ کے) پیغمبر ہو تو اسے ہم پر لے آؤ۔“ (الاعراف 77-7)

سازشی قوم نے اللہ کے مجزے پر ایمان لانے کی بجائے اس پر ظلم وعدوان کیا اور اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا بندوبست کر دیا۔

جس شخص نے اونٹنی کو قتل کرنے کی ذمہ داری اٹھائی اس کا نام (قدار بن سالف بن جندع) تھا۔ وہ صرخ فام اور نیلی آنکھوں والا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ سالف کی بیوی سے (صہبان) کے نام پر تعلق کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اس نے لوگوں کے متفقہ فیصلے میں اونٹنی کو قتل کیا تھا۔ اس لیے اس کام کی نسبت ان سب کی طرف کی گئی۔

امام ابن جریر (رحمۃ اللہ) اور دیگر مفسرین کا بیان ہے کہ قوم ثمود میں دو خواتین تھیں۔ ایک کا نام (صدوق بنت معجبان زہیر بن مختار) تھا جو مال دار اور اونٹنی خاندان کی عورت تھی۔ اس نے قبیلہ اسلم کے ایک آدمی سے نکاح کیا، لیکن پھر طلاق لے لی۔ اس نے اپنے چچا زاد (مصدق بن مرج بن معجبان) کو بلا کر کہا۔ ”اگر تم اونٹنی کو قتل کرو تو میں تم سے شادی کر لوں گی۔“

دوسری عورت کا نام (عنیزہ) تھا۔ جو (غنیم بن معجلن) کی بیٹی تھی۔ اس کی کنیت (ام غنیم) تھی۔ یہ ایک کافر رہیا تھی۔ اس کا والد (ذواب بن عمرو) ایک

رحمیس تھا۔ اس عورت نے قدار بن سالف سے کہا۔
”یہ میری چار بیٹیاں ہیں۔ اگر تم اونٹنی کو قتل کر دو تو
جس لڑکی سے چاہو گے شادی کر دوں گی۔“
چنانچہ یہ دونوں جوان اس کام کے لیے کمر بستہ
ہو گئے اور قوم کے اور افراد کو بھی ترغیب دی۔ مزید
سات افراد ان کے ساتھ آٹے اور یوں کل نو افراد
ہو گئے۔

انہوں نے باقی قبیلے کو بھی ساتھ ملائے کی کوشش
کی تو لوگوں نے تائید کی۔ وہ اونٹنی کو قتل کرنے کے
لیے گھات میں بیٹھ گئے۔ جب وہ پانی پی کر واپس آئی تو
مصدق نے جو چھپ کر بیٹھا ہوا تھا اس پر تیر چلا دیا جو
اس کی پٹلی کی ہڈی میں پیوست ہو گیا۔ عینہ اور اس
کی بیٹیاں بھی قدار کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے
آگئیں اور انہیں جوش دلانے کے لیے اپنے چہروں
سے نقاب الٹ دیے۔ قدار بن سالف نے جلدی
سے اونٹنی پر تلوار سے حملہ کیا اور اس کی کوٹھیں کاٹ
دیں۔ وہ زمین پر گر پڑی اور زور سے آواز نکالی جس
سے اس کا بچہ چونکا ہو گیا اور دوڑ پھاڑ پر چلا گیا اور تین
بار بلبلایا۔ قدار نے اونٹنی کے گلے پر نیزہ مار کر اسے
قتل کر دیا۔

حضرت عبداللہ بن زمعہ سے روایت ہے کہ رسول
اللہ صلی علیہ وسلم نے خطبہ کے دوران۔ اونٹنی کا
اور اسے قتل کرنے والے کا ذکر کیا اور فرمایا۔ ”اسے
قتل کرنے کے لیے ایک دلیر سردار اٹھا جس کی بات
مانی جاتی تھی جیسے۔ (قریش میں) ابو زمعہ ہے۔“
حضرت عمار بن یاسر سے روایت ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا۔
”کیا میں تجھے نہ بتاؤں کہ سب سے زیادہ بد بخت
کون ہے؟“

انہوں نے کہا۔ ”جی ہاں! فرمائیے۔“ نبی صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”یہ شخص ہیں ایک تو محمود کا سرخ
قام آدمی جس نے اونٹنی کو قتل کیا تھا اور ایک وہ جو تجھے
اے علی! اس جگہ (یعنی سر) ضرب لگائے گا جس

سے یہ (یعنی داڑھی) تر ہو جائے گی۔“
جب ان لوگوں نے اونٹنی کو قتل کیا تو اس پر سب
سے پہلے قدار بن سالف (لعنہ اللہ علیہ) نے حملہ کیا
اور اس کی کوٹھیں کاٹ دیں وہ زمین پر گر پڑی۔ پھر
سب افراد نے جلدی جلدی تلوار سے اس کے گلے ٹکڑے
کر دیے۔ جب اس کے بچے نے یہ دیکھا تو بھاگ کر
سب سے اونچے پہاڑ پر چڑھ گیا اور تین بار بلبلایا۔ اس
لیے حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا۔

”اپنے گھروں میں تین دن اور فائدہ اٹھا لو۔“
یعنی انہیں اس دن کے علاوہ تین دن کی مہلت دی
گئی۔ انہوں نے اس موکد و عید پر بھی اعتبار نہ کیا
بلکہ شام ہوئی تو انہوں نے پروگرام بنایا کہ حضرت
صالح علیہ السلام کو بھی شہید کر دیا جائے۔ چنانچہ سب
قسمیں کھا کر کہنے لگے۔
”ہم رات کو صالح علیہ السلام کے گھر میں گھس کر
آپ کو اٹل و عیال سمیت شہید کر دیں گے۔ پھر اگر
آپ کے اقارب نے قصاص یا دیت کا مطالبہ کیا تو ہم
مکر جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے قتل نہیں
کیا۔“

جن افراد نے حضرت صالح علیہ السلام کو شہید
کرنے کی سازش تیار کی تھی اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کی
قوم سے پہلے ہی عذاب نازل فرما دیا اور ان پر پھر رسا کر
کچل ڈالا اور تباہ کر دیا۔ جب مہلت کا پہلا دن یعنی
جمعرات کا دن آیا تو ان کے چہرے زرد ہو گئے جیسے
صالح علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ شام ہوئی تو انہوں نے
کہا۔

”مہلت کا ایک دن تو گزر گیا۔“
جب دوسرے دن یعنی جمعہ کی صبح ہوئی تو ان کے
چہرے سرخ ہو گئے۔ شام ہوئی تو انہوں نے کہا۔
”مہلت کے دو دن گزر گئے۔“

جب مہلت کا تیسرا دن آیا یعنی ہفتے کی صبح ہوئی تو
ان کے چہرے سیاہ ہو گئے۔ شام ہوئی تو انہوں نے کہا۔
”صالح کی کسی ہوئی (مہلت تو ختم ہو گئی)۔“

اتوار کی صبح ہوئی تو انہوں نے خوشبو لگائی اور تیار ہو کر
بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں کون سا عذاب
آتا ہے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا
سلوک ہونے والا ہے اور ان پر کس طرف سے عذاب
آنے والا ہے۔

جب سورج طلوع ہوا تو آسمان سے ایک شدید آواز
آئی اور نیچے سے زلزلہ آگیا۔ چنانچہ تمام افراد کی
روحیں پرواز کر گئیں وہ مر کر بے حس و حرکت اور
خاموش ہو گئے۔ وہ اپنے گھروں میں جیسے بیٹھے تھے
ویسے ہی بیٹھے بیٹھے بے جان اجسام میں تبدیل ہو گئے
اور حرکت بھی نہ کر سکے۔ ان میں سے صرف ایک
لوتذی زندہ بچ گئی جو چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ اس
کا نام ”کلبہ بنت سلیق“ تھا اور اسے ”ذریعہ“ بھی کہتے
تھے۔ وہ بچی کا فرہ تھی اور صالح علیہ السلام کی سخت
دشمن تھی۔ جب اس نے عذاب دیکھا تو اسے چلنے کی
طاقت مل گئی چنانچہ وہ انتہائی تیزی سے بھاگی حتیٰ کہ
عربوں کے ایک قبیلے کے پاس جا پہنچی۔ اس نے تمام
مجموعہ دید و واقعہ سنایا اور قوم پر آنے والے عذاب کی
خبر دی۔ پھر پانی مانگا۔ جب اس نے پانی پیا تو وہ بھی مر
گئی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”یوں محسوس ہوتا کہ وہ کبھی
یہاں بسے اور آباد ہی نہیں ہوئے۔“ یعنی اس طرح فنا
ہو گئے گویا کبھی تھے ہی نہیں۔

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کی تباہی و بربادی پر
نہایت غم و حسرت کا اظہار فرمایا۔
”میری قوم! میں نے تمہیں اپنے رب کا پیغام
پہنچایا تھا اور تمہارا بھلا چاہا تھا۔“

بدر کے کنوئیں میں جن مقتول کافروں کو پھینکا گیا تھا
اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن بعد ان سے
بھی اسی طرح خطاب فرمایا تھا۔ رات کے آخری حصے
میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی لشکر کو
کوچ کا حکم دے دیا تھا اور خود سواری پر تشریف فرما
ہو چکے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اے کنوئیں والو! تمہارے رب نے تم سے جو وعدہ
کیا تھا کیا تم نے اسے پورا ہوتے دیکھ لیا؟ مجھ سے
میرے رب نے جو وعدہ فرمایا تھا میں نے تو اسے پورا
ہوتے دیکھ لیا ہے۔“

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ان
لاشوں کو مخاطب کر کے یہ بھی فرمایا تھا۔ ”تم اپنے نبی
کے لیے اس کا برا خاندان ثابت ہوئے۔ تم نے اس
وقت مجھے جھوٹا کہا جب لوگوں نے مجھے سچا مانا، تم نے
مجھے اس وقت (وطن سے) نکالا جب لوگوں نے مجھے
جگہ دی، تم نے اس وقت مجھ سے لڑائی کی جب لوگوں
نے میری مدد کی۔ تم اپنے نبی کے لیے نبی کا برا خاندان
ثابت ہوئے۔“

بعض علماء رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے کہ اس واقعہ
کے بعد حضرت صالح علیہ السلام حرم شریف میں
تشریف لے گئے اور وفات تک وہیں مقیم رہے۔
حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی
علیہ وسلم جب مقام حجر سے گزرے تو فرمایا۔

”مہجرات کا مطالبہ نہ کرو صالح علیہ السلام کی قوم
نے یہ مطالبہ کیا تھا تو وہ (اونٹنی کی صورت میں) ظاہر
ہو گیا۔ وہ اس راہ سے پانی پینے آئی تھی اور اس راستے
سے واپس جاتی تھی۔ انہوں نے اپنے رب کا حکم نہ
مانتے ہوئے سرکشی کی اور اس کی کوٹھیں کاٹ دیں۔
ایک دن وہ پانی پیتی تھی اور دوسرے دن وہ اس کا دودھ
پیتے تھے۔ جب انہوں نے اسے مار ڈالا تو ان پر ایسی
سخت جح کا عذاب آیا جس سے تمام لوگ ہلاک
ہو گئے صرف ایک آدمی بچا جو (اس وقت) حرم کی
سرزمین میں تھا۔“

صحابہؓ نے عرض کی۔ ”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ
وسلم وہ کون تھا؟“
فرمایا۔ ”وہ ابو رغال تھا۔ جب وہ حرم کی حدود سے
نکلا تو وہ بھی اسی عذاب کی لپیٹ میں آگیا جو اس کی قوم
پر آیا تھا۔“

کھیلنے والے

ایک سائن بورڈ پر پڑی۔ اس میں ماڈل کی تصویر دیکھ کر انہوں نے حیران سے اس کی تعریف کی، تب انہوں نے عابد علی کو خبر دیا کہ یہ ان کی اپنی بیٹی ایمان ہے۔

علی ظفر کی خواہش

معروف گلوکار و اداکار علی ظفر کی مصوراتہ صلاحیتوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کی شریک حیات بھی ان کو اسی فن کی بدولت ملی ہیں۔ ہوا کچھ یوں کہ علی اپنے پہلے میوزک البم کی ریکارڈنگ کے لیے پیسہ جمع کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں لوگوں کے پورٹریٹ بنانے لگے۔ اسی دوران وہاں عائشہ اپنا پورٹریٹ بنوانے آ گئیں اور یوں علی ظفر پورٹریٹ میں رنگ بھرتے بھرتے اپنی حیات کو عائشہ کی تصویر سے سجایا۔ اب علی کی خواہش ہے کہ وہ بلی ووڈ کے ممتاز اداکار امیتابھ بچن کی تصویر بھی بنائیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ علی کی یہ خواہش کب پوری ہوتی ہے۔

جوہر شناسی

معروف ہدایت کار محسن رضوی نے اپنی زندگی کے ایک دلچسپ واقعے کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ ایک مرتبہ وہ کراچی کی ایک مصروف شاہراہ سے گزر رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر ایک خوب صورت خاتون پر پڑی۔ محسن رضوی کی جوہر شناسی نظریں ان کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں تک پہنچ گئیں۔ انہوں نے ان خاتون کو فوراً "ماڈلنگ کی پیشکش کر دی۔ ساتھ ہی اپنا کارڈ دے دیا اور کہا کہ "اگر آپ ماڈلنگ کے لیے



عابد علی کی بے خبری

معروف اداکار و ماڈل ایمان علی فلم "بول" میں شاندار اداکاری کے بعد آج کل پھر لوگوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ نامور اداکار کی بیٹی ہونے کے باوجود ایمان علی نے اس شعبے میں اپنی صلاحیتوں کی بنا پر کامیابی حاصل کی ہے اور طویل جدوجہد کا دریا عبور کیا ہے۔ آج کی معروف اداکارہ و سپر ماڈل کو اپنی جدوجہد کے آغاز میں کوئی نہیں پہچانتا تھا، خود ان کے والد عابد علی بھی نہیں۔ جی ہاں! یہ بالکل سچ ہے۔ عابد علی نے اپنے ایک انٹرویو میں خود اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ کچھ یوں ہے کہ....

ایک دن عابد علی اپنی بیگم حمیرا چوہدری کے ہمراہ لانگ ڈرائیو پر نکلے تو ان کی نظر سڑک کے کنارے لگے

جی ہاں! آپ صحیح سمجھے، دلپ کمار نے عمران عباس کو اپنی پروڈکشن کے تحت بننے والی ایک فلم میں کام کرنے کی پیشکش کی ہے۔ لوجی! ہمارے ٹیلنٹ پر ایک اور ہماری ڈاک۔

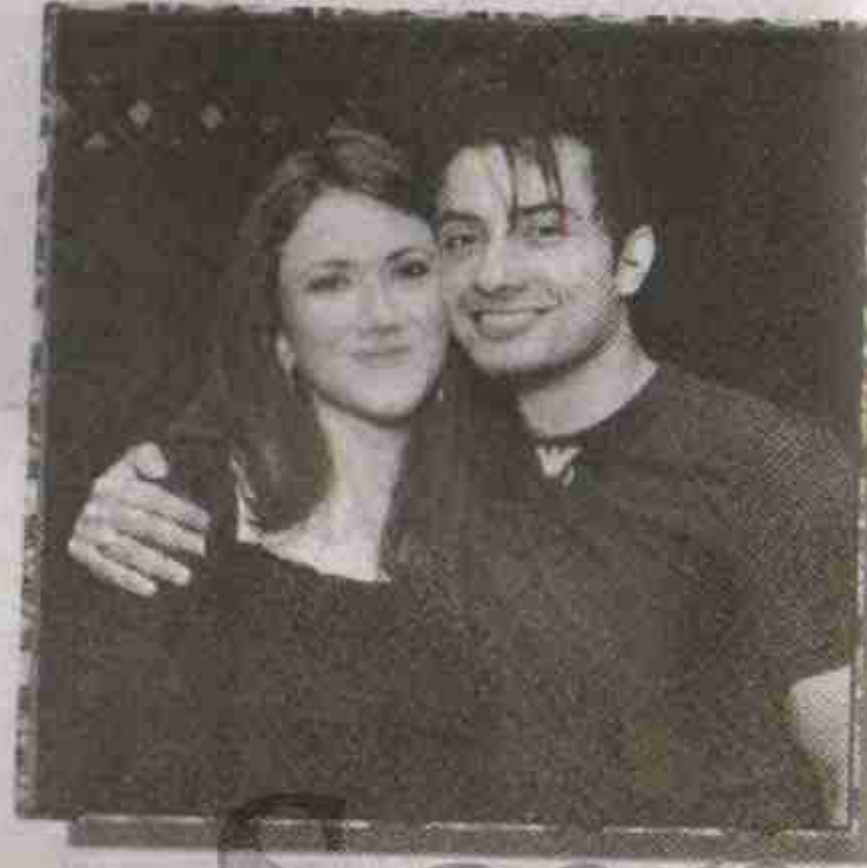


یہ بیان کالمائے

☆ الیکٹرک میڈیا جس کے نزدیک گالی بھی ایک خبر ہے اور گولی بھی۔ خبر دینے اور فساد پھیلانے کے فرق سے نا آشنا۔ سب سے پہلے کی دوڑ میں پٹلا۔ جن کے لیے ریٹنگ ہی سب کچھ ہے۔ ڈکڑی بھانے اور بندر نچانے والے کی سطح پر آگئے۔ نتیجہ کراچی ایکسپریس پھر خون میں نہا گیا۔ (مشتاق احمد خان۔ نقارہ)

☆ امریکہ افغانستان سے جانا چاہتا ہے تو اس طرح کہ طالبان اس کی بات مان کر ایسی حکومت کا صدر بن جائیں جس کی باگ ڈور امریکہ کے ہاتھ میں آئے۔ (عبداللہ طلال۔ تہل)

وغیرہ وغیرہ

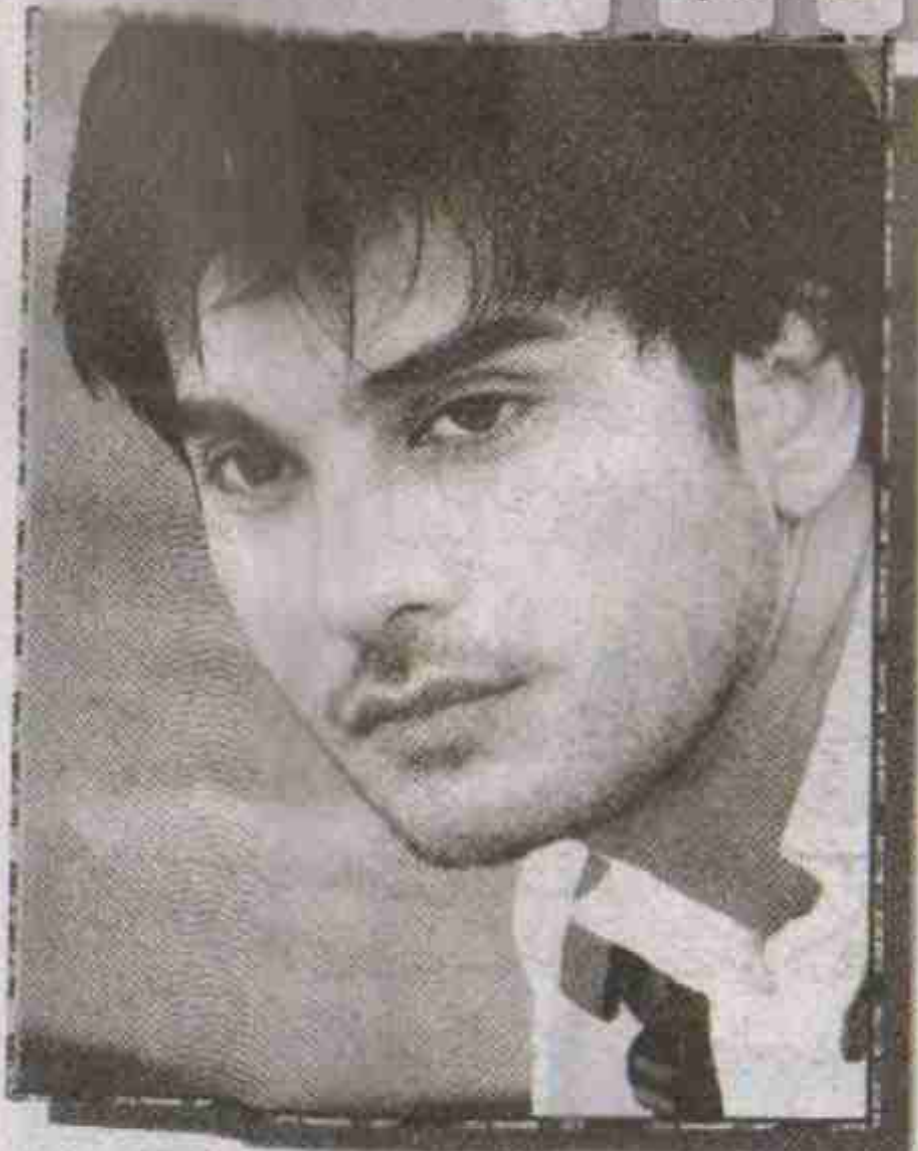


راضی ہوں تو وہ دن بعد اپنے والدین بھائی کے ساتھ میرے دفتر آجائیں۔ "آج وہ خاتون ملک کی معروف ماڈل ہیں۔ سچ ہے قسمت کو مہربان ہونا ہوتا ہے تو وہ راہ چلتے بھی ہو جاتی ہے ورنہ طویل تر جدوجہد کے پر خطر سفر بھی رائیگاں جاتے ہیں۔

محسن صاحب! کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ ان خاتون کا نام بھی بتا دیتے تاکہ ہم اس بات کا تعین تو کر لیتے کہ آپ کی نظریں واقعی جوہر شناس ہیں یا۔۔۔؟

حیرانی

کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ عمران عباس اچانک حیران ہو گئے۔ ان کی یہ حیرت کسی ڈرامے کا حصہ نہیں تھی بلکہ ان کے اپنے ذاتی تاثرات پر مبنی تھی۔ اپنی اس حیرت کا قصہ انہوں نے ایک ٹی وی انٹرویو میں بیان کیا۔ عمران بتاتے ہیں کہ وہ اس وقت حیران رہ گئے، "جب انہیں عظیم اداکار دلپ کمار کا فون موصول ہوا۔ دلپ کمار نے عمران کے ڈرامے دیکھ کر انہیں فون کیا اور ان کی بے پناہ تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "ہمیں بہت خوشی ہوگی کہ آپ جیسا خوب اداکار ہماری فلموں میں کام کرے، جو صرف اچھی شکل و صورت کا مالک ہی نہیں، بلکہ اداکاری کی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہے۔"



* انتخابی نتائج میں کامیابی کا حق پر ہونے کی دلیل نہیں قرآن پاک میں پچیس انبیاء کا تذکرہ ہے دیگر الہامی کتب اور اسرائیلی روایات کو سامنے رکھا جائے تو ہمیں 35-30 کے لگ بھگ پیغمبروں کے نام اور ان کے تذکرے ملتے ہیں۔ ایک بڑا سوال ہے کہ ان میں سے کتنے انبیاء نے وہ کامیابی حاصل کی جسے دنیاوی نگاہ میں کامیابی کہا جاتا ہے۔ شاید تین یا چار۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم - حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت یوسفؑ (محمد ابراہیم عزری) * آزاد کشمیر میں انتخابات میں جو دھاندلی ہوئی ہے وہ اپنی جگہ 20 بار پھانسی سے کم نہیں ہے۔ مثلاً "ایک جگہ ایک خاتون کے چالیس بچے دکھائے گئے اور مزے کی بات کہ چالیس کے چالیس بچوں کے ووٹ بھی کاٹ ہوئے۔ (عبداللہ طارق سہیل وغیرہ وغیرہ) * امریکا پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جب افغانستان عراق اور لیبیا میں اسے کامیابی نہیں مل سکی تو یہ ایک کثیر آبادی والا نیوکلیر پاور ملک ہے۔ (اجیت ساہی مہینہ جرنلسٹ دہلی)

* میرا اللہ یہ حکم دیتا ہے کہ اپنے گناہ کو دوسروں کے سامنے بیان کر کے اپنے خلاف گواہ مت پیدا کرو۔ گناہ جب تک بندے اور اللہ کے درمیان رہتا ہے تو توبہ کی قبولیت کے قریب ہوتا ہے، لیکن گواہ بناؤ گے تو مقدمہ درج ہو گیا اور سزا لازم۔ (اور یا مقبول جان حرف راز)

* ترکی نے ترقی اور خوشحالی مولوی قسم کے سیاست دانوں کے ذریعے ہی حاصل کی۔ (جاوید چودھری - زیرو پوائنٹ)

* اگرچہ ہمارے امریکا نواز دانشوروں کو یہ بات ہضم نہیں ہوگی لیکن باقی دنیا کو دکھائی دینے والا سچ یہ ہے کہ امریکا نے افغانستان میں جنگ ہار دی ہے۔ افغانستان میں لاکھ کے قریب لاشیں گرانی اور انفراسٹرکچر اور بستوں کو لمبے کا ڈھیر بنانے کے سوا اس نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا، الناس کی اپنی معیشت کا دیوالہ پٹ گیا۔ (عبداللہ طارق سہیل - وغیرہ وغیرہ)

* مختار ماہی نے عالمی سطح پر شہرت کمانے کے بعد سیاست شروع کر دی۔ 21 جون 2006ء کو نو سالہ بچی کے ساتھ زیادتی کے کیس پر مختار ماہی نے عدالت کے بجائے پنجایت بٹھانے کا کہا اور اپنے بھائی حضور بخش کو پنجایت کا سربراہ بنایا۔ حضور بخش نے نو سالہ لڑکی کے ساتھ زیادتی کرنے والے ملزم فیضان کو حکم دیا کہ وہ اپنی نو سالہ بہن کو لڑکی کے بوڑھے باپ سے بیاہ دے۔ (وکی لیکس کا انکشاف)

بدایوں کے پیڑے اور کراچی کا حلوہ

انور مقصود کی بیگم عمرانہ مقصود اور عامرہ عالم کی کتاب "بدایوں کے پیڑے اور کراچی کا حلوہ" کی تقریب رونمائی گزشتہ دنوں ڈیفنس کراچی میں منعقد ہوئی۔ جی ہاں! یہ کتاب دو مصنفین کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ عامرہ عالم عمرانہ مقصود کی بہن اور "سٹریٹ میگزین" کی مدیر بھی ہیں یہ کتاب دراصل عمرانہ مقصود اور عامرہ عالم کے بچپن کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کی تقریب رونمائی ایک غیر رسمی تقریب تھی جس کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ تقریب اپنے مقررہ وقت پر شروع ہوئی، جس پر ہمیں خوش گوار حیرت ہوئی۔ کتاب پر اظہار خیال کرنے والوں میں فاطمہ ثریا بیجا، زبیدہ طارق، عامرہ عالم عمرانہ مقصود اور انور مقصود شامل تھے۔ تقریب کے آخر میں لذت کام و دہن کا انتظام کیا گیا تھا جس کی انفرادیت یہ تھی کہ کتاب کے نام کی مناسبت سے میز پر "بدایوں کے پیڑے اور کراچی کا حلوہ" بطور خاص موجود تھے۔ شرکائے تقریب نے ان سے بھرپور انصاف کیا۔



نوائین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

نوائین ڈائجسٹ

اگست 2011 کے
شمارے کی ایک جھلک



اگست

2011

کا شمارہ شائع
ہو گیا ہے

* "میرے خواب لوٹا دو" نگہت عبداللہ

* "سفال گر" بشری سعید کاناوٹ،

* نجمہ ثاقب، حیات بخاری، شاہدہ ملک اور

* طور سینا کے افسانے،

* "کچھ ریزے نرم سوالوں کے"

* شیریں ملک کا مکمل ناول،

* "مصحف" نمرہ احمد کے ناول کی آخری قسط،

* "عروسہ صدیقی" سے باتیں،

* "دریچے تو کھولیں" نایاب جیلانی کا

* مکمل ناول،

* "عروسہ صدیقی" سے باتیں،

* "دریچے تو کھولیں" نایاب جیلانی کا

* مکمل ناول،

نوائین ڈائجسٹ اگست کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

کے بارے میں لکھیں۔ کچھ اپنی دل کی لکھیں پوری سچائی کے ساتھ۔

شہابیہ گل۔۔۔ عیسیٰ خیل

عیسیٰ خیل میانوالی کی ایک چھوٹی سی تحصیل ہے۔ کافی پسماندہ علاقہ ہے، تعلیم کی سہولتیں بھی محدود ہیں۔ میں نے حال ہی میں بی اے کا امتحان دیا ہے۔

1۔ یوں تو شعاع کی بے شمار کہانیاں دل پہ نقش ہیں۔ فرحت اشتیاق کی ”وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر“ مجھے بہت پسند ہے۔ اس تحریر میں فریاد عبد الرحمان کا کردار ایسا تھا کہ جس سے مجھے خاص دل لگاؤ محسوس ہوا، کیونکہ اسپینش باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود اس کی سوچ خالص مشرقی لڑکیوں جیسی تھی اور اس نے اپنی ڈائری میں جو الفاظ لکھے وہ مجھے ازبہ و گئے کہ۔

”محبت ہم لڑکیوں کے بس کا رنگ نہیں۔ ہم کرلیں تو نبھانا مشکل“ نبھالیں تو زندگی گزارنا مشکل۔

وہ جو لفظوں کو برتنے کا ہنر جانتی ہیں ان کے سامنے کوئی کیونکر کچھ بول سکتا ہے۔ بہر حال! ہم نے اچانک ایک شدت پسند اپنے اصولوں پر اٹل اور سمجھوتہ نہ کرنے والی جذبوں کی انتہا کو چھوتی ہوئی ایک رائٹر کے قریب پہنچتے ہی سوال دلایا۔

”سالار (پیر کامل) کا ایڈریس مل سکتا ہے۔ عمیرہ جی! (بابا)

طاہرہ نوانہ۔۔۔ کوٹ ادو

1۔ ہماری تمام مصنفین بڑی محنت اور بڑی محبت سے کہانیاں تخلیق کرتی ہیں۔ عمیرہ، نمرہ، فرحت، کنیز نبوی، رخسانہ نگار اور باقی سب کے ہاتھ چومنے کو دل کرتا ہے۔ ”متاع جاں کی“ سفید سجاد، ”قراقرم کا تاج محل“ کی ”پریش“ وغیرہ سب سے دوستی تو کہانی پڑھنے کے دوران ہی ہو جاتی ہے۔

2۔ کاش کہ کوئی ایسا موقع ملے جہاں تمام مصنفین جمع ہوں اور ہم بھی انہیں دیکھ سکیں۔ ان سے کچھ پوچھ سکیں۔ ان سے مل کر میں تو اس قدر خوشی سے حواس باختہ ہو جاؤں گی سوال و جواب کی زحمت ہی نہیں کہوں گی۔ اس کے علاوہ شعاع کو اپنی 26 ویں سالگرہ مبارک ہو شعاع کے لیے۔

تیری حیات کا ہر لمحہ شادماں گزرے
ہماریں سجدہ کریں تو جہاں جہاں گزرے
خدا نصیب کرے تجھ کو دائمی خوشیاں
تو سرخرو رہے جب بھی امتحان گزرے

مسز عبد الوحید۔۔۔ لاہور

1۔ شعاع کی تمام مصنفین کی تحریریں قابل تعریف ہیں۔ ان کی تعریف کرنا ”کوزے میں دریا بند کر دینے کے مترادف ہے۔

آسیہ رزاقی کی بہت سی تحریریں پڑھی ہیں ان کی کہانی ”پہلی نظر کا انعام“ کی ”آنر“ کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ نگہت سیمائی کی تحریر جو کہ نومبر 2004ء میں چھپی تھی ”علیہ کا کردار ناول کا نام تھا“ ایک تھی علیہ ”جو کہ آج تک یاد ہے۔ اس میں اس کی ذہانت اور سادگی و معصومیت بہت پسند آئی۔

فرحت کے تو کیا ہی کہنے دل دن فرحت! ان کی تحریر ”وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر“ ”فریاد“ سے ملنے کو دل چاہا اور اس کے دکھ پر ساتھ دینا چاہا۔ فریاد کی سعادت مندی پسند آئی۔

رفعت سراج کی ”دل دا دلیر“ کی ”روشانی“ اور اس کا غصہ بھرا انداز بہت بھایا۔ نایاب جیلانی کی تحریر ”پرکھ“ میں ”ملشہ“ کا کردار اور اس کی سعادت مندی اور دوسروں کا خیال رکھنے کا جذبہ۔

نمرہ بخاری کی تمام تحریریں اور کردار اپنی طرز میں بہت مختلف اور اچھوتے ہوتے ہیں جن میں پنجاب کی کرم زمینوں کی خوشبو پوری بسی ہوئی ہے۔

کنیز نبوی کی تحریر ”جن صدائیں سو جھرو“ کی ”ماروی“ رخسانہ نگار کی تحریر اب سفر کا استعارہ اور ہے کی ہیروئین کیسہ کا کردار اور صبر بے مثال تھا۔

رخسانہ جی کی تحریر ”دھند کے پار“ کی ”نانکھ“ کا کردار بہت ہی بے مثال تھا جو کہ کہیں نہ بھولے گا۔

نمرہ احمد کی تمام تحریریں بہت ہی بے مثال ہیں جو کہ ہمیشہ ہی ناقابل فراموش رہیں گی ”قراقرم کا تاج محل“ ایک یادگار تحریر اور ادب کی دنیا کا تاج محل ”اس کی ڈاکٹر پریشہ جہاں زیب کا کردار ادب“ ”بلی راجپوتوں کی ملکہ“ میں ”مایا فرینڈس“ کا کردار اور رائٹر کا بیان اس کی پر سنائی

کے بارے میں بے ساختہ ملنے کو دل چاہا۔
راحت کی تحریر ”زرد موسم“ کی ”ایمن“ اور ”سفر تمام ہوا“ میں ”رجا کا کردار“ جو کہ ایک ایٹارنل لڑکی کا کردار تھا ناقابل فراموش تھا۔ میں نے اس میں راحت کے فن کی انتہا دیکھی۔ راحت کی منظر کشی کی بہترین صلاحیت کی وجہ سے اس کہانی کے کرداروں کے گھر تک خیالی دنیا میں محفوظ ہو گئے۔ راحت کی تحریروں میں ”منظر بدل گیا ہے“ کی ”ایلی“ اک ایلی پکڈنڈی ”ہے۔ ”یہ موسم سبز پتوں کا“ یادگار تحریریں ہیں۔

عنیزہ سید کی تحریر ”بیاباں میں ہے منظر لالہ کب سے“ کی ”لالہ رخ“ اور عمر لنگھیال ”پہاں پار“ کی آمنہ کا کردار مندرجہ بالا تمام کرداروں سے ان کی اپنی اپنی خوبیوں کی بناء پر ملنے کو دل چاہا تمام مصنفین کی اور مجھے کافی زیادہ تحریروں ہیں جو کہ ذہن کے گوشوں میں محفوظ ہیں۔

2۔ کاش یہ سچ ہو تاکہ تمام رائٹرز میرے سامنے ہیں اور میں ان سے مل رہی ہوں۔ سب سے پہلے میں راحت سے پوچھتی کہ اتنی اچھی منظر نگاری کہاں سے سیکھی کہ ”ہمارے لفظوں میں اتنی آتی“ ان کی تحریروں سے ہی مجھے پھولوں کی ملک آتی ہے۔

فرحت کے پاس محبت کی چاشنی و مٹھاس کی آج کی دنیا میں اتنی فراوانی I Love farhat وہ اتنا مٹھاس کیسے لکھ لیتی ہیں۔

نمرہ بخاری سے ضرور پوچھوں گی کہ پاکستان ریلوے کی وہ اتنی مداح کیوں ہیں۔ میں انہیں کہوں گی کہ وہ ایک اچھی سی دادی اور نانی مجھے بھی لادیں۔ مجھے ان رشتوں کا پیار نہیں ملا خاص کر دادا اور دادی۔

نمرہ احمد سے کہوں گی کہ مجھے پریشہ سے ملو ادیں نمرہ اتنی انفارمیشن کہاں سے لاتی ہیں۔

نگہت سے کہوں گی اپنی تحریر کی روانی مجھے دے دیں۔ عمیرہ کے ہاتھ چوموں گی جس نے پیر کامل تحریر کیا۔ عنیزہ کی تحریروں میں جو فسوں خیزی ہے وہ کیسے آجاتی ہے۔

فاخرہ سے کہوں گی کہ دوبارہ آجاؤ ہماری دنیا میں۔ میونہ سے کہوں گی کہ ”تیری راہ میں دل گئی دے“ کی دوبارہ جیسے کردار دوبارہ کیوں نہیں تخلیق کیے۔

پہلا سوال عمیرہ احمد سے یہ ہو گا کہ کہتے ہیں کہ عشق حقیقی کے لیے عشق مجازی ضروری ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟

نگہت سیمائی سے لکھنا آپ کا شوق ضرورت یا مقصد؟ رفعت سراج سے۔ کیا آپ میری استاد بن کر مجھے قلم چلانے کا ہنر سکھائیں گی؟

عنیزہ سید سے۔ آپ کے خیال میں عورتوں کو گھر کے اندر اور باہر کتنی خود مختاری ملنی چاہیے۔

عالیہ بخاری سے۔ کیا اعلیٰ خاندان کے اوصاف عام لوگوں میں نہیں پائے جاتے؟ ان لوگوں سے غلطی یا کوئی گناہ ہو جائے تو ہم کہتے ہیں کہ ان کی ذات ہی گھٹیا اور پچ ہے۔ ان کا خون گندہ ہے؟ آپ اس بارے میں کیا کہیں گی؟

نمرہ احمد سے۔ کیا عورت کو اپنی ذات کے خوف کے گئے فیصلے پہ مرد کے سامنے کھڑا ہونا چاہیے یا وہ ہمیشہ اس کے حکم پہ سر جھکا رہے۔

راحت جی سے۔ عورت کو اپنی ذات کو کس حد تک اہمیت دینی چاہیے؟ کنیز نبوی سے شہادہ الطیف بھٹائی نے عورت کی جن خوبیوں کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے، آپ ان خوبیوں کو اپنی ذات میں کس حد تک دیکھتی ہیں؟ رخسانہ نگار عدنان سے۔ لکھنے کے لیے آپ نے اپنی زندگی سے کن چیزوں کو نکال کر باہر پھینکا؟

شائستہ اکبر۔۔۔ گڈو

آپ کے سوالات ہمیشہ منفرد ہوتے ہیں اور ہم ان کو لکھنے اور جوابات دینے میں بہت انجوائے کرتے ہیں۔

1۔ میں نے سب سے زیادہ ”فریاد عبد الرحمان“ کو اپنے دل کے بہت قریب سمجھا۔ اس لیے محبتیں کرنے والی فری سے میرا دوستی کرنے کو دل چاہا۔ مجھے فرحت اشتیاق کی فریاد عبد الرحمان سے بھی بہت محبت ہے اور اس کردار کو تخلیق کرنے والی فرحت اشتیاق سے بھی۔

2۔ بہت اوکھا سوال ہے۔ اگر میں کسی ایسی تقریب میں جاؤں جہاں مصنفین کا اجتماع ہو تو میں اپنی فیورٹ مصنفہ فرحت اشتیاق سے سوال کروں گی ”کہ وہ کچھ اپنی زندگی

چھٹرک دیں۔ اس سال رمضان میں افطار پر چاٹ کا نیا
ذائقہ متعارف کروائیں۔

آملیٹ

اجزا :

اندھے

نمک

پسی سیاہ مرچ

تیل

ترکیب :

اندھوں کو اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اس میں پسی
ہوئی سیاہ مرچ اور نمک ڈال کر مزید پھینٹ لیں۔ ایک
فرانی پان میں تیل گرم کر کے اندھے کا آمیزہ ڈال دیں
اور کم از کم 60 سیکنڈ تک اس کے نیٹ ہونے تک
انتظار کریں۔ جب ایک سائیڈ مناسب براؤن ہو
جائے تو چھپرے کی مدد سے پلٹ دیں۔ جب دونوں اطراف
سے پک جائے تو اتار لیں۔ سحری کے لیے جھٹ پٹ
تیار کرنے والی آسان ترکیب اس سال رمضان
السلارک میں ضرور استعمال کریں۔

کیری کا مرہ

ضروری اجزا :

دو کلو

چینی

الپچی سبز

ایک پاؤ

کیاں دو کر خشک کر لیں۔ پھر ان کو چھیلیں اور چار
تکڑے کر لیں۔ گھٹلی نکال دیں۔ اب ایک پٹیلی میں
تھی گرم کریں اور اس میں الپچی کے دانے ڈال
دیں۔ جب کڑکڑا جائے تو اس میں دو سیر پانی ڈال کر
پکائیں۔ دو چار اباں آنے کے بعد اس میں کٹی ہوئی
کیاں ڈال دیں۔ پھر دو منٹ پکنے کے بعد چینی ڈال
دیں اور آدھ گھنٹہ پکنے دیں۔ جب کیاں گل جائیں تو
اتار لیں۔ ٹھنڈا کر کے شیشے کے جار میں محفوظ کر لیں۔

1 عدد
1 کپ
3/4 کپ
2 کھانے کے پچے
حسب ذائقہ

اندھا
پاپے کا چورا
برید گرمز
پارسلے کٹا ہوا
سفید مرچ پاؤڈر

ترکیب :

ایک پیالے میں مرغی کا قیمہ 'اندھا' برید گرمز (ڈبل
روٹی کا چورا) پارسلے، نمک اور سفید مرچ پاؤڈر ڈال کر
مکس کریں اور چھوٹے چھوٹے ٹکٹس بنیں۔
پاپے کے چورے میں اچھی طرح پینیل پھر فرانی
پان میں تیل گرم کر کے اس میں تیار کیے ہوئے
ٹکٹس ڈال کر دو درمیانی آنچ پر گولڈن برن تک
تلیں۔ مزیدار چکن ٹکٹس تیار ہیں۔ اٹو کچپ
کے ساتھ افطار پر پیش کریں۔

چنا چاٹ

اجزا :

1/2 کلو

6 عدد

2 چائے کے پچے

حسب ذائقہ

حسب ذائقہ

2 کھانے کے پچے

4 کھانے کے پچے

کالی چنے ابلے ہوئے

ہری پیاز

لیمون کارس

نمک

پسی سیاہ مرچ

زیتون کا تیل

پارسلے کٹا ہوا

ترکیب :

چنوں کا پانی مختار کر ایک طرف رکھ لیں۔ ہری پیاز
کے سفید حصے سلائس کی طرح کاٹ لیں جبکہ ہرے
حصے کو تقریباً "3" انچ لمبے کاٹ لیں۔
ایک بڑے برتن میں زیتون کا تیل اور لیمون کارس
ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب اس میں چنے،
ہری پیاز (دونوں حصے) اور پارسلے ڈال کر مکس کریں۔
آخر میں نمک اور پسی ہوئی کالی مرچ ڈال کر ہلکا سا
الٹ پلٹ کریں۔ ساتھ ہی لیمون کارس بھی اوپر



رمضان کے پکوان

خالکہ جلاتی

ترکیب :

پیاز، لہسن، سبز مرچ آدھا کپ پانی میں بلینڈ کر کے
پیسٹ بنالیں۔ ایک برتن میں بیسن، زیرہ گرم مسالا،
سرخ مرچ، نمک اور میٹھا سوڈا مکس کر لیں۔ اب اس
میں چکن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈالیں
اور اچھی طرح مکس کر لیں تاکہ چکن پر بیسن کی تہہ بن
جائے۔ تیل گرم کر کے گولڈن براؤن ہونے تک
تلیں۔ کچپ یا املی کی کھنی چٹنی کے ساتھ خود بھی
کھا سیں اور گھر والوں کو بھی افطاری پر پکوانوں کا نیا مزہ
نیٹ کروائیں۔

چکن ٹکٹس

اجزا :

1/2 کلو

مرغی کا قیمہ

چکن پکوڑے

اجزا :

بغیر ہڈی کا چکن

پیاز باریک

لہسن

سبز مرچ

سرخ مرچ

بیسن

پیاز ہوا زیرہ

پیاز گرم مسالا

میٹھا سوڈا

نمک

تیل

1 1/2 پاؤ

1 عدد

3 جوے

2 عدد

1/2 چائے کا چمچ

1/2 پاؤ

1 چائے کا چمچ

1/2 چائے کا چمچ

1 چٹکی

حسب ذائقہ

تلنے کے لیے

رمضان المبارک میں صحت بخش غذائیں

رمضان المبارک کی آمد آہے۔ ہمارے مذہب میں ہمیشہ تھوڑی بھوک چھوڑ کر کھانا کھانے کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ طبی ماہرین بھی اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ بھوک رکھ کر کھانا ہمارے جسم کے لیے بے حد فائدہ مند ہے۔ رمضان کا مہینہ ہمیں قدرت کی طرف سے یہ مشق اختیار کرنے کے لیے فراہم ہوا ہے۔ تاہم اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہم رمضان میں عام دنوں سے کہیں زیادہ مقدار میں خوراک استعمال کر کے روزے کے روحانی اور طبی فوائد سے خود کو محروم کر لیتے ہیں۔ سحر و افطار کے وقت ہماری یہ ہی کوشش ہوتی ہے کہ دنیا جہان کی نعمتیں اپنے دسترخوان کی زینت بنالیں۔ ہم سحری میں کھجلا، پھنی، انڈے، پرائے اور افطار میں پکڑے، سمو سے اور روزہ وغیرہ تناول کر کے جسم میں زائد مقدار میں کیلوریز جمع کر لیتے ہیں۔ اسی زائد خوراک کی بدولت روزے میں بھی بد ہضمی اور طبیعت میں گرائی کی شکایت ہو جاتی ہے ہمیں چاہیے کہ مناسب مقدار میں متوازن غذا کا استعمال کریں تاکہ پورا مہینہ تمام امور کی مستعدی سے انجام دہی کے ساتھ ساتھ خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت بھی کر سکیں۔

پیارے بہنو! آج ہم آپ کو رمضان المبارک کے لیے چند اہم باتوں اور مشوروں سے آگاہ کر رہے ہیں کہ جنہیں اپنا کر آپ روزوں کے صحیح فیوض و برکات سے مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے من و خوب صورتی کو بھی ماند پڑنے سے بچا سکیں گی بلکہ چہرے کی تروتازگی و شادابی میں پہلے سے بھی کہیں زیادہ اضافہ کر سکیں گی اور ضرورت سے زائد کیلوریز کو چربی کی تہ کی صورت میں جسم پر چڑھانے سے بھی محفوظ رہیں گی۔

1 انتخاب کریں۔ کھجلا، پھنی، سمو سے، رول اور گھی میں تیار کردہ دیگر پر تکلف غذا میں نظام ہضم پر بوجھ ثابت ہوتی ہیں، ان کو اعتدال میں رہتے ہوئے استعمال کریں۔

2 سحر و افطار میں کھجور بہ طور خاص شامل کریں۔ کھجور کا استعمال برکت کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین اور مکمل غذا بھی ہے۔ اس میں شامل طاقت ور غذائی اجزاء جسم کو فوری توانائی فراہم کرتے ہیں۔

3 پھل اور سبزیاں بہ کثرت استعمال کریں کیونکہ یہ سادہ اور صحت بخش غذا ہے، لہذا افطار میں فروٹ چاٹ، چھولوں کی چاٹ اور تازہ سبزیوں کا سلاوا استعمال کریں۔ سحری میں سبزیاں اور ترکاریاں بطور سالن استعمال کرنا روزے کے دوران بد ہضمی اور گرائی سے محفوظ رکھے گا۔

4 طبی ماہرین دہی کو ایک مکمل غذا قرار دیتے ہیں۔ سحر و افطار میں دہی اور لسی کا استعمال دن بھر پیاس سے محفوظ رکھتا ہے اور توانائی کے بہترین حصول کا باعث بھی ہے۔ تازہ ترین جلابی تحقیق کے مطابق روزانہ دہی کھانے سے مسوڑھے صحت مند رہتے ہیں۔ نیز بال، ناخن اور جلد بھی چمک دار اور تروتازہ رہتی ہے۔ دہی کا باقاعدہ استعمال جگر، معدہ، فساد خون اور آنتوں کے امراض سے محفوظ رکھتا ہے۔ پیٹ کی تمام تکالیف دور ہو جاتی ہیں۔ نیز دہی کی لسی، گردوں اور شوگر کے مریضوں کے لیے بھی مفید ہے۔

5 بہتر صحت اور چمکتی جلد کے لیے روزانہ کم از کم آٹھ گلاس پانی پینا بے حد ضروری ہے۔ روزوں کے

روزوں میں صحت مند غذاؤں اور شادابی کے لیے روزانہ کم از کم آٹھ گلاس پانی پینا بے حد ضروری ہے۔ روزوں کے دوران صحت مند غذاؤں اور شادابی کے لیے روزانہ کم از کم آٹھ گلاس پانی پینا بے حد ضروری ہے۔ روزوں کے

1 سحر و افطار میں مرغن اور شادابی کے لیے روزانہ کم از کم آٹھ گلاس پانی پینا بے حد ضروری ہے۔ روزوں کے دوران صحت مند غذاؤں اور شادابی کے لیے روزانہ کم از کم آٹھ گلاس پانی پینا بے حد ضروری ہے۔ روزوں کے